مقدمہ دستور

(حصہ اول)

حزب التحریر

من منشورات حزب التحرير

یہ کتاب حزب التحریر کی نشر کردہ کتب میں سے ہے

فہرست کتاب

عمومی احکامات 8
نظامِ حکومت 112
خلافت 145
بیعت کی کیفیت 147
معاونین 210
معاونِ (وزیرِ) تنفیذ 220
رعایا کو براہِ راست خطوط پہنچانا 224
بین الاقوامی تعلقات 225
فوج 226
فوج کے علاوہ ریاست کے دیگر ڈھانچے 226
والی 228
أمیر جہاد: شعبہ حرب - فوج 243
داخلی امن 267
شعبہ خارجہ 280
شعبہ صنعت 281

قضاء(عدلیہ) 284
انتظامی ڈھانچہ 330
آسانی 330
جلد تکمیل 332
قابلیت 332
بیتُ المال 338
آمدن(محصولات)کاڈپارٹمنٹ 346
نفقات (اخراجات)کاڈپارٹمنٹ 347
میڈیا 348
مجلسِ امت(شوریٰ ومحاسبہ) 352
معاشرتی نظام 375

پہلا ایڈیشن: 1382ھ- 1963ء

دوسرا ایڈیشن: 1430ھ- 2009ء

اردو ترجمہ- 2014ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ o وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُوْنَ ہ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ o

(المائدۃ: 48 – 50)

”اور ہم نے آپ ﷺ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، یہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر حاوی (منسوخ کرنے والی) ہے۔ پس ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلہ کریں، اور جو حق آپ کے پاس آیا ہے، اس کے مقابلے میں ان کی خواہشات کی پیروی کبھی نہ کریں۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور واضح راہ مقرر کر دی ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی امت کر دیتا لیکن وہ تمہیں اپنے دیے ہوئے حکموں میں آزمانا چاہتا ہے لہٰذا نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم سب کو اللہ کے پاس پہنچنا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔ کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ سے اچھا فیصلہ کرنے والا اور کون ہے؟ یہ بات ایسی قوم کے لیے ہے جو یقین رکھتی ہے“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عمومی احکامات

دفعہ نمبر ۱: اسلامی عقیدہ ہی ریاست کی بنیاد ہے یعنی ریاست کے وجود، اس کی ساخت (ڈھانچہ)، اس کے محاسبے اور اس سے متعلق کسی بھی چیز کی بنیاد اسلامی عقیدہ ہی ہو گا۔ ساتھ ہی یہ عقیدہ دستور اور قوانین کے لیے ایسی اساس ہو گا کہ ان دونوں سے متعلق کسی بھی چیز کی اُس وقت تک اجازت نہیں ہو گی جب تک وہ اسلامی عقیدہ سے اخذ شدہ نہ ہو۔

جن نئے افکار کی بنیاد پر ریاست وجود میں آتی ہے، ان افکار کی نشوونما کے ساتھ ساتھ ریاست کی بھی نشوونما ہوتی ہے۔ ان افکار کے بدلنے سے ریاست کے اندر اتھارٹی بھی تبدیل ہو جاتی ہے، کیونکہ افکار (Thoughts) جب مفاہیم (Concepts) بن جاتے ہیں یعنی جب اِن کے معنی واضح ہو جاتے ہیں اور ان کی تصدیق ہو جاتی ہے تب یہ افکار انسان کے رویے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسان کا رویہ اس کے مفاہیم (تصورات) کے مطابق ہوتا ہے۔ یوں زندگی کے بارے میں اس کا نقطہ نظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر کی تبدیلی کے نتیجے میں مصالح (مفادات) کے بارے میں اس کا نقطہ نظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اقتدار تو صرف اِن مفادات کی نگہبانی اور نگرانی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے بارے میں نقطہ نظر ہی وہ بنیاد ہے جس پر ریاست قائم ہوتی ہے اور اسی بنیاد پر اقتدار وجود میں آتا ہے۔ زندگی کے بارے میں نقطہ نظر، زندگی کے بارے میں ایک خاص متعین فکر کے ذریعے وجود میں آتا ہے، یوں زندگی کے بارے میں یہ مخصوص متعین فکر ریاست اور پھر اقتدار کی اساس ہے۔ چونکہ زندگی کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر تصورات، پیمانوں standards اور اعتقادات میں نمایاں ہوتا ہے، چنانچہ یہی تصورات، پیمانے اور اعتقادات بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور اقتدار ان کے مجموعے کے مطابق لوگوں کے معاملات کی نگرانی اور مفادات کی نگہبانی کے لیے ہوتا ہے۔ پس یہ بنیاد صرف کوئی ایک فکر نہیں بلکہ افکار کا مجموعہ ہے۔ افکار کے اس مجموعے سے ہی زندگی

کے بارے میں نقطۂ نظر وجود میں آتا ہے، پھر اس کے نتیجے کے طور پر مفادات کے بارے میں نقطہ نظر وجود میں آتا ہے اور اقتدار اس نقطۂ نظر کی بنیاد پر ان مفادات کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ ریاست وہ انتظامی ڈھانچہ ہے جو اُن تصورات، پیمانوں اور اعتقادات کے مجموعے کو نافذ کرتا ہے جن کو لوگوں کے گروہ (مجموعہ) نے قبول کیا ہو۔

یہ بات تو ریاست کے بحیثیت ریاست ہونے کے حوالے سے تھی، یعنی بحیثیت ایک اقتدار کے، جو مفادات کی دیکھ بھال کی ذمہ دار ہے اور ان کی نگرانی کرتی ہے۔ تاہم افکار کا یہ مجموعہ، جن پر ریاست قائم ہوئی ہے، یعنی تصورات، پیمانے اور اعتقادات، یا تو ایک بنیادی فکر پر مبنی ہوں گے یا کسی بنیادی فکر پر مبنی نہیں ہوں گے۔ اگر افکار کا یہ مجموعہ بنیادی فکر پر مبنی ہو گا تو اس کی بنیاد اور ستون پختہ ہوں گے اور اس کا وجود پائیدار ہو گا کیونکہ اس صورت میں اس کی بنیاد مضبوط اور مستحکم ہو گی جس کی طاقت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی فکر وہ فکر ہوتی ہے جس سے پہلے کوئی فکر نہ ہو اور یہ بنیادی فکر عقلی عقیدہ ہے۔ یعنی اس صورتِ حال میں ریاست ایک عقلی عقیدے پر مبنی ہو گی۔ اگر ریاست بنیادی فکر پر مبنی نہ ہو تو اس کو ختم کرنا آسان ہوتا ہے اور اس کے وجود کو مٹانا یا اس کے اقتدار کو چھین لینا مشکل نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ریاست کسی 'واحد' عقیدے پر مبنی نہیں ہوتی جس سے اس کے وجود نے جنم لیا ہو۔ تب اس ریاست کو نیست و نابود کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ ریاست کے مضبوط بنیادوں پر استوار ہونے کے لیے لازمی ہے کہ وہ ایک ایسے عقیدے پر مبنی ہو، جس عقلی عقیدے سے وہ افکار پھوٹ رہے ہوں جن کی بنیاد پر یہ ریاست وجود میں آئی ہو۔ یعنی وہ عقلی عقیدہ جس سے وہ تصورات، پیمانے اور عقائد جنم لیتے ہوں جو زندگی کے بارے میں ریاست کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہوں اور زندگی کے بارے میں اس نقطۂ نظر کے نتیجے کی صورت میں مصالح (مفادات) کے بارے میں ریاست کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوں۔

اسلامی ریاست صرف اور صرف اسلامی عقیدے پر قائم ہوتی ہے، کیونکہ ان تصورات، پیمانوں اور عقائد کا مجموعہ جن کو امت نے قبول کیا ہے اس عقلی عقیدے سے نکلتے ہیں۔ امت نے پہلے اس عقلی عقیدے کو

قبول کیا اور قطعی دلیل سے ثابت ایک یقینی عقیدے کے طور پر اسے اختیار کیا، یوں یہ عقیدہ زندگی کے بارے میں امت کی کُلی فکر ہے اور زندگی کے بارے میں امت کا نقطۂ نظر بھی اسی عقیدے کی پیداوار ہے۔ پھر مفادات کے بارے میں نقطۂ نظر بھی اسی عقیدے کا نتیجہ ہے اور اسی عقیدے سے امت نے تصورات، پیمانوں اور عقائد کے مجموعے کو اخذ کیا ہے۔ لہٰذا اسلامی عقیدہ ہی اسلامی ریاست کی اساس ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ وہ اسلامی ریاست جس کو رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا ایک مخصوص اساس پر قائم تھی۔ اس لیے یہ فرض ہے کہ یہی اساس ہر زمانے میں اور ہر جگہ اسلامی ریاست کی اساس ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ میں ریاست قائم کی اور زمامِ اقتدار سنبھالی تو پہلے دن سے ہی اسلامی عقیدے کو اس ریاست اور اقتدار کی بنیاد بنایا حالانکہ شرعی احکامات کی آیات ابھی تک نازل نہیں ہوئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے **لا اله الا الله محمد رسول الله** کی شہادت کو مسلمانوں کی زندگی، لوگوں کے ایک دوسرے سے تعلقات، مظالم کو روکنے اور جھگڑوں کے فیصلے، نیز زندگی کے تمام شعبوں اور اقتدار اور حکومت کی بنیاد قرار دیا۔ پھر اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جہاد شروع کیا اور جہاد کو مسلمانوں پر فرض قرار دیا تاکہ اسلامی عقیدے کو انسانوں تک پھیلایا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لاَ إِلَهَ إِلا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيُقِيمُوا الصَّلاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلا بِحَقِّ الإِسْلامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ»** "مجھے اس وقت تک لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت نہ دیں اور نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، اگر وہ یہ کام کریں تب وہ اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کریں گے، سوائے اُس کے جو اُن پر اسلام کی طرف سے عائد حق ہو، اور ان کا حساب اللہ کے پاس ہے" یہ حدیث متفق علیہ ہے اور یہ الفاظ بخاری میں سے لئے گئے ہیں۔

مزید بر آں رسول اللہ ﷺ نے اسلامی عقیدے کو ریاست کے لیے بنیاد ہونے کو دائمی بنانا مسلمانوں پر فرض قرار دیا اور کھلم کھلا کفر ظاہر ہونے کی صورت میں تلوار کے ذریعے قتال کرنے کا حکم دیا یعنی

جب یہ عقیدہ اقتدار اور حکومت کی بنیاد نہ رہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ظالم "ضرر رساں" حکمرانوں کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا ہم ان کو تلوار سے ہٹا نہ دیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«لا، مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلاةَ»** "نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان صلاۃ (یعنی دین) کو قائم رکھیں" (مسلم)۔ اور اُولی الامر کی اطاعت کی بیعت کو اس امر سے مشروط رکھا کہ جب تک کہ حکمرانوں سے کوئی کفر بواح (واضح کفر) نہ نظر آجائے۔ ضرر رساں حکمرانوں کے حوالے سے عوف بن مالکؓ سے مروی حدیث میں فرمایا :**«قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَفَلا نُنَابِذُهُمْ بِالسَّيْفِ؟ فَقَالَ: لا، مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلاةَ»** "پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم ان حکمرانوں کو اپنی تلواروں سے نہ ہٹا دیں؟ فرمایا: نہیں، جب تک وہ تمہارے درمیان صَلاۃ (دین) کو قائم کیئے رکھیں" (مسلم)۔ بیعت کے حوالے سے عبادہ بن صامتؓ سے مروی متفق علیہ حدیث میں ہے کہ :**«وَأَنْ لا نُنَازِعَ الأمْرَ أَهْلَهُ إلا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا»** "اور اس بات پر ہم نے بیعت کی کہ حکمرانوں سے اس وقت تک نہیں لڑیں گے جب تک کھلم کھلا کفر نہ دیکھ لیں" اور طبرانی نے **«كفراً صُراحاً»** "واضح کفر" کے الفاظ روایت کیے ہیں جبکہ ابنِ حبان نے اپنی صحیح میں یوں روایت کی ہے: **«إِلاَّ أَنْ تَكُونَ مَعْصِيَةُ اللَّهِ بَوَاحاً»** "مگر جب اللہ تعالیٰ کی کھلم کھلا نافرمانی کی جائے"۔ یہ تمام احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلامی عقیدہ ہی ریاست کی اساس اور بنیاد ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسی بنیاد پر اقتدار قائم کیا اور اسی عقیدے کو اقتدار کی بنیاد کے طور پر برقرار رکھنے کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم دیا اور اسی بنیاد کے لیے جہاد کرنے کا حکم دیا۔

ان وجوہات کی بنا پر دستور کی پہلی دفعہ اِس دفعہ کو بنایا گیا ہے۔ یہ بالکل ہی ممنوع ہے کہ ریاست میں کوئی بھی مفہوم، عقیدہ یا پیمانہ ایسا ہو جو اسلامی عقیدے سے نہ نکلا ہو۔ اسلامی عقیدے کو صرف علامتی طور پر بنیاد بنانا کافی نہیں ہے بلکہ اسلامی عقیدے کا ریاست کے وجود کے ہر پہلو میں نمایاں ہونا ضروری ہے اور تمام معاملات چاہے چھوٹا کام ہو یا بڑا کام، کے لیے اسلامی عقیدہ کا بنیاد ہونا ضروری ہے۔ ریاست کے لیے یہ جائز نہیں کہ زندگی یا حکمرانی کے بارے میں کوئی ایسا مفہوم اپنائے جو اسلام سے ماخوذ نہ ہو۔ ایسے کسی مفہوم کی اجازت ہی

نہیں ہو گی جو اسلامی عقیدے سے نہ نکلتا ہو۔ اس لیے ریاست میں جمہوریت جیسا مفہوم اپنانے کی اجازت نہیں ہو گی کیونکہ یہ اسلامی عقیدے سے نہیں نکلتا بلکہ یہ تو اسلامی نظریے سے سراسر متصادم ہے۔ نہ ہی قومیت کے مفہوم کو ریاست میں جڑ پکڑنے کی اجازت ہو گی کیونکہ یہ اسلامی عقیدے سے نہیں ہے بلکہ اسلامی احکامات میں اس کی مذمت کی گئی ہے اور اس کے خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے اور نہ ہی وطنیت کے مفہوم کا کوئی وجود ریاست میں ہو گا کیونکہ یہ اسلامی عقیدے سے نہیں نکلتا بلکہ یہ تو اسلامی احکامات کے سراسر خلاف ہے۔ اسی طرح ریاستی ڈھانچے میں نہ جمہوری طرز کی وزارتیں ہوں گی اور نہ ہی اس کی حکمرانی شہنشاہیت، بادشاہت یا جمہوری ہو گی کیونکہ یہ سب اسلامی عقیدے کی پیداوار نہیں بلکہ یہ تو اسلامی احکامات کے بالکل خلاف ہیں۔ یہ بھی مکمل طور پر ممنوع ہو گا کہ ریاست کا محاسبہ اسلامی عقیدے کے علاوہ کسی اور چیز کی بنیاد پر ہو خواہ یہ محاسبہ افراد، تحریکوں یا گروہوں کی جانب سے ہو۔ اس قسم کا ہر احتساب ممنوع ہو گا جس کی بنیاد اسلامی عقیدہ نہ ہو۔ ایسی تحریکوں اور پارٹیوں کی اجازت نہیں ہو گی جن کی بنیاد اسلامی عقیدہ نہیں۔ اسلامی عقیدے کا ریاست کی بنیاد ہونے کا یہی مطلب ہے کہ ہر چیز میں اساس، اسلامی عقیدہ ہی ہو گا اور تمام رعایا پر فرض ہے کہ ہر معاملے میں اس بنیاد پر قائم رہیں اور ریاست بھی بحیثیتِ ریاست اپنے ہر کام اور ہر تعلق میں اسی اسلامی عقیدے کو اساس بنائے گی۔

جہاں تک اس دفعہ میں مذکور دوسرے نکتے کا تعلق ہے تو اس کی دلیل اس امر میں ہے کہ دستور ریاست کا اساسی قانون ہوتا ہے سو اسے قانون ہی کہا جائے گا اور اقتدار کا صادر کردہ حکم قانون ہی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے حکمران کو رسول ﷺ پر نازل کئے ہوئے احکامات کے مطابق حکومت کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے **بِما أنزل الله** (اللہ کے نازل کردہ) کے علاوہ حکومت کرنے والے حکمران کو کافر قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ اپنے نافذ کئے ہوئے ان احکامات پر اعتقاد رکھتا ہو اور اس کا اعتقاد یہ ہو کہ اسلام موجودہ دور میں حکومت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اگر اس کا اعتقاد ایسا نہ ہو بلکہ اعتقاداً وہ اسلام کو ضابطہ حیات تو سمجھتا ہو لیکن حکومت اس کے مطابق نہ کرتا ہو تو اس کو اللہ کا نافرمان (عاصی) قرار دیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ

تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان ہی وہ اساس ہے جس کے ذریعے حکمران حکومت کر سکتا ہے یعنی یہی عقیدہ قانون اور دستور کی اساس ہے۔ یہ بات تو قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمران کو شرعی احکامات کے مطابق حکومت کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے **فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ** "سو قسم ہے تیرے پروردگار کی! یہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپس کے اختلافات میں آپ ﷺ کو حاکم نہ مالیں" (النساء: 65) اور فرمایا **وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ** "اور اُن کے درمیان اللہ کے نازل کردہ کے مطابق حکم کیجیے" (المائدہ:49)۔

اللہ تعالیٰ نے ریاست کی جانب سے قانون سازی کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات تک محدود کر دیا اور اس کے علاوہ کسی چیز کو اختیار کرنے سے روک دیا، ارشاد ہے: **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ** "جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی وحی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں" (المائدہ: 44)۔ ایک متفق علیہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ»** "جو کوئی ہمارے اس معاملے (دین کے معاملے) میں ایسی نئی بات لائے جو اس (دین میں) سے نہیں تو وہ (عمل) مردود ہے" یہ الفاظ بخاری کے ہیں جبکہ مسلم نے **«ما ليس منه»** کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور ابن حزم نے المُحلّٰی میں جبکہ ابن عبد البر نے التمہید میں یوں روایت کیا ہے کہ **«كُلُّ عَمَلٍ لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»** "ہر وہ کام جو ہمارے حکم کے مطابق نہیں وہ مردود ہے"۔

یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ ریاست کے قوانین صرف اور صرف اسلامی عقیدے سے ہی اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ یہ وہ احکاماتِ شرعیہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمائے خواہ یہ نزول صریح ہو؛ کہ یہ اللہ کا حکم ہے جو کتاب وسنت میں ہے یا جسکے اللہ کا حکم ہونے پر صحابہؓ نے اجماع کیا ہو۔ یا یہ نزول غیر صریح ہو؛ یعنی اس میں اللہ کے حکم ہونے کا کوئی اشارہ پایا جائے گا، جسے شرعی علت کی بنیاد پر قیاس کے ذریعے اخذ کیا جاتا ہے۔ یہاں اس دفعہ کا دوسرا بنیادی نکتہ واضح ہو گیا۔

چونکہ بندوں کے افعال کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ ان میں شارع کے خطاب کی پابندی لازمی ہے۔ اس لیے ان افعال کی تنظیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اسلامی شریعت نے لوگوں کے تمام افعال اور ان کے تمام تعلقات کا احاطہ کیا ہے خواہ یہ تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو یا اپنے آپ سے یا پھر دوسرے انسانوں سے۔ اس لیے اسلام میں لوگوں کی جانب سے تعلقات کو منظم کرنے کے لیے قوانین وضع کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ وہ فقط شرعی احکامات کے پابند ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا** "اور تمہیں جو کچھ رسول ﷺ دیں وہ لے لو، اور جس سے بھی روکیں، اس سے رک جاؤ" (الحشر:7)، اور ارشاد فرمایا: **وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا** "کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ اگر اللہ اور اس کا رسول ﷺ کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہ ہو گیا" (الاحزاب:36)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّ اللَّهَ تعالى فَرَضَ فَرَائِضَ فَلاَ تُضَيِّعُوهَا، وَحَدَّ حُدُوداً فَلاَ تَعْتَدُوهَا، وَحرَّم أَشْيَاءَ فَلاَ تَنْتَهِكُوهَا»** "اللہ تعالیٰ نے (تمہارے اوپر) کچھ فرائض مقرر کر دیے ہیں ان کو ضائع مت کرو، تمہارے لیے کچھ حدود مقرر کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کا ارتکاب مت کرو" اس کو دارقطنی نے ابی ثعلبہ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور النووی نے الریاض میں اس کو حسن قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»** "جو ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات لائے جو اس میں سے نہیں ہے تو وہ رد ہے" عائشہؓ کی یہ حدیث متفق علیہ ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے جس نے قانون سازی کی اور یہ حکمران کا کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہی لوگوں کو اور حکمران کو ان احکامات پر عمل کرنے کا پابند بنایا ہے تاکہ وہ اپنے تعلقات اور معاملات کو صرف ان احکامات کے مطابق استوار کریں کسی اور چیز کے مطابق نہیں۔ اس لیے لوگوں کے تعلقات کو منظم کرنے کے

لیے انسان کو قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں، نہ حکمران لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ لوگوں کو اس بات کا اختیار دے سکتا ہے کہ وہ اپنے تعلقات کو منظم کرنے کے لیے انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کریں۔

دفعہ نمبر2: دارالاسلام وہ ملک ہے جہاں اسلامی احکامات نافذ ہوں اور اُس کی امان اسلام کی امان کی وجہ سے ہو۔ دار الکفر وہ ہے جہاں کفریہ قوانین نافذ ہوں یا اس کی امان اسلام کی امان کے بغیر ہو۔

لفظ "دار" کے کئی معانی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: "المنزل" یعنی رہائش گاہ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ** "ہم نے اسے اس کی رہائشگاہ سمیت زمین میں دھنسا دیا" (القصص:81) "المحلة" ہر وہ جگہ جہاں کچھ لوگ رہائش اختیار کرتے ہیں اس کو 'دار' کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ** "پس ان کو زلزلے نے آپکڑا سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے" (الاعراف:78)۔ "البلد"یعنی ملک یا علاقہ جیسا کہ سِیبوَیہ نے کہا ہے کہ یہ دار (رہائش کا علاقہ) کیا ہی اچھا بلد (ملک) ہے۔ اس طرح "المثوى والموضع" یعنی پناہ گاہ اور جگہ کے معنی میں جیسا کہ ارشاد باری ہے **وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ** "اور کیا ہی خوب پرہیز گاروں کا ٹھکانہ ہے"۔(النحل: 30) یہ لفظ" القبيلة "کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن مجازاً، جیسا کہ بخاری میں ابی حمید الساعدی کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ «**إِنَّ خَيْرَ دُورِ الأَنْصَارِ دَارُ بَنِي النَّجَّارِ ...**». "انصار کے قبیلوں میں سب سے اچھا قبیلہ بنو نجار ہے"۔

لفظ 'دار' کی اضافت کبھی اسمائے اعیان (یعنی اصل اسم) کی طرف کی جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں: **سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفَاسِقِيْنَ** "اب بہت جلد تم لوگوں کو ان فاسقوں کا مقام دکھلاتا ہوں" (الاعراف:145)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ **وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ** "اور کیا ہی خوب پرہیز گاروں کا گھر ہے" (النحل:30) یا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ **فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ** "پھر بھی ان لوگوں نے اس اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے، اس پر صالح نے کہا کہ اچھا تم اپنے گھروں میں تین دن تک رہ لو، یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے"۔ (ھود:65) اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: **وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ** "اور اس نے تمہیں ان کی زمینوں کا اور ان کے گھر بار کا اور ان کے مال کا وارث کر دیا" (الاحزاب:27) اور مسلم میں بریدہؓ کی اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «... **ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ**» "پھر ان کو ان کے علاقے سے دار المہاجرین منتقل ہونے کی دعوت دو۔" یا احمد کے نزدیک سلمہ بن نفیلؓ کی حدیث جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**أَلاَ إِنَّ عُقرَ دار المؤمنين الشامُ**» "سنو! شام مومنوں کے گھر کا اندرونی حصہ ہے"۔

دار کا لفظ کبھی اسمائے معانی کی طرف مضاف کیا جاتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری ہے: **وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ** "اور (انہوں نے) اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لا اُتارا" (ابراھیم: 28) یا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: **اَلَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ** "جس نے ہمیں اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اُتارا" (الفاطر:35)۔ علیؓ سے مروی ایک حدیث ہے جس کو ابنِ عساکر نے حسن اور صحیح اسناد کے ساتھ اور ترمذی نے بھی اسی حدیث کو روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**رَحِمَ اللَّهُ أَبَا بَكْرٍ زَوَّجَنِيَ ابْنَتَهُ وَحَمَلَنِي إِلَى دَارِ الْهِجْرَةِ**» "اللہ ابو بکرؓ پر رحم کرے جس نے اپنی بیٹی کو میرے نکاح میں دیا اور مجھے سواری پر بیٹھا کر دار الہجرت (مدینہ) لے آیا"۔ اسی طرح دار قطنی میں ابن عباسؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**إِذَا خَرَجَ العَبْدُ مِنْ دَارِ الشِّرْكِ قَبْلَ سَيِّدِهِ فَهُوَ حُرٌّ،**

وَإِذَا خَرَجَ مِنْ بَعْدِهِ رُدَّ إِلَيْهِ. وَإِذَا خَرَجَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ دَارِ الشِّرْكِ قَبْلَ زَوْجِهَا تَزَوَّجَتْ مَنْ شَاءَتْ، وَإِذَا خَرَجَتْ مِنْ بَعْدِهِ رُدَّتْ إِلَيْهِ» ”غلام جب اپنے آقا سے پہلے دارالشرک سے نکلے (مسلمان ہو کر ہجرت کرے) تو وہ آزاد ہے اور اگر اپنے مالک کے بعد نکلے تو مالک کی طرف ہی لوٹایا جائے گا۔ بیوی اگر اپنے شوہر سے پہلے دار الشرک سے نکلے (مسلمان ہو کر ہجرت کرے) تو جس سے چاہے شادی کر سکتی ہے اور اگر اپنے شوہر کے بعد نکلے تو اسی کی طرف لوٹائی جائے گی“۔

شارع نے دار کے لفظ کو دو ناموں کی طرف منسوب کیا اور یہ دو نام اسلام اور شرک ہیں، سلمہ بن نفیلؓ کی سابقہ حدیث جس کو طبرانی نے مسندِ شامیین میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: **«أَلاَ إِنَّ عُقْرَ دَارِ الإسلام الشَّامُ»** ”شام دار الاسلام کا مرکزی حصہ ہے“ یہاں دار کی اضافت اسلام کی طرف کی گئی ہے۔ اسی طرح ماوردی نے الاحکام السلطانیہ اور حاوی الکبیر میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَنَعَتْ دَارُ الإِسْلاَمِ مَا فِيهَا، وَأَبَاحَتْ دَارُ الشِّرْكِ مَا فِيهَا»** ”دارالاسلام میں جو کچھ ہے وہ محفوظ و ممنوع ہے جبکہ دار الشرک میں جو کچھ ہے وہ مباح ہے“۔

یعنی دار الاسلام میں لوگوں کی جان و مال محفوظ ہوتے ہیں سوائے اس کے جو شرعی احکامات کے مطابق ان سے لیا جاتا ہے۔ جبکہ دار الشرک (یعنی دار الحرب) میں عملاً حالتِ جنگ کے دوران یہ چیزیں (جان و مال) محفوظ نہیں ہوتے بلکہ شرعی احکامات کے مطابق مالِ غنیمت کی شکل میں لیے جاتے ہیں۔ ساری دنیا اس تقسیم (دار الاسلام یا دارالکفر) میں شامل ہے۔ دنیا کا کوئی حصہ اس کے علاوہ نہیں ہو سکتا یعنی یا تو کوئی حصہ دار الاسلام ہو گا یا دارالکفر یعنی دار الحرب۔ کسی علاقے یا ملک کے دار لاسلام ہونے کی دو شرطیں ہیں:

پہلی شرط: اس علاقہ کی امان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، اس کی دلیل یہ ہے کہ ابنِ اسحاق نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں اپنے صحابہؓ سے فرمایا: **«إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ جَعَلَ لَكُمْ إِخْوَاناً وَدَاراً تَأْمَنُونَ بِهَا»** ”بے شک اللہ عزوجل نے تمہیں ایسے بھائی اور ایسا گھر (دار) دیا جہاں تم کو

امان ملے گی "۔ اس دار سے مراد " دار الهجرة" ہے جو علی المار کی حدیث کے مطابق ہے جس کو ابنِ عساکر نے روایت کیا ہے اور عائشہؓ کی حدیث میں بھی جس کو بخاری نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : «قَدْ أُرِيتُ دَارَ هِجْرَتِكُمْ» "مجھے تمہارا دارِ ہجرت دکھایا گیا ہے"۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہؓ نے اس وقت تک مدینہ ہجرت نہیں کی جب تک انہوں نے امان اور قوت کی موجودگی کے بارے میں اطمینان حاصل نہیں کر لیا، الحافظ نے الفتح میں کہا ہے کہ: "بیہقی نے قوی اسناد کے ساتھ شعبی سے روایت کی ہے اور طبرانی نے اس کو ابو موسیٰ انصاریؓ کی حدیث سے جوڑا ہے جس میں وہ کہتے ہیں: «انْطَلَقَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَمَعَهُ العَبَّاسُ عَمُّهُ إِلَى سَبْعِينَ مِنَ الأَنْصَارِ عِنْدَ العَقَبَةِ، فَقَالَ لَهُ أبو أُمامَة - يعني أسعد بن زُرارة - سَلْ يا محمّد لِرَبِّكَ ولِنَفْسِكَ ما شِئْتَ، ثُمَّ أَخْبِرنا ما لَنا من الثَّوَابِ. قال: أَسْأَلُكُمْ لِرَبِّي أَنْ تَعْبُدُوهُ وَلا تُشْرِكُوا به شيئاً، وأَسْأَلُكُمْ لِنَفْسِي ولأَصْحَابِي أَنْ تُؤْوُونَا وتَنْصُرُونَا وتَمْنَعُونَا مِمَّا تَمْنَعُونَ منه أَنْفُسَكُمْ. قالوا: فما لَنا؟ قال: الْجَنَّةُ. قالوا: ذٰلِكَ لَكَ» " رسول اللہ ﷺ اپنے چچا عباسؓ کے ساتھ انصار کے ستر آدمیوں کے پاس گھاٹی (پہاڑی کے پاس) روانہ ہوئے جب وہاں پہنچے تو ابو امامہ یعنی اسعد بن زُرارہؓ نے آپ ﷺ سے کہا: اے محمد ﷺ! اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے جو چاہیں ہم سے مانگیں پھر ہمیں بتائیں کہ اس کے بدلے ہمیں کیا ثواب ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تم سے اپنے رب کے لیے یہ سوال کرتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، جبکہ اپنے اور اپنے صحابہؓ کے لیے تم سے یہ سوال کرتا ہوں کہ تم ہمیں پناہ دو، نصرت دو اور ہماری ایسی حفاظت کرو جیسے تم اپنی جانوں کی کرتے ہو۔ ان لوگوں نے کہا: ہمیں کیا ملے گا؟ فرمایا: جنت، انہوں نے کہا: ہمیں منظور ہے"۔ اس کی دلیل وہ روایت بھی ہے جس کو احمد نے کعب بن مالکؓ سے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے جس میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أُبَايِعُكُمْ عَلَى أَنْ تَمْنَعُونِي مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ نِسَاءَكُمْ وَأَبْنَاءَكُمْ قَالَ فَأَخَذَ الْبَرَاءُ بْنُ مَعْرُورٍ بِيَدِهِ ثُمَّ قَالَ نَعَمْ وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَنَمْنَعَنَّكَ مِمَّا نَمْنَعُ مِنْهُ أُزُرَنَا فَبَايِعْنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَنَحْنُ أَهْلُ الْحُرُوبِ وَأَهْلُ الْحَلْقَةِ وَرِثْنَاهَا كَابِرًا عَنْ كَابِرٍ» "میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں

کہ تم میری ایسے ہی حفاظت کروگے جیسے اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کی کرتے ہو۔ راوی کہتا ہے کہ یہ سن کر براء بن معرورؓ نے آپ ﷺ کا ہاتھ تھام کر کہا، جی ہاں! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے ہم آپکی ایسی ہی حفاظت کریں گے جیسے اپنی عزت و آبرو کی کرتے ہیں، اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم سے بیعت لیجئے، ہم متحد اور جنگجو لوگ ہیں اور یہ (خوبی) ہمیں پشت در پشت وراثت میں ملی ہے"۔ اور احمد کے نزدیک جابرؓ کی ایک صحیح روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیعتِ عقبہ میں فرمایا: «... **وَعَلَى أَنْ تَنْصُرُونِي فَتَمْنَعُونِي إِذَا قَدِمْتُ عَلَيْكُمْ مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ أَنْفُسَكُمْ وَأَزْوَاجَكُمْ وَأَبْنَاءَكُمْ، وَلَكُمُ الْجَنَّةُ** ...» "اور یہ کہ تم مجھے نصرت دو اور میری اس طرح حفاظت کرو جس طرح سے تم اپنی، اپنی بیویوں اور اپنے بچوں کی حفاظت کرتے ہو، جس کے بدلے میں تمہارے لیے جنت ہے"۔ بیہقی کی دلائلِ نبوت میں جید اور قوی اسناد سے عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ «**وَعَلَى أَنْ نَنْصُرَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا قَدِمَ عَلَيْنَا يَثْرِبَ مِمَّا نَمْنَعُ أَنْفُسَنَا وَأَزْوَاجَنا وَأَبْنَاءَنَا وَلَنَا الْجَنَّةَ** ...» "اور ہم نے اس بات پر بیعت دی کہ جب رسول اللہ ﷺ یثرب میں ہمارے پاس آئیں گے تو ہم ان کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسا کہ ہم اپنی، اپنی بیویوں اور اپنے بچوں کی حفاظت کرتے ہیں اور (اس کے بدلے) ہمارے لیے جنت ہوگی"۔ رسول اللہ ﷺ ہر اس جگہ ہجرت کرنے سے انکار فرماتے تھے جہاں امان اور اور قوت نہ ہو۔ بیہقی نے حسن اسناد کے ساتھ علیؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو شیبان بن ثعلبہ سے فرمایا: «**مَا أَسَأْتُمْ فِي الرَّدِّ إِذْ أَفْصَحْتُمْ بِالصِّدْقِ، وَإِنَّ دِينَ اللَّهِ لَنْ يَنْصُرَهُ إِلاَّ مَنْ حَاطَهُ مِنْ جَمِيعِ جَوَانِبِهِ**» "تم لوگوں نے کوئی برا جواب نہیں دیا جبکہ تم نے سچائی سے صاف بات کھل کر کہی، مگر اللہ کے دین کو صرف وہی نصرت دے سکتے ہیں جو ہر طرف سے اس کی حفاظت کرسکتے ہوں"۔ ان لوگوں نے یہ پیشکش کی تھی کہ جہاں تک عرب کے پانی ہیں وہاں تک ہم آپ کی مدد کریں گے، فارس کے مقابلے میں نہیں۔

دوسری شرط: جہاں اسلام کے احکامات نافذ ہوں۔ اس کی دلیل بخاری میں عبادہ بن صامتؓ کی یہ حدیث ہے: **«دَعَانَا النَّبِيُّ ﷺ فَبَايَعْنَاهُ، فَقَالَ فِيمَا أَخَذَ عَلَيْنَا أَنْ بَايَعَنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا، وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا، وَأَثَرَةً عَلَيْنَا، وَأَنْ لاَ نُنَازِعَ الأَمْرَ أَهْلَهُ إِلاَّ أَنْ تَرَوْا كُفْراً بَوَاحاً عِنْدَكُمْ مِنْ اللَّهِ فِيهِ بُرْهَانٌ»** "نبی کریم ﷺ نے ہمیں بلایا ہم نے ان کی بیعت کی۔ راوی کہتا ہے کہ ہم سے سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت لی پسند اور ناپسند میں، خوشحالی اور تنگ دستی میں، اور اس صورت میں بھی کہ کسی کو ہم پر ترجیح دے دی جائے، اور جس کو امر سونپا گیا ہو (یعنی حکمران) سے کوئی تنازعہ نہ کرنے کی سوائے اس کے کہ تم (اپنے حکمران سے) کوئی کھلم کھلا کفر دیکھو جس کی تمہارے پاس اللہ کی جانب سے قطعی دلیل ہو"۔

سننے اور اطاعت کرنے کا مطلب رسول اللہ ﷺ کے اوامر اور نواہی، یعنی آپ ﷺ کے لائے ہوئے احکامات، کا نفاذ کرنا ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت بھی ہے جس کو احمد اور ابنِ حبان نے اپنے صحیح میں جبکہ ابو عبید نے الاموال میں عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **«وَالْهِجْرَةُ هِجْرَتَانِ هِجْرَةُ الْحَاضِرِ وَالْبَادِي فَأَمَّا الْبَادِي فَيُطِيعُ إِذَا أُمِرَ وَيُجِيبُ إِذَا دُعِيَ وَأَمَّا الْحَاضِرُ فَأَعْظَمُهُمَا بَلِيَّةً وَأَعْظَمُهُمَا أَجْرًا»** "ہجرت دو طرح کی ہوتی ہے، شہری کی ہجرت اور دیہاتی (بدّو) کی ہجرت، دیہاتی کو حکم دیا جائے تو اطاعت کرتا ہے جب پکارا جائے تو جواب دیتا ہے جبکہ شہری کی آزمائش اور اجر بہت زیادہ ہوتا ہے"۔ اور اس سے استدلال کرنے کی وجہ واضح ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«فَيُطِيعُ إِذَا أُمِرَ وَيُجِيبُ إِذَا دُعِيَ»** "جب حکم دیا جاتا ہے تو اطاعت کرتا ہے اور جب پکارا جاتا ہے تو جواب دیتا ہے"۔ دیہات اگرچہ دار الاسلام تھے لیکن دارِ ہجرت نہیں تھے۔ اس کی دلیل طبرانی میں موجود وائلہ بن الاسقع کی حدیث بھی ہے۔ ہیثمی نے اسے ایسی اسناد سے روایت کیا ہے جو کہ قابلِ اعتماد ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: **«وَهِجْرَةُ البَادِيَةِ أَنْ تَرْجِعَ إِلَى بَادِيَتِكَ، وَعَلَيْكَ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِي عُسْرِكَ وَيُسْرِكَ وَمَكْرَهِكَ وَمَنْشَطِكَ وَأَثْرَةٍ عَلَيْكَ ...»** " دیہاتی کی ہجرت یہ ہے وہ اپنے گاؤں لوٹ جائے، اور تنگی، خوشحالی، پسند، ناپسند اور اپنے اوپر (کسی اور

کو) فوقیت دینے کی صورت میں بھی وہ سننے اور اطاعت کی لازمی پابندی کرے"۔ اس کی ایک اور دلیل وہ روایت ہے جس کو احمد نے صحیح اسناد سے انسؓ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ «**إِنِّي لأَسْعَى فِي الغِلْمانِ يَقولونَ جاءَ مُحمّد، فَأَسْعَى فَلا أَرى شَيْئاً. ثُمَّ يَقولونَ: جاءَ مُحمّد، فَأَسْعَى فَلا أَرى شَيْئاً. قال: حتى جاءَ رَسولُ اللَّهِ ﷺ وصاحِبُهُ أبو بَكْر، فَكُنّا في بَعْضِ حِرارِ المدينة، ثُمَّ بَعَثَا رَجُلاً مِنْ أَهْلِ المدينة لِيُؤْذِنَ بِهِما الأنصارَ، فَاسْتَقْبَلَهُمَا زُهَاءُ خَمْسِمائَةٍ مِنَ الأَنْصَارِ حتى انْتَهَوْا إِلَيْهِمَا. فقالت الأنصارُ: انْطَلِقَا آمِنَيْنِ مُطَاعَيْنِ. فَأَقْبَلَ رسولُ اللَّهِ ﷺ وصاحِبُهُ بَيْنَ أَظْهُرِهِمْ. فَخَرَجَ أَهْلُ المدينةِ حتّى إِنَّ العَوَاتِقَ لَفَوْقَ البُيُوتِ يَتَرَاءَيْنَهُ يَقُلْنَ أَيُّهُم هُوَ أَيُّهُمْ هُوَ ؟**» "میں لڑکوں کے ساتھ دوڑ رہا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ محمد ﷺ آگئے میں دوڑتا لیکن کچھ دیکھ نہ پاتا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ محمد ﷺ آگئے پھر میں دوڑنے لگا لیکن میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس طرح ہوتے ہوئے رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابی ابو بکرؓ آپہنچے، ہم مدینہ کے ایک محلے میں تھے پھر ان دونوں نے انصار کو خبر دینے کے لیے ایک آدمی کو بھیجا جس پر انصار میں سے پانچ سو افراد ان دونوں کے استقبال کے لیے آگئے انصار نے آتے ہی کہا، چلیئے تشریف لایئے امان کے ساتھ اور آپ ﷺ کی اطاعت کی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابیؓ ان لوگوں کے درمیان چلنے لگے۔ یہ دیکھنے کے لیے مدینہ کے لوگ گھروں سے باہر آگئے یہاں تک کہ بوڑھی عورتیں بھی گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر یہ کہتی رہیں کہ ان لوگوں میں وہ رسول اللہ ﷺ کون ہے ان لوگوں میں وہ کون ہے؟"۔ اس حدیث میں دونوں شرطوں کی دلیل ہے یعنی امان اور احکام شرعیہ کا اجراء۔ امان کی دلیل یہ ہے کہ انصار کے پانچ سو آدمی کہہ رہے ہیں کہ امان کے ساتھ چلیئے اور رسول اللہ ﷺ کا اُن کے قول پر اقرار۔ یوں دار الہجرت میں امان اور اطاعت دونوں میسر آگئے۔ اگر یہ دو چیزیں نہ ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ ہجرت نہ فرماتے، کیونکہ بیعتِ عقبہ میں رسول اللہ ﷺ نے انصار کے سامنے یہ دونوں شرطیں امان اور اطاعت رکھی تھیں۔ بیہقی نے قوی اسناد کے ساتھ عبادہ بن صامتؓ کی روایت نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ «**... إِنَّا بَايَعْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي النَّشَاطِ وَالْكَسَلِ، وَالنَّفَقَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ، وَعَلَى الأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَعَلَى أَنْ نَقُولَ فِي اللَّهِ لاَ تَأْخُذُنَا فِيهِ لَوْمَةُ لاَئِمٍ. وَعَلَى أَنْ نَنْصُرَ**

رَسُولَ اللَّهِ ﷺ إِذَا قَدِمَ عَلَيْنَا يَثْرِبَ مِمَّا نَمْنَعُ أَنْفُسَنَا وَأَزْوَاجنَا وَأَبْنَاءَنَا وَلَنَا الجَنَّةَ. فَهَذِهِ بَيْعَةُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الَّتِي بَايَعْنَاهُ عَلَيْهِ» ''ہم نے طاقت اور کمزوری میں سننے اور اطاعت کرنے، تنگدستی اور کشادگی میں خرچہ کرنے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے کی شرط پر رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی اور اس بات پر کہ ہم اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے اور رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائیں تو ان کی مدد نصرت کریں گے، ہم آپ ﷺ کی ایسی حفاظت کریں گے جیسے کہ اپنی جان اور اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہیں اور اس کے بدلے ہمیں جنت ملے گی۔ یہ تھی رسول اللہ ﷺ کی وہ بیعت جو ہم نے آپؐ سے کی تھی''۔

اس قول میں حکم کے نفاذ کی شرط واضح ہے کیونکہ فرمایا ہم نے رسول اللہ ﷺ کے سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی، اس سے یہ بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ امان مسلمانوں کے پاس ہو گی کیونکہ فرمایا جب رسول اللہ ﷺ مدینہ میں ہمارے پاس آئیں گے تو ہم آپ ﷺ کی ایسی حفاظت کریں گے جیسے اپنی جان یا اپنے بیوی اور بچوں کی کرتے ہیں۔

دار الاسلام کا یہ معنی رسول اللہ ﷺ کی اس تحریر میں بھی واضح ہے جسے مہاجرین اور انصار کے درمیان لکھا گیا اور جس سے یہودیوں کے ساتھ بھی معاہدہ کر کے ان کو خاموش کر دیا گیا۔ یہ تحریر آپ ﷺ نے ہجرت کے پہلے سال لکھوائی، اس کو ابنِ اسحاق نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیفہ کہا گیا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا: **«بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ: هَذَا كِتَابٌ مِنْ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ ﷺ بَيْنَ المُؤْمِنِينَ وَالمُسْلِمِينَ مِنْ قُرَيْشٍ وَيَثْرِبَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ فَلَحِقَ بِهِمْ وَجَاهَدَ مَعَهُمْ أَنَّهُمْ أُمَّةٌ وَاحِدَةٌ مِنْ دُونِ النَّاسِ ... وَإِنَّ المُؤْمِنِينَ بَعْضُهُمْ مُوَالِي بَعْضٍ دُونَ النَّاسِ ... وَإِنَّ عَلَى اليَهُودِ نَفَقَتَهُمْ وَعَلَى المُسْلِمِينَ نَفَقَتُهُمْ، وَإِنَّ بَيْنَهُمْ النَّصْرَ عَلَى مَنْ حَارَبَ أَهْلَ هَذِهِ الصَّحِيفَةِ ... وَإِنَّهُ مَا كَانَ بَيْنَ أَهْلِ هَذِهِ الصَّحِيفَةِ مِنْ حَدَثٍ أَوْ اشْتِجَارٍ يُخَافُ فَسَادُهُ، فَإِنَّ مَرَدَّهُ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَإِلَى مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ...»** ''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، یہ تحریر اللہ کے نبی محمد صلی

اللہ علیہ والہ وسلم کی طرف سے ہے۔ یہ قریش اور یثرب سے تعلق رکھنے والے مومنوں و مسلمانوں اور جو اُن کے تابع ہیں یا ان سے ملے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کرنے والوں کے درمیان ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے الگ ایک امت ہیں... اور مومن دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کے مدد گار اور حمایتی ہیں... بیشک یہودیوں کا نفقہ یہودیوں پر ہے اور مسلمانوں کا نفقہ مسلمانوں پر ہے اور جو اس صحیفے (تحریر) والوں سے لڑا تو دونوں (یہود و مسلمان) ان کے خلاف مدد کریں گے... اس تحریر والوں کے درمیان ایسا کوئی واقعہ پیش آئے یا اختلافات پیدا ہو جائیں جن سے فساد کا خوف ہو تو اس معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول محمد ﷺ فرمائیں گے"۔

یوں کوئی بھی دار (ملک) اسوقت دار لا سلام ہو گا جب وہاں کی امان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو گی اور اسلام کے احکام نافذ ہوں گے، اگر اِن میں سے کوئی ایک شرط بھی ختم ہو جائے یا نہ پائی جائے جیسے امان کفار کے ہاتھوں میں ہونا یا لوگوں پر طاغوت کے ذریعے حکومت ہونا تو یہ دار الشرک یا دار لکفر ہو جائے گا۔ دار الشرک ہونے کے لیے دونوں شرطوں کا ختم ہونا ضروری نہیں بلکہ کوئی ایک شرط بھی ناپید ہو جائے تو وہ دار الشرک بن جائے گا۔

تاہم دار الکفر کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ وہاں رہنے والے سارے لوگ کافر ہیں اور نہ ہی دارالا سلام کا مطلب یہ ہے کہ وہاں رہنے والے سارے مسلمان ہیں۔ دار کا لفظ ایک شرعی اصطلاح ہے یعنی دار کے یہ معنی شریعت نے مقرر کیے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح شریعت میں صلاۃ، صوم وغیرہ کی اصطلاحات کے معنی مقرر کیئے گئے ہیں۔

اس وجہ سے وہ علاقہ جہاں کے رہنے والوں کی اکثریت نصاریٰ ہے لیکن وہ اسلامی ریاست کے اندر واقع ہے اس کو دار الاسلام کہا جائے گا۔ کیونکہ وہاں نافذ احکامات اسلامی ہیں اور وہاں کی امان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

اسی طرح وہ علاقہ جہاں کے رہنے والوں کی اکثریت مسلمان ہے لیکن وہ ایسی ریاست کے اندر ہے جہاں اسلام کی حکمرانی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی امان اسلامی فوج کے ہاتھ میں ہے بلکہ وہ کفار کی فوج کے رحم و کرم پر ہیں ایسے دار کو دار الکفر کہا جائے گا باوجود یہ کہ اس کے رہنے والے زیادہ تر مسلمان ہیں۔ دار ایک شرعی حقیقت ہے اس کے لیے مسلمانوں کی اکثریت یا اقلیت کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اعتبار صرف وہاں نافذ احکامات اور اس علاقے میں پائے جانے والی امان کا ہے۔ دار کا معنی ان شرعی نصوص سے لیا گیا ہے جو اِس کی وضاحت کرتی ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح صلاۃ کا لفظ، شرعی نصوص سے اخذ کیا گیا ہے اور اس معنی کی وضاحت شرع کرتی ہے۔ تمام شرعی حقائق کا یہی حال ہے کہ ان کے معنی شرعی نصوص سے اخذ کئے جاتے ہیں الفاظ کے لغوی معنی سے نہیں۔

دفعہ نمبر 3: خلیفہ کچھ معین شرعی احکامات کی تبنی کر کے ان کو دستور اور قوانین قرار دے گا، خلیفہ نے جب کسی حکمِ شرعی کی تبنی کر دی اور اس کو قانون بنا دیا تب صرف یہی (تبنی شدہ) حکم واجب العمل شرعی حکم ہو گا، اور یہ ایک نافذ شدہ قانون بن جائے گا۔ رعایا کے ہر فرد پر اس حکم پر عمل کرنا ظاہراً اور باطناً فرض ہو گا۔

اس کی دلیل اجماعِ صحابہؓ ہے۔ اس بات پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو گیا تھا کہ خلیفہ معین شرعی احکامات کی تبنی کر سکتا ہے، پھر اس بات پر بھی اجماع صحابہ ہو گیا تھا کہ خلیفہ جن احکامات کی تبنی کرے ان پر عمل کرنا فرض ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ خلیفہ کی تبنی کو چھوڑ کر کسی اور رائے پر عمل کرے حتیٰ کہ دوسری رائے کو کسی مجتہد نے مستنبط ہی کیوں نہ کیا ہو، کیونکہ خلیفہ کی جانب سے کسی حکم کی تبنی کے بعد وہی حکم تمام مسلمانوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ خلفائے راشدینؓ نے ایسا ہی کیا اور کچھ معین احکامات کی تبنی کی اور ان پر عمل کرنے کا حکم دیا، تمام مسلمان اور سارے صحابہؓ اس تبنی شدہ حکم پر عمل کرتے تھے اور اپنا

اجتہاد چھوڑ دیتے تھے۔ مثال کے طور پر، ابو بکرؓ نے ایک نشست میں تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا اور مال غنیمت کو مسلمانوں کے درمیان برابر تقسیم کرنے کو تبنی کیا اور اس معاملے میں نئے اور پرانے مسلمان کے درمیان فرق نہیں کیا وغیرہ، تمام مسلمانوں نے ان مسائل میں آپؓ کی پیروی کی حتیٰ کہ قاضیوں اور گورنروں نے بھی آپؓ کی تبنی کے مطابق فیصلے کیے۔ جب عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے ان مسائل میں ابو بکرؓ کی رائے کے بر خلاف تبنی کی اور تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیا اور مال کی تقسیم میں اسلام میں سبقت اور ضرورت مندی کو مقدم رکھا اور برابری کی بنیاد پر تقسیم نہیں کی۔ مسلمانوں نے ان کی پیروی کی اور قاضیوں اور گورنروں نے ان کی رائے کے مطابق فیصلے کیے۔ اسی طرح عمر بن خطابؓ نے یہ تبنی کی کہ مال غنیمت کے طور پر حاصل ہونے والی زمین لڑنے والوں کے درمیان تقسیم نہیں ہوگی بلکہ اسے بیت المال کا حق قرار دیا جائے گا اور یہ حکم دیا کہ زمین ان لوگوں کے پاس ہی رہے گی جن کی ہے، مسلمانوں اور لڑنے والوں میں تقسیم نہیں کی جائیگی اور قاضیوں اور گورنروں نے اس تبنی کے مطابق فیصلے کیے اور تمام مسلمانوں نے بھی ان کی تابعداری کی۔ یوں تمام خلفائے راشدینؓ نے تبنی کی اور لوگوں کو اپنے تبنی کردہ احکامات پر عمل کرنے کا پابند بنایا اور ان کو اپنے اجتہاد چھوڑ کر خلیفہ کی رائے پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ پس دو باتوں پر اجماع ٹھہرا۔ ایک تبنی پر جبکہ دوسری بات یہ ہے کہ خلیفہ کی جانب سے تبنی کردہ حکم پر عمل کرنا فرض ہے۔ اس اجماع سے یہ مشہور شرعی قاعدے اخذ کئے گئے (للسلطان أن يحدث من الأقضية بقدر ما يحدث من مشكلات) "خلیفہ ہر نئے آنے والے مسئلے کے حل کے لئے حکم دینے کا اختیار رکھتا ہے"۔ (أمر الإمام يرفع الخلاف) "خلیفہ کا حکم اختلاف کو ختم کرتا ہے" (أمر الإمام نافذ) "خلیفہ کا حکم نافذ ہوتا ہے"۔

تبنی کی حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی مسئلے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے اس مسئلے میں حکم شرعی پر عمل کرنے کے لیے ایک معین (خاص) رائے کی تبنی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ شرعی احکامات بندوں کے افعال سے متعلق شارع کے خطاب کو کہتے ہیں۔ یہ خطاب قرآن وحدیث ہے، قرآن وحدیث میں عربی لغت اور شرعی اعتبار سے کئی معانی کا احتمال ہوتا ہے، اس لیے ان کو سمجھنے میں لوگوں کے درمیان اختلاف رائے کا

ہونا ایک طبعی اور حتمی بات ہے، پھر معنی کا یہ اختلاف فہم کے لحاظ سے انتشار اور تضاد تک پہنچ سکتا ہے۔ یوں دائمی طور پر متضاد اور مختلف رائے پائی جاسکتی ہیں اور ایک ہی مسئلے میں کئی رائے ہو سکتی ہیں جو کہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب غزوہ احزاب کے موقع پر فرمایا: **«لاَ يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلاَّ فِي بَنِي قُرَيْظَةَ»** ''کوئی بھی شخص بنو قریظہ پہنچے سے پہلے عصر نہ پڑھے''، اس کو بخاری نے ابن عمرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے، اس فرمان سے کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ اس سے مراد جلدی کرنا ہے اس لیے ان لوگوں نے راستے میں ہی عصر کی نماز پڑھ لی، جبکہ کچھ لوگوں نے کہا کہ اس سے ظاہری الفاظ ہی مراد ہیں اس لیے انہوں نے راستے میں نماز عصر ادا نہیں کی بلکہ بنو قریظہ پہنچ کر تاخیر سے عصر کی نماز پڑھ لی۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس کی خبر دی گئی تو دونوں کو اپنے اپنے فہم پر برقرار رکھا، یہی احوال کئی آیات اور احادیث کا ہے۔ ایک ہی مسئلے میں کئی اختلافی آراء ہونے سے مسلمان لامحالہ اِن آراء میں سے کسی ایک رائے کو ہی اختیار کرے گا۔ کیونکہ یہ سب شرعی احکامات ہیں لیکن ایک مسئلے میں ایک ہی شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکامات متعدد نہیں ہو سکتے، اس لیے اس ایک حکم کا تعین لازمی ہے تاکہ اس کو اختیار کیا جائے، یوں مسلمان کی جانب سے ایک معین حکم شرعی کو اپنانا (تبنی کرنا) لازمی امر ہے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے اس کے علاوہ اُس حکم پر عمل کرنے کی کوئی اور صورت نہیں۔ عمل کرنے کے لیے حکم شرعی کو اختیار کرنا فرض ہے حکم شرعی پر عمل کرنے کے واجب ہونے کی وجہ سے ایک معین حکم کی تبنی بھی فرض ہے خواہ وہ عمل فرض ہو، مندوب ہو، حرام ہو، مکروہ ہو یا مباح ہو، تاکہ اس حکم شرعی پر عمل ہو سکے۔ اس لیے ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ عمل کرنے کے واسطے حکم شرعی اخذ کرتے وقت ایک معین حکم کی تبنی کرے، چاہے یہ مسلمان مجتہد ہے یا مقلّد یا پھر خلیفہ یا کوئی اور۔

خلیفہ کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے حوالے سے کچھ معین احکامات کی تبنی کرے تاکہ وہ براہِ راست لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس وجہ سے تمام مسلمانوں سے متعلق امور، حکومت اور اتھارٹی کے حوالے سے خاص احکامات کی تبنی ضروری ہے جیسے زکوٰۃ، ٹیکسز، خراج یا

خارجہ تعلقات یا ریاست اور حکومت کی وحدت سے متعلق کوئی بھی معاملہ۔ تاہم جن احکامات کی وہ تبنی کرتا ہے ان کو دیکھا جائے گا کہ اگر خلیفہ خاص حکم شرعی کی تبنی کئے بغیر لوگوں کے ان معاملات کی نگرانی نہیں کر سکتا جو اس پر واجب ہے تب خلیفہ کے لیے ان معاملات میں تبنی کرنا اس شرعی قاعدے کی رُو سے واجب ہو گا کہ **(ما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب)** "جس عمل کے بغیر فرض ادا نہ ہو سکتا ہو وہ عمل بھی فرض ہے"، جیسے کہ معاہدات۔ اگر وہ معاملات ایسے ہیں کہ خلیفہ کسی خاص حکم شرعی کی تبنی کیے بغیر شرعی احکامات کے مطابق ان معاملات کی دیکھ بھال کر سکتا ہے تب تبنی کرنا اس کے لیے مباح ہو گا فرض نہیں۔ جیسا کہ شہادت کا نصاب ہے اس معاملے میں تبنی کرنا اور نہ کرنا دونوں جائز ہیں۔ کیونکہ بنیادی طور پر تبنی مباح ہے فرض نہیں، یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ نے اس بات پر اجماع کیا کہ خلیفہ تبنی کر سکتا ہے لیکن اس بات پر اجماع نہیں کیا کہ خلیفہ کے لیے تبنی لازمی ہے۔ اس لیے تبنی اصولی طور پر مباح ہے تاہم عوام کے امور کی واجب دیکھ بھال کی ادائیگی کسی خاص حکم شرعی کی تبنی کے بغیر نہ ہو سکتی ہو تو اس خاص حکم کی تبنی واجب ہو گی۔

دفعہ نمبر 4: خلیفہ عبادات میں سے سوائے زکوٰۃ، جہاد اور اس چیز کے جو مسلمانوں کی وحدت کی حفاظت کے لیے ضروری ہو، کسی خاص شرعی حکم کی تبنی نہیں کرے گا۔ اور اسلامی عقیدہ سے متعلقہ افکار میں سے بھی کس خاص فکر کی تبنی نہیں کرے گا۔

صحابہؓ نے اس بات پر اجماع کیا کہ صرف خلیفہ کو تبنی کا حق حاصل ہے اور اسی اجماع سے یہ مشہور قواعد اخذ کئے گئے: "خلیفہ کا حکم یا فیصلہ اختلاف کو ختم کرتا ہے" ، "امام کا حکم نافذ ہوتا ہے"۔

چونکہ خلیفہ مامون کے زمانے میں خلقِ قرآن کا فتنہ رونما ہوا اور یہ عقائد سے متعلقہ افکار میں تبنی کی وجہ سے تھا، چنانچہ عقائد سے متعلقہ افکار میں تبنی کرنے سے خلیفہ کے لیے مشکلات اور مسلمانوں کے درمیان فتنے کا اندیشہ ہے اس لیے خلیفہ کو چاہیے کہ مشکلات سے بچے، مسلمانوں کو راضی رکھنے اور ان کے اطمینان کے

لیے عقائد اور عبادات میں کوئی تبنی نہ کرے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ عقائد اور عبادات میں تبنی کرنا خلیفہ کے لیے حرام ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ ان میں تبنی کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے لیکن وہ تبنی نہ کرنے کو چنے گا۔ اس دفعہ میں تبنی نہ کرنے کا یہی مطلب ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ تبنی کرنا جائز نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ خود تبنی نہ کرنے کو اختیار کرے گا۔

اب رہی یہ بات کہ عقائد اور عبادات میں تبنی نہ کرنے کو اختیار کرنا تو اس کی دو وجوہات ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ عقیدے میں ایک خاص رائے پر مجبور کرنے کا سبب بنتا ہے اور اس میں حرج ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ خلیفہ جس چیز کو وجہ تبنی بناتا ہے وہ ہے مسلمانوں کے معاملات کی دیکھ بھال جو کہ ایک ہی رائے کے مطابق ہو، تاکہ ریاست اور حکومت کی وحدت کی حفاظت کی جاسکے، اس لیے خلیفہ افراد کے مابین تعلقات اور عام معاملات سے متعلق تبنی کرتا ہے اور انسان کے اپنے رب سے تعلق کے متعلق تبنی نہیں کرتا۔ پہلی وجہ کا جہاں تک تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے کفار کو انکے عقائد ترک کرنے اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے سے منع فرمایا، اسی طرح ان کو اپنی عبادات ترک کرنے اور اسلامی احکامات پر عمل کرنے پر مجبور کرنے سے بھی منع فرمایا۔ اس لیے مسلمانوں کو تو بدرجہ اولیٰ عقائد سے متعلق احکامات کو ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان کے عقائد اسلام پر مبنی ہوں اور نہ ان کو عبادات سے متعلقہ احکامات کو ترک کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے جب تک یہ احکامات شرع پر مبنی ہوں۔ یہ بات بھی قطعی ہے کہ عقائد سے متعلقہ افکار کو ترک کرنے پر مجبور کرنا بہت بڑی پریشانی کا سبب بنتا ہے بلکہ ان عقائد کو مزید راسخ کرنے کا سبب بنتا ہے۔ جیسا کہ بعض علماء اکرام کے ساتھ ہوا مثال کے طور پر خلق قرآن کے فتنے میں امام احمد بن حنبل کے ساتھ ہوا، ان کو زدوکوب کیا گیا، ان کی توہین کی گئی اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا لیکن وہ اپنے عقائد پر ڈٹے رہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ** ''اور تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں ڈالی'' (الحج:78)۔

عقائد اور عبادات میں کسی شخص کو ایک خاص رائے پر مجبور کرنا یا اس کو اپنی رائے چھوڑ کر دوسری رائے اپنانے پر مجبور کرنا جائز نہیں کیونکہ اس کا تعلق اعتقادات سے اور انسان کے اپنے رب کے ساتھ تعلق

سے ہے، اس لیے خلیفہ ہر اس چیز میں تبنی نہیں کرے گا جو مسلمانوں کو تنگ کرنے کا سبب بنتی ہو حالانکہ یہ تبنی خلیفہ کے لیے حرام نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عقائد اور عبادات انسان اور اللہ کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے یہ انسانوں کے آپس کے تعلقات کے خراب ہونے اور مشکلات پیدا ہونے کا سبب نہیں بنتے،اس کے بر خلاف، معاملات اور عقوبات چونکہ معاشرے کے افراد کے درمیان تعلقات پر اثر انداز ہوتے ہیں، ان سے تعلقات خراب ہوسکتے ہیں اور مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔ معاملات کی حقیقت لوگوں کے درمیان تنازعات کو ختم کرنا ہے اور خلیفہ کی جانب سے تبنی کرنے کی حقیقت بھی لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال ہے اور خلیفہ کی جانب سے دیکھ بھال لوگوں کے آپس کے تعلقات میں ظاہر ہوتی ہے، خلیفہ لوگوں اور اللہ کے درمیان تعلقات کی یعنی عقائد اور عبادات کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا، یوں خلیفہ کی جانب سے تبنی کا تعلق لوگوں کے معاملات کو حل کرنے کے لیے ان کے آپس کے تعلقات سے ہے نہ کہ اللہ اور بندوں کے تعلقات سے۔ چونکہ تبنی اصلاً لوگوں کے مابین تعلقات کو اُستوار کرنے کے لیے ہوتی ہے، لہٰذا اللہ اور انسان کے تعلق کے حوالے سے تبنی کرنا حقیقت کے بر عکس ہے، یوں خلیفہ تبنی کی حقیقت کے بر خلاف کوئی تبنی نہیں کرے گا، اگرچہ یہ اس کے لیے حرام نہیں۔

ان دونوں وجوہات کی بنا پر یعنی حرج اور تبنی کی حقیقت سے متضاد ہونے کی وجہ سے خلیفہ عقائد سے متعلقہ افکار اور عبادات سے متعلقہ احکام میں تبنی نہیں کرے گا۔ تاہم کتاب وسنت میں کسی عقیدے سے متعلق صریح نہی موجود ہو تو حرج اور تبنی کی حقیقت سے متضاد ہونے کے باوجود خلیفہ اس بارے میں تبنی کرے گا کیونکہ قطعی نص کو ترجیح دی جائے گی۔ مثال کے طور پر یہ امر کہ عقیدہ صرف قطعی نصوص پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اِسی طرح ایسے معاملات جن میں مسلمانوں کے امور کی دیکھ بھال کی خاطر اجتماعیت کا معاملہ ہو تو خلیفہ (عبادات میں) تبنی کرے گا۔ اس کی دلیل وہ تمام نصوص ہیں جو مسلمانوں کی اجتماعیت اور ریاست کی وحدت کے تحفظ کو لازم قرار دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر حج، روزوں اور عیدین کے اوقات مقرر کرنے کے حوالے سے

یا زکوٰۃ اور جہاد کے بارے میں، ان چیزوں میں خلیفہ ایک معین شرعی حکم کی تبنی کرے گا۔ یہ تبنی عقائد میں مجبور کرنے کے زمرے میں نہیں آتی، بلکہ یہ لوگوں کو اپنے اختیار کیے ہوئے عقیدے کا پابند کرنے میں شامل ہے جو کہ ایسی نص کی بنیاد پر ہے جو کہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ ہے، عبادات کے حوالے سے بھی اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ صرف انسان اور اس کے رب کے درمیان تعلق کے ساتھ مخصوص نہیں جیسا کہ نماز ہے، بلکہ یہ ایسی عبادات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے ساتھ ساتھ انسانوں سے بھی تعلقات ہیں جیسے عیدین۔ یوں عقائد اور عبادات میں بھی ان دو صورتوں میں تبنی جائز ہے۔

جو چیز کسی فکر کا تعین کرتی ہے کہ اس فکر کا تعلق عقیدے سے ہے یا احکام شرعیہ سے وہ چیز صرف شرعی دلیل ہے، کیونکہ حکم شرعی کی تعریف ہی یہ ہے کہ بندوں کے افعال سے متعلق شارع کا خطاب، اگر اس خطاب کا تعلق بندوں کے افعال سے نہیں تو پھر اس کا تعلق عقیدے سے ہو گا۔ عقیدے اور حکم شرعی کے درمیان یہ فرق بھی ہے کہ جس چیز پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے یا جس میں عمل کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے وہ عقیدہ میں سے ہے جیسے قرآن میں موجود قصّے یا غیب کی خبریں، جہاں عمل کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ احکام شرعیہ ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتَابِ الَّذِىْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتَابِ الَّذِىٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ** ” اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر، اسکے رسولوں پر، اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل کیں“(النساء136)، ارشاد ہے: **اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ** ”اللہ ہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے“ (الزمر:62)، ارشاد ہے **وَاذْكُرْ فِى الْكِتَابِ مَرْيَمَ** ” اس کتاب میں مریم کا بھی واقعہ بیان کر...“ (مریم:16)۔ اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ o وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ** ”جس دن انسان بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہو جائیں گے اور پہاڑ دُھنی ہوئی رنگین اُون کی طرح ہو جائیں گے“ (القارعۃ:4-5)۔ ان سب کا تعلق عقیدے سے ہے، ان کا بندوں کے افعال سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ ان میں ایمان لانے کا مطالبہ ہے یہاں عمل کا کوئی مطالبہ نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا "اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے" (البقرہ: 275)، ارشاد ہے: فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ " اگر وہ تمہارے لیے بچے کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت دے دو" (الطلاق:6)۔ یہ سب کے سب احکامِ شرعیہ ہیں، کیونکہ ان کا تعلق بندوں کے افعال سے ہے اور ان میں عمل کا مطالبہ ہے۔ اسی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا عقیدہ ہے کیونکہ اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے، لیکن امامت یعنی خلافت کا تعلق عقیدے سے نہیں کیونکہ اس کے لیے عمل کرنے کا مطالبہ ہے یا نبی ﷺ کا معصوم ہونا عقیدہ ہے جبکہ خلیفہ کا قریشی ہونا، آلِ بیت میں سے ہونا یا پھر کوئی بھی مسلمان ہونا احکامِ شرعیہ میں سے ہے نہ کہ عقیدے سے، اس کا تعلق بندوں کے افعال سے ہے یعنی خلیفہ کے لیے شرائط کیا ہونی چاہئیں۔ یوں ہر وہ حکم جن میں ایمان کا مطالبہ ہے یا وہ بندوں کے افعال کے متعلق نہیں وہ عقائد میں سے ہے۔ عقیدہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک اساسی فکر ہے کسی حکم کے عقیدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسرے احکامات کے لیے بنیادی معیار (پیمانہ) ہے اسی طرح ایسی فکر جو اساسی نہ ہو اس کو عقیدہ نہیں کہا جائے گا۔ گویا عقیدہ انسان، حیات اور کائنات کے بارے میں ایک کُلی فکر کا نام ہے۔ اسی طرح وہ زندگی سے ماقبل اور مابعد کے بارے میں بھی ایک کُلی اور بنیادی فکر ہے اور زندگی کے اپنے ماقبل اور مابعد کے ساتھ تعلق کے بارے میں بھی۔ یہ ہر عقیدے کی تعریف ہے اور اس کا اطلاق اسلامی عقیدے پر بھی ہوتا ہے، جس میں تمام مغیبات (غیب کی باتیں) شامل ہیں۔ اس کُلی فکر کے افکار میں سے ہر فکر عقیدہ ہے، اس لیے ہر وہ فکر جس کا اللہ تعالی کے خالق ہونے سے، قیامت کے دن سے، کائنات کی تخلیق سے یا اسی طرح کی کسی اور فکر سے ہو، وہ عقیدہ ہے۔ جس چیز کا تعلق ان امور سے نہیں وہ عقیدہ نہیں ہے۔

دفعہ نمبر 5 : وہ تمام افراد جو اسلامی ریاست کے شہری ہیں ان کو تمام شرعی حقوق حاصل ہوں گے۔

دفعہ نمبر6: ریاست کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شہریوں کے مابین حکومتی معاملات عدالتی فیصلوں، لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال اور دیگر امور میں امتیازی سلوک کرے، بلکہ اس پر فرض ہے کہ وہ تمام افراد کو رنگ نسل اور دین سے قطع نظر ایک ہی نظر سے دیکھے۔

یہ دونوں دفعات ان لوگوں کے احکام کو بیان کرنے کے لیے وضع کی گئی ہیں جن کے پاس اسلامی شہریت ہے خواہ وہ مسلمان ہیں یا اہلِ ذمہ۔ رسول ﷺ نے ان مسلمانوں کو جو اسلامی ریاست سے باہر رہتے تھے اور ریاست کے شہری نہیں تھے ان فوائد سے محروم رکھا جو ریاست کے شہریوں کو میسر تھے۔

سلیمان بن بریدہ نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ **«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَمَّرَ أَمِيرًا عَلَى جَيْشٍ أَوْ سَرِيَّةٍ أَوْصَاهُ فِي خَاصَّتِهِ بِتَقْوَى اللَّهِ وَمَنْ مَعَهُ مِنْ الْمُسْلِمِينَ خَيْرًا، ثُمَّ قَالَ: اغْزُوا بِاسْمِ اللَّهِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، قَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ، اغْزُوا وَلا تَغُلُّوا وَلا تَغْدِرُوا وَلا تَمْثُلُوا وَلا تَقْتُلُوا وَلِيدًا، وَإِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنْ الْمُشْرِكِينَ فَادْعُهُمْ إِلَى ثَلاثِ خِصَالٍ أَوْ خِلالٍ، فَأَيَّتُهُنَّ مَا أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى الإِسْلامِ، فَإِنْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَكُفَّ عَنْهُمْ، ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ، وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ إِنْ فَعَلُوا ذَلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِينَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِينَ، فَإِنْ أَبَوْا أَنْ يَتَحَوَّلُوا مِنْهَا فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ يَكُونُونَ كَأَعْرَابِ الْمُسْلِمِينَ يَجْرِي عَلَيْهِمْ حُكْمُ اللَّهِ الَّذِي يَجْرِي عَلَى الْمُؤْمِنِينَ، وَلا يَكُونُ لَهُمْ فِي الْغَنِيمَةِ وَالْفَيْءِ شَيْءٌ إِلاَّ أَنْ يُجَاهِدُوا مَعَ الْمُسْلِمِينَ»** ”رسول ﷺ جب کسی کو کسی لشکر یا فوجی دستے کا امیر مقرر فرماتے، تو خاص طور پر اس کو اللہ سے ڈرنے اور اپنے ساتھی مسلمانوں کی خیر خواہی کی وصیت کرتے۔ پھر فرماتے، اللہ کا نام لے کر اللہ کی راہ میں لڑو، اللہ کا انکار کرنے والوں کو قتل کرو، غلو مت کرو بے وفائی مت کرو۔ فساد مت کرو، نو مولود بچوں کو قتل مت کرو۔ جب دشمن مشرکین سے آمنا سامنا ہو جائے تو ان کو تین باتوں کی دعوت دو، اگر وہ ان میں سے کسی ایک کا بھی مثبت جواب دے دیں تو قبول کرو اور لڑائی روک دو۔ ان کو اسلام کی دعوت دو؛ اگر وہ مان جائیں تو قبول کرو اور لڑائی سے رک جاؤ۔ پھر انہیں دارُ الہجرت کی طرف ہجرت کرنے کی دعوت دو اور انہیں بتادو کہ

اگر وہ ہجرت کرلیں تو ان کے وہی حقوق و فرائض ہوں گے جو مہاجرین کے ہیں۔ اور اگر وہ ہجرت نہ کریں تو انہیں بتادو کہ انہیں بدو مسلمانوں کی طرح مال غنیمت اور مال فئی میں اس وقت تک کوئی حصہ نہیں ملے گا جب تک وہ مسلمانوں کے شانہ بشانہ جہاد نہ کریں"، اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث صریح اور واضح ہے کہ جو شخص دارالاسلام منتقل نہیں ہو گا اور ریاست کی شہریت حاصل نہیں کرے گا تو اس کو شہریت کے حقوق بھی نہیں ملیں گے اگرچہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ رسول ﷺ نے مسلمانوں جیسے حقوق و فرائض کے لئے اسلام کے اقتدار کے زیر سایہ آنے کو شرط قرار دیا اور فرمایا «**ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى التَّحَوُّلِ مِنْ دَارِهِمْ إِلَى دَارِ الْمُهَاجِرِينَ، وَأَخْبِرْهُمْ أَنَّهُمْ إِنْ فَعَلُوا ذَلِكَ فَلَهُمْ مَا لِلْمُهَاجِرِينَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَى الْمُهَاجِرِينَ**» "پھر ان کو اپنے ملک سے دارالمہاجرین منتقل ہونے کی دعوت دو اور ان کو بتاؤ کہ اگر وہ ایسا کریں تو ان کے حقوق و فرائض بھی مہاجرین جیسے ہوں گے"۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہمارے جیسے حقوق و فرائض حاصل کرنے کے لئے ان کا دارالمہاجرین منتقل ہونا شرط ہے، دوسرے الفاظ میں ان پر شرعی قوانین کے نفاذ کے لئے دارالمہاجرین منتقل ہونا شرط ہے۔ اور یہ روایت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اگر انہوں نے ہجرت نہ کی تو ان کے وہ حقوق نہیں ہوں گے جو مہاجرین کے حقوق ہیں یعنی جو حقوق دارالاسلام میں ہوں گے۔ یہ نص دارالاسلام منتقل ہونے والوں اور منتقل نہ ہونے والوں کے درمیان احکامات کے لحاظ سے فرق کو واضح کرتی ہے اور یہ واضح کرتی ہے کہ دارالمہاجرین ہی اصل میں دارالاسلام تھا اور اس کے علاوہ باقی سب دارالکفر تھے۔ دارلاسلام یا دارالکفر میں سے رہنے کی جگہ متعین کرنے کے حوالے سے ہی ایک فرد کی شہریت کا تعین کیا جاتا ہے۔ اگر وہ دارالاسلام میں رہنے کا فیصلہ کرے گا تو اس پر اسلام کے قوانین نافذ ہوں گے اور اسے اسلامی شہریت حاصل ہو گی۔ اگر وہ دارالکفر میں رہے گا تو اس پر دارالکفر کے قوانین نافذ ہوں گے اور اسے اسلامی شہریت حاصل نہیں ہو گی۔ دارالاسلام میں رہنے والے ذمی کو تمام حقوق فراہم کیے جائیں گے کیونکہ وہ دارالاسلام کا شہری ہے۔ ذمی ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا دین، اسلام کے علاوہ کوئی اور ہو لیکن وہ اسلامی ریاست کا شہری بن کر رہے چاہے وہ اپنے مذہب پر قائم رہے۔ ذمی کا لفظ ذمہ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں عہد، یعنی ان سے ہمارا عہد ہے کہ جن شرائط پر ان سے صلح ہوئی ہے ہم ان کے

ساتھ ویسا معاملہ کریں گے، ہم ان کے معاملات اور مفادات کی اسلامی احکامات کے مطابق دیکھ بھال کریں گے۔ اسلام میں اہلِ ذمہ کے بارے میں بہت سے احکامات ہیں جن میں ان کو شہری حقوق کی ضمانت اور ان کے فرائض بتائے گئے ہیں، اہلِ ذمہ کے بھی عدل وانصاف کے حوالے سے وہ حقوق ہیں جو ہمارے ہیں اور ان کے بھی وہ فرائض ہیں جو ہمارے ہیں، اس حوالے سے قران کی آیتیں عام ہیں جیسا کہ ارشاد ہے کہ **اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَہْلِہَا ۙ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ ۭ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا** " اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو اللہ تعالیٰ تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے بیشک اللہ سنتا اور دیکھتا ہے "(النساء: 58)، اور ارشاد ہے **وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ ہُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی** "...کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل پر آمادہ نہ کرے بلکہ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیز گاری کی بات ہے..." (المائدہ:8) اوراہل کتاب کے درمیان فیصلہ کرنے کے بارے میں فرمایا: **وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَہُمْ بِالْقِسْطِ** "اور اگر ان میں فیصلہ فرماؤ تو انصاف سے فیصلہ کرو" (المائدہ:42)۔

جہاں تک ان کو بھی انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کا تعلق ہے، تو یہ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ جس طرح مسلمانوں پر حدود کو قائم کرتے تھے اسی طرح کفار پر بھی حدود کو قائم کرتے تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اُس یہودی کو قصاص کے طور پر قتل کیا جس نے ایک عورت کو قتل کیا تھا جیسا کہ بخاری میں انس بن مالکؓ کی روایت ہے: **«خَرَجَتْ جَارِيَةٌ عَلَيْهَا أَوْضَاحٌ بِالْمَدِينَةِ قَالَ فَرَمَاهَا يَهُودِيٌّ بِحَجَرٍ قَالَ فَجِيءَ بِهَا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَبِهَا رَمَقٌ فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فُلَانٌ قَتَلَكِ فَرَفَعَتْ رَأْسَهَا فَأَعَادَ عَلَيْهَا قَالَ فُلَانٌ قَتَلَكِ فَرَفَعَتْ رَأْسَهَا فَقَالَ لَهَا فِي الثَّالِثَةِ فُلَانٌ قَتَلَكِ فَخَفَضَتْ رَأْسَهَا فَدَعَا بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَقَتَلَهُ بَيْنَ الْحَجَرَيْنِ»** "مدینہ میں ایک باندی جارہی تھی جس نے زیور پہن رکھا تھا۔ راوی کہتا ہے کہ ایک یہودی نے اس کو پتھر مارا پھر اس باندی کو رسول اللہ ﷺ کے پاس اس حالت میں لایا گیا کہ وہ بمشکل زندہ تھی۔ رسول

اللہ ﷺ نے پوچھا کہ فلاں نے تمہیں قتل کیا تو اس نے سر اٹھایا، پھر پوچھا کہ فلاں نے تمہیں قتل کیا پھر اس نے سر اٹھایا پھر تیسری بار پوچھا کہ فلاں نے تمہیں قتل کیا تو اس لڑکی نے (ہاں میں) سر نیچے ہلایا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس یہودی کو بلا کر دو پتھروں کے درمیان اس کو قتل کیا"۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک یہودی مرد اور ایک عورت لائی گئی جنھوں نے زِنا کیا تھا آپ نے ان دونوں کو سنگسار (رجم) کیا، چنانچہ بخاری میں ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ **«أُتِيَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِيَهُودِيٍّ وَيَهُودِيَّةٍ قَدْ أَحْدَثَا جَمِيعًا فَقَالَ لَهُمْ مَا تَجِدُونَ فِي كِتَابِكُمْ قَالُوا إِنَّ أَحْبَارَنَا أَحْدَثُوا تَحْمِيمَ الْوَجْهِ وَالتَّجْبِيهَ قَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ سَلَامٍ ادْعُهُمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ بِالتَّوْرَاةِ فَأُتِيَ بِهَا فَوَضَعَ أَحَدُهُمْ يَدَهُ عَلَى آيَةِ الرَّجْمِ وَجَعَلَ يَقْرَأُ مَا قَبْلَهَا وَمَا بَعْدَهَا فَقَالَ لَهُ ابْنُ سَلَامٍ ارْفَعْ يَدَكَ فَإِذَا آيَةُ الرَّجْمِ تَحْتَ يَدِهِ فَأَمَرَ بِهِمَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَرُجِمَا»** "رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک یہودی مرد اور عورت لائے گئے، جنھوں نے زِنا کا ارتکاب کیا تھا رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا تمہاری کتاب میں کیا لکھا ہے انہوں نے کہا کہ ہمارے مشائخ نے کہا ہے کہ چہرے کو داغ دیا جائے۔ عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! ان سے کہیں کہ تورات لائیں۔ تورات لائی گئی ان دونوں میں سے ایک نے اپنا ہاتھ رجم والی آیت پر رکھ لیا اور اس سے پہلے اور بعد والی آیت پڑھنے لگے، عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا اپنا ہاتھ اٹھاؤ تو رجم والی آیت اس کے ہاتھ کے نیچے تھی، رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ان دونوں کو (رجم) سنگسار کیا جائے پس دونوں کو سنگسار کیا گیا"۔ اسی طرح اہلِ ذمہ کا ہم پر حق ہے کہ ہم ان کی بھی مسلمانوں کی طرح حفاظت کریں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«أَلا مَنْ قَتَلَ نَفْسًا مُعَاهِدًا لَهُ ذِمَّةُ اللَّهِ وَذِمَّةُ رَسُولِهِ فَقَدْ أَخْفَرَ بِذِمَّةِ اللَّهِ، فَلا يُرَحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ سَبْعِينَ خَرِيفًا»** "اور سنو! جس نے کسی ایسے معاہد شخص کو قتل کیا جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے عہد دیا، تو اس نے اللہ کے عہد کو توڑا، ایسا شخص جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو ستر سال کے فاصلے سے بھی سونگھی جائے گی"، اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو حسن صحیح کہا ہے، بخاری نے اس کو ان الفاظ سے روایت کیا ہے **«مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَإِنَّ رِيحَهَا تُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ أَرْبَعِينَ عَامًا»** "جس نے

معاہد (ذمی) کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو کو بھی سونگھ نہیں پائے گا جبکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کے فاصلے سے بھی سونگھی جائے گی "۔ اہل ذمہ کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ ان کے معاملات کی دیکھ بھال کی جائے اور ان کو بھی مسلمانوں کی طرح معاشی ضمانت دی جائے، ابووائل اور ابو موسیٰ یا ان میں سے ایک نے اسناد سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «أَطْعِمُوا الْجَائِعَ، وَعُودُوا الْمَرِيضَ، وَفُكُّوا الْعَانِيَ» بھوکے کو کھلاؤ، مریض کی عیادت کرو اور مصیبت زدہ کی مدد کرو"، اس کو بخاری نے ابو موسیٰ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ " اسی طرح اہل ذمہ کے لیے بھی (ان کی حفاظت کے لیے) لڑا جائے گا اور ان کو چھڑایا جائے اور نجات پائیں تو آزادی سے اپنے ذمہ اور عہد کی طرف آئیں گے اور اس حوالے سے احادیث بھی ہیں "۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ نجران کے ساتھ صلح کی اور اس کی تفصیل ابو داؤد نے سنن میں یوں بیان کی ہے **"عَلَى أَنْ لاَ تُهْدَمَ لَهُمْ بَيْعَةٌ، وَلاَ يُخْرَجَ لَهُمْ قَسٌّ، وَلاَ يُفْتَنُوا عَنْ دِينِهِمْ مَا لَمْ يُحْدِثُوا حَدَثًا أَوْ يَأْكُلُوا الرِّبَا"** اس شرط پر کہ ان کا کوئی عبادت خانہ نہیں گرایا جائے گا، ان کے روحانی پیشواؤں کو نہیں نکالا جائے گا اور اس وقت تک ان کو انکے دین کے بارے میں آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا جب تک وہ کوئی جرم نہ کریں یا سود نہ کھائیں "۔ رسول اللہ ﷺ ان کے مریضوں کی عیادت بھی کرتے تھے، بخاری نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ **«كَانَ غُلاَمٌ يَهُودِيٌّ يَخْدُمُ النَّبِيَّ ﷺ فَمَرِضَ، فَأَتَاهُ النَّبِيُّ ﷺ يَعُودُهُ، فَقَعَدَ عِنْدَ رَأْسِهِ فَقَالَ لَهُ: أَسْلِمْ، فَنَظَرَ إِلَى أَبِيهِ وَهُوَ عِنْدَهُ، فَقَالَ لَهُ: أَطِعْ أَبَا الْقَاسِمِ ﷺ فَأَسْلَمَ، فَخَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ وَهُوَ يَقُولُ: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْقَذَهُ مِنْ النَّارِ»** "ایک یہودی لڑکا تھا جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا ایک دن وہ بیمار ہو گیا اور نبی کریم ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لائے اور اس کے سراہنے بیٹھ گئے اور فرمایا: اسلام لاؤ۔ وہ لڑکا اپنے ماں باپ کی طرف دیکھنے لگا تو اس کے باپ نے کہا کہ ابو القاسم کی بات مانو، یہ سُن کر وہ لڑکا مسلمان ہو گیا، رسول اللہ ﷺ یہ کہتے ہوئے وہاں سے نکل گئے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے اس کو آگ سے بچایا"۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی عیادت کرنا ان کے ساتھ بیٹھنا اور ان کے دل بہلانا جائز ہے۔ بخاری نے عمرو بن میمون سے عمر بن خطابؓ کی یہ وصیت نقل کی ہے جو

انہوں نے وفات کے وقت کی تھی: ”میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے ذمہ (عہد) کی پاسداری کرے اور ان (اہلِ ذمہ) سے بد عہدی نہ کرے، ان (اہل ذمہ) کے لیے لڑے اور ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے“۔ ذمیوں کو ان کے عقائد اور عبادات پر ہی چھوڑا جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کو خط لکھا کہ **«مَنْ كَانَ عَلَى يَهُودِيَّتِهِ أَوْ نَصْرَانِيَّتِهِ فَإِنَّهُ لاَ يُفْتَنُ عَنْهَا، وَعَلَيْهِ الجِزْيَةَ»** ”جو شخص اپنی یہودیت یا نصرانیت پر قائم رہے اس کو آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا بلکہ وہ صرف جزیہ ادا کرے گا“۔ اس کو ابو عبید نے الاموال میں عروہؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ذمیوں سے بھی کوئی ایسا 'کسٹم ٹیکس' نہیں لیا جائے گا جو مسلمانوں پر لاگو نہیں ہوتا۔ ابو عبید نے الاموال میں عبد الرحمٰن بن معقلؓ سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ: میں نے زیاد بن حدیر سے پوچھا کہ تم کس سے کسٹم ٹیکس لیتے تھے؟ انہوں نے کہا: ہم کسی مسلمان یا معاہد (ذمی) سے یہ ٹیکس نہیں لیتے تھے۔ تو میں نے پوچھا، پھر کس سے لیتے تھے؟ انہوں نے کہا: ہم دارالحرب کے تاجروں سے ایسا کسٹم ٹیکس لیتے تھے جیسا کہ وہ ہم سے لیتے تھے“۔ العاشر سے مراد کسٹم ڈیوٹی جمع کرنے والا ہے۔ یوں ذمی ریاست کے تمام شہریوں کے مساوی شہری ہیں، ان کو تمام شہری حقوق حاصل ہوں گے، ان کو تحفظ کا حق حاصل ہے، ان کو باعزت زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے، ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا جائے گا اور ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ ہو گا، وہ اسلامی فوج میں بھرتی ہو کر لڑ سکتے ہیں لیکن یہ ان پر فرض نہیں، ان سے جزیہ کے علاوہ کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا، اور وہ ٹیکس بھی نہیں لگائے جائیں گے جو مسلمانوں پر فرض ہیں، عدالت میں اور قاضی کے سامنے یا ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے ہوئے، یا سزاؤں میں، ان کو اور مسلمانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ذمی کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو ایک مسلمان شہری کو حاصل ہیں اور اس کے وہ تمام فرائض ہیں، جو ذمہ کے معاہدے کے تحت اور ریاست کی اطاعت میں آتے ہیں۔

یوں معاملات کی دیکھ بھال اور نگہبانی کرتے وقت ریاست کے شہری ہونے کو مدِ نظر رکھا جائے گا چاہے وہ شہری مسلمان ہو یا ذمی، رعایا کے درمیان کسی قسم کی کوئی تمیز نہیں کی جائے گی کیونکہ حکومت اور فیصلے

کے حوالے سے دلائل عام ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ** "اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے فیصلہ کرو"(النساء:58)، یہ حکم سب کے لیے یکساں ہے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «**البَيِّنَةُ عَلَى المُدَّعِي، وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ أَنْكَرَ**» گواہ لانا دعویٰ کرنے والے پر ہے، جبکہ قسم کھانا انکار کرنے والے (ملزم) پر ہے"، اس کو بیھقی نے صحیح اسناد سے نقل کیا ہے اور یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے عام ہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ «**قَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنَّ الْخَصْمَيْنِ يَقْعُدَانِ بَيْنَ يَدَيِ الْحَكَمِ**» اور سول اللہ ﷺ نے فیصلہ کردیا ہے کہ دونوں فریق قاضی کے سامنے بیٹھیں گے"۔ اس کو احمد اور ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ یہ بھی عام ہے خواہ فریق مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «**الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ**» اور خلیفہ نگہبان اور اپنی رعیت کے لیے جواب دہ ہے" (متفق علیہ) رعیت کا لفظ عام ہے جس میں مسلم یا غیر مسلم دونوں شامل ہیں۔ یوں تمام دلائل عام ہیں اور اس میں مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ، عرب اور غیر عرب کے ساتھ، کسی سفید اور کالے کے ساتھ امتیازی سلوک ناجائز ہے، بلکہ وہ تمام لوگ جو اسلامی ریاست کے شہری ہیں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں، ریاست کی نظر میں وہ سب برابر ہیں اور ان سب کے حقوق کی ادائیگی ان کی جان ومال اور عزت و آبرو کی حفاظت ریاست پر فرض ہے اور قاضی صرف عدل اور برابری کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا پابند ہے۔

دفعہ نمبر 7: ریاست ان تمام افراد پر جو اسلامی ریاست کے شہری ہوں مسلم ہوں یا غیر مسلم حسب ذیل طریقے سے اسلامی شریعت نافذ کرے گی:

ا) مسلمانوں پر بغیر کسی استثناء کے تمام اسلامی احکامات نافذ کرے گی۔

ب) غیر مسلموں کو ایک عام نظام کے تحت ان کے عقیدے اور عبادت کی آزادی دی جائے گی۔

ج) مرتدین اگر خود مرتد ہوئے ہیں تو ان پر مرتد کے احکامات نافذ کیے جائیں گے، اگر وہ مرتد کی اولاد ہوں اور پیدائشی غیر مسلم ہوں تو ان کے حالات کو مدِ نظر رکھ کر ان سے غیر مسلموں کا معاملہ کیا جائے گا یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ مشرک ہیں یا اہل کتاب۔

د) غیر مسلموں کے ساتھ کھانے پینے اور لباس کے معاملات میں شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان کے دین کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔

ھ) غیر مسلموں کے درمیان شادی اور طلاق کے معاملات ان کے ادیان کے مطابق نمٹائے جائیں گے اور مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کے یہ معاملات اسلامی احکامات کے مطابق طے کئے جائیں گے۔

و) ریاست باقی تمام شرعی احکامات، تمام شرعی اوامر جیسے معاملات عقوبات، بینات (گواہیوں کا نظام) نظامِ حکومت اور اقتصادیات وغیرہ سب کے سب، برابری کی بنیاد پر نافذ کرے گی رعایا خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ اسی طرح معاہدین (اہل معاہدہ) مستامنین (اسلامی ریاست کے امان میں رہنے والے) اور ہر وہ شخص جو اسلامی ریاست کے زیر سایہ ہے ان پر اسلامی احکامات کو نافذ کرے گی، سوائے سفیروں، ایلچیوں اور اس نوعیت کے دوسرے لوگوں کے جن کو سفارتی امان حاصل ہوتا ہے۔

اسلام تمام انسانوں کیلئے آیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **وَمَآ اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ** ”ہم نے آپ ﷺ کو تمام انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا، ہاں مگر لوگوں کی اکثریت اس سے بے علم ہے“ (سباء:28)۔ کافر جس طرح اصول یعنی اسلامی عقیدے کا مکلف ہے اس طرح فروع یعنی احکام شرعیہ کا بھی مکلف ہے اصول کا

مکلف ہونا تو قرآن کریم کی آیات سے بالکل واضح ہے، جبکہ بعض فروع کا مکلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انتہائی صراحت کے ساتھ ان کو بعض فروع کا مکلف قرار دیا، جیسے عبادت کا حکم دینے والی آیات۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **يَآ يُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ** "اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا، یہی تمھارا بچاؤ ہے" (البقرہ:21)۔ اور فرمایا **وَلِلّٰـهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا** "اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر جو اس کی طرف راہ پاسکتے ہوں اس گھر کا حج فرض کر دیا ہے" (آل عمران:97)۔ اسی قسم کی کئی اور آیتیں ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اگر کفار فروعات کے مکلف نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان پر کفار کو وعیدیں نہ سناتا جبکہ ان فروع کو ترک کرنے کی وجہ سے ان کو سخت ترین وعیدیں سنائی گئی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : **وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ○ اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ** "ان مشرکوں کے لئے (بڑی ہی) خرابی ہے جو زکوٰۃ نہیں دیتے" (فصلت:7-6)، اور فرمایا: **وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰـهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰـهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا** اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور کسی ایسے نفس کو جسے قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہو وہ بجز حق کے قتل نہیں کرتے، نہ وہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور جو کوئی یہ کام کرے گا وہ اپنے اوپر سخت وبال لائے گا" (الفرقان:68)۔ اسی طرح فرمایا: **مَا سَلَكَكُمْ فِىْ سَقَرَ○ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ** "اور تمھیں دوزخ میں کس چیز نے ڈالا وہ جواب دیں گے کہ ہم نمازی نہ تھے" (المدثر:42-43)۔ یہ معاملہ کہ کافروں کو چند احکامات کا مکلف بنایا گیا ہے، اس بات کو بھی ثابت کرتا ہے کہ وہ باقی تمام اوامر و نواہی کے مکلف بھی ہیں۔ کیونکہ یہ تمام آیات جو تکلیف کے بارے میں ہیں یہ عام ہیں ان کی تخصیص کی کوئی دلیل نہیں اس لئے یہ مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہیں جو مسلمانوں اور کافروں سب کے لئے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَاَحَلَّ اللّٰـهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۚ** "اور اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کر دیا ہے" (البقرہ:275)۔ یا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ **فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ** "پھر اگر

تمھارے کہنے پر وہی (عورتیں) بچوں کو دودھ پلائیں تو تم انہیں ان کی اجرت دے دو" (طلاق:6)۔ اور ارشاد ہے **فَرِهَانٌ مَّقْبُوْضَةٌ** "تو رہن قبضہ میں رکھ لیا کرو..." (البقرہ:283)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَنْ أَحْيَا أَرْضًا مَيِّتَةً فَهِيَ لَهُ»** "جس نے مردہ زمین کو آباد کیا وہ اسی کی ہے"۔ اس کو احمد اور ترمذی نے جابرؓ کے حوالے سے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کہ **«عَلَى الْيَدِ مَا أَخَذَتْ حَتَّى تُؤَدِّيَهُ»** "جس ہاتھ (آدمی) نے کسی سے کچھ لیا تو واپس کرنے تک وہی ذمہ دار ہے۔" اس کو احمد نے صحیح اسناد کے ساتھ سمرہ بن جندبؓ سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح کے اور بھی کئی احکامات ہیں۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کفار فروع کے بھی مکلف ہیں۔ یہ بات بھی ہے کہ اصل کا مکلف ہونا دراصل فروع کا بھی مکلف ہونا ہے۔ کیونکہ کُل کی تکلیف جزو کی بھی تکلیف ہے، جیسے نماز کی تکلیف کا مطلب رکعت، قرات اور قیام وغیرہ کی تکلیف ہے۔ چونکہ کافر، اصل کا مکلف ہے اس لئے وہ فروع کا بھی مکلف ہے۔ ہاں بعض فروع کا ان کے لئے جائز نہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ ان کے لئے شرط اسلام ہے اور جب تک شرط نہیں پائی جائے گی یہ فروع جیسے نماز، روزہ وغیرہ صحیح نہیں ہونگے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ فروع ان پر فرض نہیں رہے۔ جہاں تک اُن فروع کا تعلق ہے جن کا کفار سے مطالبہ نہیں کیا گیا ہے جیسے جہاد، باوجود اس کے کہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے اسلام شرط نہیں، چونکہ جہاد کفار کو ان کے کفر کی وجہ سے قتل کرنا ہے، اور ذمی بھی کافر ہے۔ وہ کفار سے ان کے کفر کی وجہ سے نہیں لڑتا ورنہ اس کے لئے اپنے آپ سے لڑنا بھی جائز ہوتا۔ حالانکہ اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا لیکن اگر وہ اپنے علاوہ دوسرے کافروں سے لڑنے کے لئے راضی ہو گیا تو قبول کیا جائے گا لیکن اس کو لڑائی کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کے لئے اللہ کے سامنے غیر مکلف ہے۔

یہ تو تھا اس حیثیت سے کہ احکامِ اسلام کا اِن کفار سے کیا مطالبہ ہے، تاہم نفاذ کے لحاظ سے، حاکم ان پر تمام اسلامی احکامات نافذ کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے بارے میں فرمایا: **فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ** " اور آپ ﷺ ان کے آپس کے معاملات میں اسی اللہ کی

اتاری ہوئی کتاب کے ساتھ حکم کیجیے" (المائدہ:48)۔ ان کے بارے میں یہ بھی فرمایا: **وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ** "اور آپ ﷺ ان کے معاملات میں اللہ کی نازل کردہ وحی کے مطابق ہی حکم کیا کیجئے"(المائدہ:49)۔اور فرمایا: **اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرَاكَ اللّٰهُ** "اور یقیناہم نے تمھاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ لوگوں میں اُس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ تعالیٰ نے تم کو شناسا کیا ہے" (النساء:105)۔

یہ حکم عام ہے، مسلم اور غیر مسلم سب اس میں شامل ہیں۔کیونکہ **لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ** میں 'الناس' کا لفظ استعمال ہوا ہے ، جو سب کے لیے عام ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: **سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ** "یہ کان لگالگا کر جھوٹ سننے والے اور جی بھر کر حرام کھانے والے ہیں اگر یہ تمھارے پاس آئیں تو تمھیں اختیار ہے خواہ ان کے آپس کا فیصلہ کرو، خواہ ان کو ٹال دو"(المائدہ:42)۔اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی ریاست کے باہر سے مسلمانوں سے اپنے تنازعات کے فیصلے کرانے آتے ہیں، اب مسلمان چاہیں تو ان کافروں کے آپس کے معاملات کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو ان کو ٹال دیں۔کیونکہ یہ آیت مدینہ سے باہر ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اسلامی ریاست میں داخل نہیں تھے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو مدینہ کے یہود سے الگ قرار دے کر ان سے معاہدے کیے تھے ایسے قبائل ریاست سے الگ سمجھے جاتے تھے اور وہ اسلامی اقتدار کے ماتحت نہیں تھے، اسی وجہ سے اسلامی ریاست اور ان کے درمیان معاہدات بھی تھے۔ اگر کفار اسلامی اقتدار کے زیر نگین ہو یعنی ذمی ہوں یا مستامن ہو کر آئے ہوں تو ان کے درمیان صرف اسلامی احکامات کے مطابق ہی فیصلہ کیا جائے گا۔اگر ان میں سے کوئی اسلامی حکم کی طرف رجوع کرنے میں پس پیش کرے تو حکمران اس کو مجبور کرے گا۔اور اسلامی حکم کے سامنے اس کو مجبور کرے گا اور اسلامی حکم کے سامنے اس کو سرنگوں کرے گا، کیونکہ ذمی سے دائمی عقد (معاہدہ) کرنا صرف دوشرطوں کے ساتھ ہی جائز ہے۔پہلی

شرط یہ ہے کہ ہر سال جزیہ ادا کریں گے۔ جبکہ دوسری شرط یہ ہے کہ اسلامی احکام کی پابندی کریں گے یعنی حقوق کی ادائیگی اور حرام کو چھوڑنے کے بارے میں ان کو جو حکم دیا جائے اس کی پاسداری کریں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ** "یہاں تک کہ وہ ذلیل وخوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں" (التوبہ:29)۔ یعنی اسلامی احکام کے سامنے سر جھکائیں۔ رسول ﷺ ان پر اسلامی احکامات نافذ کرتے تھے۔ بخاری نے ابن عمرؓ کے حوالے نقل کیا ہے کہ **«أَنَّ الْيَهُودَ جَاءُوا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ بِرَجُلٍ مِنْهُمْ وَامْرَأَةٍ زَنَيَا فَأَمَرَ بِهِمَا فَرُجِمَا»** "یہودی ایک ایسے مرد اور عورت کو لے کر رسول ﷺ کے پاس آئے جنہوں نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ آپ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ سنگسار کرو، ان دونوں کو سنگسار کیا گیا۔" بخاری ہی نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَتَلَ يَهُودِيًّا بِجَارِيَةٍ قَتَلَهَا عَلَى أَوْضَاحٍ لَهَا»** "رسول ﷺ نے ایک ایسے یہودی کو قتل کر دیا جس نے زیور کے لالچ میں ایک باندی کو قتل کیا تھا۔" یہ یہودی اسلامی ریاست کا شہری تھا۔ اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اہلِ نجران، جن میں نصاریٰ بھی تھے کو لکھ کر بھیجا کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَتَلَ يَهُودِيًّا بِجَارِيَةٍ قَتَلَهَا عَلَى أَوْضَاحٍ لَهَا»** جس نے سودی لین دین کیا اس کے ساتھ ہمارا کوئی معاہدہ (ذمہ) نہیں"۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے شعبی سے نقل کیا ہے۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ تمام رعایا پر تمام اسلامی احکام نافذ کیے جائیں گے۔ اس حوالے سے مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں۔ اسی بنیاد پر اس دفعہ کی شق (ا) کو مرتب کیا گیا ہے۔

اور جہاں تک شق (ب) کی بات ہے تو اسلامی احکام کو لوگوں پر نافذ کرنے کا جو عام حکم اس آیت میں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ** "اور اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کیجئے" (المائدہ:48)۔ اس حکم کو شرع نے خاص کر دیا، یعنی اس کی تخصیص کر دی اور یہ کہا کہ ان کے عقیدے اور اُن احکامات میں جن کا تعلق ان کے عقیدے کے ساتھ ہے ان کو آزادی حاصل ہے۔ اسی طرح ان احکامات میں، جن کو وہ اپنا عقیدہ مانتے ہیں یا پھر وہ احکام جن پر رسول ﷺ نے ان

کو بر قرار رکھا، ان کو اسلام نے صریح نصوص کے ساتھ مستثنیٰ کر دیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ **لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ** "دین (عقیدے) کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں" (البقرہ:256)۔رسول ﷺ نے فرمایا:«**إِنَّهُ مَنْ كَانَ عَلَى يَهُودِيَّتِهِ أَوْ نَصْرَانِيَّتِهِ فَإِنَّهُ لاَ يُفْتَنُ عَنْهَا، وَعَلَيْهِ الجِزْيَةُ**» "جو اپنی یہودیت یا نصرانیت پر ہو اس کو زبردستی اپنے دین سے نہیں ہٹایا جائے گا بلکہ وہ جزیہ دیتا رہے گا"۔اس کو ابو عبید نے الاموال میں عروہؓ کے حوالے سے نقل کیا۔ پس جو بھی فعل عقائد کے باب سے ہو اگرچہ ہمارے ہاں وہ عقائد میں سے نہیں، اس میں ہم ان کو نہیں چھیڑیں گے بلکہ ان کو ان کے حال پر چھوڑیں گے۔ اسی طرح ہر وہ فعل جس پر رسول ﷺ نے اُن کو بر قرار رکھا جیسے شراب پینا یا ان کے شادی بیاہ کے معاملات، ہم ان سے کوئی اعراض نہیں کریں گے جب تک کہ وہ عام نظام کی حدود میں رہیں۔ یعنی اپنی خاص زندگی میں (یعنی گھروں میں) وہ شراب پی سکتے ہیں لیکن عام زندگی میں نہیں جہاں وہ مسلمانوں کے ساتھ ہوتے ہیں جیسے بازاروں میں۔

جہاں تک شق (ج) کا تعلق ہے تو اسلام نے مرتد کے لیے احکامات واضع کیے ہیں۔ ان احکامات میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ اگر وہ دوبارہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو قتل کیا جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «**مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ**» ''جو اپنے دین کو تبدیل کرے اس کو قتل کرو''، اس کو بخاری نے ابنِ عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ انسؓ کہتے ہیں کہ ''میں عمر کے پاس آیا تو انہوں نے فرمایا: اے انس، بکر بن وائل کے ان چھ آدمیوں کا کیا ہوا جو اسلام سے مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے تھے؟ انسؓ نے کہا: اے امیر المومنین وہ لوگ جنگ میں مارے گئے، تو عمرؓ نے انا للہ وان الیہ راجعون کہا۔ میں نے کہا: کیا قتل کے علاوہ ان کے لیے کوئی راستہ تھا؟ عمرؓ نے فرمایا: ہاں، میں ان کو اسلام کی دعوت دیتا، انکار پر جیل بھیج دیتا" (بیہقی)۔ یعنی یہاں تک کہ توبہ کرتے، اگر توبہ نہ کرتے تو ان کو قتل کیا جاتا۔ کیونکہ مرتد کے سامنے اسلام کی دعوت، توبہ کے اسلوب کے ساتھ رکھی جاتی ہے اگر وہ توبہ نہیں کرتا تو قتل کیا جاتا ہے، مرتد ہوتے ہی اسے قتل نہیں کیا جاتا۔ جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ: «**أَنَّ امْرَأَةً هِيَ أُمُّ مَرْوَانَ ارْتَدَّتْ، فَأَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ بِأَنْ يُعْرَضَ**

عَلَيْهَا الإِسْلاَمُ، فَإِنْ تَابَتْ، وَإِلاَّ قُتِلَتْ» "اُمِ مروان نام کی ایک عورت مرتد ہوگئی تو نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، اگر توبہ کرتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ قتل کی جائے گی"۔اس کو دار قُطنی اور بیہقی نے نقل کیا ہے۔ عام طور پر فقہاء جیسے ابن قدامہ نے 'المغنی' میں، ماوردی نے 'الحاوی الکبیر' میں اور 'الاحکام السلطانیہ' میں، ابو اسحاق شیرازی نے 'المذہب' میں، رافعی نے 'الشرح الکبیر' میں، بغوی نے 'التھذیب' میں، جبکہ ابن جوزی نے 'التحقیق' میں اسی حدیث سے استدلال کیا ہے،اور اس کو حسن قرار دیا ہے۔اور اس پر اسی طرح عمل کا لکھا ہے۔یعنی قتل سے قبل مرتد سے توبہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

یہ تو اس شخص کے حوالے سے تھا،جو خود مرتد ہوا ہے، اب رہی اس اولاد کی بات جو کہ مرتد کی اولاد ہے، یعنی جب ایک مسلمان مرتد ہوگیا اور اس کو قتل نہیں کیا گیا اور اپنے اسی دین پر قائم رہا جس کو مرتد ہونے کے بعد اختیار کیا تھا یعنی نصرانی، یہودی یا مشرک، پھر اِس حال میں اس کی اولاد ہوگئی تو وہ اولاد بھی نصرانی، یہودی یا مشرک ہی ہو گی۔ اب سوال ہے کہ ان اولاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا یعنی ان کے ساتھ مرتدوں کا معاملہ کیا جائے گا یا پھر ان کو جس دین پر پیدا ہوئے ہیں اسی پر سمجھا جائے گا؟اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اولاد جو کسی شخص کے مرتد ہونے سے قبل پیدا ہوئی وہ مسلمان ہی ہوں گے، ہاں اگر وہ بھی اپنے والدین کی پیروی میں مرتد ہوگئی تب مرتد ہی سمجھی جائے گی۔ اگر اولاد ارتداد کے بعد اس کی کافر یا مرتد بیوی سے ہوئی ہے تو وہ کفار کی اولاد ہے، اسے کفار ہی کہا جائے گا۔اس صورت میں اگر والدین یہودی یا نصرانی ہوں تو ان کے ساتھ بھی یہودیوں یا نصرانیوں یعنی اہلِ کتاب کا معاملہ کیا جائے گا اور اگر والدین مشرک ہوں تب اولاد کے ساتھ بھی مشرک کا معاملہ کیا جائے گا۔ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ **«أَنَّ ﷺ وَسَلَّمَ لَمَّا أَرَادَ قَتْلَ أَبِيكَ (عقبة بن أبي معيط) قَالَ مَنْ لِلصِّبْيَةِ قَالَ النَّارُ»** نبی کریم ﷺ نے جب عقبہ بن ابی معیط کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا بچوں (اولاد) کے لیے کیا ہے، فرمایا آگ" ۔اس کو ابو داؤد اور الحاکم نے روایت کیا ہے جبکہ ذَھبی نے اس کو صحیح قرار دے کر اس کی موافقت کی ہے، جبکہ دار قُطنی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں **«النَّارُ لَهُمْ وَلأَبِيهِمْ»** ان کے لیے اور ان کے باپ کے لیے آگ ہے"۔ صحیح بخاری

میں کتاب الجہاد کے باب 'اہل الدار' کے باب میں ہے کہ ابن عباسؓ نے صعب بن جثامہ سے روایت کی ہے کہ «**مَرَّ بِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِالأَبْوَاءِ - أَوْ بِوَدَّانَ - وَسُئِلَ عَنْ أَهْلِ الدَّارِ، يُبَيَّتُونَ مِنْ الْمُشْرِكِينَ فَيُصَابُ مِنْ نِسَائِهِمْ وَذَرَارِيِّهِمْ، قَالَ ﷺ: هُمْ مِنْهُمْ**». مقامِ ابواء یا بودان میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم میرے پاس سے گزرے تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے اہل الدار (کافروں کے بیوی بچوں) کے بارے میں سوال کیا گیا کہ مشرکین کی عورتیں اور اولاد جو مرتے ہیں، رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا وہ بھی انہی (کافروں) میں سے ہیں"۔ یعنی ہر وہ بچہ جو کفار ماں باپ سے پیدا ہوا وہ کافر ہی ہے، اس کا حکم بھی وہی ہے جو کفار کا ہے۔ یہی وجہ ہے جو لوگ اسلام سے مرتد ہو کر غیر اسلامی فرقے بن چکے ہیں جیسے دُروز، بہائی اور قادیانی، ان کے ساتھ مرتدوں والا معاملہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ لوگ بذاتِ خود مرتد نہیں ہوئے ہیں کہ ان کے ساتھ مرتد کا معاملہ کریں، بلکہ ان کے آباؤاجداد مرتد ہوئے تھے اور موجودہ لوگ اُن کافر ماں باپ کی اولاد ہیں تو ان کے ساتھ کافروں والا معاملہ کیا جائے گا اور ان پر کافر ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔ چونکہ ان لوگوں نے اہل کتاب کے ادیان میں سے کوئی دین اختیار نہیں کیا یعنی نصرانیت یا یہودیت کو، اس لیے ان کے ساتھ مشرکوں والا معاملہ کیا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم یا تو اہل کتاب ہوتے ہیں یا اہل کتاب کے علاوہ یعنی مشرکین، کوئی تیسرا راستہ نہیں یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے 'ہجر' کے مجوسیوں کے بارے میں فرمایا، جسے حسن بن محمد بن حنفیہ نے روایت کیا «**فَمَنْ أَسْلَمَ قُبِلَ مِنْهُ، وَمَنْ لَمْ يُسْلِمْ ضُرِبَتْ عَلَيْهِ الجِزْيَةُ، غَيْرَ نَاكِحِي نِسَائِهِمْ وِلاَ آكِلِي ذَبَائِحِهِمْ**» ان میں سے جو اسلام لے آئے قبول کیا جائے گا، اور جو اسلام نہ لائے اس پر جزیہ لگایا جائے گا، ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کیا جائے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا"۔ اس کو الحافظ نے الداریۃ میں عبد الرزاق اور ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے، یہ مرسل ہے اور اس کے اسناد عمدہ ہیں۔ ان لوگوں کی اولاد جو اسلام سے مرتد ہو کر نصرانی بن گئے تھے جیسا کہ لبنان میں شھاب خاندان ہے، ان کے آباؤاجداد اسلام سے مرتد ہو کر نصرانی بن گئے اور ان کی یہ اولاد نصرانیت پر ہیں، لہٰذا اِن کے ساتھ اہلِ کتاب والا معاملہ کیا جائے گا۔

شق (د،ھ) کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود و نصاریٰ کو ان کی شراب نوشی پر برقرار رکھا اسی طرح ان کو ان کی شادی اور طلاق کے معاملے میں بھی ان کو ان کے دین پر برقرار رکھا۔ آپ ﷺ کا 'اقرار' (برقرار رکھنا) عام دلیل کی تخصیص ہے۔ شادی اور طلاق کے حوالے سے ان کو برقرار رکھنا اس صورت میں تھا کہ میاں بیوی دونوں کافر ہوں۔ اگر میاں مسلمان اور بیوی نصرانی یا یہودی ہو تو پھر ان پر شرعی احکامات کو نافذ کیا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بیوی مسلمان ہو اور خاوند کافر کیونکہ یہ باطل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ** "اب تم انہیں کافروں کی طرف واپس نہ کرو، نہ یہ ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ ان کے لیے حلال ہیں" (الممتحنہ:10)۔ یوں مسلمان عورت کی شادی غیر مسلم مرد سے جائز نہیں اگر وہ شادی کریں تو یہ باطل ہو گی۔

شق (و): یہ تمام اسلامی احکامات کی تنفیذ کے حوالے سے ہے اور اس کی دلیل پہلے گزر چکی ہے کہ کفار جس طرح اصول کے مکلف ہیں اسی طرح فروع کے بھی مکلف ہیں، ان سے تمام اسلامی احکامات پر عمل کا مطالبہ ہے۔ یہ دلیل عام ہے ذمی اور غیر ذمی جو کوئی بھی اسلامی اقتدار کے ماتحت ہے وہ اس میں داخل ہے۔ وہ تمام کفار جو دار الاسلام میں داخل ہوتے ہیں چاہے ذمی ہے یا معاہد یا پھر مستامن، ان سب پر تمام اسلامی احکامات کو نافذ کیا جائے گا۔ سوائے عقائد یا جس کو وہ عقائد سمجھتے ہیں یا پھر جس فعل پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو برقرار رکھا۔ البتہ سفراء اور اس قسم کے دوسرے لوگ اس سے مستثناء ہیں ان پر عقوبات کے احکامات نافذ نہیں کئے جائیں گے اور ان کو ڈپلومیٹک تحفظ دیا جائے گا، کیونکہ احمد نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: **«جَاءَ ابْنُ النَّوَّاحَةِ وَابْنُ أُثَالٍ، رَسُولاَ مُسَيْلِمَةَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ ، فَقَالَ لَهُمَا: أَتَشْهَدَانِ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ؟ قَالاَ: نَشْهَدُ أَنَّ مُسَيْلِمَةَ رَسُولُ اللَّهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : آمَنْتُ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ، لَوْ كُنْتُ قَاتِلاً رَسُولاً لَقَتَلْتُكُمَا، قَالَ عَبْدُ اللَّهِ: قَالَ: فَمَضَتِ السُّنَّةُ أَنَّ الرُّسُلَ لاَ تُقْتَلُ»** مسیلمہ کذاب، کے دو ایلچی ابنِ نَواحہ اور ابن اُثال،

رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں سے پوچھا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟۔ ان دونوں نے کہا کہ ہم تو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتا ہوں، اگر میں کسی ایلچی کو قتل کرنے والا ہوتا تو تم دونوں کو قتل کرتا، عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد یہ سنت جاری ہوگئی کسی ایلچی کو قتل نہ کیا جائے"۔ اس کو احمد نے نقل کیا ہے اور ھیثمی نے اس کو حسن قرار دیا ہے، یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کفار کی طرف سے آنے والے ایلچی کو قتل کرنا جائز نہیں، تمام عقوبات بھی قتل کی طرح ہیں۔ تاہم یہ اس شخص کے لیے ہے جو واقعی سفیر ہو اور سفیروں کا کام کرتا ہو۔ جو شخص سفیر نہ ہو بلکہ کوئی قونصلر یا تجارتی نمائندہ ہو، تو اس کو کوئی سفارتی تحفظ حاصل نہ ہوگا کیونکہ وہ سفیر نہیں ہے۔ اس حوالے سے بین الاقوامی قواعد کو دیکھا جائے گا کیونکہ یہ ایک عام اصطلاح ہے اس کے لیے زمینی حقائق کو جاننا ضروری ہے، جو کہ تحقیق المناط میں آتا ہے، یعنی یہ دیکھنا کہ آیا کوئی شخص سفیر ہے یا نہیں۔

دفعہ نمبر 8: عربی زبان چونکہ اسلام کی زبان ہے، اس لیے ریاستی زبان صرف عربی ہی ہوگی۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ باوجود یہ کہ قرآن کریم کے مخاطب تمام انسان ہیں اور اللہ نے فرمایا ہے **وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ** "ہم نے تو اس قرآن میں لوگوں کے سمجھنے کے لیے ہر طرح سے تمام مثالیں بیان کر دیں" (الروم:58)، اللہ تعالیٰ نے اس کو عربی زبان میں نازل کیا اور اسکو عربی قرآن بنایا اور فرمایا **قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا** "عربی قرآن" (یوسف:2)، پھر فرمایا **بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ** "واضح عربی زبان میں" (الشعراء: 195)۔ یہی وجہ ہے کہ عربی زبان ہی تن تنہا اسلام کی زبان ہے، کیونکہ یہی قرآن کی زبان ہے اور قرآن رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے، اس کا اعجاز ان الفاظ کے ساتھ اس کی تعبیر میں ہے یعنی لفظ اور اسلوب دونوں عربی ہیں۔ اگرچہ قرآن کا اعجاز اس کے الفاظ اور معانی میں اس طرح ایک سا

تھ ہے کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا تاہم اس کے اعجاز سے مراد معانی کا اعجاز نہیں یعنی الفاظ کے جو معانی یا موضو عات ہیں وہ مراد نہیں کیونکہ یہ معانی اور موضوعات تو سنت میں بھی ہیں حالانکہ وہ معجزہ نہیں۔ قرآن کا اعجاز اس کے معنی میں اس طرح ہے کہ جو اس میں موجود الفاظ اور اسلوب میں تعبیر کیا گیا ہے۔یعنی یہ معجزہ عربی الفا ظ کا عربی اسلوب کے ساتھ اس کے معنی کی تعبیر میں ہے۔ یوں اللہ کا یہ ارشاد کہ: **وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ** ”اگر تمہیں کسی قوم کی خیانت کا ڈر ہو تو برابر کی حالت میں ان کا عہد نامہ توڑ دو“(الانفال: 58) لوگوں کے لیے ایک معجزہ ہے کہ وہ اس جیسی ایک اور آیت لانے سے عاجز ہیں، اس آیت کا اعجاز ان الفاظ اور اس اسلوب کے ذریعے، معنی کی اِس بہترین تعبیر میں ہے۔ یوں عربی الفاظ اور عربی اسلوب کے ذریعے جس معنی کو ادا کیا گیا ہے وہ معجزہ ہے۔ قرآن کا اعجاز اس کی عربیت پر منحصر ہے کیو نکہ یہ اعجاز کی اصل ہے اور اس کو لے کر چیلنج کیا گیا ہے کہ اس جیسی عربی لاؤ، یوں یہ عربی قرآن کا وہ بنیادی جزو ہے جو کبھی اس سے الگ نہیں ہو سکتا، اس کے بغیر قرآن قرآن نہیں رہے گا، اس لیے اس کا ترجمہ جائز نہیں کیو نکہ اس طرح قرآن اپنے نظم سے نکل جائے گا اور پھر اُسے قرآن نہیں کہا جا سکے گا بلکہ صرف تفسیر کہا جائے گا اور اگر تفسیر قرآن ہی کی طرح ہوتی تو جس وقت چیلنج کیا گیا تھا عرب اس کی مثال لانے سے عاجز نہ رہتے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ **قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا** ”عربی قرآن“ کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ عربی میں نہ ہو تو اس کو قرآن نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے الفاظ کے ذریعے ہم عبادت کرتے ہیں اور اس کے بغیر نماز ہو گی ہی نہیں کیونکہ اللہ تعا لیٰ نے فرمایا ہے: **فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ** ”لہٰذا قرآن پڑھو جتنا (پڑھنا) تمھارے لیے آسان ہو“(المزمل: 20) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«لاَ صَلاَةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»** ”اس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی“، یہ عبادہؓ سے مروی ایک متفق علیہ حدیث ہے۔یوں عربی زبان اسلام کا ایک بنیادی جزو ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: **وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ** ”اور میرے پاس یہ قرآن بطور وحی کے بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس قرآن کے ذریعے تم کو اور جس تک یہ قرآن پہنچے ان سب کو ڈراؤں“(الانعام:19)۔ اس سے مراد یہ ہے

کہ قرآن میں جو کچھ ہے اس کے ذریعے میں تم کو ڈراؤں، جس میں قرآن کے الفاظ اور اس کی تفسیر کے ذریعے ڈراناسب شامل ہیں، کیونکہ یہ سب قرآن کے ذریعے ڈرانا ہے۔ **فَاقْرَءُوْا** "پڑھو" اللہ تعالیٰ کے اس قول کے برخلاف، تفسیر اور ترجمے کو پڑھنا قرآن پڑھنا نہیں ہے کیونکہ کتاب پڑھنے کا مطلب کتاب کے الفاظ کو پڑھنا ہوتا ہے، نہ کہ ترجمہ پڑھنا یا تفسیر پڑھنا۔ کتاب کو پڑھنا ایسا نہیں جیسا کتاب سے ڈرانا، کیونکہ ڈرانا الفاظ سے بھی ہوتا ہے اور اس کے معانی اور تفسیر کے ذریعے بھی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی جانب سے (اللہ کی پکڑ سے) ڈرانے کے بارے میں بھی یہ فرمایا کہ یہ ڈرانا عربی میں ہو جیسا کہ ارشاد ہے: **نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ o عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ o بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ** "اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ آپ کے دل پر اُتارا ہے تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں، صاف (واضح) عربی زبان میں" (الشعراء:193-195)۔ اس سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں سورۃ الفاتحہ کو صرف عربی میں ہی پڑھا جاسکتا ہے اور یہ دلیل ان لوگوں کی اس رائے کو بھی رد کرتی ہے جو اللہ کے اس ارشاد کہ : **وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ** "میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے" (الانعام:19) سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جو عربی نہیں پڑھ سکتا وہ نماز میں سورۃ الفاتحہ کا ترجمہ پڑھ سکتا ہے۔ یہ تو تھا عربی زبان کے اسلام کے بنیادی جزو ہونے کے حوالے سے، اب رہی یہ بات کہ صرف عربی ہی ریاست کی زبان ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیصر و کسریٰ اور مقوقس کو خطوط لکھ کر ان کو اسلام کی دعوت دی اور یہ تمام خطوط عربی زبان میں لکھے گئے حالانکہ ان کے ترجمے کرنے کے تمام وسائل بھی دستیاب تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے قیصر و کسریٰ اور مقوقس کو ان کی زبانوں میں خطوط نہیں لکھے باوجود اس کے کہ وہ غیر عرب تھے اور یہ خطوط بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان ہی ریاست کی زبان ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے عمل سے واضح ہے۔ پھر تبلیغِ دین کی وجہ سے ان خطوط کے ترجمہ کی ضرورت بھی تھی، لیکن پھر بھی ترجمے نہیں کئے گئے، اور یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ ریاست صرف اور صرف عربی زبان میں لوگوں کو مخاطب کرے گی خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب۔ لہٰذا تمام غیر عرب مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ

وہ عربی سیکھیں۔ ریاست کے لئے جائز نہیں کہ وہ عربی کے علاوہ کسی زبان کو ریاستی زبان بنائے۔ امام شافعی نے اصول الفقہ پر اپنی مشہور کتاب "رسالہ" میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں پر عربی زبان سیکھنے کو فرض قرار دیا ہے کیونکہ ان کو قرآن کو سمجھنے اور پڑھنے اور اس کے ذریعے عبادت کا حکم دیا ہے اور یہ سب فرض ہے اور یہ بات بھی فرض ہے کہ ریاست کی زبان صرف عربی ہو۔ تاہم یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ عربی کی ریاست کی زبان ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ریاست عربی کے علاوہ کوئی بھی زبان بالکل استعمال نہیں کر سکتی، بلکہ عربی کے علاوہ کسی اور زبان کو استعمال کرنا ریاست کے لیے جائز ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر مخاطب کو سمجھایا جا سکے یا کوئی ضروری معلومات حاصل کی جا سکیں یا دوسرے ممالک میں دعوت و تبلیغ کے لیے کوئی زبان استعمال کی جائے وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی عربی اور سریانی زبان استعمال کیں۔ لہٰذا حکم یہ ہے کہ ریاستی (سرکاری) زبان عربی ہونی چاہیے تاہم ضرورت پڑنے پر کسی بھی زبان کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اب یہ سوال رہ گیا کہ اُن علاقوں میں جہاں اسلامی ریاست کی عملداری ہے کیا عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں بات چیت کرنا یا لکھنا پڑھنا جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں گفتگو اور لکھنا پڑھنا یا تو خود ریاست کے متعلق ہو گا یا رعایا کے ریاست کے ساتھ تعلق کے حوالے سے ہو گا یا پھر صرف رعایا سے متعلق یا رعایا کے افراد کے آپس کے تعلقات کے لیے ہو گا۔ اگر گفتگو اور لکھنا پڑھنا خود ریاست سے متعلق یا ریاست کے ساتھ تعلقات سے متعلق ہو تو عربی کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں استعمال کی جا سکتی یعنی ریاستی امور کے لیے ریاست کی زبان ہی استعمال کی جائے گی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے غیر عرب کو لکھے گئے خطوط کا، وسائل ہونے کے باوجود اور حقیقتاً انتہائی ضرورت ہونے کے باوجود، ترجمہ نہیں کروایا۔ اس لیے یہ اس بات کی دلیل ہے، کہ ریاستی امور، ریاست کے تعلقات یا ریاست سے متعلق کسی بھی چیز کے لیے صرف اور صرف عربی زبان کا استعمال واجب ہے۔

اس بنا پر ریاست کے تعلیمی پروگرام میں عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کو تدریسی زبان بنانے کی کوئی گنجائش نہیں، نہ ان غیر عرب اقوام کی زبانوں کی جو اسلامی ریاست کے زیر سایہ رہتی ہیں اور نہ ہی ان

اقوام کی زبانوں کے لیے کوئی گنجائش ہے جو اسلامی ریاست کے اختیار سے باہر ہیں۔ اسی طرح پرائیوٹ سکولوں کو بھی ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ ان کی تدریسی زبان عربی کے علاوہ ہو کیونکہ وہ ریاستی پروگرام کے پابند ہوں گے۔ یوں ہر اس چیز میں جس کا تعلق ریاست سے ہو یا اس کے تعلقات سے ہو یا رعایا کے اس کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے ہو یا پھر کسی بھی چیز میں جو ریاست سے متعلق ہو عربی زبان ہی لکھنے اور پڑھنے کی زبان ہو گی۔ ہاں اگر لکھنا پڑھنا یا بات چیت رعایا سے متعلق ہو یا رعایا کا ایک دوسرے سے تعلقات کے لیے ہو تب عربی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان استعمال کرنا جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے غیر عربی زبان سے عربی میں ترجمہ کرنے یا اس زبان کے سیکھنے کو مباح قرار دیا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غیر عربی زبان میں گفتگو اور لکھنا جائز ہے۔ زید بن ثابتؓ کی حدیث میں ہے کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهُ أَنْ يَتَعَلَّمَ كِتَابَ الْيَهُودِ حَتَّى كَتَبْتُ لِلنَّبِيِّ ﷺ كُتُبَهُ وَأَقْرَأْتُهُ كُتُبَهُمْ إِذَا كَتَبُوا إِلَيْهِ»** "نبی کریم ﷺ نے ان (زید) کو یہودیوں کی کتاب کو سیکھنے کا حکم دیا یہاں تک کہ میں نبی کریم ﷺ کے خطوط لکھنے لگا اور آپ کے خطوط کو پڑھ کر آپ ﷺ کو سناتا اس طرح یہودیوں کے خطوط کو جو وہ آپ ﷺ کو لکھتے، وہ بھی پڑھ کر آپ ﷺ کو سناتا" اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عربی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں لکھنا پڑھنا جائز ہے۔ صحابہؓ کے زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے جو عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بات چیت کرتے تھے، ان پر عربی سیکھنے کے لیے زبردستی نہیں کی گئی، بلکہ حکمران کے پاس ترجمان ہوا کرتا تھا۔ بخاری نے "حکمرانوں کے ترجمان" کے باب میں نقل کیا ہے کہ خارجہ بن زید بن ثابت نے زید بن ثابتؓ سے روایت کی ہے کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَهُ أَنْ يَتَعَلَّمَ كِتَابَ الْيَهُودِ حَتَّى كَتَبْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُتُبَهُ وَأَقْرَأْتُهُ كُتُبَهُمْ إِذَا كَتَبُوا إِلَيْهِ»** "نبی کریم ﷺ نے ان کو یہودیوں کی کتاب کو سیکھنے کا حکم دیا یہاں تک میں رسول اللہ ﷺ کے لیے خطوط لکھنے لگا اور یہودی جو خطوط آپ ﷺ کو لکھتے تھے وہ آپ ﷺ کو پڑھ کر سنانے لگا"۔ عمرؓ نے، علیؓ، عبد الرحمنؓ اور عثمانؓ کی موجودگی میں کہا "یہ عورت کیا کہہ رہی ہے"، عبد الرحمٰن بن حاطب نے

کہا کہ "یہ آپ کو اس شخص کے بارے میں بتا رہی ہے جس نے اس کے ساتھ یہ کام کیا"، اسی طرح ابو جمرہ کہتے ہیں کہ میں ابن عباسؓ اور لوگوں کے درمیان ترجمان کا کام کرتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث جس میں انھوں نے زید بن ثابتؓ کو یہودیوں کی کتاب سیکھنے کا حکم دیا اور عمرؓ کا اس عورت کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے جس کو حمل ہو گیا تھا اور عبد الرحمٰن بن حاطب کا اس عورت کی ترجمانی کرنا اور ابو جمرہ کا لوگوں کی باتیں ترجمہ کرکے ابنِ عباسؓ کو بتانا، اس سب کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ایسے لوگ تھے جو غیر عربی زبان بولتے تھے۔ یوں حدیث اور اجماع صحابہؓ کی بنا پر غیر عربی زبان میں بات چیت کرنا اور لکھنا پڑھنا مباح ہے۔ اس لیے ریاست بھی غیر عربی زبان میں کتابیں، اخبارات اور میگزین وغیرہ شائع کرنے کی اجازت دے گی اور اس کے لیے ریاست سے باقاعدہ اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ایک مباح کام ہے اسی طرح غیر عربی زبان میں ٹیلی ویژن چینل کھولنے کی بھی اجازت ہو گی اور اگر کوئی فرد یا کوئی پارٹی ایسا کرنا چاہے اس کو نہیں روکا جائے گا۔ البتہ سرکاری ٹی وی چینل اور ریڈیو صرف اور صرف عربی زبان میں ہوں گے کیونکہ ریاست سے متعلق ہر چیز عربی میں ہونا فرض ہے۔ لوگوں کے باہمی تعلقات میں غیر عربی زبان کا استعمال مباح ہے مگر اس مباح کے کسی حصے سے ضرر اور نقصان کا خطرہ پیدا ہو جائے تو صرف اس حصے کو ممنوع قرار دیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 9: اجتہاد فرضِ کفایہ ہے۔ ہر وہ مسلمان جس کے اندر اجتہاد کی شرائط پائی جائیں اس کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔

شریعت اسلامی نے شارع کے خطاب یعنی وہ نصوص جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف وحی کیں، سے شرعی احکامات کے استنباط کے لیے اجتہاد کرنے کا حکم دیا اور اس کو فرض قرار دیا۔ اجتہاد کا فرض ہونا کئی احادیث سے ثابت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: «إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ

«أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ» "اگر ایک حاکم نے اجتہاد کیا اور وہ اجتہاد درست ہو تو اس کے لئے دو اجر ہیں، اور اگر اجتہاد کیا لیکن غلطی کر بیٹھا تب بھی اس کے لیے ایک اجر ہے" یہ متفق علیہ حدیث عمرو بن العاص ؓ سے روایت ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«وَرَجُلٌ قَضَى لِلنَّاسِ عَلَى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ»** "جس شخص نے لوگوں کے فیصلے جہالت سے (بغیر علم کے) کئے وہ آگ میں ہوگا" اس کو اصحابِ سنن، حاکم اور طبرانی نے، صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے بڑی تاکید سے یہ واضح ہو گیا کہ فیصلہ کرنے والے (قاضی) کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کیا فیصلہ دے رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابنِ مسعود ؓ سے فرمایا **«اقْضِ بِالْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ إِذَا وَجَدْتَهُمَا، فَإِذَا لَمْ تَجِدِ الحُكْمَ فِيهِمَا فَاجْتَهِدْ رَأْيَكَ»** "اگر (کسی مسئلے کا) حکم قرآن وحدیث میں تمہیں ملے تو ان کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر قرآن وحدیث میں نہ ملے تو اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کرو" اس کو الآمدی نے الاحکام میں اور الرازی نے المحصول میں ذکر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے معاذؓ اور ابو موسیٰ الاشعریؓ کو ذمہ داری دے کر یمن روانہ کرتے وقت ان سے فرمایا **«بِمَ تَقْضِيَانِ ؟ فَقَالاَ: إِنْ لَمْ نَجِدِ الْحُكْمَ فِي الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ قِسْنَا الأَمْرَ بِالأَمْرِ، فَمَا كَانَ أَقْرَبَ إِلَى الحَقِّ عَمِلْنَا بِهَ»** "تم کس طرح فیصلے کرو گے؟ انہوں نے کہا: اگر ہمیں کتاب اور سنت میں ایک حکم نہ ملا تو ہم دو معاملات کے درمیان قیاس کریں گے اور جو حق کے زیادہ قریب ہوگا اس پر عمل کریں گے" الآمدی نے اس کو الاحکام میں جبکہ ابو حسین نے المعتمد میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ان دونوں کا یہ قیاس کرنا ہی حکم کے استنباط کے لیے اجتہاد کرنا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی تائید کی۔ رسول اللہ ﷺ سے اس حوالے سے ایک اور روایت بھی ہے کہ جب آپ ﷺ نے معاذؓ کو والی (گورنر) بنا کر یمن روانہ فرمایا تو معاذؓ سے پوچھا: "تم کیسے فیصلہ کرو گے؟ معاذ نے کہا: کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، فرمایا اگر کتاب اللہ میں موجود نہ ہو؟ معاذؓ نے کہا: رسول اللہ ﷺ کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ فرمایا: اگر رسول اللہ ﷺ کی سنت میں بھی نہ ملے؟ معاذؓ نے کہا: اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے رسول کے ایلچی کو اس بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہو"، اس کو احمد، ترمذی، دارمی اور ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ جبکہ حافظ ابن کثیر بصروی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن اور مشہور ہے اور اس پر آئمہ اسلام نے اعتماد کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی جانب سے اجتہاد پر معاذؓ کی تصدیق کرنا اسکے حق میں واضح ثبوت ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ احکام کی معرفت کا دارومدار اجتہاد پر ہے اور بغیر اجتہاد کے احکام کی معرفت اورادراک ممکن نہیں، یوں اجتہاد فرض ہے، کیونکہ شرعی قاعدہ ہے۔ "جس چیز کے بغیر کوئی فرض ادانہ ہو، تو وہ چیز بھی فرض ہو جاتی ہے"۔

احکام کا استنباط اصلاً مجتہدین کا کام ہے۔ کیونکہ ایک مسئلے میں اللہ کے حکم کی معرفت اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اصول فقہ کے علماء نے اجتہاد کو مسلمانوں پر فرض کفایہ قرار دیا ہے یعنی کسی بھی زمانے کا بغیر مجتہد کے ہونا جائز نہیں ہے اور اگر سب نے اجتہاد کو ترک کرنے پر اتفاق کیا تو سب گنہگار ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی معرفت کا راستہ صرف اجتہاد ہے اور کسی بھی زمانے کے مجتہد سے خالی ہونے سے شریعت معطل ہو سکتی ہے جو کہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔ نصوص شرعیہ نے اجتہاد کو مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے کیونکہ یہ نصوص شرعیہ یعنی کتاب وسنت عمومی طرز میں آئی ہیں نہ کہ تفصیلی طرز میں نیتجتاً یہ بنی نوع انسان کی ہر حالت اور ہر صورت حال پر منطبق ہوتی ہیں۔ ان نصوص کو سمجھنے کے لیے، ان میں موجود اللہ تعالیٰ کے حکم کو معلوم کرنے کے لیے اور ہر رونما ہونے والے واقعے کے حکم شرعی کو معلوم کرنے کی لیے بھرپور کوشش (اجتہاد) کی ضرورت ہے اور یہ اجتہاد کوئی ناممکن یا انتہائی درجے کا مشکل کام نہیں، بلکہ یہ احکام شرعیہ کو معلوم کرنے کے لیے اپنے گمان کے مطابق حتی الوسع کوشش ہے یعنی مقدور بھر کوشش کر کے نصوص شرعیہ کو سمجھنا اور یہ ہر اس شخص کے لیے ممکن ہے جس کے اندر یہ صلاحیت ہو۔ ابتدائی دور کے مسلمانوں کے لیے اجتہاد ایک طبعی اور ظاہری بات تھی، اس کے لیے کسی قسم کی شرائط نہیں تھیں، تاہم جب سے عربی زبان میں آنے والی کمزوری کے ذریعے لوگوں کی دین کی سمجھ میں کمی آئی، تب سے مجتہد کے لیے ان سمعی دلائل کی

معرفت ضروری ہو گئی جن سے احکام اور قواعد کو استنباط کیا جاتا ہے، اسی طرح اس کے لیے ان عربی اصطلاحات کی پہچان ضروری ہے جو عربی زبان میں عام طور پر یا فصاحت اور بلاغت سے استعمال ہوتی تھی۔ ان دو شرطوں کے علاوہ اجتہاد کے لیے کوئی شرط نہیں۔ پس، اجتہاد مسلمانوں پر فرض کفایہ ہونے کے ساتھ ساتھ تمام مسلمانوں کے لیے ایک ممکن اور قابل عمل کام ہے۔ یہ سب اس دفعہ کی دلائل تھے۔

دفعہ نمبر 10: تمام مسلمان اسلام کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائیں گے، اسلام میں کوئی مخصوص رجالِ دین (مذہبی طبقہ) نہیں ہوتے، ریاست پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندر اس قسم کا کوئی رجحان محسوس کریں تو اس کو روکیں۔

تمام مجتہدین اگرچہ علماء ہوتے ہیں لیکن یہ بات ضروری نہیں کہ ہر عالم مجتہد بھی ہو۔ کیونکہ عالم کبھی مجتہد ہوتا ہے اور کبھی مقلد۔ مسلمان جب عمل کرنے کے لیے کسی حکم شرعی کو اخذ کرتا ہے تو اس معاملے کو دیکھا جائے گا: اگر اُس نے یہ حکم کسی مجتہد سے لیا ہے تو یہ اس مجتہد کا مقلد ہو گا۔ اگر اُس نے اِس حکم کو کسی غیر مجتہد سے سمجھا ہو تو وہ صرف ایک حکم کو اِس شخص سے سمجھ رہا ہے لیکن اس کا مقلد نہیں ہے۔ جس مسلمان نے کوئی حکم سیکھا یعنی اس کا علم حاصل کیا خواہ کسی مجتہد سے ہو یا کسی غیر مجتہد سے تو وہ اس حکم کا عالم ہے، یہ علماء خواہ مجتہد ہوں یا غیر مجتہد رجالِ دین نہیں کیونکہ یہ کسی چیز کو حلال یا حرام نہیں بنا سکتے، یہ علماء بھی اسلام کے احکامات کے حوالے سے باقی تمام مسلمانوں کی طرح ہیں۔ اسلامی احکام میں ان کو کسی قسم کا امتیاز حاصل نہیں، علم، اجتہاد اور احترام میں وہ کتنے ہی بڑے مرتبے پر فائز کیوں نہ ہوں وہ کسی حرام کو اپنے لیے یا دوسرے کے لیے مباح نہیں کر سکتے اور نہ ہی جو عمل دوسروں پر فرض ہے وہ ان کے لیے مندوب ہو سکتا ہے، بلکہ وہ بڑے سے بڑے عالم ہو کر بھی مسلم امت کے افراد میں سے ایک فرد ہیں۔ یوں رجال دین کا جو تصور نصرانیت میں ہے اسلام میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ یوں رجال دین کا یہ تصور نصاریٰ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ ان کے ہاں رجالِ دین حلال

وحرام کا فیصلہ کرتے ہیں (یعنی کسی چیز کو حرام یا حلال کرسکتے ہیں)۔ پھر یہ لفظ (رجال دین) اسی نصرانی مفہوم کے ساتھ ایک مسلمان عالمِ دین کے لیے اسلام کے اندر داخل کر دیا گیا، حالانکہ مسلمان علماء کسی چیز کو حلال اور حرام نہیں کرسکتے اس لیے مسلمان علماء پر اس اصطلاح (رجال دین) کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہود و نصاریٰ کی تقلید کی حرمت کے حوالے سے صریح احادیث موجود ہیں۔ ابو سعید خدریؓ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: «**لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ، حَتَّى لَوْ دَخَلُوا فِي جُحْرِ ضَبٍّ لَاتَّبَعْتُمُوهُمْ، قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، آلْيَهُودَ وَالنَّصَارَى؟ قَالَ: فَمَنْ**» ''تم ضرور اپنے سے پہلے والے لوگوں کی پیروی کروگے اور ان کے نقش قدم پر چلوگے حتی کہ اگر وہ گوہ کے بل میں داخل ہوئے تو تم بھی ایسا ہی کروگے، ہم نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ کیا یہود و نصاریٰ کی پیروی؟ فرمایا: تو اور کس کی'' یہ متفق علیہ حدیث ہے اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ یہ حدیث 'نہی' (منع) کے لیے ہے، کیونکہ یہود و نصاریٰ کی تقلید ممنوع ہے، اس لیے یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں کفر طریقہ پر وان دیا جائے؟ کسی مسلمان عالم کو رجال دین کہنا نصاریٰ کی تقلید ہے کیونکہ وہ اپنے علماء کو رجال دین کہتے ہیں اس لیے یہ کفریہ مفہوم کسی مسلمان عالم دین کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا، یوں اُن کی تقلید کی وجہ سے یہ ممنوع ہے اور اس مفہوم کو اسلام میں منتقل کرنے کے ممنوع ہونے کی وجہ سے بھی یہ بالکل ممنوع ہے، اور کسی مسلمان عالم دین کو رجال دین کہنا کسی بھی طرح صحیح نہیں۔ کسی عالم دین کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ اس نصرانی مفہوم میں اپنے آپ کو رجال دین سمجھے، اگر ایسا شخص پایا گیا جو اپنے آپ کو رجال دین کہتا ہے تو اس کو منع کیا جائے گا اور اس کو سزا دی جائے گی کیونکہ اس نے حرام کام کیا حالانکہ رسول اللہ ﷺ بھی اپنے آپ کو لباس اور شکل وصورت کے لحاظ سے اپنے صحابہؓ سے ممتاز نہیں کرتے تھے، چنانچہ بخاری میں انس بن مالکؓ سے روایت ہے: «**بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ، دَخَلَ رَجُلٌ عَلَى جَمَلٍ فَأَنَاخَهُ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهُ، ثُمَّ قَالَ لَهُمْ: أَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ؟ - وَالنَّبِيُّ ﷺ مُتَّكِئٌ بَيْنَ ظَهْرَانَيْهِمْ - فَقُلْنَا: هَذَا الرَّجُلُ الأَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ. فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ: يَا ابْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ قَدْ أَجَبْتُكَ ...**» ''ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہو

ئے تھے کہ ایک شخص اونٹ پر سوار ہو کر آیا اور اونٹ کو بیٹھا کر رسی باندھ دی، پھر کہا تم میں سے کون محمد ہے؟ نبی کریم ﷺ لوگوں کے درمیان ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا: یہ گورے (سفید) آدمی جو ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس آدمی نے آپ ﷺ سے کہا: اے عبد المطلب کے بیٹے، نبی کریم ﷺ نے اس سے فرمایا: میں نے تم کو جواب دے دیا...' ان دلائل کی بنیاد پر اس دفعہ کو وضع کیا گیا ہے۔

دفعہ نمبر 11: اسلامی دعوت کا علمبر دار بننا ہی ریاست کا اصل کام ہے۔

یہ دفعہ اس لیے وضع کی گئی ہے کہ اسلامی دعوت کا علمبر دار بننا جس طرح مسلمانوں پر فرض ہے اسی طرح یہ اسلامی ریاست پر بھی فرض ہے۔ دعوت کا علمبر دار بننا اگرچہ تعلقات کے حوالے سے شرع کی تنفیذ کا جزو اور اسلام کے احکامات میں ایک حکم ہے اور ریاست پر بھی اس کا ویسے ہی اطلاق ہوتا ہے جس طرح فرد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، تاہم ریاست کے لیے اسلامی دعوت کا علمبر دار بننا یہ ہے کہ یہی مقصد دوسری ریاستوں کے ساتھ اس کی تعلقات کی بنیاد ہو یعنی ریاست کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہو کیونکہ ریاست کا حقیقی کام ہی اسلامی دعوت کا علمبر دار بننا ہے۔ اسلامی دعوت کے علمبر دار ہونے کی فرضیت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ "اور میرے پاس یہ قرآن بطور وحی کے بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس قرآن کے ذریعہ سے تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو ڈراؤں" (الانعام:19)۔ یہ ڈرانا تمہارے لیے بھی ہے اور ان کے لیے بھی جن کو تم اس قرآن کے ذریعے تبلیغ کرتے ہو۔ یعنی اس قرآن کے ذریعے صرف تم کو نہیں ڈرایا گیا ہے بلکہ تم کو بھی اور ان لوگوں جن کو تم اس قرآن کے ذریعے ڈراتے ہو یعنی تم اس کے ذریعے تبلیغ کرتے ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«نَضَّرَ اللَّهُ عَبْداً سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا، فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرِ فَقِيهٍ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ»** "اور اللہ اس بندے کو تر و تازہ رکھے جو میری بات (حدیث) سنتا ہے اس کو یاد کرتا ہے پھر اسے سمجھتا ہے اور اس کو دوسروں تک پہنچاتا ہے، ممکن ہے کہ پہنچانے والا شخص اپنے سے بہتر فقیہ کو یہ

حدیث پہنچا رہا ہو"، یہ مسند الشافعی میں عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے **وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ** "تم میں سے ایک جماعت ایسی (ضرور) ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے" (آل عمران:104) یہاں خیر سے مراد اسلام ہے۔ ارشادِ باری ہے: **وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ** "اس شخص سے زیادہ کس کی بات اچھی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلاتا ہے"(فصلت:33) یعنی اللہ کے دین کی طرف بلاتا ہے۔ یہ تمام نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دعوت کا بیڑہ اٹھانا فرض ہے اور یہ فرضیت عام ہے مسلمان اور ریاست دونوں اس میں شامل ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ اسلامی دعوت کا علمبردار بننا ہی ریاست کا اصلی کام ہے تو اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا قول و فعل ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ: «**أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لا إِلَهَ إِلاَّ اللَّهُ وَيُؤْمِنُوا بِي وَبِمَا جِئْتُ بِهِ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلاَّ بِحَقِّهَا، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ**» "مجھے اس وقت تک لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت نہ دیں اور مجھ پر اور وہ جو میں لے کر آیا ہوں اس پر ایمان نہ لائیں، اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں، اگر وہ یہ کام کریں تب وہ اپنی جان اور مال کو مجھ سے محفوظ کریں گے، سوائے اُس کے جو اسلام کی جانب سے ان پر عائد ہوتا ہے، اور اس کا حساب اللہ پر ہے"۔ ابنِ عمرؓ کی یہ روایت متفق علیہ ہے اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں، بخاری نے عروہ بن جعد سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «**الْخَيْلُ مَعْقُودٌ فِي نَوَاصِيهَا الْخَيْرُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ**» "گھوڑے کی پیشانی پر خیر قیامت کے دن تک لکھ دی گئی ہے" یہاں گھوڑے سے مراد جہاد کی فرضیت کی دلیل ہے کہ جہاد ہر نیک اور بدکار امیر کے تحت ہو سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان ہو۔ بخاری نے بھی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جہاد فاجر اور نیک ہر امیر کے تحت دائمی طور پر جاری رہے گا اور اس کے لیے ایک خاص باب مقرر کیا ہے جس کا عنوان ہی یہ ہے کہ جہاد فاجر امیر یا نیک امیر کے تحت جاری رہے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: "گھوڑے کی پیشانی پر خیر قیامت کے دن تک کے لیے لکھ دیا گیا ہے"۔ بخاری کی طرح امام احمد نے بھی اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ سعید بن منصور نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «**وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِي اللَّهُ إِلَى أَنْ**

يُقَاتِلَ آخِرُ أُمَّتِي الدَّجَّالَ، لا يُبْطِلُهُ جَوْرُ جَائِرٍ وَلا عَدْلُ عَادِلٍ» ''جب اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا جہاد اس وقت سے لیکر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک میری امت کا آخری حصہ دجال سے لڑے گا، کسی ظالم کا ظلم نہ کسی عادل کا عدل جہاد کو ختم کر سکتا ہے'' اس حدیث کو ابو داؤد نے بھی نقل کیا ہے جبکہ منذری اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو اس وقت تک قتال کرنے کا حکم کہ جب تک لوگ **لا الہ اللہ محمد رسول اللہ** کا اقرار نہ کر لیں، کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی دعوت کا علمبر دار بنناریاست پر فرض ہے اور جہاد ہی دعوت کی یہ علمبر داری ہے اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک رسول اللہ ﷺ کی امت کا آخری حصہ دجال سے لڑے گا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جہاد ریاست کا وہ فرض منصبی ہے جو کسی بھی حالت میں منقطع نہیں ہو تا یوں یہ بات واضح ہو گئی کہ دعوت کا علمبر دار بننا ایک دائمی عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا اور یہی بنیادی عمل ہے جس کی ریاست ہر حال میں پابندی کرے گی۔ پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں اسلامی ریاست قائم کرنے کے بعد آخری دم تک جہاد کرتے رہے اور جہاد ہی آپ ﷺ کا اصلی عمل رہا۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین آئے ان کا اصلی عمل بھی دائمی طور پر جہاد ہی رہا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب آپ ﷺ کے صحابہ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہ نے ریاست کی باگ ڈور سنبھالی تب ریاست کا اصلی اور اولین کام جہاد ہی رہا، یوں سنت اور اجماع صحابہؓ سے یہ ثابت ہو گیا کہ اسلامی دعوت کا علمبر دار بننا ہی ریاست کا اصلی اور بنیادی کام ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا اس وقت سے لیکر اس دارِ فانی سے کوچ کرتے وقت تک آپ ﷺ اسلام کی دعوت کی تبلیغ کرتے رہے۔ مدینہ میں آپ ﷺ ریاست کے سربراہ تھے اور جونہی مدینہ میں ریاست قائم ہو گئی آپ ﷺ نے دعوت کو ہی خارجہ تعلقات کے لیے بنیاد بنایا اور اسی کو ریاست کا اصلی کام قرار دیا۔ آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ اور اسلامی دعوت کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے غزوات، سرایاء اور معاہدات کئے۔ جب آپ ﷺ نے محسوس فرمایا کہ اب ریاست طاقتور ہو گئی ہے تب آپ ﷺ نے عالمی سطح پر اسلامی دعوت کو پہنچانا شروع کر دیا اور اس

مقصد کے لیے بیک وقت بارہ بادشاہوں کے پاس بارہ ایلچی روانہ فرمائے اور ان کو اسلام کی دعوت دی۔ ان میں سے روم وفارس کے بادشاہ قیصر وکسریٰ بھی تھے، مسلم نے انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے کہ: «أَنَّ نَبِيَّ اللَّهِ ﷺ كَتَبَ إِلَى كِسْرَى وَإِلَى قَيْصَرَ وَإِلَى النَّجَاشِيِّ وَإِلَى كُلِّ جَبَّارٍ يَدْعُوهُمْ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى» "نبی ﷺ نے کسریٰ، قیصر، نجاشی اور ہر جابر کو خط لکھ کر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا"۔ جب آپ ﷺ جزیرہ عرب میں ریاست کی طاقت سے مطمئن ہو گئے اور دیکھا کہ عرب پر دعوت کا اثر ہو گیا ہے اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو آپ ﷺ غزوہ روم کی طرف متوجہ ہوئے یوں معرکہ مؤتہ پھر معرکہ تبوک برپا ہوئے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی دعوت کا علمبردار بننا ریاست پر فرض ہے اور یہ ہی ریاست کا اصلی کام ہے۔

دفعہ نمبر 12: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، اجماع صحابہؓ اور قیاس ہی شرعی احکامات کے لیے معتبر ادِلّہ ہیں۔

اس دفعہ کا ہر گز یہ معنی نہیں کہ ریاست اجتہاد کے لیے طریقہ کی تبنی کرے گی، بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ریاست احکام کی تبنی کے لیے ایک مخصوص طریقہ استعمال کرے گی، کیونکہ کچھ احکامات کی تبنی ریاست پر فرض ہے جبکہ کچھ کی تبنی اس کے لیے صرف جائز ہے۔ پھر یہ تبنی اگر دو متضاد طریقوں سے ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جس اساس پر تبنی ہوئی ہے اس میں ہی تناقض ہے اسی لیے ریاست احکام کی تبنی کے لیے ایک متعین طریقے کو استعمال کرے گی۔ احکامات کی تبنی کے اس طریقے کی تبنی کے تین اسباب ہیں:

پہلا سبب: وہ حکم جس کے مطابق ایک مسلمان کو چلنا ہے وہ ایک شرعی حکم ہے نہ کہ کوئی عقلی حکم، یعنی یہ کسی مسئلے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، کسی انسان کا بنایا ہوا حکم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس دلیل سے اس حکم کو استنباط کیا گیا ہے وہ دلیل لازمی طور پر وحی ہونی چاہیے۔

دوسرا سبب: جس دلیل سے اس حکم کو مستنبط کیا گیا ہے اس کے وحی ہونے کا ثبوت قطعی ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں دلیل کا وحی ہونا ظنی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا قطعی ہونا لازمی ہے کیونکہ یہ فروع میں سے نہیں بلکہ اصول میں سے ہے؛ اس میں ظن کافی نہیں کیونکہ یہ عقائد کے باب میں سے ہے نہ کہ احکامِ شرعیہ کے باب میں سے۔ یہ اس لیے کہ حکم کو استنباط کرنے کی دلیل کے لیے وحی ہونا لازمی ہے صرف دلیل ہونا کافی نہیں۔ اس وجہ سے یہ ثبوت ضروری ہے کہ یہ دلیل وحی ہے۔ پھر اس بات کا ثبوت کہ یہ وحی ہے یہ عقیدہ سے متعلق ہے حکم شرعی میں سے نہیں۔ یوں دلیل کا ایسا ہونا لازمی ہے کہ وہ قطعی ہو یعنی وحی ہو کیونکہ عقائد کو صرف یقین کی بنیاد پر ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا سبب: یہ بات قطعی ہے کہ زندگی میں انسان کا رویہ زندگی کے بارے میں اس کے تصورات کے مطابق ہوتا ہے، اگرچہ زندگی کے بارے میں نقطہ نظر کی اساس عقیدہ ہے، تاہم یہ نقطہ نظر ان تصورات، پیمانوں (معیارات) اور اعتقادات کے مجموعے سے بنتا ہے جو امت میں پائے جاتے ہیں، پھر یہ افکار جو تصورات، پیمانوں (معیارات) اور اعتقادات کے مجموعے کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں سب کے سب عقائد نہیں ہوتے بلکہ ان میں سے کچھ عقائد اور کچھ احکام شرعیہ ہوتے ہیں۔ چونکہ احکام صرف غلبۂ ظن کی بنا پر مستنبط کئے جاتے ہیں، چنانچہ اس بات کی تاکید نہ کرنے کی صورت میں کہ احکام وحی کے ذریعے آئے ہیں یہ خطرہ ہے کہ امت کے اندر غیر اسلامی افکار جنم لیں گے، کیونکہ جن اخذ کردہ احکامات کی اصل وحی نہ ہو تو وہ امت میں غیر اسلامی افکار کو پروان دے سکتے ہیں، یہ احکامات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے بارے میں امت کی نقطہ نظر پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پھر نتیجے کے طور پر امت کے رویے کو بھی متاثر کر سکتے ہیں۔ اس وجہ سے اس بات کی

تاکید لازمی ہے کہ جن دلائل سے ان احکام کو استنباط کیا گیا ہے، جن کو ریاست کی جانب سے نافذ کیا جائے گا ،ان ادِلّہ کا وحی ہونا یقینی ہو۔

ان تین اسباب کی بناپر اس طریقے کی تبنی ضروری ہے جس کے مطابق احکام شرعیہ کی تبنی کی جائے۔ رہی یہ بات کہ یہ ادِلَّہ شرعیہ چار ہی کیوں ہیں ؟ تواس کا جو اب یہ ہے کہ تحقیق اور چھان بین (استقراء)کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادِلَّہ چار ہی ہو سکتے ہیں ۔ جب ہم نے ان ادلہ شرعیہ کی چھان بین(استقراء) کی جو قطعی دلیل سے ثابت ہیں اور وحی ہیں تو ہمیں ان چار کے علاوہ ایسے کوئی ادلہ بالکل نہیں ملے۔

قرآن کے مِن جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے الفاظ اور معنی قطعی دلیل کے مطابق وحی ہیں۔ قرآن کا اعجاز اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے انسانوں کا نہیں، یہ قطعی دلیل قائم و دائم ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ کا کلام ہونے کی یہ قطعی دلیل اس کے اعجاز سے ثابت ہے، قرآن کا اعجاز اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ وحی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ پر نازل کی۔ ارشاد باری ہے : **وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ o نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ o عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ** ”اور یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔ آپ ﷺ کے دل پر اتارا ہے تاکہ آپ ﷺ آگاہ کردینے والوں میں سے ہو جائیں “(الشعراء: 194-192)،اور فرمایا: **وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ** ”اور یہ قرآن میرے پاس بطور وحی بھیجا گیا“ (الانعام:19)، پھر فرمایا **قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ** ”کہہ دیجئے ! کہ میں تو تمھیں اللہ کی وحی کے ذریعے آگاہ کر رہا ہوں “ (الانبیاء:45)،اور فرمایا **مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى** ” ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لیے نہیں اتارا کہ آپ مشقت میں پڑجائیں“(طہٰ:2)،اور فرمایا: **وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ** ”ہم نے آپ پر قرآن کو نازل کیا“ (النمل:6)،اور ارشاد ہوا: **اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا** ”یقیناً ہم ہی نے آپ پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے“ (الانسان:23)، پھر فرمایا **اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا** ”ہم نے

آپ کی طرف عربی قرآن کی وحی کی ہے" (الشوریٰ:7) یہ تمام ادلہ قطعی ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ قرآن وحی کے ذریعے اللہ کی طرف سے آیا۔

سنت کی جہاں تک بات ہے، تو وہ بھی معنی کے لحاظ سے وحی کے ذریعے ہی اللہ کی طرف سے آئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے الفاظ میں اس وحی کی تعبیر کی ہے، اس کے حوالے سے قرآن کی صریح آیات موجود ہیں۔ ارشاد باری ہے: **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى O اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى** "اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں، ان کا بولنا تو سراسر وحی ہے جو اتاری جاتی ہے" (النجم 4-3) اور فرمایا: **اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ** "یقیناہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی کی ہے جیسے کہ نوح اور ان کے بعد والے نبیوں کی طرف کی" (النساء: 163) پھر فرمایا **اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ** "میں تو صرف جو کچھ میرے پاس وحی آتی ہے اس کی اتباع کرتا ہوں" (الانعام : 50) اور فرمایا: **قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ** "آپ فرما دیجئے کہ میں اُس کی اتباع کرتا ہوں جو مجھے وحی کی جاتی ہے" (الاعراف:203) اور فرمایا **قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ** "کہہ دیجئے! میں تو تمہیں اللہ کی وحی کے ذریعے ڈراتا ہوں" (الانبیاء : 45) پھر فرمایا **وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا** "اور تمہیں جو کچھ رسول دیں اسے لے لو، اور جس سے روکیں رک جاؤ" (الحشر:7)۔

یہ تمام دلائل نہایت ہی واضح ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر ارشاد وحی ہے اور اللہ تعالیٰ قرآن میں انتہائی صراحت کے ساتھ ہمیں حکم دیتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جس کا حکم دیا ہے اس کو اختیار کریں اور جس کام سے منع فرمایا ہے اس سے باز رہیں اور یہ حکم عام ہے۔ یوں سنت کے وحی ہونے کی دلیل قطعی ہے کیونکہ یہ قرآن کی ایسی نصوص سے ثابت ہے جو ثبوت اور معنی کے اعتبار سے قطعی (قطعی الثبوت، قطعی الدلالۃ) ہیں۔

جہاں تک اجماعِ صحابہ رضوان اللہ علیہم کا تعلق ہے تو یہ بھی حکم شرعی ہے۔ اجماع صحابہ کا مطلب ہے کہ صحابہؓ کا اس بات پر اجماع کہ فلاں حکم شرعی ہے یا اس بات پر اجماع کہ فلاں معاملے میں حکم یہ ہے۔ جب انہوں نے کسی حکم کے بارے میں اجماع کیا کہ یہ حکم شرعی ہے تب ان کا یہ اجماع شرعی دلیل ہو گا۔ اس کی دلیل میں دو امور ہیں: پہلی بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن کی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ نصوص میں ان کی تعریف کی ہے۔ ارشاد ہے: **وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ** "اور ایمان لانے میں سبقت کرنے والے یعنی مہاجرین اور انصار اور جو لوگ احسن طور پر ان کے پیرو ہیں، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ رہیں گے یہ بڑی کامیابی ہے" (التوبۃ: 100)۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے مہاجرین و انصار اور جو بھی احسان کے ساتھ ان کی پیروی کریں، کی تعریف کرنا، صحابہ کرام کی تعریف کرنا ہے کہ جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ہجرت اور آپ ﷺ کی نصرت کی، کیونکہ یہی (مہاجرین و انصار) صحابہ ہیں اور آیت کا مدلول (مصداق) ان تک محدود ہے۔ یہ ان کی مجموعی طور پر تعریف ہے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ جن کی ایسی تعریف کر دے تو یہ ان لوگوں کے سچے ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے انہی صحابہؓ سے اپنا دین لیا ہے، انہوں نے ہی اس بات کو نقل کیا کہ یہ بعینہٖ وہی قرآن ہے جو سیدنا محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ کسی حکم پر ان کے اجماع میں ذرا بھی خلل کا مطلب قرآن میں خلل ہے یعنی اس دین میں خلل ہے جو ہم نے ان سے حاصل کیا ہے اور یہ شرعی طور پر ناممکن ہے۔ اگرچہ یہ ممکن اور جائز ہے کہ صحابہؓ کے اجماع میں کوئی غلطی ہو کیونکہ صحابہ انسان ہیں لیکن شرعاً یہ محال ہے کہ وہ کسی غلط حکم پر اجماع کریں کیونکہ اگر یہ ممکن ہوتا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ دین میں خلل ممکن ہے یعنی اس بات میں خلل ممکن ہے کہ یہ قرآن وہی ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہوا، اور یہ شرعاً محال اور ناممکن ہے۔ یوں ان کے لیے کسی غلط حکم پر اجماع ناممکن اور محال ہے اور یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اجماع صحابہؓ شرعی دلیل ہے۔ پھر یہ بات ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: **اِنَّا**

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ "ہم نے ہی اس قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"(الحجر:9)۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اور صحابہؓ نے اس قرآن کو نقل کیا اور انہوں نے ہی اس کو محفوظ بھی رکھا اور یہ قرآن کو نقل کرنے اور اس کو جمع کرنے میں ان کے اجماع کی سچائی اور صداقت کی دلیل ہے۔ یوں یہ ان کے اجماع کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ اگر ان کے اجماع میں غلطی ممکن ہوتی تو قرآن کو نقل کرنے میں بھی غلطی ممکن ہوتی پھر یہ کہنا بھی جائز ہوتا کہ قرآن محفوظ نہیں جبکہ آیت کی دلیل کے مطابق قرآن کا محفوظ نہ ہونا ناممکن ہے، یوں قرآن کو نقل کرنے، جمع کرنے اور محفوظ کرنے کے بارے میں ان کے اجماع میں غلطی محال اور ناممکن ہے۔ یوں ان کا اجماع قطعی طور پر حجت ہے۔

اس حوالے سے جس امر کی وضاحت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کسی حکم کے بارے میں صحابہؓ کے اجماع کے حکم شرعی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس حکم کی شرع میں دلیل موجود تھی، خواہ وہ دلیل رسول اللہ ﷺ کا فعل، قول یا سکوت ہے، صحابہؓ نے اس حکم کو نقل کیا لیکن اس کی دلیل کو نقل نہیں کیا، ان کا کسی حکم کو نقل کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس حکم کے لیے کوئی شرعی دلیل موجود ہے، ان کے اجماع کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کی اپنی ذاتی آراء میں سے کسی ایک رائے پر اتفاق ہوا تھا کیونکہ ان کی آراء وحی نہیں ان میں سے کوئی بھی خطاء اور غلطی سے معصوم نہیں اس لیے ان کی رائے شرعی دلیل نہیں اور نہ ہی ایک رائے پر ان کا اتفاق کوئی شرعی دلیل ہے۔ اس لیے کہ شرعی دلیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ وحی ہو تب ہی وہ معتبر ہے اور صحابہؓ کی آراء وحی نہیں اس لیے وہ شرعی دلیل بھی نہیں۔ نہ وہ آراء جہاں ان کا اختلاف ہوا اور نہ ہی وہ آراء جہاں وہ متفق ہوئے، لہٰذا ان کے اجماع کا بالکل یہ مطلب نہیں کہ کسی ایک رائے میں ان کا اتفاق بلکہ ان کے اجماع کا معنی ہے کہ انہوں نے ایک حکم کے شرعی حکم ہونے پر اجماع کیا یا یوں کہیے کہ ان کا اس بات پر اجماع تھا کہ فلاں مسئلے کا شرع میں یہ اور یہ حکم ہے، اب یہ ان کی رائے نہیں بلکہ اس بات پر اجماع ہے کہ یہ حکم شرعی ہے، اس لیے اجماع صحابہ اس حکم کے بارے میں دلیل کو ظاہر یا منکشف کرتا ہے۔

قیاس بھی شرعی دلیل ہے۔ لغت میں قیاس اندازہ لگانے کو کہتے ہیں جبکہ علمائے اصول (مجتہدین) کی اصطلاح میں ایک معلوم (چیز) کو دوسری معلوم پر محمول کرنا، اس طرح کہ دونوں کے لیے ایک ہی حکم کو ثابت کیا جائے یا دونوں کے لیے اس حکم کو نفی کیا جائے، کسی ایسی چیز کی وجہ سے جو دونوں کے مابین مشترک ہو۔ یعنی قیاس یہ ہے کہ حکم کی علت (شرعی وجہ) میں اشتراک کی وجہ سے ایک کا حکم دوسرے کے لیے بھی ثابت کرنا۔ یہ اصل سے فروع کی طرف بڑھنا ہے یعنی فروع کو اصل سے جوڑنا ہے۔ ایک معلوم کو دوسرے معلوم پر محمول کرنے کا معنی یہ ہے کہ دونوں معلوم، حکم میں شریک ہیں یعنی دونوں کا ایک ہی حکم ہو گا۔ پھر حکم کے اثبات اور نفی میں محمول کرنے کے معنی یہ ہیں کہ فروع اور اصل کو ایک ہی حکم میں شریک کرنا، یوں اصل کا حکم فروع کے لیے بھی ثابت ہو گا یعنی فروع حکم میں اپنے اصل کا شریک ہو گا۔ پھر یہ حکم جو کہ اصل کا ہے کبھی اثبات میں ہو گا جیسا کہ بخاری نے ابنِ عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ **«أَنَّ امْرَأَةً مِنْ جُهَيْنَةَ جَاءَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ: إِنَّ أُمِّي نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ فَلَمْ تَحُجَّ حَتَّى مَاتَتْ، أَفَأَحُجُّ عَنْهَا ؟ قَالَ: نَعَمْ، حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قَاضِيَةً، اقْضُوا اللَّهَ فَاللَّهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ»** "جہینہ (قبیلے) کی ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور کہا کہ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن حج کرنے سے پہلے وفات پا گئی۔ کیا میں ان کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ فرمایا: جی ہاں، ان کی طرف سے حج کر لو، دیکھو اگر تمہاری ماں پر قرضہ ہوتا، تو کیا تم وہ قرضہ لوٹا دیتی؟ اللہ کا قرضہ بھی لوٹا دو، اللہ تعالیٰ حق ادا کرنے کا زیادہ حقدار ہے"۔ اس دلیل میں رسول ﷺ نے اللہ کے قرض کو انسان کے قرض پر قیاس کیا گیا اور فرمایا گیا کہ انسان کی طرف سے اللہ کا حق ادا کرنا چاہیے۔ یہاں اثبات کا حکم ہے جو کہ قرض کی ادائیگی ہے۔ کبھی محمول علیہ اصل کا حکم نفی میں ہوتا ہے، مثال کے طور پر عمرؓ کے حوالے سے یہ روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روزہ دار کے بوسہ کے بارے میں سوال کیا کہ کیا یہ بوسہ روزہ کو توڑ دیتا ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا **«أَرَأَيْتَ لَوْ تَمَضْمَضْتَ، أَكَانَ ذَلِكَ يُفْسِدُ الصَّوْمَ ؟ فَقَالَ: لاَ»** "دیکھو جب تم کُلّی کرتے ہو کیا وہ روزے کو توڑ دیتی ہے؟ میں نے کہا: نہیں"، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے جبکہ ذھبی نے اس کی موافقت کی ہے، اس میں روزہ دار کے بوسے کو اس کے کُلی کرنے پر قیاس کیا گیا جو کہ روزے کو نہیں

توڑ تا یہاں حکم نفی میں ہے جو کہ روزے کا نہ ٹوٹنا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ قیاس ان دونوں کے درمیان ایک مشترک امر کی بنا پر ہے جو کہ اصل کی علت کا فروع میں موجود ہونا ہے۔ اس علت کی وجہ سے ایک حکم دوسرے پر بھی لاگو ہو گا۔ یہ امر مقیس (جس کو قیاس کیا جاتا ہے) اس مقیس علیہ (جن پر قیاس کیا جاتا ہے) کے درمیان مشترک ہے۔ یعنی اصل اور فروع کے درمیان مشترک ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے جب آپ ﷺ سے چھوارے کے بدلے تازہ کھجور کے بارے میں پوچھا گیا: «**أَيَنْقُصُ الرُّطَبُ إِذَا يَبِسَ ؟ فَقَالُوا: نَعَمْ، فَقَالَ: فَلاَ، إِذَنْ**» "پوچھا کیا تازہ کھجور (خشک ہو کر) کم ہو جاتی ہے؟ لوگوں نے کہا: جی ہاں، فرمایا: تب تو جائز نہیں" اس حدیث کو ابو یعلیٰ نے انہی الفاظ سے سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کیا ہے اور ابن حبان اور الحاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سودی مال میں موجود علت کے بارے میں سوال کیا اور یہ علت زیادہ ہونا ہے یعنی کیا یہ علت کھجور کو چھوارے کے بدلے میں بھیجنے میں پائی جاتی ہے، جب آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ یہ علت موجود ہے تب آپ ﷺ نے اس بیع (خرید و فروخت) کے لیے ربا (سود) کا حکم صادر کیا اور فرمایا: "تب تو جائز نہیں" یعنی سوکھنے سے اگر کم ہو جاتی ہے تو جائز نہیں۔ آپ ﷺ نے ان سے مشترک امر کے بارے میں سوال کیا جو کہ ربا کے لیے شرعی علت ہے۔

یہ ہے قیاس کی شرعی تعریف اور یہ تعریف رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے لی گئی ہے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ: «**جَاءَتِ امْرَأَةٌ إِلَى رَسُولِ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنَّ أُمِّي مَاتَتْ وَعَلَيْهَا صَوْمُ نَذْرٍ، أَفَأَصُومُ عَنْهَا ؟ قَالَ: أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ فَقَضَيْتِهِ أَكَانَ يُؤَدِّي ذَلِكِ عَنْهَا؟ قَالَتْ: نَعَمْ، قَالَ: فَصُومِي عَنْ أُمِّكِ**» "ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہا: اے اللہ کے رسول میری ماں اس حالت میں وفات پا گئی کہ اس پر نذر کا روزہ تھا۔ کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھ سکتی ہوں؟ فرمایا: دیکھو اگر تمہاری ماں پر قرضہ ہوتا اور تم وہ قرضہ ادا کر دیتی تو کیا یہ اس کی طرف ادا ہو جاتا اس عورت نے کہا: جی ہاں فرمایا اسی لیے اپنی ماں کی طرف سے روزہ رکھو"، اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ عبد اللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ: «**جَاءَ رَجُلٌ مِنْ خَثْعَمٍ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنَّ أَبِي أَدْرَكَهُ الْإِسْلَامُ وَهُوَ**

شَيْخٌ كَبِيرٌ لَا يَسْتَطِيعُ رُكُوبَ الرَّحْلِ وَالْحَجُّ مَكْتُوبٌ عَلَيْهِ أَفَأَحُجُّ عَنْهُ قَالَ أَنْتَ أَكْبَرُ وَلَدِهِ قَالَ نَعَمْ قَالَ أَرَأَيْتَ لَوْ كَانَ عَلَى أَبِيكَ دَيْنٌ فَقَضَيْتَهُ عَنْهُ أَكَانَ ذَلِكَ يُجْزِئُ عَنْهُ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاحْجُجْ عَنْهُ» " خثعم (قبیلے) کا ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا میرے والد نے اسلام قبول کیا لیکن وہ بہت بوڑھے ہیں اور سواری پر بیٹھنے اور سفر کی استطاعت نہیں رکھتے، اور وہ حج جو ان پر فرض ہے اسے ادا نہیں کر سکتے، کیا میں ان کی طرف سے حج کر سکتا ہوں، فرمایا، تم اس کے سب سے بڑے بیٹے ہو، اس شخص نے کہا: ہاں۔ فرمایا: دیکھو اگر اس پر قرضہ ہوتا اور تم اس کی طرف سے ادا کر دیتے تو کیا یہ کافی ہوتا۔ اس شخص نے کہا: ہاں۔ فرمایا: تو ان کی طرف سے حج بھی کرو" اس کو احمد نے ایسی اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے جن کو الزین نے صحیح کہا ہے اور دارمی نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔

ان دو حدیثوں میں رسول اللہ ﷺ نے روزے اور حج میں اللہ کے قرض کو آدمی کے قرض پر محمول کیا ہے۔ اور دونوں جگہ ایک معلوم کو دوسرے معلوم پر قیاس کیا ہے، یعنی اللہ کے قرض اور آدمی کے قرض میں یہ اشتراک ہے کہ دونوں میں ایک شخص کی طرف سے ادائیگی سے دوسرے کی جانب سے ادائیگی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں قرض ہیں یہی حکم کی علت ہے، ان دونوں کا جو حکم ثابت ہوا وہ یہ ہے کہ قرضوں کو ادا کرنا چاہیے۔ یہ ہے قیاس کی شرعی حیثیت اور اسے شرعی نص سے مستنبط کیا گیا ہے، یوں یہ تعریف ایک حکمِ شرعی ہے اور اس سے اخذ کرنا فرض ہے۔ پھر یہ اس شخص کے حق میں، جو اس کو استنباط کرتا ہے یا اس کی اتباعی تقلید کرتا ہے یا پھر تقلید عام کے طور پر اس کو اختیار کرتا ہے، یہ اس کے لیے شرعی دلیل سے مستنبط کسی بھی حکمِ شرعی کی طرح ہے، کیونکہ ادلہ شرعیہ سے مستنبط قواعد اور تعاریفات دوسرے احکامِ شرعیہ کی طرح شرعی احکام ہیں۔

یہ قیاس علت پر قائم ہوتا ہے، یعنی معلوم محمول اور معلوم محمول علیہ کے درمیان ایک مشترکہ امر پر، دوسرے لفظوں میں فروع اور اصل کو ایک حکم کے ماتحت کرنے والی علت پر، جب یہ علت پائی جائے، یعنی جب مقیس اور مقیس علیہ کو باہم اکٹھا کرنے والی بات پائی جائے تو قیاس بھی پایا جائے گا ورنہ کوئی قیاس نہیں ہو

گا۔ یہ علت اگر کسی شرعی نص میں وارد ہو یا اس علت کو اُس امر پر قیاس کیا گیا ہو جس کے بارے میں شرعی نص وارد ہو تب ہی یہ قیاس بطورِ شرعی دلیل معتبر ہو گا، کیونکہ جس علت پر یہ قیاس قائم ہے وہ شرعی نص میں وارد ہے۔ اس کے برخلاف اگر یہ علت شرعی نص میں وارد نہ ہوئی ہو تو یہ قیاس غیر شرعی ہو گا کیونکہ اس کے بارے میں شرعی نص وارد نہیں ہوئی ہے، اس لیے یہ قیاس شرع سے نہیں ہو گا اور یوں اس کو شرعی دلیل نہیں کہا جائے گا، یہ اس لئے کہ جس علت پر یہ قیاس مبنی ہے وہ شرعی نص میں وارد نہیں ہے۔

قیاس کی شرعی دلیل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ شرعی نص جس میں علت بیان کی گئی ہے یا اس پر قیاس کیا گیا ہے جس نص میں وارد ہے وہ یا تو کتاب اللہ میں سے ہو گی یا سنت میں سے یا پھر اجماعِ صحابہ سے۔ ان تینوں کی شرعی دلیل ہونا قطعی دلیل سے ثابت ہے یوں شرعی علت کی دلیل قطعی دلیل ہوئی، اور یہی قیاس کی دلیل ہے۔ کیونکہ وہ شرعی علت جو حکم میں موجود ہے اس کے بارے میں نص موجود ہے جو کہ اصل ہے اور اس اصل نے فروع میں موجود حکم کو شرعی حکم بنا دیا، جس کی وجہ سے قیاس کیا گیا اگر یہ اصل نہ ہوتا تو قیاس کا بھی کوئی وجود نہ ہوتا یوں اس کی دلیل قیاس کی بھی دلیل ہے۔

اس شرعی قیاس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے اور اس کو شرعی دلیل قرار دیا ہے، صحابہؓ بھی اسی پر چلے اور احکام شرعیہ کے استنباط کے وقت قیاس کو شرعی دلیل بنایا۔ نبی کریم ﷺ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ ﷺ نے معاذؓ اور ابو موسیٰ الاشعریؓ کو یمن روانہ کرتے وقت ان سے فرمایا: **«بِمَ تَقْضِيَانِ ؟ فَقَالاَ: إِنْ لَمْ نَجِدِ الحُكْمَ فِي الكِتَابِ وَلاَ السُّنَّةِ قِسْنَا الأَمْرَ بِالأَمْرِ، فَمَا كَانَ أَقْرَبَ إِلَى الحَقِّ عَمِلْنَا بِهِ»** ''تم دونوں کس چیز کے مطابق فیصلے کرو گے ؟ ان دونوں نے کہا: اگر کتاب و سنت میں حکم ہمیں نہ ملے تو ہم ایک معاملے کو دوسرے پر قیاس کریں گے اور جس کو حق کے زیادہ قریب پائیں گے اس پر عمل کریں گے''، اس کو الآمدی نے الاحکام میں اور ابو الحسین نے المعتمد میں نقل کیا ہے۔ انہوں نے صریحاً قیاس پر عمل کیا اور نبی ﷺ نے ان دونوں کو اس پر برقرار رکھا اس لیے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قیاس شرعی دلیل ہے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ: **«أَنَّ امْرَأَةً مِنْ جُهَيْنَةَ**

جَاءَتْ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَتْ: إِنَّ أُمِّي نَذَرَتْ أَنْ تَحُجَّ فَلَمْ تَحُجَّ حَتَّى مَاتَتْ، أَفَأَحُجُّ عَنْهَا ؟ قَالَ: نَعَمْ، حُجِّي عَنْهَا، أَرَأَيْتِ لَوْ كَانَ عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قَاضِيَةً، اقْضُوا اللَّهَ فَاللَّهُ أَحَقُّ بِالْوَفَاءِ» "قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نبی ﷺ کے خدمت میں آئی اور کہا: میری ماں نے حج کرنے کی نذر مان رکھی تھی لیکن وہ حج نہیں کر پائی تھی کہ ان کی وفات ہو گئی۔ کیا میں ان کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ فرمایا ہاں، ان کی طرف سے حج کرو، دیکھو اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا، تو کیا تم ادا کر دیتی۔ اللہ کا قرض بھی ادا کرو اللہ تعالیٰ ادائیگی کا زیادہ حقدار ہے" اس کو بخاری نے نقل کیا ہے یہاں رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو سمجھایا اور اللہ کے قرض کو انسان کے قرض سے الحاق کیا اور اس کی ادائیگی کو فرض قرار دیا یہی بعینہٖ قیاس ہے۔ عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے سوال کیا کہ روزہ دار کا بوسہ دینا روزے کو توڑتا ہے یا نہیں؟ نبی ﷺ نے فرمایا «أَرَأَيْتَ لَوْ تَمَضْمَضْتَ، أَكَانَ ذَلِكَ يُفْسِدُ الصَّوْمَ ؟ فَقَالَ: لاَ» "دیکھو جب تم کُلّی کرتے ہو، کیا یہ روزے کو توڑ دیتی ہے؟ میں نے کہا: نہیں"، الحاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے جبکہ ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے، یہاں رسول اللہ ﷺ نے روزہ دار کے بوسے کو 'مضمضة' (کُلی) پر قیاس کرتے ہوئے اس سے روزے کے ٹوٹنے کی نفی کر دی کیونکہ دونوں صورتوں میں پیٹ میں کوئی چیز نہیں گئی۔ اس میں قیاس کے ذریعے حکم کو سمجھایا گیا۔ ان تین نصوص میں حکم کی علت ہی بیان نہیں کی گی بلکہ اس میں قیاس کا اقرار کیا گیا، قیاس کی تعلیم دی گئی اور قیاس کے ذریعے حکم کو سمجھایا گیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قیاس شرعی دلیل ہے۔

یہ تو رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے تھی جہاں تک صحابہ کرامؓ کا تعلق ہے، وہ بھی کئی مسائل میں قیاس کو شرعی دلیل کے طور پر لیتے تھے، مثال کے طور پر سعید بن منصور نے اپنی سنن میں القاسم بن محمد سے نقل کیا ہے کہ " ایک آدمی دو دادیاں، ماں کی ماں اور باپ کی ماں، چھوڑ کر مر گیا، لوگ ابو بکرؓ کے پاس آئے انہوں نے اس شخص کے ترکہ (چھوڑ ہوا مال) میں سے ماں کی ماں کو چھٹا حصہ دے دیا، جبکہ باپ کی ماں کو کچھ نہیں دیا۔ تو ایک انصاری شخص اٹھا اور کہا یہ عورت مر گئی ہوتی اور یہ شخص (مرنے والا) زندہ ہوتا تو وہ اس

عورت کی ساری دولت کا وراث بن جاتا، ایسا کرو کہ اس چھٹے حصے میں ان دونوں دادیوں کو شریک کر دو'' اس واقعے کو غزالی نے المستصفیٰ میں جبکہ الآمدی نے الاحکام میں ذکر کیا ہے۔ اس میں زندہ شخص کے مردے کا وارث بننے کو، مردہ کے زندہ کے وارث بننے پر قیاس کیا گیا، کہ اگر یہ مردہ زندہ ہوتا اور زندہ مر چکا ہوتا اور مردہ اس زندہ شخص کا وارث بنتا تو اس کو میراث میں حصہ ملتا، یعنی دونوں حالتوں میں ان کی رشتہ داری (قرابت) ایک ہی ہے (یعنی دونوں ایک دوسرے کے وارث ہیں)، ابو بکرؓ نے جب اس قیاس کے بارے میں سنا تو اس کے سامنے سر جھکا دیا، اس پر عمل کیا اور اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ عمرؓ کے حوالے سے بھی ہے، انہوں نے ابو موسیٰ الأشعریؓ کو خط لکھا کہ: اشیاء کی مشابہت اور مثال کو سمجھو پھر اپنی رائے کے مطابق قیاس کیا کرو'' اس کو شیرازی نے 'طبقات الفقہاء' میں ذکر کیا ہے جبکہ بیہقی نے اپنی کتاب ' ادب القاضی' کے باب المعرفہ میں اس واقعے کو بیان کیا ہے۔ اس وقت عمرؓ امیر المومنین جبکہ ابو موسی الأشعریؓ قاضی تھے۔ اسی طرح ایک اور واقعہ میں عمرؓ کو بتایا گیا کہ سمرہ نے یہودی تاجروں سے کسٹم کے طور پر شراب وصول کی، آپؓ نے فرمایا **(قاتَلَ اللَّهُ سَمُرَةَ! أَمَا عَلِمَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قال: لَعَنَ اللَّهُ اليهودَ، حُرِّمَتْ عليهِمُ الشُّحومُ فَجَمَلُوها وباعوها وأَكَلُوا ثَمَنَها)** "اللہ سمرہ کو قتل کرے! کیا اس کو معلوم نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: یہود پر اللہ کی لعنت ہو کہ ان پر چربی کو حرام کر دیا لیکن انہوں نے اس کو جمع کر کے بیچ کر اس کی قیمت کھالی''، اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہاں عمرؓ نے شراب کو چربی پر قیاس کیا اور حرمت میں اس کی قیمت بھی شامل ہے۔ اسی قسم کی ایک اور مثال میں عمرؓ کو ایسے مقتول کے بدلے (قصاص) کے بارے میں شک تھا جس کے قتل میں سات لوگ شریک ہوئے تھے۔ علیؓ نے ان سے کہا کہ ''اے امیر المومنین، دیکھئے اگر کئی ایک آدمی مل کر چوری کریں تو کیا آپ ان کے ہاتھ کاٹیں گے؟ فرمایا: جی ہاں!، علیؓ نے فرمایا تب قتل میں بھی ایسا ہی ہو گا''۔ اس کو عبد الرزاق نے المصنف میں ذکر کیا ہے، اس میں قتل کو چوری پر قیاس کیا گیا ہے۔ یوں سنت اور اجماع صحابہؓ سے یہ ثابت ہو گیا کہ قیاس شرعی دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے جو ثابت ہے وہ سنت اور صحابہؓ سے جو ثابت ہے وہ اجماع سکوتی (خاموش اجماع) ہے،

کیونکہ صحابہ کرامؓ نے اپنی آنکھوں سے (قیاس ہوتے) دیکھا اور کانوں سے سنا اور کسی نے بھی ان کی مخالفت نہیں کی، اس لیے یہ اجماع صحابہ ٹھہرا۔ یہ الگ بات ہے کہ سنت اور اجماع صحابہؓ اگر خبر واحد کے ذریعے روایت کی گئی ہو تو وہ ظنی دلیل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بات کی قطعی دلیل کہ قیاس شرعی دلیل ہے، وہ تھی جو ہم نے پہلے بیان کی اور وہ یہ تھی کہ اس کی علت کسی شرعی نص یعنی کتاب، سنت اور اجماع صحابہ میں ہونی چاہیے۔ کیونکہ ان تینوں کا ادلہ شرعیہ ہونا قطعی دلیل سے ثابت ہے اور یہی قیاس کی دلیل ہے، کیونکہ یہ شرعی علت کی دلیل ہے۔

پس یہ چار ادِلّہ: کتاب، سنت، اجماعِ صحابہؓ اور قیاس کا قطعی دلیل کے ساتھ ثبوت موجود ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے وحی ہیں۔ اسکے علاوہ کسی بھی ادلہ کے متعلق دلیلِ قطعی سے ثابت نہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے وحی کردہ ہے، بلکہ ان کے بارے میں یہ بھی ثابت نہیں کہ جن دلائل کو ان کے لئے شرعی دلیل کے طور پر لایا گیا ہے وہ ان کے لیے شرعی دلائل ہیں۔ ان کا قطعی دلیل سے ثابت نہ ہونا تو واضح ہے کیونکہ جو ان سے استدلال کرتے ہیں وہ بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ان کے ادلہ شرعیہ ہونے کی دلیل قطعی ہے۔ ان کے لیے شرعی دلائل نہ ہونے کا ثبوت بھی ظاہر ہے کیونکہ جو دلائل ان کے ثبوت کے طور پر لائے جاتے ہیں ان کا اطلاق ان ادلہ پر ہوتا ہی نہیں۔ ان کی استدلال کی غلطی ظاہر اور واضح ہے جیسا کہ اجماع المسلمین یا مصالح المرسلہ یا پھر استحسان کے شرعی ادلہ ہونے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اجماع المسلمین شرعی دلیل ہے وہ نبی ﷺ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں کہ: **«لاَ تَجْتَمِعُ أُمَّتِي عَلَى ضَلاَلَةٍ»** "کسی گمراہی پر میری امت جمع نہیں ہو گی" ابنِ حجر نے کہا ہے کہ یہ مشہور حدیث ہے، اسے کئی ایک طریقوں سے روایت کیا گیا ہے اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس پر اعتراض نہ کیا گیا ہو۔ یہ حدیث سرے سے ہی اجماع المسلمین کی دلیل نہیں کیونکہ یہاں ضلالہ (گمراہی) سے مراد ارتداد ہے یعنی دین سے مرتد ہونا۔ اس سے مراد غلطی کرنا نہیں، اسی معنی میں یہ حدیث بھی ہے کہ **"«لَنْ تَجْتَمِعَ أُمَّتِي عَلَى ضَلاَلَةٍ، فَعَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ، فَإِنَّ يَدَ اللَّهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ»**

میری امت گمراہی پر کبھی اکٹھی نہیں ہو گی، تمہیں چاہیے کہ تم جماعت کے ساتھ رہو کیونکہ اللہ کی مدد جماعت کے ساتھ ہوتی ہے"اس کو طبرانی نے ایسی اسناد کے ساتھ ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے جس کے راوی قابل اعتماد ہیں اور یہ حدیث صحیح ہے امت مسلمہ کبھی بھی اجتماعی طور پر دین سے مرتد نہیں ہو گی، لیکن یہ ممکن ہے کہ اجتماعی طور پر کوئی غلطی کر بیٹھے اس کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک لمبے عرصے تک خلیفہ کے تقرر کے کام سے اجتماعی طور پر غفلت برتتی رہی اور یہ غلطی پر اجماع ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مصالح (فائدہ) کو حاصل کرنا اور مفسدات (نقصان) سے بچنا احکام شرعیہ کے لیے شرعی علت ہے اور اسی کے مطابق قیاس کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں **وَمَآ اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ** ''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے" (الانبیاء: 107)۔ گویا ان لوگوں نے نبی ﷺ کے رحمت ہونے کو شریعت کی علت قرار دیا اور رحمت تب ہی ہے جبکہ اس میں فوائد کا حصول اور نقصانات سے بچاؤ ہو، یہ دونوں باتیں احکام کے لیے شرعی علت ہیں۔ یہ استدلال دو وجوہات کی بنا پر غلط ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں موضوع آپ ﷺ کی رسالت ہے یعنی آپ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجنا ہے نہ کہ احکام شرعیہ، اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آپ ﷺ کی رسالت سے مراد آپ ﷺ کی شریعت ہے تب بھی موضوع پوری شریعت ہے یعنی تمام عقائد اور احکام صرف احکام شرعیہ نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجنے کا مطلب آپ ﷺ کی رسالت کی حکمت کو بیان کرنا ہے یعنی آپ ﷺ کی رسالت سے مرتب ہونے والے نتیجے کا بیان ہے۔ یہ بالکل اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے کہ: **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** "میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں" (الذاریات:56)، یعنی ان کو پیدا کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ عبادت کریں یوں یہ ان کی پیدائش کی حکمت ہے، ان کی پیدائش کی علت نہیں۔ اس کی ایک مثال یہ آیت ہے کہ **لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ** " تاکہ اپنے لیے فائدے حاصل کریں"(الحج: 28) یہ حج کی حکمت ہے، یعنی ایسا نتیجہ ہے جو حج کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کا

یہ ارشاد ہے کہ: **اِنَّ الصَّلَاۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ** "یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے" (العنکبوت:45)۔ یہ نماز کی حکمت ہے یعنی وہ نتیجہ ہے جو نماز سے حاصل ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح مذکورہ آیت بھی حکم کی علت کے طور پر نہیں۔ کیونکہ علت وہ چیز ہے جس کے لیے شرعی حکم وجود میں آئے۔ نص میں علت کے پائے جانے کے لیے ضروری ہے کہ یہ ایک ایسا وصف ہو جو کہ وصف مفہم (reasoned description) ہو، یعنی وہ شرعی حکم کی وجہ کو بیان کرتا ہو یعنی یہ شرع حکم اس علت کے سبب سے ہو، تب وہ لازمی ہو گا اور ہر حال میں ہو گا کہ جہاں علت پائی جائے وہاں معلول بھی لازمی طور پر ہو گا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کے اس قول رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ اور باقی آیات میں اگرچہ وصف ہے اور ایسے حروف بھی ہیں جو تعلیل (علت ہونے) کا فائدہ دیتے ہیں لیکن کلام کا سیاق وسباق علت کا فائدہ نہیں دیتا، کیونکہ یہ کبھی حاصل ہوتا ہے اور کبھی نہیں، اور تشریع اس کے سبب سے نہیں۔ کیونکہ اسلامی شریعت کبھی اس شخص کے لیے رحمت ہوتی ہے جو اس پر ایمان لائے اور عمل کرے جیسا کہ ابتدائی مسلمانوں نے کیا، کبھی یہ اس شخص کے لیے زحمت ہوتی ہے جو اس کا انکار کرے جیسے کفار نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار کیا تو کفار کے لیے زحمت یعنی عذاب کا سبب ہے، حالانکہ وہ بھی العالمین میں داخل ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسلام کا پیغام (رسالت) آج بھی موجود ہے کیونکہ اسلام کا پیغام عملی طور پر بھیج دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اس پیغام پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں نے ہی اس کو نافذ نہیں کیا اور وہ بدبختی کا شکار ہیں یہی وجہ ہے کہ فقط رسالت یعنی شریعت کی موجودگی رحمت نہیں، اس لیے یہ رسالت کی علت بھی نہیں، یوں فوائد کا حصول یا نقصانات سے بچنا کوئی شرعی علت نہیں اس وجہ سے اس کو قیاس کی بنیاد بنانا بالکل درست نہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عقل بھی ادلہ شرعیہ میں سے ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ بات حکم شرعی کی ہے یعنی غالب گمان کے مطابق جو اللہ کا حکم ہے اور یہ صرف وحی میں ہی ہو سکتا ہے۔ جبکہ عقل کوئی وحی نہیں اس لیے ایسی قطعی یا ظنی کسی بھی قسم کی کوئی دلیل نہیں کہ عقل بھی ادلہ شرعیہ میں سے ہے، اسی لیے یہ سرے سے ادلہ شرعیہ میں شمار ہی نہیں ہوتی۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ صحابی کا مذہب ادلہ شرعیہ میں سے ہے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب اجماع صحابہ دلیل ہے تو ایک صحابی کا مذہب (رائے) بھی دلیل ہے کیونکہ جس طرح ان کے اجماع کی تعریف کی گئی ہے یہ تعریف ان کے ہر فرد کے لیے بھی ہے اور جس طرح دین کو آگے پہنچانے میں ان کے اجماع میں کوئی خلل نہیں ہو سکتا اسی طرح ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ خلل نہیں پایا جا سکتا، پھر رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھی ہے کہ: «أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ، بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ» "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کسی کی تم پیروی کروگے ہدایت پاؤگے" اس کو رزین نے نقل کیا ہے اور اِن لوگوں کے نزدیک یہ ایک صحابی کے مذہب (مسلک) کے شرعی دلیل ہونے کی تائید کرتی ہے۔ یہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے صرف ایک صحابی کی مدح نہیں بلکہ صحابہ کے اجماع کی مدح اجماعِ صحابہ کی شرعی دلیل ہے، اور یہ کہ قرآن کا صحابہ کی طرف سے انفرادی طور پر منقول ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ ان کا اجماع دلیل ہے۔ بلکہ شرعی دلیل تو یہ ہے کہ ان کی مجموعی طور پر تعریف اور مدح کی گئی، اور یہ کہ انہوں نے اس بات پر اجماع کیا کہ فلاں حکم، حکمِ شرعی ہے۔ یعنی دلیل دو باتیں ہیں: ان کی 'ثناو تعریف' اور ان کا 'اجماع' ، اور یہ بات ایک صحابی میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ صرف تعریف اور قرآن کو نقل کرنا اس بات کے لیے کافی دلیل نہیں کہ جس نے قرآن کو نقل کیا اور اس کی تعریف کی گئی ہے اس کا کلام شرعی دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جیسے صحابہ کی تعریف کی ہے اسی طرح ان کی بھی تعریف کی ہے جو صحابہ کی اتباع کریں، اس لیے اگرچہ قرآن کو نقل کرنے والا ان لوگوں میں سے ایک ہے جن کی تعریف کی گئی ہے لیکن اس کا کلام شرعی دلیل نہیں ۔ یوں یہ استدلال ساقط ہو گیا۔ اس استدلال کو یہ بھی ساقط کرتا ہے کہ ایک صحابی جو کچھ نقل کرتا ہے یا کوئی حدیث روایت کرتا ہے اس کو قطعی الثبوت نہیں سمجھا جاتا بلکہ وہ ظنی ہوتی ہے۔ اسی لیے (الشيخ والشيخة إذا زنيا فارجموهما البتة) کو قرآن میں سے نہیں سمجھا جاتا حالانکہ اس کو صحابی نے ہی نقل کیا ہے کیونکہ اس پر صحابہ کا اجماع نہیں ہوا، اسی طرح وہ احادیث جن کو صحابہ نے خبر واحد کے طور پر روایت کیا ہے قطعی نہیں بلکہ ظنی ہیں۔ بر خلاف اجماع صحابہ کے کہ انہوں نے جس آیت پر اجماع کیا کہ یہ

قرآن کی آیت ہے تو وہ قرآن ہی سمجھا جاتا ہے اور قطعی ہے اور جن احادیث پر اجماع کیا اور ان سے تواتر کے ساتھ روایت کی گئیں، وہ احادیث بھی قطعی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے کہ جس چیز پر صحابہ کا اجماع ہو چکا ہو اس کے قطعی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور اس کا منکر کافر ہے اور جس چیز کو کوئی ایک صحابی روایت کرے وہ ظنی ہے اور اس کے منکر کو کافر نہیں کہا جا سکتا، یوں اجماع صحابہؓ شرعی دلیل ہے اور ایک صحابی کا مذہب شرعی دلائل میں سے نہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ ممکن ہے کہ ایک صحابی غلطی کرے کیونکہ وہ خطاؤں سے معصوم نہیں، بر خلاف اجماعِ صحابہ کے جس میں غلطی پر اجماع ہونا محال اور ناممکن ہے۔ صحابہؓ کا کئی مسائل میں اختلاف بھی ہوا اور وہ ایک دوسرے کے بر خلاف رائے اختیار کر لیتے تھے۔ اگر ایک صحابی کے مذہب کو حجت کہا جائے تو اللہ تعالیٰ کی حجتیں مختلف اور متناقض ہو جائیں گی، اس وجہ سے ایک صحابی کا اپنا مذہب (رائے) شرعی دلیل نہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم سے پہلی شریعتیں ہمارے لیے بھی شریعت ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں کہ: **اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ** ”یقیناً ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی کی ہے جیسے کہ نوح کہ طرف کی...“(النساء:163)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کہ: **شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا** ”اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کر دیا ہے جس کے قائم کرنے کا اس نے نوح کا حکم دیا تھا“ (الشوریٰ:13) اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی کہ: **ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا** ”پھر ہم نے آپ کی جانب وحی بھیجی کہ آپ ملتِ ابراہیم کی پیروی کریں“ (النحل:123)۔ اُن کے مطابق یہ تمام آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ہم گزشتہ انبیاء کی شریعتوں کے مخاطب ہیں، اور چونکہ رسول اللہ ﷺ بھی اصلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں اس چیز سے آگاہ کرنے کے لیے آئے جس کی پابندی ہمارے لیے ضروری ہے، اس لیے قرآن میں کوئی بھی حرف یا رسول اللہ ﷺ کا کوئی بھی عمل قول یا تقریر (بر قرار رکھنا) سب کے سب ہر صورت میں واجب العمل ہیں اور اس کی پابندی ضروری ہے سوائے اس عمل کے جو آپ کے ساتھ خاص ہو یا کسی اور کے ساتھ مخصوص ہو۔ چنانچہ

قرآن میں جو کچھ ہے یا احادیث میں جو کچھ ہے ہم سے اس سب کچھ پر عمل کرنے کا مطالبہ ہے سوائے اس کے کہ جس کے بارے میں نص ہو کہ وہ گزشتہ شریعت والوں کے ساتھ خاص ہے یا جس کے منسوخ ہونے کے بارے میں نص موجود ہو، اگر ایسا نہ ہو تو پھر ہم سے بھی اس پر عمل کرنے کا مطالبہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کو عبث (بیکار) ذکر نہیں کیا، لامحالہ اس کے مخاطب ہم ہیں۔ اس طرح کا استدلال غلط ہے۔ پہلی آیت کی جہاں تک بات ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء کی طرف وحی بھیجی اسی طرح آپ ﷺ کی طرف بھی وحی بھیجی۔ دوسری آیت سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بھی وہی توحید اصل کے طور پر مقرر کر دی جس کا نوحؑ کو بھی حکم دیا تھا، جبکہ تیسری آیت سے مراد توحید کی اصل کی پیروی کرنے کا حکم ہے کیونکہ اسمیں ملت کا لفظ ہے جسکا مطلب ہے اصلِ توحید۔ اس قسم کی تمام آیتیں اسی مفہوم میں ہیں، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد **فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ** "آپ بھی ان ہی کے طریقے پر چلئے" (الانعام:90)۔ رہی بات اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی کہ **اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ** "ہم نے تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت و نور ہے جس کے مطابق انبیاء لوگوں میں فیصلہ کرتے تھے۔" (المائدۃ:44)، یہاں انبیاء سے مراد انبیاء بنی اسرائیل ہیں، محمد ﷺ نہیں کیونکہ مسلمانوں کا تو صرف ایک ہی نبی ہے۔ جہاں تک ابوہریرہؓ کی اس روایت کا تعلق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**الأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ مِنْ عَلاَّتٍ، وَأُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى، وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ**» "انبیاء کرام الگ الگ ماں سے بھائی ہیں جن کی مائیں الگ اور دین ایک ہے" اس کو مسلم نے نقل کیا ہے، دین کے ایک ہونے کا معنی یہ ہے کہ سب ایک ہی توحید کے داعی ہیں اس میں سرے سے کوئی اختلاف ہی نہیں، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جو دین وہ دے کر مبعوث کئے گیے وہ بھی ایک ہی ہے کیونکہ ارشاد ہے کہ **لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ** "تم میں سے ہر ایک کیلئے ہم نے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی" (المائدۃ:48)۔ اس سب سے یہ ظاہر ہو گیا کہ یہ دلائل استدلال کے قابل نہیں اور ان دلائل سے استدلال کر کے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم سے پہلی شریعتیں ہمارے لیے شریعت ہیں، اس پر مستزاد یہ کہ ایسے واضح دلائل موجود ہیں کہ جن میں پہلی

شریعتوں کی پیروی سے مطلقاً منع کیا گیا ہے خواہ وہ قرآن وحدیث میں ہوں یا نہ ہوں ارشاد ہے کہ: **وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ** ”جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے، اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا۔“(آل عمران:85) ،اور فرمایا **اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ** ”بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے“(آل عمران:19)۔ یہ اس حوالے سے نص ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی دین کو کسی شخص کی جانب سے اختیار کرنا قابلِ قبول نہیں، پھر کس طرح مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی اور شرع کی پیروی کریں؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ** ”اور ہم نے آپ ﷺ کی طرف حق کے ساتھ یہ کتاب نازل فرمائی ہے جو اپنے سے اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان کو منسوخ کرنے والی ہے“(المائدہ:48)۔ اس آیت میں قرآن کا گزشتہ کتابوں کی مُهَيْمِنًا (غالب، احاطہ کرنے والی) کا مطلب ان کی تصدیق نہیں۔ کیونکہ تصدیق کا لفظ اس آیت میں مُصَدِّقًا آگیا اور مُهَيْمِنًا کا معنی یہاں ناسخ (منسوخ کرنے والی) ہے۔ اس بات پر اجماع بھی ہو چکا ہے کہ اسلام گزشتہ تمام شریعتوں کو منسوخ کرتا ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ: **اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ہ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْاَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** ”کیا یعقوبؑ کے انتقال کے وقت تم موجود تھے؟ جب انہوں نے اپنی اولاد کو کہا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ تو سب نے جواب دیا کہ آپ کے معبود کی اور آپ کے آباؤاجداد ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی، جو واحد معبود ہے ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے۔ یہ جماعت تو گزر چکی جو انہوں نے کیا وہ ان کے لیے ہے اور جو تم کرو گے تمہارے لیے ہے، ان کے اعمال کے بارے میں تم نہیں پوچھے جاؤ گے“(البقرہ:134-133)۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دے دی کہ وہ ہم سے ان انبیاء کے اعمال کے بارے میں نہیں پوچھے گا اور جب ان کے اعمال کے بارے میں ہم سے نہیں پوچھے گا تو ان کی شریعت کے بارے میں بھی ہم سے نہیں پوچھے گا کیونکہ اس کی تبلیغ اور

اس پر عمل کرنا ان کے اعمال کا حصہ ہے پھر جس چیز کے بارے میں ہم سے پوچھا ہی نہ جائے گا تو ہم سے اس کا مطالبہ بھی نہیں اور وہ ہمارے لیے لازم بھی نہیں۔ جابرؓ سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي: كَانَ كُلُّ نَبِيٍّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى كُلِّ أَحْمَرَ وَأَسْوَدَ»** ''مجھے وہ پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی (نبی) کو نہیں ملیں: ہر نبی کو خاص اس کی اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا جبکہ مجھے ہر سرخ اور کالے کی طرف بھیجا گیا''، اس کو مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے اور یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«فُضِّلْتُ عَلَى الأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ»** ''مجھے دوسرے انبیاء سے چھ چیزوں میں فضلیت دی گئی''، اس کو بھی مسلم نے ذکر کیا ہے اور ان چھ چیزوں میں یہ بھی ہے کہ: **«وَأُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً»** ''مجھے تمام مخلوق کی طرف بھیجا گیا''۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خبر دی کہ ہمارے نبی ﷺ سے پہلے ہر نبی کو خاص اس کی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا، اپنی قوم کے علاوہ کسی اور کی طرف نہیں بھیجا گیا اور ان اقوام پر اپنے نبی کی شریعت کے علاوہ اور کسی شریعت کی پابندی کو لازم قرار نہیں دیا گیا جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ گزشتہ انبیاء میں سے کسی کو ہماری طرف نہیں بھیجا گیا اس لیے ان کی شریعت ہمارے لیے شریعت نہیں اور قرآن میں انتہائی صراحت سے اس کی تائید موجود ہے، ارشاد ہے: **وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا** ''اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا'' (ھود: 61) **وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا** '' اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ھود کو بھیجا'' (ھود: 50) **وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا** ''اور ہم نے مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا''۔ (ھود: 84) اس تمام بحث سے یہ واضح ہو گیا کہ ہم سے پہلی قوموں کی شریعتیں تین اسباب کی بنا پر ہمارے لیے شریعت نہیں: پہلا سبب یہ ہے کہ تمام دلائل جن سے یہ استدلال کیا جاتا ہے وہ سب صرف اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اصلِ توحید ایک ہی ہے اس بات پر بالکل دلالت نہیں کرتے کہ تمام انبیاء کی شریعتیں ایک ہیں۔ دوسرا سبب یہ کہ تمام نصوص میں اسلامی شریعت کے علاوہ دوسری شریعتوں سے منع کیا گیا ہے۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ ہر نبی کو ان کی قوم کی طرف بھیجا گیا اور ہم ان کی قوم نہیں اس لیے وہ ہماری طرف نہیں آئے یوں ہم ان کی شریعتوں کے مخاطب نہیں اور ان کی پیروی (یعنی شریعتوں کی پیروی) ہم پر لازم نہیں۔ اس

وجہ سے ہم سے پہلے کی کوئی شریعت ہمارے لیے شرعی دلائل کی حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ تو آیات کے بارے میں ان کے استدلال کے حوالے سے تھا۔ رہی بات ان کے اس استدلال کی کہ رسول ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس کی تبلیغ کے لیے آئے اس سب کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ یہ اس پہلو سے تو صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس بھی حکم کی تبلیغ کر دی اس کی پابندی ہم پر لازم ہے اور یہ وہ شریعت ہے جو آپ ﷺ لے کر آئے، تا ہم یہ کہنا اُس معالے میں صحیح نہیں کہ جس کی پابندی کا ہمیں حکم نہیں دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی طرف سے ہم سے پہلے گزری امتوں کے احوال ہمیں بتائے لیکن یہ عبرت اور نصیحت کے طور پر بتایا، ان شریعتوں کی پابندی کے لیے نہیں، اسی طرح کئی انبیاء کے قصے، ان کی خبریں اور ان کی امتوں کی خبریں بتائیں، ان کے احوال بیان کیے اور یہ بھی بتایا کہ وہ کن احکامات کی پیروی کرتے تھے۔ یہ سب کے سب صرف اور صرف عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لیے ہے کسی اور مقصد کے لیے نہیں۔ ان کی پابندی ہمارے لیے ضر وری نہیں۔ جہاں تک قصوں اور خبروں کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ وہ وعظ اور عبرت کے لیے ہیں جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں، جہاں تک امتوں کے احوال اور جن احکامات کی وہ پیروی کرتے تھے، کا تعلق ہے تو وہ بطورِ حکایت بیان کیے گئے ہیں ان کی پابندی کے لیے نہیں۔ یہ بھی قصص کی طرح ہیں، مزید یہ کہ ان میں سے بہت سے احکامات اپنی تفاصیل میں اسلامی شریعت سے مختلف ہیں۔ اس لیے اگر ہم ان احکامات کے بھی مخاطب ہیں تو گویا ہم دو مختلف شریعتوں کے مخاطب ہیں جو کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ مثال کے طور پر سلیمان علیہ السلام کی شریعت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: **وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ہ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ** ”آپ نے پرندوں کا جائزہ لیا اور فرمانے لگے یہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا؟ کیا واقعی وہ غیر حاضر ہے؟ یقیناً میں اسے سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر ڈالوں گا، یا میرے سامنے کوئی صریح دلیل بیان کرے“ (سورۃ النمل:20-21)۔ مسلمانوں میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں کہ پرندہ کوئی نقصان کرے اس کی سزا ساقط ہے بلکہ تمام حیوانات کی سزا ساقط ہے۔ اس حوالے سے نص موجود ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«الْعَجْمَاءُ جَرْحُهَا جُبَارٌ»** ”حیوانات کے جرائم کی کوئی ذمہ داری نہیں“ ابوہریرہ ؓ

کی یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ القاموس المحیط میں ہے کہ ”الجبار، سحاب کے وزن پر ہے اور اس کے معنی ضائع اور باطل کے ہیں“۔ جانوروں کے جرائم (کاٹنے یا مارنے وغیرہ) کا کوئی ذمہ نہیں اور ان پر کوئی سزا نہیں اور پرندے بھی اس میں داخل ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: **وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ** "اور ہم نے ان پر تمام ناخن والے جانور حرام کر دیے تھے اور گائے اور بکری میں سے ان دونوں کی چربیاں ان پر ہم نے حرام کر دی تھیں، مگر وہ جو ان کی پشت پر یا انتڑیوں میں لگی ہو یا جو ہڈی سے ملی ہو“ (الانعام:146)۔ اسلامی شریعت میں یہ تمام چیزیں کئی ایک نصوص کے مطابق حلال ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے شریعت محمدی کی رو سے کئی چیزوں کو بنی اسرائیل کے لیے حلال قرار دیا جو پہلے ان پر حرام تھیں فرمایا: **وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ** ”اور تمہارا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے“(المائدہ:5)۔ جانور کی چربی بھی ہمارے کھانے کی چیز ہے جو ان کے لیے بھی حلال ہے۔ زکریا علیہ السلام کے زمانے کی شریعت کے بارے اللہ تعالیٰ نے مریم علیہ السلام کی والدہ کا یہ قول ذکر کیا ہے کہ: **اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا** ”اے میرے رب! میرے پیٹ میں جو کچھ ہے اسے میں نے تیرے نام آزاد کرنے کی نذر مانی“ (آل عمران:35)۔ یہ بھی اسلام میں بالکل جائز نہیں، اسی طرح یعقوب علیہ السلام کی شریعت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ اِسْرَآئِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآئِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ** ”کھانے کی تمام چیزیں بنی اسرائیل پر حلال تھیں سوائے اس کے جس کو یعقوب نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا“ (آل عمران:93)۔ اسلام میں یہ بالکل جائز نہیں کہ کوئی اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے اوپر حرام کرے کیونکہ ارشاد باری ہے: **يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ** ”اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے اسے کیوں حرام کرتے ہو“ (التحریم:1)۔ اسی طرح اہل کتاب کی شریعت میں اصحابِ اہل کہف کے بارے میں ارشاد ہے کہ: **قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا** ”جن لوگوں نے ان کے بارے میں غلبہ پایا وہ کہنے لگے کہ ہم تو ان کے اوپر (آس پاس) مسجد بنالیں گے“(الکھف:21)۔ اسلام میں قبروں پر مسجد بنانا حرام ہے۔

عائشہؓ سے روایت ہے کہ اُمہات المومنین امِ حبیبہؓ اور امِ سلمہؓ نے حبشہ میں ایک ایسا کلیسا دیکھا جو تصویروں سے سجایا گیا تھا اور اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّ أُولَئِكَ إِذَا كَانَ فِيهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، فَأُولَئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»** ''وہ لوگ ایسے تھے کہ ان میں سے کوئی نیک آدمی مر تا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے اور اس مسجد میں ان افراد کی تصویریں سجا لیتے اور وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں بد ترین لوگوں میں شمار ہوں گے'' (متفق علیہ)۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ** ''اور ہم نے اس (تورات) میں لکھ دیا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں پر بھی قصاص (بدلہ) ہے'' (المائدہ:45)۔ ہم اس پر عمل نہیں کرتے کیونکہ ہمیں اس طرح کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ ہمیں دوسرا حکم دیا گیا ہے۔ ان معاملات میں اسلام نے ہم پر انصاف کے ساتھ بدلہ لینے کا حکم دیا، ارشاد ہے: **فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ** ''جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اسی کے مثل زیادتی کرو جو تم پر کی ہے'' (البقرۃ:194)۔ اور فرمایا: **وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ** ''اور اگر بدلہ لو بھی تو بالکل اتنا ہی جتنا صدمہ تمہیں پہنچایا گیا ہو'' (النحل:126)۔ پھر فرمایا **وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا** ''اور برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے'' (الشوریٰ:40)۔ پھر یہ بات کہ مذکورہ آیت کے آخر میں **وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ** ''زخموں پر بھی قصاص ہے'' اسلامی قصاص کے برخلاف ہے۔ اسلام میں قصاص اَرش ہے، تورات میں اَرش قبول کرنے کا کوئی حکم نہیں۔ ارش کا حکم صرف اسلام میں ہے اور ارش، دیت (خون بہا) کو کہتے ہیں، جان سے کم کی دیت کو ارش کہا جاتا ہے۔ یوں سابقہ انبیاء اور سابقہ امتوں کے قصوں میں بیان کیے گئے احکامات اسلامی احکامات کے خلاف ہیں۔ پھر ہم کس طرح ان احکامات کی مخاطب ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی شریعت کے احکامات کے ذریعے ان احکامات کو منسوخ کر دیا گیا کیونکہ یہ احکامات مطلق ہیں اور جو احکامات ہمارے لیے

آئے ہیں وہ ہم سے پہلے والوں کے احکامات کو منسوخ کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ صرف ہمارے لیے شریعت کے طور پر آئے ہیں ان احکامات کا گزشتہ احکامات سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں، کہیں بھی کوئی نسخ وارد نہیں ہوئی۔ نسخ کا دعویٰ کرنا بے تکا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ نسخ کہتے ہیں پہلے آنے والے نص سے حاصل ہونے والے حکم کو بعد میں آنے نص کے ذریعے باطل (منسوخ) کرنا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں ہے کہ: **«نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا»** "میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب زیارت کیا کرو" ۔ اس کو مسلم نے بریدہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور مسند میں ربیع سے ابن عباسؓ کے حوالے سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، أَلاَ فَزُورُوهَا»** "میں نے تمہیں قبروں پر جانے سے منع کیا تھا اب جایا کرو" ۔ یوں نئی نص کے ذریعے پہلے حکم کو باطل (منسوخ) کرنا یعنی پرانے حکم کو ختم کرنا نسخ کہلاتا ہے۔ نسخ میں یہ ضروری ہے کہ وہ حکم جو منسوخ کیا گیا ہے پہلے اس کا نزول ہو چکا ہوا اور پھر دوسری نص کے ذریعے اس حکم کو ختم کر دیا گیا ہو، اور ناسخ حکم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسمیں اس بات پر دلالت ہو کہ یہ پہلے حکم کو منسوخ کر رہا ہے، اس کے بغیر نسخ نہیں سمجھا جائے گا۔ دو حکموں کے درمیان اختلاف یا تناقض کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایک حکم دوسرے کے لیے ناسخ ہے، بلکہ منسوخ کرنے والے نص میں اس بات کا قرینہ ہونا ضروری ہے کہ وہ ناسخ ہے، یعنی فلاں حکم کے لیے ناسخ ہے۔ یوں گزشتہ شریعتوں کے یہ احکامات اسلامی احکامات کے مخالف اور متضاد ہونے کی وجہ سے منسوخ نہیں کیونکہ اس کی کوئی دلیل موجود نہیں بلکہ اسلام کے شرعی احکامات اور گزشتہ احکامات کے درمیان سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں کہ جسے وہ منسوخ کر دے۔ ایسا نہیں کہ کسی اسلامی حکم نے گزشتہ شریعتوں کے کسی حکم کو منسوخ کر دیا یعنی ایک خاص حکم نے دوسرے حکم کو منسوخ کر دیا ہو، جی ہاں! ایسا بالکل نہیں۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ کہنا غلط ہے کہ سابقہ رسول جو کچھ لائے ہیں، ہم اس سب کا مخاطب ہیں۔ یہ استدلال بالکل غلط ہے بلکہ درست بات یہ ہے کہ ہم اس چیز کے مخاطب ہیں جو آپ ﷺ ہمارے لیے بطور شریعت لے کر آئے ہیں اور ہم اسی کے پابند ہیں۔ یوں یہ بات واضح و ظاہر ہو گئی کہ ہم سے پہلے لوگوں کی شریعتیں

ہمارے لیے شریعت نہیں، اس لیے وہ شرعی ادلہ میں سے بھی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلی شریعتوں میں موجود کسی حکم کے بارے میں کوئی نص وارد ہوئی ہو اور اس میں یہ دلالت بھی ہو کہ ہم اس کے مخاطب ہیں تب کتاب و سنت میں وارد یہ حکم اس دلالت کی وجہ سے ہمارے لیے حکم ہو گا اور ہم اس کے مخاطب ہوں گے کیونکہ اب یہ ہماری شریعت ہے اور شارع کی جانب سے ہم سے خطاب اس کی دلیل ہے، اس لیے حکم پر عمل کرنا فرض ہو گا تاہم یہ عمل کرنا اس وجہ سے نہیں کہ یہ حکم گزشتہ شریعت میں بھی تھا بلکہ یہ اس لیے کہ شارع نے ہمیں بھی یہی حکم دیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں مخاطب کر کے حکم دیا اور رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم ہم تک پہنچایا اور ہمیں بتایا کہ یہ ہماری شریعت ہے، یعنی یہ اسلامی حکم ہے۔ کتاب و سنت میں موجود گزشتہ شریعتوں کے احکامات کی چھان بین کرنے سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جہاں جہاں ہمیں مخاطب کیا گیا ہے یعنی وہ احکامات اب ہماری شریعت ہیں، اس کی تین حالتیں ہیں:

پہلی حالت یہ ہے کہ جس آیت میں حکم ہے اس میں ہمیں متوجہ کر کے حکم دیا گیا ہے جیسا کہ کنز (خزانہ) والی آیت میں ہے: **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ** "اے ایمان والو! اکثر علماء اور عابد لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روک دیتے ہیں اور جو لوگ سونے چاندی کا خزانہ رکھے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجئے" (التوبہ:34)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم سے خطاب کیا ہے اسمیں جو کچھ ہے وہ ہمارے لیے شریعت ہے۔ اس وجہ سے ہماری شریعت میں خزانہ جمع کر کے رکھنا حرام ہے اگرچہ خزانے کو حرام قرار دینے والی اس آیت میں بنی اسرائیل کے علماء ومشائخ کا بیان بھی ہے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ وہ آیت جس میں حکم آیا ہے وہ ایسے الفاظ کے ساتھ ہو جو عمومیت پر دلالت کرتا ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت نہ کرنے کے سزا کے بارے میں جو آیات

ہیں، ان میں ارشاد ہے **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ** ”جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کیساتھ فیصلے نہ کریں، وہ کافر ہیں“ (المائدۃ:44)۔ اس میں لفظ (مَنْ) ”جو کوئی بھی“ اِس حکم کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ ہمارے لیے بھی ہے اور ہم بھی اس کے مخاطب ہیں۔ اسی طرح یہ آیت ہے کہ: **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ** ”جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق حکم نہ کریں وہی لوگ ظالم ہیں“ (المائدۃ:45)۔ یہی معاملہ اس آیت کا بھی ہے کہ **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ** ”اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ سے ہی حکم نہ کریں تو ایسے لوگ ہی فاسق (بدکار) ہیں“ (المائدہ:47)۔

تیسری حالت یہ ہے کہ آیات کے بعد ایسی بات ہو جو ہمیں متوجہ کرتی ہو، اس کی مثال یہ آیت ہے جس میں قارون کا قصہ ہے، ارشاد ہے کہ **اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ وَاٰتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓءُ بِالْعُصْبَةِ اُولِى الْقُوَّةِ** ”قارون تھا تو قوم موسیٰ سے لیکن اُن پر اکڑنے لگا تھا ہم نے اسے (اس قدر) خزانے دے رکھے تھے کہ ایک طاقتور جماعت بہ مشکل اس کی کنجیاں اٹھا سکتے تھے“ (القصص 76)۔ آگے اس آیت کے بعد فرمایا: **وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُوْنَ** ”کیا دیکھتے نہیں ہو کہ ناشکروں کو کبھی کامیابی نہیں ہوتی“ (القصص:82)۔ پھر ان آیات کے بعد ہی فرمایا: **تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا** ”آخرت کا یہ بھلا گھر ہم ان کے لیے مقرر کر دیتے ہیں جو زمین میں نہ تو اکڑتے (غرور کرتے) ہیں اور نہ فساد کی چاہت رکھتے ہیں، پرہیز گاروں کے لیے نہایت ہی عمدہ انجام ہے“ (القصص:83-84)۔ یوں یہاں اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کو خطاب کیا گیا ہے، اسی کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور کہا گیا ہے **لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ** ”زمین میں غرور (اکڑ) نہیں کرتے ہیں“۔ یہ احکامات قارون کے بارے میں تھے جس نے زمین پر غرور (فخر) اور بڑائی اختیار کی لیکن ہم بھی ان احکامات کے مخاطب ہیں۔

یہی تین احوال تھے جن میں موجود احکامات ہمارے لیے شرعی احکامات ہیں کیونکہ یہاں ایسی دلالت موجود ہے کہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہمیں مخاطب کیا گیا ہے اور ہم اسلامی شریعت کے احکامات سمجھ کر ان کی پابندی کریں گے نہ کہ یہ سمجھ کر کہ یہ ہم سے پہلی شریعتوں کے احکامات ہیں کیونکہ پہلی شریعتوں کے احکامات ہمارے لیے شرع نہیں۔

جولوگ یہ کہتے ہیں کہ استحسان بھی ادلہ شرعیہ میں سے ہے، وہ اس کے لیے شرع سے کوئی دلیل نہیں لاسکتے حتی کہ کوئی ظنی دلیل بھی نہیں۔ جولوگ استحسان کو شرعی دلیل مانتے ہیں وہ اس کی یہ تفسیر کرتے ہیں کہ یہ ایسی دلیل ہے جو مجتہد کے دماغ میں ہوتی ہے جسکو وہ ظاہر نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے لیے مجتہد کے پاس مناسب الفاظ نہیں ہوتے۔ اس کی تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ قوی ترین سبب کی بنا پر اجتہاد کی صورتوں میں سے ایک صورت کو ترک کرنا، جبکہ اس سبب کو بیان کرنے کے لیے جامع الفاظ نہ ہوں۔ وہ لوگ اس کی تفسیر اس طرح بھی کرتے ہیں کہ ایک مسئلے میں کسی قوی سبب کی وجہ سے ایک حکم کو چھوڑ کر دوسرے حکم کو اختیار کرنا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک مسئلے کو اس جیسے دوسرے مسائل سے الگ کرنا۔ پھر استحسان کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں: ایک کو استحسان قیاسی کہتے ہیں جبکہ دوسری قسم کو استحسان بِلضرورت کہتے ہیں۔ استحسان قیاسی یہ ہے کہ ایک مسئلے کے ایسے حکم سے جو ظاہری قیاس سے معلوم ہو گیا ہو ایسے حکم کی طرف منتقل ہونا جو اس قیاس سے مختلف قیاس کے نتیجے میں معلوم ہوا ہو، جو پہلے قیاس سے زیادہ دقیق اور خفیہ ہو لیکن دلیل اور نقطہ نظر کی وضاحت کے حساب سے پہلے قیاس کے حکم سے مضبوط ہو۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص نے ایک ہی سودا (ڈیلنگ) میں دو آدمیوں سے ایک گاڑی قرض پر خریدی، پھر دو آدمیوں میں سے ایک گاڑی خریدنے والے سے اس قرض میں سے کچھ پیسے وصول کرے جو کہ اکیلے اس کا نہیں بلکہ اس کے دوسرے شریک کا بھی حصہ ہے اور اس شریک (حصہ دار) کو اپنے حصے کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے، کیونکہ جس شخص نے جو رقم وصول کی ہے وہ ایسی چیز کی قیمت میں سے ہے جو کہ مشترک تھی اور ایک ہی سودے میں بیچ دی گئی تھی۔ اب دونوں شریکوں میں سے کسی کی طرف سے بھی رقم وصول کرنا ایسا ہے جیسا کہ دونوں نے وصول کیا گویا کہ یہ

کمپنی (شریک) کی طرف سے وصولی ہے ایک شخص کی طرف سے نہیں۔ اب اگر یہ وصول کی ہوئی رقم دوسرے شریک پارٹنر کو ملنے سے پہلے ہی ضائع ہو جائے تو قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ نقصان دونوں شریکوں کا ہے یعنی کمپنی کا ہے لیکن استحسان یہ ہے کہ یہ نقصان صرف اس شخص کا ہے جس نے رقم اپنے قبضے میں لی تھی اور دوسرا شریک استحساناً اس نقصان کے زمرے میں نہیں آئے گا، کیونکہ وہ وصولی کے وقت شریک نہیں تھا بلکہ وہ خسارے کو رقم وصول کرنے والے پر ڈال کر اپنا حصہ قرضدار (گاڑی خریدنے والے) سے لے سکتا ہے۔ استحسان کے قائل لوگ اسی قسم کی کئی مثالیں دیتے ہیں اور اسی کو استحسان قیاسی کہا جاتا ہے۔

جہاں تک استحسانِ ضرورت کا تعلق ہے، تو استحسان ضرورت وہ ہے جس میں انتہائی ضرورت کو دیکھ کر قیاس کے حکم کے برخلاف عمل کیا گیا ہو۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ کسی مسئلے میں قیاس کا حکم کسی مشکل یا حرج کا سبب بنتا ہو تب استحساناً اس حکم کو چھوڑ کر ایسا حکم اختیار کیا جاتا ہے جس سے حرج نہ ہو اور مشکل بھی حل ہو۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اجیر (ملازم) کا ہاتھ امانت والا ہاتھ ہوتا ہے اگر اس کے ہاتھ سے غیر اختیاری طور پر یعنی اس کی کسی غلطی کی بغیر، کوئی نقصان ہو تو وہ اس کی ذمہ داری نہیں مثلاً ایک شخص کو ایک مہینے کے لیے دوسرے شخص کے لیے کپڑا سینے کے لیے گھر میں ملازم رکھا گیا تو یہ پرائیوٹ ملازم ہے۔ اب اس کے ہاتھ سے کوئی کپڑا ضائع ہو گیا جس میں اس کا اختیار شامل نہیں تو وہ اس نقصان کا ذمہ دار نہیں کیونکہ اس کا ہاتھ صرف امانت کا ہاتھ تھا۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص کو دوسرے کے لیے کپڑا سینے کے لیے دکان میں ملازم رکھا گیا اور وہ عام لوگوں کے کپڑے سیتا ہو تو وہ اجیر عام (عام ملازم) ہے، اب اس کے ہاتھ سے کوئی کپڑا ضائع ہو گیا تو اس پر ذمہ داری ہو گی، یعنی عام ملازم نقصان کا ذمہ دار ہو گا، تاکہ وہ اپنی طاقت سے زیادہ کام نہ لے اور لوگوں کے اموال کو ضائع نہ کرے۔

یہ ہے استحسان کا خلاصہ اور ان کے دلائل اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ دلائل سرے سے دلائل ہی نہیں، بلکہ عقلی اختراع ہیں، کیونکہ یہ نہ کتاب اللہ سے ہیں اور نہ ہی سنت رسول اللہ ﷺ سے۔ قطعی دلیل تو دُور کی بات ہے اس بات کی ظنی دلیل بھی نہیں کہ استحسان شرعی دلیل ہے۔ یہ تو تھا ایک پہلو سے جبکہ

دوسرے پہلو سے جو عقلی وجوہات وہ بیان کرتے ہیں وہ بالکل ہی باطل ہیں۔ استحسان کی یہ سب تفاسیر explanations بھی باطل ہیں، پہلی تفسیر اس لیے باطل ہے کہ مجتہد کا اپنی دلیل کو بیان کرنے پر قادر نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دلیل اس کے ذہن میں شفاف اور واضح نہیں اس لیے وہ ادلہ شرعیہ میں سے ہو ہی نہیں سکتی۔ باقی تفسیر میں ان سب کا تقریباً ایک معنی ہے کہ وہ یہ ہے کہ ایک مسئلے میں ایک حکم کو چھوڑ کر اس سے مضبوط حکم کی طرف جانا یعنی قوی دلیل کی وجہ سے قیاس کو تبدیل کرنا۔ ان تفسیرات میں قوی دلیل سے مراد اگر کتاب وسنت ہوتا تو یہ سرے سے استحسان ہی نہیں بلکہ ایک نص کو دوسرے نص پر ترجیح دینا ہے، تب یہ استدلال بالنص ہو گا، یعنی کتاب وسنت سے استدلال ہو گا، اس کو استحسان سے استدلال نہیں کہا جائے گا۔ اگر قومی ترین دلیل عقل ہے اور عقل جس کو مصلحت سمجھتی ہے جیسا کہ وہ لوگ سمجھتے ہیں تو یہ بالکل باطل ہے۔ کیونکہ قیاس، نص سے ثابت شرعی علت کی بنیاد پر ہوتا ہے اور نص شارع کے خطاب کا نام ہے، جبکہ عقل یا مصلحت نص ہی نہیں، نہ ہی وہ نص سے زیادہ طاقتور کوئی علت ہے، بلکہ عقل یا مصلحت کا شرعی نص سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے اس طرح ایک حکم سے دوسرے حکم کی طرف منتقل ہونا باطل ہے۔ یہ تو تھا ان تفسیرات کے پہلو سے اور جہاں تک استحسان کی اقسام کی بات ہے تو استحسان قیاسی کا باطل ہونا دوسری تفسیرات کے باطل ہونے سے ہی ظاہر ہے یعنی ایک مسئلے میں اسی جیسے دوسرے مسائل کے بر خلاف حکم لگانا اور ان کا یہ کہنا بھی باطل ہے کہ یہ پوشیدہ (خفیہ) قیاس ہے کیونکہ اس کا قیاس سے تعلق ہی نہیں بلکہ یہ مصلحت کے لیے بہانہ سازی ہے۔ ایک ہی سودے میں فروخت کی گئی مشترکہ گاڑی کی قیمت کے ضائع ہونے کی صورت میں دو مختلف حکم ہرگز نہیں ہوسکتے کیونکہ جس نے بھی رقم وصول کی تھی وہ کمپنی کے لیے تھی اور وہ گاڑی بھی کمپنی کی تھی، یہ مال کسی ایک حصہ داری کا نہیں، اس مال کا ضائع ہونا کمپنی کا نقصان ہے جیسا کہ اس مال (قیمت) کو حاصل کرنا کمپنی کے لیے تھا، اب مصلحت کے لیے اس حکم کو تبدیل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ یہ خلاف شرع ہے۔

استحسانِ ضرورت کا باطل ہونا بھی ظاہر ہے کیونکہ اس میں بھی عقل، مصلحت اور فائدے کی بنیاد پر فیصلہ دیتی ہے، جو کوئی شرعی نص نہیں۔ اس میں شرعی نص سے ماخوذ علت پر ترجیح دی جاتی ہے یعنی شرعی نص

سے معلوم ہونے والی چیز پر عقلی علت کو ترجیح دی جاتی ہے جو کہ بالکل ہی بے معنی اور باطل بات ہے اور اس کے باطل ہونے پر کوئی کلام نہیں، پھر مشترکہ ملازم کو ذمہ دار ٹھہرانا اور پرائیوٹ ملازم کو ذمہ دار قرار نہیں دینا بلاوجہ ایک طور پر دوسرے کو ترجیح دینا ہے اور شرعی نص کے بھی خلاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے جو کہ بیہقی نے اپنے سنن الکبریٰ میں عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے باپ اور پھر دادا سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے کہا: «**ثُمَّ لاَ ضَمَانَ عَلَى مُؤْتَمَنٍ**» "پھر جس کے پاس امانت پڑی ہے اس کا کوئی ذمہ دار نہیں"۔ اسی طرح بیہقی نے ہی اپنے سنن الکبریٰ میں القاسم بن عبد الرحمن سے روایت کی ہے کہ علیؓ اور ابن مسعودؓ نے کہا ہے کہ **"لا ضَمانَ"** "جس کے پاس امانت رکھی ہے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں"۔ بیہقی نے ہی اپنی سنن میں جابرؓ کے حوالے سے روایت کی ہے کہ ابو بکر صدیقؓ نے ایک ایسی امانت رکھی ہوئی چیز کے بارے میں فیصلہ دیا جو تھیلے میں رکھی تھی اور تھیلے کے جلنے کی وجہ سے وہ ضائع ہو گئی تھی کہ اس شخص پر کسی قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ حدیث میں لفظ ' لا' لا نفی جنس ہے اور عمومیت پر دلالت کرتا ہے اور ہر قسم کی امانت رکھنے والا اس میں شامل ہے خواہ وہ عام ملازم ہو یا خاص ملازم۔ اس بحث سے یہ ثابت ہو گیا کہ استحسان سرے سے ہی ادلہ شرعیہ میں سے نہیں۔ اس کو ادلہ شرعیہ میں سے سمجھنا ہی غلط ہے، کیونکہ اس کے ادلہ شرعیہ میں سے ہونے کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی، نہ کتاب اللہ سے نہ سنت رسول ﷺ سے، اور نہ ہی اجماع صحابہؓ سے، اس کے لیے کسی قسم کی کوئی قطعی یا ظنی دلیل بھی نہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے دعوے دار جس طرح کا عقلی استدلال کرتے ہیں وہ بھی ساقط ہے اور اس کی بعض مثالیں شرعی نصوص کے بھی خلاف ہیں۔

جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مصالح مرسلہ بھی ادِلّہ شرعیہ میں سے ہے وہ اس کے لیے کوئی شرعی دلیل نہیں لا سکے۔ تاہم وہ یہ کہتے ہیں کہ پوری شریعت کی علت مفادات کا حصول اور نقصانات سے بچنا ہے، پس شرعی احکامات میں سے ہر حکم کی علت بھی یہی ہے کہ اس میں فائدے کا حصول اور نقصان سے بچاؤ ہے۔ تاہم ان میں سے بعض یہ شرط رکھتے ہیں کہ اس کام کے مصلحت ہونے کے بارے میں شرع میں کوئی نص موجود ہو یا یہ پتہ چلتا ہو کہ یہ کام مصلحت میں سے ہے جبکہ بعض یہ شرط بھی نہیں لگاتے، بلکہ مصلحت (مفاد) کو شرعی دلیل

قرار دیتے ہیں اگر چہ اس کے بارے میں یا اس کی رعایت رکھنے کے بارے میں کوئی نص موجود نہ بھی ہو، کیونکہ ہر مصلحت ان عام مصالح میں داخل ہے جس سے فوائد حاصل ہوتے ہیں اور نقصانات سے بچا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں نے مصالح مرسلہ کی یہ تعریف کی کہ ہر وہ مصلحت (مفاد) جس کی اصل یا فروع کے بارے میں شرع میں کوئی نص نہ ہو۔ مرسلہ کا مطلب ہی مرسلة من الدليل ہے یعنی اس کے لیے دلیل کی ضرورت نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر مصلحت ایسی ہے کہ جس کے بارے میں کوئی خاص نص موجود ہے جیسے لکھنا، پڑھنا، سیکھنا (تعلیم حاصل کرنا) یا اس کے بارے میں عام نص ہے جو اس کی اہمیت کو بڑھا دیتی ہے جیسے ہر قسم کی اچھائی کا حکم دینا اور ہر قسم کی برائی سے منع کرنا، تب تو وہ مصالح مرسلہ ہے ہی نہیں۔ مصالح مرسلہ تو وہ ہوتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں اور اسے شریعت کی اس عمومیت سے لیا گیا ہے کہ شریعت کو مفادات کے حصول اور نقصانات سے بچاؤ کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ تاہم شرعی مصالح اور غیر شرعی مصالح میں فرق ہے۔ شرعی مصالح وہ ہیں جو شریعت کے مقاصد کے موافق ہیں۔ اور غیر شرعی مصالح وہ ہیں جو کہ شریعت کے مقاصد کے منافی ہیں۔ وہ مصالح مرسلہ شرعی دلیل سمجھے جائیں گے جو شریعت کے مقاصد کے موافق ہیں اور اگر وہ شریعت کے منافی ہیں تو نہ وہ مصالح مرسلہ ہیں اور نہ ہی شرعی دلیل۔ مصالح مرسلہ وہ ہے جس کے معتبر ہونے پہ شرعی نصوص مکمل طور پر دلالت کرتی ہیں، اس لیے جزوی احکام شرعیہ اسی کی بنیاد پر مبنی ہوتے ہیں چنانچہ جب کسی پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں شرعی نص موجود نہ ہو تب مصلحہ مرسلہ ہی دلیل ہو گی۔

یہ تھا مصلحہ کا خلاصہ اور یہ دو وجوہات کی بنا پر باطل ہے :

پہلی وجہ: کتاب و سنت کی شرعی نصوص بندے کے کسی خاص فعل کے بارے میں ہیں اور یہ نصوص اس فعل کا حکم معلوم کرنے کے لیے شرعی دلیل ہیں۔ ان نصوص کا مصلحت (فائدے یا مفاد) سے کوئی تعلق نہیں نہ ہی یہ مصلحت کو دلیل بنانے کے لیے جواز ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ : **فَرِهَانٌ مَّقْبُوْضَةٌ** "تو رہن (گروی) قبضہ میں رکھ لیا کرو" (البقرۃ:283) یا یہ فرمایا: **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ** "اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے

سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو"(البقرة:282)،اسی طرح یہ ارشاد کہ **وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ** "خرید و فروخت کے وقت بھی گو اہ مقرر کر لیا کرو"(البقرہ:282)،توان آیات میں خرید و فروخت کے وقت رہن رکھنے (ضمانت رکھنے) قرض کو لکھنے اور گواہ مقرر کرنے کے حکم کو بیان کیا گیا ہے،ان آیات میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ مصلحت ہے یا یہ مصلحت نہیں اور ان آیات میں نہ صراحت کے ساتھ مصلحت کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہی دلالت کے ساتھ ان نصوص میں کہیں بھی یہ نہیں کہ پھر کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایسی مصلحتیں ہیں کہ شریعت نے ان کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انہیں شرعی دلیل سمجھا جائے؟

شرعی علتیں جو شرعی نصوص میں وارد ہوئی ہیں،انسان کے فعل سے متعلق ہیں اور اس فعل میں حکم شرعی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہ شرعی علتیں اس لیے وارد نہیں ہوئیں کہ مصالح کو بیان کیا جائے یا مصالح کی طرف اشارہ کیا جائے،پس جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ** "تاکہ مال تمہارے دولت مندوں کے ہاتھ میں ہی گردش کر تا نہ رہ جائے"(الحشر:7)،اور جب یہ فرمایا **لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ** "تاکہ مسلمانوں پر اپنے لے پالکوں کی بیویوں کے بارے میں کسی طرح کی تنگی نہ رہے"(الاحزاب 37)،اور جب فرمایا: **وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ** "اور جن کی دل جوئی کی جانی ہو" (التوبہ:60)،توان آیات میں سے پہلی آیت میں مال کو مالداروں کو چھوڑ کر غریبوں اور فقیروں میں تقسیم کرنے کی علت بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ کہیں مال صرف مالداروں کے درمیان گردش کرتا نہ رہے،دوسری آیت رسول اللہ ﷺ کی زینب ؓ سے شادی کرنے کی علت بتائی گئی ہے اور وہ علت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی سابقہ بیوی سے شادی کرنا مباح ہے،جبکہ تیسری آیت میں ریاست کی جانب سے ان لوگوں کو مال دینے کی علت بیان کی گئی ہے جن کے دلوں کو موم کرنا مقصود ہو۔ ان آیات میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ یہ مصلحت (نفع بخش) ہے یا عدم مصلحت ہے،بلکہ اس کے فائدہ مند ہونے کی طرف دور دور تک کوئی اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے۔ نصوص میں صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس خاص حکم کے پیچھے علت یہ اور یہ ہے۔ پھر کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ علتیں جن پر شریعت دلالت کرتی ہے یہ دراصل

مصالح ہیں اوریوں یہ مصالح شرعی دلیل ہیں ؟ جب شرعی نصوص ہی اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ وہ مصلحت کے لیے آئی ہیں نہ حکم پر دلالت کرنے میں اور نہ حکم کی علت پر دلالت کرنے میں تو پھر یہ کہنا جائز نہیں کہ نصوص مصالح کی اصل یا مصالح کی فروع پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ شرعی نصوص میں کہیں بھی ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہ کہنا بالکل باطل ہے کہ شرعی نصوص اصل مصالح یا فروعی مصالح کے لیے دلیل ہیں، یوں ان مصالح کو شرعی دلیل سمجھنا ہی غلط ہے جب یہ حال ان مصالح کا ہے جو بقول ان لوگوں کے جن کی اصل یا فروع کے بارے میں شرعی دلیل وارد ہوئی ہے تو پھر وہ مصالح تو شرعی دلیل ہو ہی نہیں سکتے جن کے بارے میں کوئی نص وارد ہی نہیں ہوئی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مصالح مرسلہ کے قائلین نے اس کے مرسلہ ہونے کے لیے شرط لگادی کہ شرع میں ایسی کوئی دلیل موجو نہ ہو جو اس کے مصلحت ہونے کی اصل یا فروع پر دلالت کرتی ہو۔ ان کی طرف سے یہ شرط لگانا کہ شرع میں اس کے لیے کوئی خاص دلیل نہ ہو بلکہ صرف مقاصد شرعیہ سے ہی یہ معلوم ہوتا ہو کہ یہ مصلحت ہے، یہ کہنا ہی اس کے شرعی اعتبار کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہ ہونا اس کی تردید کے لیے کافی ہے، کیونکہ جس حکم کو اخذ کرنا ہے وہ شرع کا حکم ہے عقل کا حکم نہیں۔ اس لیے اس کے معتبر ہونے کے لیے لازم ہے کہ اس کے لیے وحی سے دلیل موجود ہو یعنی کتاب وسنت میں اس کی دلیل موجود ہو، اسمیں یہ شرط لگانا کہ اس کے لیے شرعی نص سے کوئی دلیل نہ ہو یہی اس کے غیر شرعی ہونے کی کافی دلیل ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ مصالح مرسلہ کو مقاصد شرعیہ کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے، یہ اس لیے غلط ہے کہ مقاصد شرعیہ کوئی نص نہیں کہ ان کو سمجھا جائے اور جو کچھ اس میں سے سمجھ میں آئے اس کو دلیل کے طور پر اختیار کیا جائے۔ پس اس بات کی کوئی قدر و قیمت نہیں کہ اس انداز سے جو کچھ سمجھ آجائے اسے حکم شرعی کی دلیل کے طور پر استعمال کیا جائے۔ پھر جن کو مقاصد شرعیہ کہا جاتا ہے اگر اس سے مراد وہ ہیں جن پر شرعی نصوص دلالت کرتی ہیں جیسے زنا کا حرام ہونا، چوری کا حرام ہونا، قتل کا حرام ہونا، شراب کا حرام ہونا یا اسلام سے

مرتد ہونے کا حرام ہونا یہ تو مقاصد شرعیہ نہیں بلکہ یہ تو بندے کے افعال کے احکامات ہیں، ان میں نص کے مدلول پر توقف کیا جائے گا، نص سے سمجھ میں آنے والے اس حکم کو شرعی دلیل (مقاصد شرعیہ) نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ یہ حکم شرعی ہے۔ جب اس سمجھ میں آنے والے حکم کو مقاصد شریعہ کہنے کا کوئی اعتبار نہیں تو پھر اس حکم کے بارے میں ذہن میں پیدا ہونے والے ان خیالات کو کس طرح مقاصد شرعیہ قرار دے کر شرعی دلیل کہا جاسکتا ہے۔ پس ایسا کرنا بالکل غلط ہے۔ اگر ان نصوص سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اس کو شریعت کی حکمت کہا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو بھیجے جانے کی حکمت کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ بھیجا جانا بندوں پر رحمت تھا، تو یہ حکمت ہے علت نہیں، حکمت کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں اس وجہ سے حکمت کو استدلال کے لیے استعمال کرنا درست نہیں کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ حکمت حاصل نہ ہو، اور اس حکمت سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہو اسے دلیل کے طور پر اختیار کرنا بدرجہ اولیٰ صحیح نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شرعی مقاصد یا اس سے سمجھ میں آنے والا مفہوم شرعی دلیل نہیں۔ اس پہلو سے بھی مقاصد شرعیہ کا شرعی دلیل ہونا باطل ہے اور یوں ہر لحاظ سے مصالح مرسلہ کا ادلہ شرعیہ ہونا باطل ہے۔

یہ تو ان اسباب کے حوالے سے تھا جن کی بنا پر مصالحہ مرسلہ کو شرعی دلیل قرار دیا گیا، رہی بات شرعی دلیل کی تو مصالح مرسلہ کے ادِلّہ شرعیہ میں سے ہونے کی کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی نہ کتاب میں نہ ہی سنت میں، نہ قطعی دلیل اور نہ ہی کوئی ظنی دلیل اس لیے مصالح مرسلہ کو شرعی دلیل سمجھنا کسی بھی طرح صحیح نہیں۔

اس تمام بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ ادلہ جن کے بارے میں قطعی دلیل سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی انہیں لائی ہے وہ صرف اور صرف چار ہیں یعنی کتاب، سنت، اجماعِ صحابہؓ اور شرعی علت پر مبنی قیاس، اس کے علاوہ کسی چیز کی قطعی دلیل موجود نہیں، نتیجتاً ادلہ شرعیہ یہی چار ہیں۔

تاہم یہ بات بھی ذہین نشین ہونی چاہئے کہ وہ احکام جو ادلہ اربعہ کے علاوہ کسی ایسی دلیل سے مستنبط کیے گئے ہوں جس کو ائمہ میں سے کوئی امام معتبر سمجھا ہو تو وہ ان کے ماننے والوں اور مخالفین دونوں کے نظر میں احکام شرعیہ ہیں، کیونکہ یہاں دلیل کا شبہہ ہے کہ یہ ادلہ شرعیہ میں سے ہے۔ مثال کے طور پر جس نے اجماع امت کو شرعی دلیل سمجھا اور اس کے مطابق کسی حکم کا استنباط کیا تو یہ حکم اسکے لیے حکم شرعی ہے اب اس کے لیے اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں، اسی طرح وہ اس کے مخالفین کی نظر میں بھی ایک حکم شرعی ہی ہے لیکن یہ ان کے حق میں حکم نہیں۔ یہی حال اس کا ہے جو یہ کہے کہ پہلی شریعتیں ہمارے لیے شریعت ہیں یا وہ لوگ جو مصالح مرسلہ یا استحسان یا پھر عقل کو ادلہ شرعیہ سمجھتے ہیں۔ ہر وہ حکم جو ان کے مطابق مستنبط کیا گیا ہو وہ حکم شرعی ہے خواہ ان لوگوں کی نظر میں ہو جو یہ کہیں کہ یہ ادلہ شرعیہ سے مستنبط ہے یا ان کے مخالفین کی نظر میں، اگرچہ یہ ان کے حق میں تو حکم شرعی ہے لیکن ان کے مخالفین کے حق میں حکم شرعی نہیں۔ یہ بالکل نصوص سے مستنبط کیے گئے احکامات کی طرح ہیں کیونکہ نص کے فہم میں اختلاف کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا کہ جس نے اس نص سے کسی حکم کا استنباط کیا ہو تو وہ اس کے حق میں تو حکم شرعی ہو لیکن اس کے مخالفین کی نظر میں وہ ایک غیر شرعی حکم ہو، بلکہ وہ تمام مسلمانوں کی نظر میں حکم شرعی ہی ہے، جب تک کہ اس نص سے اس مفہوم کا امکان ہے یعنی جب تک شبہہ دلیل موجود ہے۔ اور اگرچہ یہ سب مسلمانوں کے حق میں ایسا حکم شرعی نہیں ہو تا کہ جس پر وہ عمل پیرا ہوں، لیکن جس نے اس کا استنباط کیا ہے یا جو استنباط کرنے والے کی تقلید کرے، تو یہ ان کے حق میں تو حکم شرعی ہے جبکہ مخالفین کے حق میں وہ ایسا حکم شرعی نہیں کہ جس پر وہ عمل کریں۔ بہر حال اس کی حیثیت حکم شرعی کی ہی ہے، جو حکم کسی دلیل سے مستنبط کیا جاتا ہے بالکل اس حکم کی طرح ہے جو نص سے مستنبط کیا گیا ہے یعنی تمام مسلمانوں کی نظر میں وہ حکم شرعی ہے چاہے کوئی اس دلیل کو (جس سے حکم مستنبط کیا گیا ہے) شرعی دلیل مانتا ہے یا شرعی دلیل نہیں مانتا جب تک کہ اس کی شبہہ دلیل موجود ہو، جیسا کہ وہ ادلہ کہ جن کے باطل ہونے کو ہم نے ثابت کر دیا۔

دفعہ نمبر 13: بری الذمہ ہونا اصل ہے، عدالتی حکم کے بغیر کسی شخص کو سزا نہیں دی جاسکتی، کسی بھی شخص پر کسی بھی قسم کا تشدد جائز نہیں، جو اس کا ارتکاب کرے گا اس کو سزا دی جائے گی۔

یہ دفعہ تین امور پر مشتمل ہے:

پہلا امر بری الذمہ ہونے کا قاعدہ ہے، دوسرا قاضی کے حکم کے بغیر سزا نہ دینا، تیسرا تشدد کا جائز نہ ہونا ہے۔ پہلے امر کی دلیل وہ روایت ہے جو وائل بن حجرؓ نے نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ: «**جَاءَ رَجُلٌ مِنْ حَضْرَمَوْتَ وَرَجُلٌ مِنْ كِنْدَةَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ الْحَضْرَمِيُّ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنَّ هَذَا قَدْ غَلَبَنِي عَلَى أَرْضٍ لِي كَانَتْ لأَبِي، فَقَالَ الْكِنْدِيُّ: هِيَ أَرْضِي فِي يَدِي أَزْرَعُهَا لَيْسَ لَهُ فِيهَا حَقٌّ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لِلْحَضْرَمِيِّ: أَلَكَ بَيِّنَةٌ؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: فَلَكَ يَمِينُهُ، قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنَّ الرَّجُلَ فَاجِرٌ لا يُبَالِي عَلَى مَا حَلَفَ عَلَيْهِ وَلَيْسَ يَتَوَرَّعُ مِنْ شَيْءٍ، فَقَالَ: لَيْسَ لَكَ مِنْهُ إِلاَّ ذَلِكَ**» "رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی حضرموت (یمن کے شہر) سے اور ایک آدمی کندہ سے آیا۔ حضرمی شخص نے کہا: اس شخص نے میری اس زمین پر قبضہ کرلیا ہے جو میرے والد کی ہے۔ کندہ کے شخص نے کہا: یہ زمین میری ہے اور میرے قبضے میں ہے، میں کاشتکاری کرتا ہوں، اِس کا اُس زمین پر کوئی حق نہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے حضرمی سے کہا: کیا تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پھر اُسے تمہارے لیے قسم کھانی ہوگی۔ حضرمی نے کہا: اے اللہ کے رسول یہ آدمی فاجر ہے، اسے کوئی پرواہ نہیں وہ کوئی بھی قسم کھاسکتا ہے، اسے کسی کا ڈر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس سے قسم لینے کے سوا تمہارا اس پر کوئی حق نہیں" اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ: «**البينة على المدعي، واليمين على من أنكر**» "گواہی پیش کرنا دعویٰ کرنے والے کے ذمے ہے اور انکار کرنے والے کے ذمے قسم کھانا ہے"، اس کو بیہقی نے صحیح اسناد سے روایت کیا ہے۔ پہلی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے دعویٰ کرنے والے کو گواہ لانے کا پابند قرار دیا، اس کا یہ مطلب ہے کہ جس پر دعویٰ کیا جارہا ہے وہ شخص اس وقت

تک بَری ہے جب تک اس کا جرم ثابت نہیں ہو جاتا۔ دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے گواہی کے واجب ہونے کی حقیقت کو بیان کیا کہ وہ مدعی پر ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مدعی علیہ اس وقت تک بری ہے جب تک اس پر لگایا گیا الزام ثابت نہ ہو جائے۔

دوسرے امر کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«... مَنْ أَخَذْتُ لَهُ مَالاً فَهَذَا مَالِي فَلْيَأْخُذْ مِنْهُ، وَمَنْ جَلَدْتُ لَهُ ظَهْراً فَهَذَا ظَهْرِي فَلْيَقْتَصَّ مِنْهُ ...»** ''اگر میں نے کسی کا مال لیا ہو تو میرا مال موجود ہے اس میں سے لے لے اور اگر میں نے کسی کے پشت پر کوڑے مارے ہوں تو میری پشت حاضر ہے اس سے بدلہ لے''، اسے ابو یعلیٰ نے فضل بن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ ہیثمی نے کہا ہے کہ اس کی اسناد میں ابو یعلی عطا بن مسلم ہے جسے ابنِ حبان نے قابل بھروسہ قرار دیا ہے، جبکہ دوسرے لوگوں نے اس کو کمزور قرار دیا ہے اور باقی راوی قابل اعتماد ہیں۔ طبرانی نے المعجم الاوسط میں ان الفاظ کیساتھ روایت کیا ہے **(أَلا فَمَنْ كنتُ جَلَدْتُ له ظَهراً فهذا ظهري فَلْيَسْتَقِدْ ومن كنت أخذت له مالا فهذا مالي فَلْيَأْخُذْ منه ومن كنت شتمت له عِرْضاً فهذا عِرْضي فليستقد)** ''سنو! اگر میں نے کسی کے کمر پر کوڑے مارے ہوں تو اس کو چاہیے کہ اپنا بدلہ لے لے، اور اگر میں نے کسی کی عزت کے حوالے سے برا بھلا کہا ہو تو میری عزت حاضر ہے وہ اپنا بدلہ لے لے، اور اگر میں نے کسی کا مال لیا ہو تو میرا مال حاضر ہے اس کو چاہیے کہ اس میں سے لے لے''۔ جبکہ البدایہ والنہایہ میں ابنِ کثیر نے یہ الفاظ روایت کیے ہیں **(أَلا فَمَنْ كنتُ جَلَدْتُ له ظَهراً فهذا ظهري فَلْيَسْتَقِدْ ومن كنت أخذت له مالا فهذا مالي فَلْيَأْخُذْ منه ومن كنت شتمت له عِرْضاً فهذا عِرْضي فليستقد)** ''سنو! اگر میں نے کسی کے کمر پر کوڑے مارے ہوں تو اس کو چاہیے کہ اپنا بدلہ لے لے اگر میں نے کسی کا مال لیا ہو تو میرا مال حاضر ہے اس کو چاہیے کہ اس میں سے لے لے اور اگر میں نے کسی کی عزت کے حوالے سے برا بھلا کہا ہو تو میری عزت حاضر ہے وہ اپنا بدلہ لے لے''۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ اس وقت فرمایا جب آپ ﷺ حکمران تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے کسی کو ناحق سزا دی ہو تو وہ مجھ سے انتقام لے سکتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جرم ثابت ہونے سے پہلے رعایا میں

سے کسی کو اس جرم کی سزا دینا حکمران کے لیے حرام ہے۔ ملاعنہ (شوہر کے، کسی گواہ کے بغیر، بیوی پر بدکاری کا الزام لگانے) کے قصے میں بھی آپ ﷺ نے فرمایا **«لَوْ كُنْتُ رَاجِمًا أَحَدًا بِغَيْرِ بَيِّنَةٍ لَرَجَمْتُهَا»** ''اگر بغیر گواہی کے میں کسی کو سنگسار کرنے والا ہوتا تو اس عورت کو سنگسار کر دیتا''، یہ حدیث متفق علیہ ہے اور الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گواہ کے عدم موجودگی کی وجہ سے شبہہ ہونے کے باوجود اس عورت کو سنگسار نہیں کیا۔ ایک اور دلیل وہ ہے جو ابن عباسؓ کی حدیث میں اُن کے بارے میں ہے جن کے درمیان رسول اللہ ﷺ نے لعان کرایا تھا، اس کی نص یوں ہے: ''ایک مجلس میں ایک شخص نے ابن عباسؓ سے کہا: کیا یہ وہی عورت ہے کہ جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر بغیر گواہی کے میں کسی کو سنگسار کرنے والا ہوتا تو اس کو سنگسار کرتا، تو ابن عباسؓ نے کہا: نہیں، وہ عورت اسلام کے باوجود اعلانیہ بدکاری کرتی تھی'' (متفق علیہ)۔ یعنی اس کا بدکار ہونا معلوم تھا لیکن اس کے خلاف گواہ کوئی نہیں تھا۔ نہ ہی وہ خود اعتراف کرتی تھی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اس عورت کے اوپر زنا کا شبہہ موجود تھا لیکن ثابت نہ ہونے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس کو سنگسار نہیں کیا اور فرمایا: ''اگر میں بغیر گواہی کے کسی کو سنگسار کرتا تو اس عورت کو کرتا''۔ اس حدیث میں 'لو' کا لفظ امتناعی ہے یعنی گواہی نہ ملنے کی وجہ سے سنگسار نہ کرنا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حکمران کے لیے اپنی رعایا میں سے کسی کو سزا دینا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ کوئی ایسے گناہ کا مرتکب نہ ہو جس کو شرع گناہ قرار دیتی ہو اور یہ گناہ (جرم) کا ارتکاب ایسے قاضی کی مجلس میں ثابت نہ ہو جس کے پاس فیصلے کا اختیار ہو، کیونکہ گواہی اس وقت تک معتبر نہیں ہوتی جب تک وہ ایسے قاضی کے سامنے نہ ہو جس کو فیصلے کرنے کا پورا اختیار ہو اور یہ گواہی فیصلے کی اس مجلس میں دی گئی ہو۔

تاہم حکمران کو یہ حق حاصل ہے کہ ملزم کو جرم ثابت ہونے تک قید میں رکھے اور جرم ثابت کرنے کے لیے عدالت میں پیش کرے۔ لیکن یہ قید محدود مدت کے لیے ہوگی، غیر معینہ مدت کے لیے کسی کو قید کرنا جائز نہیں۔ قید کی مدت انتہائی مختصر ہونی چاہیے۔ ملزم کو قید میں رکھنے کے جواز کی دلیل وہ حدیث ہے جسے

ترمذی نے روایت کیاہے اور اسے حسن قرار دیاہے، احمد نے بھی اس حدیث کو نقل کیاہے جبکہ حاکم نے بھی اس حدیث کی اسناد کو صحیح قرار دیاہے۔ حدیث کے راوی بھز بن حکیم نے اپنے باپ اور دادا سے روایت کیاہے کہ «أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حَبَسَ رَجُلاً فِي تُهْمَةٍ، ثُمَّ خَلَّى عَنْهُ» "رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو کسی الزام میں قید کر لیا پھر اسے آزاد کیا"، حاکم نے اس کو ابوہریرہؓ کے حوالے سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: «أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حَبَسَ فِي تُهْمَةٍ يَوْماً وَلَيْلَةً» "رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو ایک تہمت (الزام) کی وجہ سے ایک دن اور ایک رات کیلئے قید کر دیا"، اگرچہ اس روایت کے اسناد میں ابراھیم بن خیثم ہے جس کے بارے میں بہت سی چہ میگوئیاں کی گئی ہیں لیکن یہی حدیث ایک اور روایت کی صورت میں بھی ہے جسے بیھقی نے الکبریٰ میں جبکہ ابنِ جارود نے المنتقیٰ میں بھز بن حکیم بن معاویہ اور اس نے اپنے باپ پھر دادا سے روایت کیاہے کہ: (أَنَّ النبيَّ ﷺ حَبَسَ رَجُلاً فِي تُهْمَةٍ ساعةً مِنْ نهارٍ ثُمَّ خَلَّى عنه) "نبی ﷺ نے ایک آدمی کو کسی الزام میں دن کے ایک پہر تک قید کر کے رکھا پھر آزاد کر دیا"۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ اس قید کی مدت محدود ہونی چاہیے اور ممکن حد تک کم سے کم ہونی چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو قید کر دیا پھر آزاد کر دیا، اس کو ایک دن اور ایک رات کے لیے قید رکھا اور یا پھر ایک پہر کے لیے قید میں رکھا۔ یہ قید اس کی سزا نہیں بلکہ مخفی حقائق کو جاننے کے لیے ہے۔

تیسرا امر یہ ہے کہ جرم ثابت ہونے سے پہلے ملزم کو سزا نہ دینا اور اسے مجرم قرار نہ دینا، اسی طرح ایسی سزا بھی نہ دینا جس کو اللہ تعالیٰ نے آخرت کا عذاب قرار دیاہے، یعنی آگ میں جلانے کی سزا۔ جہاں تک جرم ثابت ہونے سے قبل سزا نہ دینے کی دلیل کا تعلق ہے تو یہ رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ حدیث سے ثابت ہے کہ «لَوْ كُنْتُ رَاجِمًا أَحَدًا بِغَيْرِ بَيِّنَةٍ لَرَجَمْتُهَا» "اگر میں بغیر گواہی کے کسی کو سنگسار کرنے والا ہوتا تو اس عورت کو سنگسار کر دیتا"۔ یہ ابن عباسؓ سے مروی متفق علیہ روایت ہے حالانکہ وہ عورت زناکاری کیاکرتی تھی جیساکہ ابن عباسؓ کی روایت سے پتا چلتاہے۔ اگر ملزم سے اعتراف جرم کرانے کے لیے سزا دینا جائز ہوتا تو اس عورت کو سزا دی جاتی کیونکہ وہ اعلانیہ فاحشہ تھی۔ اس وجہ سے ملزم کو سزا دینا کسی حال

میں جائز نہیں اور نہ ہی جرم ثابت ہونے سے پہلے اس کو مارنا جائز ہے اور اس کو گالی وغیرہ دینا یا جرم کے ارتکاب کے ثبوت سے قبل کسی بھی قسم کی سزا حرام ہے۔ اس کی تائید ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ **«شَرِبَ رَجُلٌ فَسَكِرَ، فَلُقِيَ يَمِيلُ فِي الْفَجِّ، فَانْطُلِقَ بِهِ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَلَمَّا حَاذَى بِدَارِ الْعَبَّاسِ انْفَلَتَ فَدَخَلَ عَلَى الْعَبَّاسِ فَالْتَزَمَهُ، فَذُكِرَ ذَلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَضَحِكَ وَقَالَ: أَفَعَلَهَا وَلَمْ يَأْمُرْ فِيهِ بِشَيْءٍ»** ”ایک آدمی شراب پی کر مدہوش ہو گیا اور چلتے چلتے ایک کھڈے میں گر گیا، لوگ اسے لے کر نبی ﷺ کی طرف روانہ ہوگئے جب وہ عباس رضی اللہ عنہ کے گھر کے برابر آیا تو ہوش میں آ گیا اور عباس رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہو کر ان سے لپٹ گیا۔ نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو ہنس پڑے اور فرمایا: کیا اس نے واقعی ایسا کیا ہے، لیکن اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا“ اس کو ابو داؤد اور احمد نے روایت کیا ہے اور الفاظ ابو داؤد کے ہیں۔ اس شخص کی جانب سے اعتراف نہ کرنے اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس کا جرم ثابت نہ ہونے کی بنا پر آپ ﷺ نے اسے کوئی سزا نہیں سنائی۔ مطلب ہے کہ اس پر نشے میں ہونے کا الزام تھا لیکن ثابت نہیں ہو سکا تھا اور اقبال جرم کرنے کے لیے اس کو کوئی سزا نہیں دی گئی، صرف الزام کی وجہ سے اس کو کوئی سزا نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ملزم کو ایسے قاضی کی مجلسِ قضاء میں کہ جس کے پاس فیصلے کا اختیار ہو، جرم ثابت ہونے سے قبل کسی بھی قسم کی کوئی سزا نہیں دی جاسکتی۔ رہی بات اس روایت کی کہ افک کے واقعے میں علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے باندھی کو مارا، یہ خادمہ ملزم تھی ہی نہیں، اس لیے اس کو مارنے کو ملزم کو مارنے کے جواز کے لیے دلیل بنانا سرے سے ہی صحیح نہیں۔ علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے خادمہ بریرہ کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے مارنے کی روایت کو بخاری نے عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اس نوکرانی سے پوچھیں اور یہ رسول اللہ ﷺ تھے جنہوں نے اس باندھی سے پوچھا اور اس روایت میں تو علی رضی اللہ عنہ کی طرف مارنے کا ذکر ہی نہیں، روایت یوں ہے: **«وَأَمَّا عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، لَمْ يُضَيِّقِ اللَّهُ عَلَيْكَ وَالنِّسَاءُ، سِوَاهَا كَثِيرٌ، وَإِنْ تَسْأَلِ الْجَارِيَةَ تَصْدُقْكَ، قَالَتْ: فَدَعَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَرِيرَةَ فَقَالَ: أَيْ بَرِيرَةُ»** ”اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول، اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں رکھی ہے اور ان کے

علاوہ اور بھی بہت سی عورتیں ہیں، اگر آپ اس خادمہ سے پوچھیں تو وہ سچائی بتادے گی۔ عائشہؓ کہتی ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے بریرہ کو بلایا اور فرمایا: اے بریرہ..." ۔ اور بخاری ہی کی دوسری روایت میں یوں ہے کہ **«وَلَقَدْ جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَيْتِي فَسَأَلَ عَنِّي خَادِمَتِي، فَقَالَتْ: لاَ وَاللَّهِ، مَا عَلِمْتُ عَلَيْهَا عَيْبًا إِلاَّ أَنَّهَا كَانَتْ تَرْقُدُ حَتَّى تَدْخُلَ الشَّاةُ فَتَأْكُلَ خَمِيرَهَا أَوْ عَجِينَهَا، وَانْتَهَرَهَا بَعْضُ أَصْحَابِهِ فَقَالَ: اصْدُقِي رَسُولَ اللَّهِ ﷺ حَتَّى أَسْقَطُوا لَهَا بِهِ»** "رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں آئے اور میری خادمہ سے میرے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا: نہیں اللہ کی قسم! میں نے ان کے اندر اس کے علاوہ کوئی عیب نہیں دیکھا ماسوائے یہ کہ وہ سو جاتی تھیں یہاں تک کہ بکری گھر میں داخل ہو کر آٹے یا گوندھے ہوئے آٹے کو کھا جاتی تھی۔ آپ ﷺ کے بعض صحابہ نے اس کو ڈانٹا بھی اور کہا کہ: رسول اللہ ﷺ کو سچ سچ بتاؤ "۔ بخاری نے یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ علیؓ نے اس نوکرانی کو مارا۔ تاہم کچھ اور روایتوں میں ہے کہ علیؓ نے اس نوکرانی کی پٹائی کی، ابنِ ھشام نے اس پٹائی کا ذکر کیا ہے، چنانچہ سیرت ابنِ ہشام میں ابنِ اسحاق نے ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنھا سے روایت کیا ہے: **«وَأَمَّا عَلِيٌّ فَإِنَّهُ قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ النِّسَاءَ كَثِيرٌ، وَإِنَّكَ لَقَادِرٌ عَلَى أَنْ تَسْتَخْلِفَ، وَسَلِ الْجَارِيَةَ فَإِنَّهَا سَتَصْدُقُكَ، فَدَعَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَرِيرَةَ لِيَسْأَلَهَا، فَقَامَ إِلَيْهَا عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ فَضَرَبَهَا ضَرْباً شَدِيداً وَيَقُولُ: اصْدُقِي رَسُولَ اللَّهِ ﷺ، قَالَتْ، فَتَقُولُ: وَاللَّهِ مَا أَعْلَمُ إِلاَّ خَيْراً»** "جہاں تک علیؓ کی بات ہے تو انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! عورتیں تو بہت ہیں۔ آپ ایک کی جگہ دوسری بھی رکھ سکتے ہیں۔ اس نوکرانی سے پوچھیں یہ سچائی بتادے گی۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے بریرہ کو بلایا تاکہ اس سے پوچھ لیں۔ علی ابن ابی طالبؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس نوکرانی کو بہت پیٹا اور کہا: رسول اللہ ﷺ کو سچ سچ بتاؤ۔ عائشہ کہتی ہیں کہ وہ نوکرانی کہنے لگی کہ اللہ کی قسم! مجھے اچھائی کے علاوہ کچھ معلوم نہیں "۔

یہ روایت اگر بالفرض صحیح بھی ہے لیکن یہ ملزم کو مارنے کے جواز کی دلیل ہر گز نہیں، کیونکہ اس معاملے میں بریرہ نوکرانی ملزم تھی ہی نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ وہ گواہ تھی کہ گواہی دینے کے لیے اس کو مارا گیا ہو۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے علاوہ بھی کئی لوگوں سے پوچھا لیکن کسی کو نہیں مارا، زینت بنت جحش

سے پوچھا اور انہیں نہیں مارا حالانکہ ان کی بہن حمنہ بنت جحش عائشہؓ کے بارے میں افواہیں پھیلاتی رہی۔ اس لیے بخاری میں افک کے واقعے کے حوالے سے ہے کہ «قَالَتْ وَطَفِقَتْ أُخْتُهَا حَمْنَةُ تُحَارِبُ لَهَا، فَهَلَكَتْ فِيمَنْ هَلَكَ» ''ان کی بہن حمنہ بھی اس میں شامل رہی اور اس کے لیے لڑتی رہی۔ پس وہ بھی ہلاکت میں پڑنے والوں کے ساتھ ہلاکت میں پڑ گئی''۔

اس بات کا گمان تھا کہ زینبؓ کو حقیقت کا علم ہے اور ان سے پوچھا بھی گیا لیکن انہیں مارا نہیں گیا۔ اس لیے یہ نہیں کہا جائے گا کہ بریرہ کو گواہ ہونے کی وجہ سے مارا گیا ہو بلکہ اسے رسول اللہ ﷺ کی باندھی ہونے کی وجہ سے مارا گیا اور رسول اللہ ﷺ کو اپنی خادمہ کی پٹائی کا حق حاصل تھا اور اس کی پٹائی کی اجازت بھی دے سکتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے سوال کیا اور اس کے علاوہ دوسروں سے بھی سوال کیا اور علیؓ کی جانب سے اس کی پٹائی پر خاموش بھی رہے۔ اسی طرح صحابہؓ کی جانب سے اسے ڈانٹے پر بھی خاموش رہے لیکن کسی اور کو نہیں مارا یا کسی اور کی پٹائی پر خاموش نہیں رہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی پٹائی اس لیے جائز تھی کہ وہ باندھی تھی اور کوئی بھی شخص ادب سکھانے یا کسی معاملے کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے اپنے غلام کو ڈانٹ یا مار سکتا ہے۔ یہ حدیث ملزم یا گواہ کو مارنے کے جائز ہونے کی دلیل بالکل نہیں بلکہ یہ صرف اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے غلام کو ادب سکھانے یا کسی معاملے کی تحقیق کے لیے مار سکتا ہے۔ یوں ملزم کو مارنے کے لیے اس حدیث سے استدلال ساقط ہو جاتا ہے اور مارنے کے جائز نہ ہونے کی دلیل برقرار ہے اور وہ دلیل ہے رسول اللہ ﷺ کا مذکورہ فرمان کہ: ''اگر میں کسی کو بغیر گواہ کے سنگسار کرنے والا ہوتا تو اس عورت کو سنگسار کرتا'' (متفق علیہ)۔ اس کے راوی ابن عباسؓ ہیں، یوں ملزم کو مارنا، گالی دینا، ڈانٹنا یا اس پر تشدد کرنا بالکل جائز نہیں صرف اسے قید میں رکھنا جائز ہے جیسا کہ دلیل میں ہے۔

یہ تو تھا ملزم کا جرم ثابت ہونے سے پہلے سزا کے ناجائز ہونے کے حوالے، اب رہی بات ایسی سزا کی جسے اللہ تعالیٰ نے آخرت کا عذاب قرار دیا ہے، اسکی دلیل وہ حدیث ہے جس میں بخاری نے عکرمہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ: ''علیؓ کے پاس کچھ زندیقوں کو لایا گیا تو انہوں نے ان کو آگ میں جلا دیا، جب ابنِ عباسؓ

نے یہ بات سنی تو کہا کہ اگر میں ہوتا تو انہیں نہ جلاتا، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: **«لاَ تُعَذِّبُوا بِعَذَابِ اللَّهِ »** ”اللہ تعالیٰ کی سزا کی طرح سزا مت دو“۔ جبکہ بخاری نے ہی ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا **«وَإِنَّ النَّارَ لا يُعَذِّبُ بِهَا إِلاَّ اللَّهُ »** ”اور بے شک آگ کا عذاب صرف اللہ ہی دے سکتا ہے“۔ ابوداؤد نے بھی ابنِ مسعودؓ سے مروی ایک حدیث کے ضمن میں یہ الفاظ ذکر کیے ہیں کہ: **«فَإِنَّهُ لا يُعَذِّبُ بِالنَّارِ إِلاَّ رَبُّ النَّارِ»** ”یقیناً آگ کی سزا آگ کے پروردگار کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا“۔

یہی وجہ ہے کہ اگر قاضی کے سامنے مجلسِ قضاء میں ملزم کا جرم ثابت ہو گیا تب بھی اس کو کسی صورت آگ کا عذاب نہیں دیا جاسکتا نہ اس جیسی کوئی اور سزا جیسے بجلی کا کرنٹ وغیرہ۔ اُس کو صرف وہی سزا دی جاسکتی ہے جو شرع نے مقرر کر دی ہے۔ شریعت نے مجرموں کی سزاؤں کے لیے عقوبات مقرر کی ہیں جو کہ قتل، کوڑے، رجم (سنگسار)، نفی (جلاوطنی)، ہاتھ یا پیر کاٹنا، قید، اس کے مال کو ضبط کرنا، جرمانہ کرنا، ڈانٹنا اور بدن کے کسی حصے کو داغ دینا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی سزا دینا جائز نہیں، کسی کو آگ میں جلانا جائز نہیں البتہ اس کے مال کو آگ لگائی جاسکتی۔ کسی کے ناخن نکالنا، بھوئیں کاٹنا، بجلی کا کرنٹ دینا، پانی میں ڈبونا، اس پر ٹھنڈا پانی ڈالنا، بھوکا رکھنا، اس کو سردی سے بچاؤ کا سامان نہ دینا یا اسی طرح کوئی اور سزا دینا حرام ہے۔ بلکہ صرف وہ سزا دی جاسکتی ہے جو شریعت نے عقوبات کی صورت میں مقرر کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ مجرم کو کوئی بھی سزا دینا حکمران کے لیے حرام ہے۔ تشدد کرنا بالکل جائز نہیں اور جس نے ایسا کیا اس نے شرعی حکم کی خلاف ورزی کی اور اس کو اس فعل کی سزا ملے گی۔ یہ تھے دفعہ نمبر 13 کے دلائل۔

دفعہ نمبر14: افعال میں اصل حکمِ شرع کی پابندی ہے، اس لیے حکم شرعی معلوم کرکے ہی کوئی کام کیا جائے گا، جبکہ اشیاء میں اصل اباحہ (مباح ہونا) ہے جب تک کسی شے کے حرام ہونے کی دلیل وارد نہ ہو۔

مسلمان کو اپنے اعمال کو احکام شرعیہ کے مطابق انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد باری ہے: **فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ** "قسم ہے آپ ﷺ کے پروردگار کی! یہ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے، جب تک کہ تمام آپس کے اختلافات میں آپ ﷺ کو حاکم نہ مان لیں" (النساء: 65)، اور فرمایا: **وَمَآ اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا** "اور تمہیں جو کچھ رسول ﷺ دیں اسے لے لو، اور جس چیز سے روکیں رک جاؤ" (الحشر: 7)۔

مسلمان کی اصل یہ ہے کہ وہ احکامِ شرعیہ کا پابند ہوتا ہے۔ پھر یہ ایک شرعی قاعدہ ہے کہ **(لا شرع قبل ورود الشرع)** " شریعت سے پہلے کوئی حکم نہیں" ۔یعنی کسی بھی مسئلے میں اللہ کا حکم آنے سے پہلے اس کا کوئی حکم نہیں۔ اللہ کا حکم آنے سے پہلے اس مسئلے پر کوئی حکم نہیں لگایا جائے گا یعنی اس کے مباح ہونے کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔ اباحت بھی ایک حکم شرعی ہے اور لازمی طور پر یہ شارع کے خطاب سے ثابت ہونا چاہیے اس کے بغیر وہ حکم شرعی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ حکم شرعی کا مطلب بندوں کے افعال کے بارے میں شارع کا خطاب ہے اس لیے جس چیز کے بارے میں شارع کا خطاب نہ ہو وہ حکم شرعی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اباحت کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے حرام ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ اباحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بارے میں شرعی دلیل موجود ہے کہ یہ مباح ہے، یعنی شرع نے اس فعل کو کرنے یا ترک کرنے کا اختیار دیا ہے۔ لہٰذا اصل شارع کے خطاب کی پابندی ہے اور اباحت اصل نہیں، کیونکہ اباحت بذات خود حکمِ شرعی کی محتاج ہے۔ یہ عام قاعدہ ہے افعال اور اشیاء دونوں اس میں شامل ہیں۔ مسلمان جب کسی فعل کی انجام دہی کا ارادہ کرے ،چاہے یہ فعل (کام) کوئی بھی ہو، تو اس پر فرض ہے کہ وہ کام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کرے،

سو اس پر فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو معلوم کرے اس کو سمجھے اور اس کی پابندی کرے۔ اسی طرح مسلمان جب کسی چیز کو لینے یا دینے کا ارداہ کرے، چاہے وہ کوئی بھی چیز ہو، تو اس پر فرض ہے کہ وہ اس چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کرے، اس پر فرض ہے کہ وہ اس کو تلاش کرے اس کو سمجھے اور اس کی پابندی کرے۔ یہی وہ بات ہے جس پر آیات اور احادیث اپنے منطوق (الفاظ) اور مفہوم دونوں لحاظ سے دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ مسلمان کے لیے یہ حلال نہیں کہ وہ کوئی بھی کام یا کسی بھی چیز میں کوئی لین دین حکم شرعی کے بغیر کرے بلکہ اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے ہر فعل اور ہر شے میں حکم شرعی کی پابندی کرے۔

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کے بعد: **اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا** ''آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا'' (المائدہ:3)۔ اور فرمایا **وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَىْءٍ** ''اور ہم نے آپ ﷺ پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے جس میں ہر چیز کا مفصل بیان ہے'' (النحل:89)، کوئی فعل یا کوئی چیز ایسی نہیں رہتی جس کے حکم کی دلیل اللہ تعالیٰ نے بیان نہ کی ہو۔ ان دونوں آیتوں کو سمجھنے کے بعد کسی شخص کے لیے یہ حلال نہیں کہ وہ یہ موقف رکھے کہ بعض افعال، بعض اشیاء یا بعض حقائق حکمِ شرعی سے خالی ہیں، یعنی کہ شریعت نے ان کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور ان کی کوئی دلیل نہیں دی ہے یا مکلف کو اس کے بارے میں متنبہ نہیں کیا ہے یعنی ایسی علت بیان نہیں کی ہے کہ جس سے مکلف اس کا حکم معلوم کر سکتا ہو، کہ آیا وہ فعل یا چیز فرض ہے یا حرام، مندوب ہے یا مکروہ یا پھر مباح۔ کسی بھی شخص کا یہ کہنا اسلامی شریعت کو ملامت کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کے لیے یہ کہنا جائز نہیں کہ یہ فعل اس لیے مباح ہے کہ اس کے متعلق کوئی شرعی دلیل نہیں آئی ہے اور جس عمل کے بارے میں شرعی دلیل وارد نہ ہو وہ مباح ہوتا ہے۔ بالکل اس طرح یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ یہ شے (چیز) مباح ہے کیونکہ اس کے متعلق کوئی شرعی دلیل نہیں اور جس شے کے لیے دلیل نہ ہو وہ مباح ہے۔ اس لیے ہر فعل اور چیز کے بارے میں اللہ کے

حکم کو معلوم کرنا اور اس پر عمل کرنا فرض ہے اور یہ کہہ کر مباح قرار دینا حرام ہے کہ اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔

تاہم حکم شرعی چونکہ بندوں کے افعال سے متعلق شارع کا خطاب ہے۔ اس لیے خطاب بندے کے فعل کے علاج کیلئے آیا ہے نہ کہ کسی چیز کے لیے۔ لیکن اشیاء کا ذکر بندے کے فعل سے تعلق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا خطاب کا اصل موضوع بندے کا فعل ہے، اور اشیاء بندے کے فعل کے تابع کے طور پر ہیں خواہ خطاب فعل کے بارے میں ہو اور شے کا کوئی ذکر نہ ہو، جیسے کہ **كُلُوْا وَاشْرَبُوْا** "کھاؤ پیو"(البقرۃ:60) یا خطاب چیز کے بارے میں ہو اور فعل کا کوئی ذکر نہ ہو جیسے: **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيْرِ** "تم پر حرام کیا گیا ہے مردار، خون اور خنزیر کا گوشت"(المائدہ:3)۔ ان تینوں اشیاء میں تحریم کا حکم بندے کے فعل یعنی انسان کی طرف سے اسے کھانے، اس کی خرید و فروخت کرنے اور اسے اجرت پر دینے سے تعلق کی وجہ سے ہے۔ اس لیے حکم شرعی بندے کے فعل کے بارے میں ہوتا ہے خواہ وہ حکم کسی فعل کا ہو یا کسی چیز کا، یوں معلوم ہو گیا کہ افعال میں اصل حکم شرعی کی پابندی ہے کیونکہ خطاب صرف اور صرف بندے کے ساتھ ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ احکامِ شرعیہ کے دلائل کی تفصیلی چھان بین کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ نصوص جو احکام کے دلائل کے طور پر آئے ہیں ان میں خطاب کے رخ کے لحاظ سے فعل کی دلیل والی نصوص اور شے کی دلیل والی نصوص ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فعل سے متعلق نصوص میں رُخ فعل کی طرف ہے خواہ اس کے ساتھ شے کا ذکر کیا گیا ہو یا نہیں، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: **وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا** "اور اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کر دیا ہے"(البقرہ:275) یا اس ارشاد میں **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ** "اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں"(التوبۃ 123)، اور فرمایا **لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ** "کشادگی والے کو کشادگی سے خرچ کرنا چاہیے"(الطلاق:7) اور فرمایا: **فَلْيُؤَدِّ الَّذِى**

اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ ”جسے امانت دی دی گئی ہے وہ اسے ادا کر دے“ (البقرہ283)،اور فرمایا **كُلُوْا وَاشْرَبُوْا** ”کھاؤ پیو“(البقرۃ:60)،اور رسول اللہ ﷺ کا یہ قول **«الْبَيِّعَانِ بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا»** ”خرید و فروخت کرنے والوں کے پاس اس وقت تک اختیار ہے جب تک وہ الگ (مجلس سے جدا) نہ ہوں“(ابن عمرؓ اور دوسروں سے مروی یہ حدیث متفق علیہ ہے)،اور فرمایا: **«أَعْطُوا الأَجِيرَ أَجْرَهُ»** ”ملازم کو اس کا معاوضہ دے دیا کرو“ (اسے ابنِ ماجہ نے ابن عمرؓ سے جبکہ بیہقی نے ابوہریرہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور بغوی نے اس کی اسناد کو حسن قرار دیا ہے)،ان تمام نصوص میں خطاب کا رُخ فعل کی طرف ہے اور شے کا کوئی ذکر نہیں۔ اب اگر ان نصوص کا جائزہ لیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا** ”تم ان دونوں میں سے تازہ گوشت کھاتے ہو“(فاطر:12)،اور یہ آیت: **لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا** ”تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھالو“ (النحل:14)،اور یہ آیت: **وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ** ”اور اس سے غلہ نکالا جس میں سے وہ کھاتے ہیں“(یٰس:33) اور یہ آیت: **اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا** ”جو لوگ ناحق یتیموں کا مال کھاجاتے ہیں“ (النساء:10)،اور فرمایا: **لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ** ”تاکہ اس کے پھل میں سے کھائیں“(یٰس:35)،تواِن تمام نصوص میں اگرچہ شے کا ذکر ہے لیکن خطاب کا رخ فعل کی طرف ہے۔ یہ بندے کے فعل کے متعلق براہِ راست خطاب کی مثال ہے۔ یہ ان نصوص سے مختلف ہے جن میں خطاب کا رخ شے کی طرف ہے،چاہے اس میں فعل کا ذکر ہے یا نہیں،اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ** ”تم پر مردار حرام کر دیا گیا ہے“ (المائدہ: 3)ارشاد کہ: **اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ** ”تم پر صرف مردار،خون اور سور کا گوشت حرام کیا گیا ہے“(النحل:115)اور فرمایا: **وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً** ”ہم آسمان سے پانی برساتے ہیں“(المومنون:18)پھر فرمایا: **وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ** ”اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے پیدا کیا“(الانبیاء: 30)،جبکہ رسول اللہ ﷺ نے سمندر کے بارے میں فرمایا: **«هُوَ الطَّهُورُ مَاؤُهُ الْحِلُّ مَيْتَتُهُ»** ”سمندر کا پانی پاک اور اس کا مردار (مچھلی) حلال ہے“ (یہ حدیث صحیح ہے اس کو امام

مالک نے ابو ہریرہؓ کے حوالے سے نقل کی ہے)، ان تمام نصوص میں خطاب کا رخ شے کی طرف ہے اور اس کے ساتھ فعل کا کوئی ذکر نہیں۔ اب یہ نصوص مثال کے طور پر: **اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ** ''بات یہی ہے کہ شراب، جوا اور تھان اور فال نکالنے کے پانسے کے تیر یہ سب گندی باتیں اور شیطانی کام ہیں، ان سے بالکل دور رہو''(المائدہ:90)اور یہ نص **اَفَرَاَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ** ''اچھا یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو''(الواقعہ:68)اور یہ نص **اَفَرَاَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ** ''اچھا ذرا یہ بھی بتاؤ کہ جو آگ تم سلگاتے ہو''(الواقعہ 71) اور یہ نص: **وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا** ''اور کھجور اور انگور کے درختوں کے پھلوں سے تم شراب بنالیتے ہو''(النحل:67)اور یہ نص **نُّسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشَّارِبِيْنَ** ''ہم ان کے جسم سے گوشت اور خون کے درمیان خالص دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والے کے لیے نہایت خوشگوار ہے''(النحل:66)، توان تمام نصوص میں خطاب کا رخ شے کی طرف ہے اگرچہ اس میں فعل کا بھی ذکر ہے۔ کسی بھی شے سے متعلق اس قسم کے خطاب کا مطلب اس شے کا حکم بیان کرنا ہے، لیکن شے کے ساتھ خطاب کا تعلق صرف بندے کے فعل سے منسوب حکم کے بیان کیلئے ہے نہ کہ بندے کے فعل سے الگ تھلک صرف شے کیلئے، کیونکہ بندے کے فعل کے بغیر شے کا کوئی حکم نہیں۔ اس تمام بحث سے خطاب کی رخ کے حوالے سے نصوص کی وضع کے درمیان اختلاف واضح ہو گیا۔ یہ اختلاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگرچہ حکم شرعی بندے کے افعال سے متعلق شارع کا خطاب ہے لیکن اشیاء کے متعلق کچھ احکامات وارد ہوئے ہیں جو کہ ان اشیاء سے متعلق احکامات کو مطلق انداز میں بیان کرتے ہیں اگرچہ ان کے احکامات بندے کے فعل کی نسبت سے ہیں اور بندے کے فعل سے الگ صرف شے کے لیے نہیں۔

ان ادلّہ کی چھان بین سے معلوم ہوتا ہے کہ اشیاء کے احکامات ایسی عام دلیل کے ساتھ آئے ہیں جو افعال کے حکم کو بھی بیان کرتی ہیں۔ اور جو دلائل مخصوص اشیاء کے لیے آئے ہیں وہ دراصل عام حکم کے استثنٰی

کے طور پر ہیں، جس میں افعال کے لیے بھی دلیل ہے۔ یہ چھان بین اور تحقیق واضح کرتی ہے کہ وہ شرعی نص جس میں خطاب کا رخ براہِ راست فعل کی طرف ہے، وہ عام ہے، اس لیے اس سے متعلقہ تمام اشیاء مباح ہوں گی کیونکہ فعل کی طلب یا اس میں اختیار دینا عام انداز میں وارد ہوا ہے، جس میں ہر شے شامل ہے، تو اس طلب کی وجہ سے تمام اشیاء مباح ہوئیں اور ان اشیاء میں سے کسی شے کو حرام کہنے کے لیے نص کی ضرورت ہے، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ** "اور آسمان وزمین کی ہر چیز کو بھی اس نے اپنی طرف سے تمہارے لیے تابع کر دیا ہے" (الجاثیہ:13)۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ (اشیاء) آسمانوں اور زمین پر ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں ہمارے لیے پیدا کیا، وہ ہمارے لیے مباح ہیں، اور فرمایا: **((وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ))** "اور اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے"۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کی خرید و فروخت کو حلال کر دیا اور کسی چیز کی خرید و فروخت کے حلال ہو نے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کیونکہ دلیل عام ہے اور تمام اشیاء اس میں داخل ہیں، اب ان میں سے کسی شے کی خرید و فروخت کے حرام ہونے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے جیسے کہ شراب کے بارے میں اللہ تعا لیٰ نے منع فرمادیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ **كُلُوْا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا** "زمین میں جتنی بھی حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انہیں کھاؤ" (البقرہ:168) اس کا یہ مطلب ہے کہ ہر چیز کا کھانا حلال ہے، کسی چیز کے کھانے کے لیے کسی خاص دلیل کی ضرورت نہیں جو اس چیز کو مباح قرار دیتی ہو، کیونکہ دلیل عام ہے اور کسی چیز کے کھانے کے حرام ہونے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے، جیسا کہ مردار کے بارے میں فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ **وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا** "اور کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو" (الاعراف:31) کا بھی یہ مطلب ہے کہ ہر چیز کا کھانا اور پینا مباح ہے، کسی چیز کو پینے کے لیے اس کو مباح قرار دینے والی مخصوص دلیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ کسی چیز کے پینے کے حرام ہونے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے جیسا کہ نشہ آور اشیاء۔ بالکل اسی طرح بات چیت، چلنا پھرنا، کھیل کود، سونگھنا، ناک میں پانی ڈالنا اور دیکھنا وغیرہ، سارے انسانی افعال سے متعلق ہر چیز کے مباح ہونے کی عام دلیل موجود ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی کے مباح ہونے کے

لیے خاص دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں سے کسی چیز کے حرام ہونے کے دلیل کی ضرورت ہے۔ اس لیے جن ادِلّہ کے لیے نصوص میں خطاب کا رخ فعل کی طرف ہے اس میں اشیاء کے بارے میں بھی عام اور مطلق حکم ہے پھر اس کے لیے دوسری نصوص کی ضرورت نہیں۔ اس وجہ سے اشیاء کے بارے میں عام حکم کے بیان کے بعد کچھ اشیاء کے بارے میں خاص احکامات اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ خاص حکم اسے چیز کو عام حکم سے استثنا دینے کے لیے ہے۔ یوں شرعی نصوص اشیاء میں موجود اباحت کے حکم کو بیان کرنے کے لیے ہیں تاہم کچھ ایسی نصوص ہیں جو ان سے بعض احکامات کو استثنٰی دینے کے لیے ہیں۔ یوں اشیاء مباح ہیں مگر جس وقت کسی شے کی حرمت کے متعلق کوئی نص آئے تو وہ چیز حرام ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ شرعی قاعدہ ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے۔ اور یہ تھے اس دفعہ کی دلائل۔

دفعہ نمبر15: حرام کا وسیلہ (ذریعہ) بھی حرام ہے بشرطیکہ غالب گمان ہو کہ یہ حرام کا وسیلہ ہے، اگر صرف خدشہ ہو کہ یہ حرام تک پہنچائے گا تب اسے حرام نہیں کہا جا سکتا۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ **وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَيَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ** "اور گالی مت دوان (معبودوں) کو جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں ایسا نہ ہو کہ کہیں وہ (کفار) اللہ کی شان میں گستاخی نہ کر بیٹھیں" (الانعام:108)۔ کفار کی توہین کرنا مباح ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن میں کفار کی تذلیل کی ہے۔ مگر جب یہ غالب گمان ہو کہ کفار کو گالی دینے سے وہ اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے تب یہ حرام کا وسیلہ ہونے کی وجہ سے حرام ہو گا۔ کیونکہ اللہ کی توہین اور گستاخی جائز نہیں اور یہ شدید حرام ہے۔ بتوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اس وجہ سے کی گئی کیونکہ یہ کفار کی طرف سے اللہ کو برا بھلا کہنے کی وجہ تھی، جیسا کہ آیت میں حرف **فَيَسُبُّوا** کے استعمال سے ظاہر ہے۔ اگر اس چیز کا غالب گمان نہ ہو تا کہ بتوں کو برا بھلا کہنے سے کفار اللہ کی توہین کرتے تو ایسے 'الفاء' کا استعمال نہ

کیا جاتا جو سببیت پر دلالت کرتا ہے اور حرمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یوں یہ شرعی قائدہ اخذ کیا گیا ہے کہ حرام کا وسیلہ بھی حرام ہے۔ تاہم وسیلہ اس وقت حرام ہو گا جب غالب گمان ہو کہ یہ حرام تک پہنچائے گا۔ اگر غالب گمان نہ ہو کہ یہ وسیلہ حرام تک پہنچائے گا بلکہ صرف خدشہ ہو کہ ایسا ہو سکتا ہے تب یہ وسیلہ حرام نہیں ہو گا جیسے عورت کھلے چہرے کے ساتھ باہر نکلے تو فتنے میں پڑنے کا اندیشہ ہے، لیکن غالب گمان نہیں اسے لیے اس وسیلے کو حرام نہیں کہا جائے گا۔ یہی اس دفعہ کی دلیل ہے۔

اس قاعدہ کی طرح ایک اور قاعدہ بھی ہے کہ "اگر مباح چیز میں سے کوئی جزو نقصان کا سبب بنے تو وہ جزو حرام ہو گا اور باقی چیز ویسے ہی مباح رہے گی''۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے جو آپ ﷺ نے حِجر سے گزرتے ہوئے اس وقت فرمایا جب لوگوں نے وہاں کے کنویں سے پانی پینا چاہا: **«لاَ تَشْرَبُوا مِنْ مَائِهَا شَيْئاً، وَلاَ تَتَوَضَّؤُوا مِنْهُ لِلْصَّلاَةِ، وَمَا كَانَ مِنْ عَجِينٍ عَجَنْتُمُوهُ فَاعْلِفُوهُ الإِبِلَ وَلاَ تَأْكُلُوا مِنْهُ شَيْئاً، وَلاَ يَخْرُجَنَّ أَحَدٌ مِنْكُمُ اللَّيْلَةَ إِلاَّ وَمَعَهُ صَاحِبٌ لَهُ»** "اس کنوئیں کے پانی سے بالکل مت پیو اور اس سے نماز کے لیے وضو بھی مت کرو، اور اس پانی سے جو آٹا گوندھا ہے اس کو اونٹوں کو کھلا دو، خود اس میں سے بالکل مت کھاؤ اور تم میں سے کوئی بھی آج رات کے لیے باہر نہ جائے بلکہ اپنے ساتھی کو ساتھ لے کر باہر نکلو"۔ اسے ابنِ ہشام نے السیرۃ میں اور ابنِ حبان نے الثقات میں نقل کیا ہے۔ پانی پینا مباح ہے۔ لیکن پانی کے ذخائر میں سے وہ خاص ذخیرہ یعنی 'ثمود کا کنواں' رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا، کیونکہ وہ عذر اور نقصان تک پہنچانے کا سبب تھا، لیکن پانی مباح ہی رہے گا۔ اسی طرح کسی شخص کا رات کے وقت اکیلے باہر نکلنا مباح ہے لیکن اس لشکر میں سے اُس رات کسی کو اکیلے باہر نکلنے کو رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا کیونکہ وہ تکلیف کا سبب تھا، لیکن عام طور پر کسی کا رات کے وقت اکیلے باہر نکلنا مباح ہی ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مباح کے جزو میں سے کوئی جزو اگر حرام کا سبب بنتا ہو یا نقصان کا وسیلہ بنتا ہو تو وہ جزو حرام ہو گا باقی شے مباح ہی رہے گی۔

نظامِ حکومت

دفعہ نمبر16: نظامِ حکومت وحدت کا نظام ہے اتحاد کا نہیں۔

صحیح نظام حکومت صرف وحدت کا نظام ہے اس کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ کیونکہ شرعی دلیل اسی کے بارے میں ہے اور اس کے سوا تمام نظاموں کو حرام قرار دیا ہے، چنانچہ عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ: انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: **«وَمَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ فَلْيُطِعْهُ إِنِ اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الآخَرِ»** ”جس نے امام (خلیفہ) کی بیعت کرلی تو اسے چاہیے کہ اس (خلیفہ) کو اپنے ہاتھ کا سودا اور اپنے دل کا پھل دے اور حتی الوسع اس کی اطاعت بھی کرے اور اگر کوئی اور اٹھ کر اس (خلیفہ) سے تنازعہ کرتا ہے تو اس دوسرے شخص کی گردن اُڑادو“ ۔اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابو سعید خدریؓ نے بھی رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ: **«إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ، فَاقْتُلُوا الآخَرَ مِنْهُمَا»** ”جب دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کرو“، اسے بھی مسلم نے روایت کیا ہے۔ ان دونوں حدیثوں سے استدلال کا سبب یہ ہے کہ پہلی حدیث میں یہ وضاحت ہے کہ ایک شخص کو امانت یعنی خلافت دینے کے بعد اس کی اطاعت فرض ہے، اگر کوئی آکر اس سے اس خلافت کے بارے میں لڑتا ہے تو اس سے لڑنا چاہیے اور اگر وہ باز نہیں آتا تو اسے قتل کرنا چاہیے۔ حدیث یہ واضح کرتی ہے کہ جو شخص خلافت کے حوالے سے خلیفہ سے لڑتا ہے اس کو قتل کرنا فرض ہے۔ اور حدیث کا مفہوم ہے کہ ریاست کے ٹکڑے نہیں ہونے چاہیے اور اس کی تقسیم کی بالکل اجازت نہیں اور اس سے کسی قسم کی علیحدگی کو بزورِ شمشیر روکنا چاہیے۔ دوسری حدیث اس حالت کی ہے کہ ریاست خلیفہ سے خالی ہو اور پھر دو شخصوں کو بیعت دی گئی ہو تب بعد میں جس کو بیعت دی گئی ہے اس کو قتل کرنا چاہیے اگر دو سے زیادہ کو بیعت دی گئی ہو تب تو بطریقہ اولیٰ ان کو قتل کیا جائے گا۔ اس حدیث کا مفہوم بھی یہ ہے کہ ریاست کی تقسیم ممنوع ہے یعنی ایک ریاست کو کئی ریاستیں بنانا حرام ہے، بلکہ ریاست کا ایک ہونا فرض ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں نظامِ حکومت اتحاد نہیں بلکہ وحدت کا ہے۔ اور وحدت کے نظام کے علاوہ کوئی نظام اختیار کرنا قطعی حرام ہے۔ اسی لیے اس دفعہ کو وضع کیا گیا۔

دفعہ نمبر 17: حکومت مرکزی ہوگی جبکہ ادارہ (انتظامیہ) لامرکزیت کی بنیاد پر ہوگا۔

یہ دفعہ حکومت اور انتظامیہ کے درمیان فرق کو واضح کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق دو پہلو سے ظاہر ہوتا ہے: دونوں کی حقیقت کے لحاظ سے اور حکمران اور ملازمین کو ذمہ داریاں دینے کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے اعمال سے۔ جہاں تک دونوں کی حقیقت کی بات ہے، تو حکم، ملک اور سلطان سب کا ایک ہی معنی ہے کہ یہ ایسی اتھارٹی کو کہتے ہیں جو قوانین نافذ کرتی ہے۔ لغت قاموس المحیط میں ہے کہ ملک کا مطلب عظمت اور سلطان ہے اور یہ لفظ مؤنث استعمال ہوتا ہے" دوسری جگہ آیا ہے کہ "السلطان حجت اور حکومتی طاقت کو کہتے ہیں" تیسری جگہ ہے کہ "الحکم القضاء (فیصلہ) کے معنی میں ہے اور اس کی جمع حکام ہے اور الحاکم حکم کے نافذ کرنے والے کو کہتے ہیں"۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ لغت میں حکم قضاء (فیصلہ) کو کہتے ہیں اور حاکم لغت میں حکم کو نافذ کرنے والے کو کہتے ہیں۔ اس دفعہ میں حکم کے اصطلاحی معنی مراد ہیں یعنی احکامات کو نافذ کرنا یا ملک یا سلطان یا حکومت کی طاقت۔ دوسرے لفظوں میں حکم امارت کا وہ عمل ہے جس کو شرع نے مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«وَلا يَحِلُّ لِثَلاثَةِ نَفَرٍ يَكُونُونَ بِأَرْضِ فَلاةٍ إِلاَّ أَمَّرُوا عَلَيْهِمْ أَحَدَهُمْ»** "روئے زمین کے کسی بھی حصے پر موجود تین مسلمانوں کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ بغیر امیر کے رہیں بلکہ اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنالیں"، اس حدیث کو احمد نے عبد اللہ بن عمروؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ امیر بنانے کا یہ عمل ہی وہ سُلطہ (اتھارٹی) ہے جو آپسی جھگڑوں اور ناانصافیوں کو روکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں 'حکم' وہ ولایتِ امر ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے **اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ** " اطاعت کرو

اللہ کی اوراس کے رسول ﷺ کی اور ان کی جو تم میں حاکم (اولی الامر) ہوں" (النساء:59)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ **وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ** "اگر یہ لوگ اس بات کو رسول اللہ ﷺ کے اور اپنے میں سے اختیار والوں (اولی الامر) کے حوالے کر دیتے" (النساء:83)

یہ براہ راست معاملات کی نگرانی کرنا ہے۔ اور یہی حکم (حکمرانی) کی حقیقت ہے۔ پس ولایت امر، امارت، مُلک اور سلطان سب 'حکم' ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ادارہ یعنی انتظامیہ ہے۔ خلیفہ اوراس کے امراء یعنی والیان اور عمال احکام شرعیہ کے نفاذ کے ذریعے اور قاضیوں کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنا کر لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کرتے ہیں، یہ حکومت ہے۔ ان امور کے علاوہ یہ لوگ یا دوسرے معاونین یا وہ لوگ جن کو خلیفہ کوئی ذمہ داری سونپتا ہے یہ انتظامیہ ہے۔ یوں حکمرانی اور انتظامی امور کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔ شارع نے ان حقائق کے ساتھ اس حکومت کو اُس خلیفہ کی ذمہ داری قرار دیا ہے جس کو امت اپنا امیر بناتی ہے۔ امت کی جانب سے کسی شخص کو امیر بنانے سے یا کسی خلیفہ کو بیعت دینے سے وہ خلیفہ یا امیر صاحب صلاحیت یعنی صاحبِ اختیار و اقتدار بن جاتا ہے، یعنی وہ خلیفہ یا امیر، حکمران بن جاتا ہے، اس کے علاوہ کوئی حکمران نہیں ہوتا، اسی لیے حکومت مرکزی ہوتی ہے، یعنی حکم اور اقتدار وہ ہے جو امت کسی شخص کو دے کر اس کو خلیفہ یا امیر بناتی ہے۔ امت کی جانب سے اس کی بیعت کرنے سے یا اس کو منتخب کرنے سے اس کو حکومت کرنے کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ اب یہ حکمران جس کو چاہے حکومت (فیصلے) کرنے کا اختیار دے سکتا ہے اور اس کی جانب سے اختیار دیئے بغیر کوئی شخص کسی قسم کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس بحث سے حکومت کی مرکزیت واضح ہو جاتی ہے، کہ حکومت کرنے کا اختیار صرف اس شخص کے پاس ہوتا ہے جس کو امت نے منتخب کیا ہو اور اس کا یہ اقتدار ذاتی ہوتا ہے۔ اس شخص کے علاوہ کسی کا اختیار ذاتی نہیں ہوتا۔ بلکہ خلیفہ اس سے یہ اختیار واپس لے کر کسی دوسرے کو سونپ سکتا ہے اور یہ اختیار کسی زمان و مکان یا کسی واقعے کے ساتھ محدود ہو سکتا ہے۔ حکمرانی کی یہ حقیقت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ اختیار و اقتدار مرکزی ہے اور اس کی مرکزیت کی پابندی لازمی ہے۔

رہی بات رسول اللہ ﷺ کے اعمال کی تو آپ ﷺ نے صوبوں کے لیے گورنر بھیجے اور آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ لوگوں پر شرعی احکامات کو نافذ کریں۔ آپ ﷺ نے ملازمین اس لیے مقرر کیے تاکہ وہ کام کریں نہ کہ احکام کو نافذ کریں کیونکہ ملازمین کا کام احکامات کو نافذ کرنا نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ نے والیان (گورنرز) مقرر کیے اور ان کو حکمرانی کا حق بھی دے دیا، ان کے لیے کوئی خاص وسائل اور اسالیب بھی مقرر نہیں کیے، بلکہ اس معاملے کو ان پر چھوڑ دیا جبکہ بعض کو آپ ﷺ نے کچھ شرعی احکامات نافذ کرنے کی غرض سے لکھ کر دے دیئے لیکن ان کو نافذ کرنے کے وسائل اور اسالیب نہیں بتائے، بعض کو صرف اتنا حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کرو۔ آپ ﷺ نے عمرو بن حزمؓ کو والی مقرر کر دیا اور ان کو ایک دستاویز لکھ کر دی، جبکہ معاذ بن جبلؓ کو مقرر کرتے وقت ان سے صرف یہ پوچھا کہ حکومت کیسے کروگے اور ان کی رائے کی تائید بھی فرمائی، عتاب بن اسیدؓ کو والی مقرر کر کے فرمایا اللہ کی شریعت کو نافذ کرنا، چنانچہ روایت ہے کہ ”عمران بن حصین کو صدقہ (زکوۃ وغیرہ) کے وصول کا ذمہ دار مقرر کیا گیا جب وہ واپس آئے تو ان سے کہا گیا: مال کہاں ہے؟ آپؓ نے جواب دیا: آپ ﷺ نے مجھے مال کے لیے بھیجا تھا، ہم نے ایسے ہی مال وصول کیا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں کرتے تھے اور اسی جگہ رکھ دیا جہاں رکھتے تھے“، اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس واقع کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے برخلاف ملازمین کے لیے متعین کام ہوتے ہیں اور جو ذمہ داری ان کو سونپی گئی ہو وہ اسی کو ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن رواحہؓ کو یہودیوں کے پھلوں کے حساب کتاب کی ذمہ داری دی وہ درختوں پر ہی پھلوں کا اندازہ لگاتے تھے۔ احمد نے صحیح اسناد کے ساتھ جابر بن عبد اللہؓ سے روایت کیا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے خیبر کو رسول اللہ ﷺ کے زیر نگین کر دیا تو آپ ﷺ نے ان کو زمینوں پر برقرار رکھا اور یہ فیصلہ فرمایا کہ پھل ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہوں گے اور عبد اللہ بن رواحہؓ کو پھلوں کا اندازہ لگانے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے یہود سے کہا: اے یہودیو! تم میرے نزدیک سب سے بدترین مخلوق ہو۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ بولا، تم سے میری نفرت کی وجہ سے کہیں میں تم پر ظلم نہ کروں۔

ان کھجوروں کا اندازہ میں نے بیس ہزار وسق لگایا ہے تم چاہو تو لے لو، اگر انکار کرو تو میں لے لیتا ہوں۔ یہود نے کہا کہ اس (عدل) پر آسمان وزمین قائم ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ اکٹھا کرنے کے لیے عمال بھیجے جاتے تھے وہ زکوٰۃ جمع کرکے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ان کی اجرت ادا کرتے تھے: «**عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيدٍ عَنِ ابْنِ السَّاعِدِيِّ الْمَالِكِيِّ أَنَّهُ قَالَ: اسْتَعْمَلَنِي عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ** τ **عَلَى الصَّدَقَةِ، فَلَمَّا فَرَغْتُ مِنْهَا وَأَدَّيْتُهَا إِلَيْهِ أَمَرَ لِي بِعُمَالَةٍ، فَقُلْتُ: إِنَّمَا عَمِلْتُ لِلَّهِ وَأَجْرِي عَلَى اللَّهِ، فَقَالَ: خُذْ مَا أُعْطِيتَ، فَإِنِّي عَمِلْتُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَعَمَّلَنِي، فَقُلْتُ مِثْلَ قَوْلِكَ، فَقَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أُعْطِيتَ شَيْئًا مِنْ غَيْرِ أَنْ تَسْأَلَ فَكُلْ وَتَصَدَّقْ**» ”بسر بن سعد بن ساعدی مالکی سے روایت ہے کہ عمر بن خطابؓ نے مجھے زکوٰۃ اکٹھا کرنے کے کام پر لگایا جب زکوٰۃ اکٹھا کرکے ان کو دے دی، تو انہوں نے مجھے اجرت دینے کا حکم دیا۔ میں نے کہا: یہ کام تو میں نے اللہ کے واسطے کیا ہے میرا اجر اللہ پر ہے۔ انہوں نے فرمایا: جو تمہیں دیا جارہا ہے لے لو کیونکہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا بغیر سوال کے تمہیں جو چیز دی جائے اس سے لیا کرو اس میں سے کھاؤ اور صدقہ دو“، اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ عمران بن حصینؓ حکمران تھے جب ان سے زکوٰۃ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے برا منایا کیونکہ انہوں نے اللہ کے حکم کو نافذ کیا تھا انہوں نے زکوۃ وصول کرکے اپنی رائے کے مطابق مستحقین میں تقسیم کی تھی جیسا کہ وہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے زمانے میں کیا کرتے تھے، لیکن بسر بن سعید ملازم تھے ان کو صرف زکوٰۃ اکٹھا کرنے کا کام سونپا گیا تھا، وہ احکامِ شریعت کو نافذ کرنے کے ذمہ دار نہیں تھے۔ یوں حکمران اور ملازم کے کاموں کے درمیان فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ حکمران کا کام شریعت کا نفاذ ہے یعنی حکومت، مُلک اور سلطان، جبکہ ملازم کا کام صرف طے کردہ کام کی انجام دہی ہے حکمرانی کرنا نہیں، کیونکہ حکمرانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ انتظامی امور ہیں۔ اس سے حکمران اور اعمال کے درمیان فرق بھی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے کچھ اعمال حکم (حکومت کرنے) ہیں یعنی شرعی احکامات کا نفاذ اور قاضیوں کے فیصلوں کا نفاذ اور یہ کام اس شخص کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا جس کے پاس اختیار ہو یا جس کو صاحب اختیار نے مقرر کیا ہو، جبکہ کچھ اعمال اسالیب اور ذرائع کے ذمے میں آتے ہیں جن کو

احکامات کی تنفید کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اسی کو انتظامیہ کہا جاتا ہے۔ حاکم کے لیے ان امور کے تعین کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ان اعمال کے تعین کے لیے حاکم کو اس شخص کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے کہ جس نے اسے حاکم مقرر کیا ہے، بلکہ اس کو حکمران مقرر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس ان وسائل اور اسالیب کو اپنے صوابدید کے مطابق استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ تاہم اگر اس حاکم مقرر کرنے والے کی طرف سے اس کے لیے کچھ خاص اسالیب و ذرائع کا تعین کر دیا گیا ہو تو پھر اس کے لیے ان اسالیب و ذرائع کے مطابق چلنا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس شخص کو حاکم مقرر کیا جائے تو اس کی یہ تقرری اسے اس بات کا حق عطا کرتی ہے کہ وہ انتظامی اعمال اپنی مرضی سے سرانجام دے، اور اگر اسے مقرر کرنے والے شخص کی طرف سے کچھ انتظامی نظاموں کا بھی تعین کر دیا گیا ہو تو پھر وہ ان نظاموں کے مطابق چلنے کا پابند ہو گا۔

اس بحث سے حکومت کے مرکزی ہونے کے معنی واضح ہوگئے: جس کا یہ مطلب ہے کہ اختیار کا مالک یعنی شریعت کو نافذ کرنے کا اختیار رکھنے والا (ذاتی اختیار رکھنے والا) صرف وہ شخص ہے جس کو امت نے یہ اختیار دیا ہے اور یہ اختیار صرف اسی کے پاس ہو گا یا جس کو اس صاحب اختیار نے اپنی طرف سے اختیارات دیئے ہوں۔ جبکہ ادارہ یا انتظامیہ لامرکزیت پر مبنی ہے یعنی حاکم نے کسی کو ذمہ داری سونپ دی تو وہ اپنی انتظامی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں حاکم کی طرف رجوع کرنے کا پابند نہیں ہو گا بلکہ اپنی صوابدید اور اپنی رائے کے مطابق وہ انتظامی ذمہ داری نبھائے گا۔ یہ بات شرعی نصوص میں وارد حکمرانی کی حقیقت سے ثابت ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی جانب سے حکمران مقرر کرنے کے عمل سے ثابت ہے، یہی اس دفعہ کی دلیل ہے۔

دفعہ نمبر 18: حکمران چار ہیں: خلیفہ، معاون تفویض، والی اور عامل، یا وہ جو ان کے حکم میں داخل ہوں۔ ان کے علاوہ کوئی حکمران نہیں بلکہ صرف اور صرف ملازمین ہیں۔

اس دفعہ میں حکمران سے مراد وہ ولی الامر ہے جو معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے خواہ پوری ریاست میں ہو یا ریاست کے کسی حصے میں۔ احکام شرعیہ کی چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رعایا کی دیکھ بھال جن کو سونپی گئی ہے یا احکامات کو قائم کرنے کی ذمہ داری جن کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے یا پھر احکامات کی تنفیذ میں جن کی اطاعت کا حکم ہے وہ یہی چار ہیں یعنی خلیفہ، معاون (معاون تضویض) والی اور عامل۔ ان کی اطاعت ولی الامر ہونے کی وجہ سے ہوگی۔ خلیفہ وہ شخص ہوتا ہے امت جس کی اس شرط پر بیعت کرتی ہے کہ وہ امت کے نائب کے طور پر دین کو قائم کرے، حدود کو قائم کرے، احکامات کو نافذ کرے، جہاد کو جاری رکھے، پھر وہ اطاعت کا مستحق ہے: **«وَمَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ فَلْيُطِعْهُ إِنِ اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الآخَرِ»** "جو شخص امام (خلیفہ) کی بیعت کرے اور اسے اپنے ہاتھ کا سودا اور اپنے دل کا پھل (اخلاص) دے دے، تو پھر وہ حسبِ استطاعت اس کی اطاعت بھی کرے۔ پھر کوئی دوسرا آکر اس خلیفہ سے اس کی اتھارٹی کے متعلق لڑے، تو دوسرے کی گردن مار دو"، اس کو مسلم نے عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کیا ہے۔

معاون تفویض وہ معاون ہوتا ہے جس کو خلیفہ رعایا کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کرتا ہے، یعنی دائمی اور لازمی عام نگہبانی کے لیے۔ اس بات کی دلیل، کہ یہ شخص ان امور میں واجب الاطاعت ولی امر ہے جن کی ذمہ داری خلیفہ اس پر ڈال دے یا وہ خود خلیفہ سے مطالبہ کرے کہ یہ ذمہ داری اس کو دی جائے اور خلیفہ اس کو دے دے، احمد کی وہ روایت ہے جو انہوں نے جید اسناد کے ساتھ عائشہؓ سے نقل کی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(مَنْ وَلاَّهُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ أَمْرِ الْمُسْلِمِينَ شَيْئًا فَأَرَادَ بِهِ خَيْرًا جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ صِدْقٍ، فَإِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهُ، وَإِنْ ذَكَرَ أَعَانَهُ)** "جس کو اللہ عزوجل مسلمانوں کے معاملات کی ذمہ داری دے اور اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمائے تو اس کو ایک سچا وزیر بھی دے دیتا ہے، پس جب وہ کوئی بات بھول جاتا ہے تو وزیر اس کو یاد دلاتا ہے، یا اس کو کوئی بات یاد آتی ہے تو وزیر اس کی مدد کرتا ہے"۔

والی وہ شخص ہوتا ہے جس کو خلیفہ کسی ایک ولایہ (صوبے) کا ذمہ دار بناتا ہے۔ اس کی دلیل کہ یہ شخص واجب اطاعت ولی امر ہے، مسلم کی وہ روایت ہے جو انہوں نے عوف بن مالک الاشجعیؓ سے نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ **(... أَلاَ مَنْ وَلِيَ عَلَيْهِ وَالٍ فَرَآهُ يَأْتِي شَيْئًا مِنْ مَعْصِيَةِ اللَّهِ، فَلْيَكْرَهْ مَا يَأْتِي مِنْ مَعْصِيَةِ اللَّهِ، وَلاَ يَنْزِعَنَّ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ)** "سنو!! جس کے اوپر کوئی والی مقرر کیا جائے جس کے اندر وہ اللہ کی نافرمانی والی کوئی بات (گناہ) دیکھے تو اس گناہ کو تو ناپسند کرے لیکن پھر بھی والی کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے"۔ جبکہ دوسری روایت میں ہے جو مسلم نے ہی نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(... إِذَا رَأَيْتُمْ مِنْ وُلاتِكُمْ شَيْئًا تَكْرَهُونَهُ، فَاكْرَهُوا عَمَلَهُ، وَلا تَنْزِعُوا يَدًا مِنْ طَاعَةٍ)** "جس وقت تم اپنے والیوں سے ایسی چیز دیکھو جس سے تم نفرت کرتے ہو، تو اس کے اس عمل سے تو نفرت کرو لیکن پھر بھی اطاعت سے ہاتھ مت کھینچو"۔

عامل وہ شخص ہے جس کو خلیفہ یا اس کا نائب کسی ضلع کا یا صوبے کے کسی حصے کا امیر بنائے۔ اس کی حکومت اگرچہ صوبے کے کسی حصے پر ہوتی ہے لیکن اس کا کام بالکل والی کے کام کی طرح ہے۔ لہٰذا وہ بھی واجب اطاعت حکمران ہے جس طرح کہ والی ہے کیونکہ یہ خلیفہ یا والی کی طرف سے مقرر کیا گیا ہوتا ہے، بخاری نے انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **"اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَإِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ كَأَنَّ رَأْسَهُ زَبِيبَةٌ"** "سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر ایسا کالا حبشی عامل مقرر کیا جائے جس کا سر کشمش کی طرح ہو"۔ اور مسلم نے اُمِ حصین سے روایت کی ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع میں یہ خطبہ دیتے ہوئے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **"وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ يَقُودُكُمْ بِكِتَابِ اللَّهِ فَاسْمَعُوا لَهُ وَأَطِيعُوا"** "اگرچہ تم پر ایک کالے شخص کو عامل مقرر کیا جائے جو اللہ کی کتاب کے مطابق تمہاری رہنمائی کرے، تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو"۔

اس عبارت کا مطلب کہ "جو ان کے حکم میں داخل ہیں"، سے مراد قاضی المظالم اور قاضی القضاۃ ہیں، جب اسے قاضی المظالم کو مقرر کرنے یا اس کو سبکدوش کرنے کا اختیار دیا جائے، کیونکہ مظالم بھی حکمرانی میں داخل ہے، جیسا کہ دفعہ نمبر 78 میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

دفعہ نمبر 19: حکمرانی یا حکمرانی میں داخل کسی بھی کام کی ذمہ داری صرف اور صرف مرد، آزاد، بالغ، عاقل، قادر و باصلاحیت شخص اٹھائے گا اور اس کا مسلمان ہونا بھی لازمی شرط ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس بات سے قطعی طور پر منع فرمایا ہے کہ کوئی کافر مسلمانوں کا حاکم ہو، ارشاد ہے: **وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** "اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ایمان والوں پر ہرگز غلبہ نہ دے گا" (النساء: 141)۔ کسی کافر کو مسلمان پر حکمران بنانا اس کو مسلمان پر غلبہ دینا ہے، اللہ تعالیٰ نے " لَنْ "'ہرگز نہیں' کا لفظ استعمال کرکے اس کی قطعی طور پر نفی کر دی، یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ کافر کو مسلمانوں پر غلبہ دینا منع ہے یعنی کافر کا مسلمان کا حکمران بننا نہی جازم (قطعی ممانعت) کے ساتھ منع ہے۔ دوسرے لفظوں میں کافر کا حکمران بننا حرام ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رجوع کے مسئلے میں گواہ کے مسلمان ہونے کی شرط رکھ دی اور فرمایا: **فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ** "پس جب یہ عورتیں اپنی عدت پوری کرنے کے قریب پہنچ جائیں تو انہیں یا تو باقاعدہ کے مطابق اپنے نکاح میں رہنے دو یا دستور کے مطابق انہیں الگ کر دو اور اپنے (مومنوں) میں سے دو عادل شخصوں کو گواہ کر لو" (الطلاق: 2)۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس معاملے میں گواہ کا غیر مسلمان ہونا جائز نہیں۔ اسی طرح قرض کے معاملے میں بھی مسلمان گواہ کی شرط لگائی گئی ارشاد ہے: **وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ** "اور اپنے (مسلمانوں) میں سے دو مرد گواہ رکھو" (البقرہ: 282) یعنی یہ گواہ مسلمان ہونے چاہیے غیر مسلم نہیں۔ جب اس جیسی گواہی میں شریعت نے

مسلمان ہونے کی شرط رکھ دی تو حکمران کے اندر مسلمان ہونے کی شرط بدرجۂ اولیٰ ہونی چاہیے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حکمران کا کام شرعی احکامات کو نافذ کرنا ہے، قاضیوں نے فیصلوں کو نافذ کرنا اور قاضیوں کو بھی یہ حکم ہے کہ وہ شرعی فیصلے کریں اس کا بھی تقاضا ہے کہ ان احکامات کو نافذ کرنے والا مسلمان ہو کیونکہ جو چیز وہ نافذ کر رہا ہوتا ہے اس پر ایمان ہی نہیں رکھتا، اس لیے اسلام کی تنفیذ میں اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ حکمران کے مسلمان ہونے کی شرط رکھی گئی اور یہ بات بھی ہے کہ حکام اولو الامر (اہلِ امر) ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اولو الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور امن اور خوف کی حالت میں معاملات کو ان کی طرف لوٹاتے وقت الوالامر کے مسلمان ہونے کی شرط رکھی ہے، فرمایا: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ** ”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اس کے رسول کی اور ان کی جو تم میں سے اہلِ امر ہوں“(النساء:59)، اور فرمایا: **وَاِذَا جَاۗءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْھُمْ** ”جہاں انہیں کوئی خبر امن یا خوف کی ملی انہوں نے اس کو مشہور کرنا شروع کر دیا حالانکہ اگر یہ لوگ اسے رسول اللہ ﷺ اور اپنے میں سے اولو الامر کی طرف لوٹاتے“ (النساء: 83)۔ اس آیت میں حکمران کے بارے میں ’اپنے میں سے‘ کے الفاظ استعمال فرمائے، یعنی وہ غیر مسلموں میں سے نہ ہو اور دوسری آیت میں بھی ’اپنے میں سے‘ فرمایا یعنی غیر (مسلموں) میں سے نہیں۔ قرآن میں ’اولی الامر‘ کے لفظ کے ساتھ ہمیشہ مسلمان ہونے کو بیان کرنا، اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ حکمران کے لیے مسلمان ہونا شرط ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حکمران کی اطاعت مسلمانوں کے لیے ضروری ہے اور مسلمان کسی کافر کی اطاعت کا مکلف نہیں کیونکہ اطاعت کا حکم صرف مسلمان ہونے کی شرط پر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے کہ ”اطاعت کرو اللہ کی، اس کے رسول کی اور ان کی جو تم میں سے اہلِ امر (حاکم) ہوں“ اس میں ولی الامر کے مسلمان ہونے کی شرط پر اس کی اطاعت کا حکم ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ کافر ہے تو اس کی کوئی اطاعت نہیں اور اطاعت کے بغیر حکمرانی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ ایک ملازم کسی محکمے کے سربراہ

(ڈائریکٹر) کی اطاعت کا پابند ہے اگرچہ کافر ہو، کیونکہ کوئی منیجر یا ڈائریکٹر 'ولی امر' نہیں بلکہ بذاتِ خود ایک ملازم ہے، اس کی اطاعت کی وجہ ولی امر کی جانب سے اس کی اطاعت کے حکم کے سبب ہے اور بات ہو رہی ہے ولی الامر کی نہ کہ ملازم کی، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا حکمران صرف اور صرف مسلمان ہو سکتا ہے، کوئی کافر مسلمانوں کا حکمران نہیں بن سکتا۔

جہاں تک اس شرط کا تعلق ہے کہ حکمران صرف مرد ہونا چاہیے، تو یہ اس لیے ہے کہ ابی بکرہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی کہ اہلِ فارس (ایران) نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا حکمران بنالیا ہے تو فرمایا: **«لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ امْرَأَةً»** "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جو عورت کو اپنا حکمران بنالے"، اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے عورت کو اپنے اوپر حکمران بنانے والوں کے بارے میں کبھی فلاح نہ پانے کی خبر دینا، طلب کے معنی میں ہے اور اس خبر میں اس کام کی مذمت کی گئی ہے اور یہ مذمت اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ نہی جازم (قطعی ممانعت) ہے اس لیے عورت کی حکمرانی حرام ہے، یہی وجہ ہے کہ حاکم کی شرائط میں سے ایک شرط اس کا مرد ہونا ہے۔

حاکم کے عادل ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گواہ کے لیے عادل کی شرط رکھی ہے فرمایا: **وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ** "اور اپنے (مسلمانوں) میں سے دو عادل لوگوں کو گواہ بنالو" (الطلاق:2)۔ جب گواہ کے لیے عادل ہونے کی شرط ہے، تو حکمرانی تو اس سے بہت بڑا معاملہ ہے اس لیے حکمران کے لیے عادل ہونے کی شرط بطریقہ اولیٰ ہے۔

آزاد ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ غلام خود اپنے اوپر اختیار نہیں رکھتا تو دوسروں کے معاملات کی دیکھ بھال کس طرح کرے گا۔ اور یہ بات بھی ہے کہ غلامی کا تقاضا ہے کہ غلام کا وقت بھی اس کے آقا کی ملکیت ہے۔

بالغ ہونے کی شرط اور بچے کی حکمرانی کا ناجائز ہونا، اس کی دلیل ابو داؤد کی وہ حدیث ہے جو انہوں نے علی بن ابی طالبؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلاَثَةٍ: عَنِ الصَّبِيِّ حَتَّى يَبْلُغَ، وَعَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الْمَعْتُوهِ حَتَّى يَبْرَأَ».** "تین لوگوں سے قلم کو اٹھا لیا گیا ہے (یعنی ان کا حساب کتاب نہیں): بچے سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے، سوئے ہوئے آدمی سے جب تک وہ بیدار نہ ہو جائے، بے ہوش سے جب تک وہ ہوش میں نہ آئے"۔

اسی حدیث کو دوسری روایت میں ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے کہ **«رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلاَثَةٍ: عَنِ الْمَجْنُونِ الْمَغْلُوبِ عَلَى عَقْلِهِ حَتَّى يَفِيقَ، وَعَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتَّى يَحْتَلِمَ»** "تین لوگوں سے قلم کو اٹھا لیا گیا ہے: وہ مجنون جس کا دماغ کام نہیں کرتا جب تک کہ ٹھیک نہ ہو جائے، سویا ہوا شخص جب تک بیدار نہ ہو، اور لڑکا یہاں تک کہ بالغ ہو جائے"۔

جس شخص سے قلم کو اٹھایا گیا ہو اس کے اپنے معاملات ہی معتبر نہیں اور وہ شرعی طور پر غیر مکلف ہے۔ اس لیے اس کا خلیفہ بننا صحیح نہیں اور نہ ہی کوئی بھی حکومتی عہدہ لینا صحیح ہے کیونکہ وہ معاملات میں تصرف کر ہی نہیں سکتا۔ بچے کے خلیفہ نہ بننے کی یہ بھی دلیل ہے کہ بخاری نے روایت کی ہے۔ **«عن أَبِي عَقِيلٍ زُهْرَةَ بْنِ مَعْبَدٍ عَنْ جَدِّهِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ هِشَامٍ، وَكَانَ قَدْ أَدْرَكَ النَّبِيَّ ﷺ وَذَهَبَتْ بِهِ أُمُّهُ زَيْنَبُ بِنْتُ حُمَيْدٍ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، بَايِعْهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ هُوَ صَغِيرٌ. فَمَسَحَ رَأْسَهُ وَدَعَا لَهُ ...»** "ابو عقیل زہرہ بن معبد نے اپنے دادا عبد اللہ بن ہشام سے روایت کی ہے، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا تھا کہ ان کی ماں زینب بنت حمید انہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئی اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ اس سے بیعت لے لیجیے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ چھوٹا ہے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے لیے دُعا کی"۔

جب بچے کی بیعت معتبر نہیں اور وہ خلیفہ کی بیعت بھی نہیں کر سکتا تو بطریقہ اولیٰ وہ خود خلیفہ بھی نہیں بن سکتا۔

عاقل ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ مجنون خلیفہ نہیں ہو سکتا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ تین لوگوں سے قلم کو اٹھایا گیا یعنی وہ مکلف نہیں۔ ان میں وہ مجنون بھی ہے جس کا دماغی توازن بالکل ٹھیک نہ ہو۔ جس شخص سے قلم کو اٹھایا گیا ہو وہ غیر مکلف ہوتا ہے کیونکہ عقل ہی مناطِ تکلیف ہے اور تصرفات (افعال) کے صحیح ہونے کی شرط ہے۔ خلیفہ شرعی احکامات کو نافذ کر کے حکمرانی کے افعال سرانجام دیتا ہے اس لیے مجنون کا خلیفہ ہونا درست نہیں، کیونکہ مجنون تو اپنے معاملات میں ہی تصرف نہیں کر سکتا تو لوگوں کے معاملات کو کیسے سنبھال سکتا ہے۔

قادر اور باصلاحیت ہونے کی شرط خلیفہ کے حق میں تو بیعت کا تقاضا ہے جبکہ خلیفہ کے علاوہ معاونین، والیوں اور عاملوں میں ذمہ داری سونپے کے عقد contract کا تقاضا ہے کیونکہ کتاب وسنت کی رُو سے ایک عاجز شخص ان معاملات کی نگرانی نہیں کر سکتا ہے کہ جس کے لیے بیعت دی جا رہی ہے یا معاملات کی ذمہ داری دیتے وقت جس کا عہد لیا جا رہا ہے۔ اس کے دلائل درجہ ذیل ہیں :

1) مسلم نے ابوذرؓ سے روایت کیا ہے کہ : «**قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَلا تَسْتَعْمِلُنِي؟ قَالَ: فَضَرَبَ بِيَدِهِ عَلَى مَنْكِبِي ثُمَّ قَالَ: يَا أَبَا ذَرٍّ، إِنَّكَ ضَعِيفٌ، وَإِنَّهَا أَمَانَةٌ، وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ، إِلاَّ مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا وَأَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا**».

"ابوذرؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ آپ مجھے عامل کیوں نہیں بناتے ؟ آپ ﷺ نے ہاتھ میرے کندھے پر مارا اور فرمایا: اے ابوذر تم کمزور آدمی ہو، یہ امانت ہے اور قیامت کے دن یہ رسوائی اور ندامت کا سبب ہے، سوائے اس شخص کے لیے جس نے اس کا حق ادا کر دیا اور اپنا حق لے لیا"۔

اس میں اپنا حق لینے اور اس کام کا حق ادا کرنے کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص یہ کام کر سکتا ہے جو اس کے کرنے کا اہل ہو۔ یہاں جو قرینہ موجود ہے وہ بھی جزم (قطعیت) کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ذمہ داری قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا سبب بن سکتی ہے۔

2) بخاری نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«إِذَا ضُيِّعَتِ الأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ. قَالَ: كَيْفَ إِضَاعَتُهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ ؟ قَالَ: إِذَا أُسْنِدَ الأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ»**"جب امانت کو ضائع کیا جائے تو قیامت کا انتظام کرو۔ ابو ہریرہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ ،اسے کس طرح ضائع کیا جائے گا؟ فرمایا: جب معاملے (حکمرانی) کو نااہل لوگوں کے سپرد کیا جائے تو قیامت کا انتظار کرنا"۔

یہ حدیث بھی نہی جازم کا فائدہ دیتی ہے یعنی ولایت (حکمرانی) کے معاملے کو نااہل لوگوں کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ قرینہ بھی جازم ہے کہ یہ امانت کو ضائع کرنا ہے اور یہ قیامت کی نشانی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نااہل لوگوں کو حکمران بنانا کتنا شدید حرام ہے۔

اب رہی یہ بات کہ باصلاحیت یا کسی کام کے قابل ہونے کا تعین کس طرح کیا جائے گا؟ اس کے لیے تحقیقِ مناط (حقیقت کی چھان بین) کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس کا تعلق کبھی جسمانی یا ذہنی مرض سے ہو سکتا ہے اس لیے اس کے تعین کو محکمہ المظالم پر چھوڑا جائے گا۔ وہی اس کا فیصلہ کرے گا کہ خلیفہ کے امیدواروں میں انعقاد کی شرائط پائی جاتی ہیں کہ نہیں۔

دفعہ نمبر 20: مسلمانوں کی جانب سے حکام کا محاسبہ مسلمان کا حق بھی ہے اور ان پر فرض کفایہ بھی۔ ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو بھی حکمران کے ظلم کی شکایت کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ وہ اسلامی احکامات کو اُن پر غلط انداز سے نافذ کرنے کی شکایت بھی کر سکتے ہیں۔

حکمران کو جب رعایا پر حکمرانی کے منصب پر فائز کیا جاتا ہے تو اس کا یہ تقرر رعایا کی دیکھ بھال کے لیے ہوتا ہے جونہی وہ اس کام میں کوتاہی کرے، اس کا محاسبہ فرض ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا حقیقی حساب تو اللہ

کے ہاں ہی ہو گا اور حکمران کی طرف سے کمی بیشی پر اس کو سزا یا جزا اللہ تعالیٰ ہی دے گا، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی اس کے محاسبے کا حق دیا ہے اور اس محاسبے کو مسلمان پر فرضِ کفایہ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امت کو یہ ذمہ داری دے دی کہ وہ حکمران سے اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بارے میں بازپرس کریں اور اگر وہ اس کی ادائیگی میں کوتاہی برتے تو اس کے اس عمل کو مسترد کریں۔ مسلم نے ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**سَتَكُونُ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ، فَمَنْ عَرَفَ بَرِئَ، وَمَنْ أَنْكَرَ سَلِمَ، وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ**» "عنقریب ایسے حکمران آئیں گے جن کے (برے اعمال) کو تم پہچانو گے اور ان کا انکار کرو گے۔ پس جس نے پہچانا وہ بری ہو گیا اور جس نے ان کا انکار کیا وہ سلامت رہا، ہاں جو ان سے راضی ہو کر ان کی پیروی کرے تو وہ نہ بری ہوا اور نہ سلامت رہا"۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے منکر کو پہنچانا تاکہ اس کو تبدیل کرے اور تبدیل نہیں کر سکتا تو کم از کم اس کو مسترد کرے (انکار کرے) اور یہ دل سے ہوتا ہے، تب بھی وہ سلامت رہا۔ ریاست کے مسلمان شہریوں پر فرض ہے کہ وہ حکمران کا محاسبہ کریں اور اس کے منکر کو تبدیل کرنے کے لیے کام کریں۔ اور اگر وہ حکمران کے منکر عمل پر راضی ہو کر اس منکر کی تابعداری کرتے رہے تو گناہ گار ہو جائیں گے۔ غیر مسلمانوں کو حکمران کے ظلم پر شکایت کے اظہار کا حق حاصل ہے کیونکہ ظلم سے مطلقاً منع کیا گیا ہے خواہ یہ ظلم مسلمان پر ہو یا غیر مسلم پر اور اہلِ ذمہ کو تکلیف پہنچانے سے بھی منع کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**أَلاَ مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا، أَوْ انْتَقَصَهُ، أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ، أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيبِ نَفْسٍ، فَأَنَا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ**» "سنو! جس نے کسی معاہد (جس کو امان دی گئی ہو) پر ظلم کیا یا اس کو نقصان پہنچایا، یا اس کے طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈال دیا یا اس کی مرضی کے بغیر اس سے کوئی چیز لی تو قیامت کے دن میں اس شخص کا مدمقابل (حریف) بنوں گا"، اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے اور زین العراقی نے اس کے اسناد کو جید (عمدہ) قرار دیا ہے۔ معاہد کو تکلیف پہنچانے کے حرام ہونے میں یہ نہی جازم (حتمی ممانعت) ہے اور اہلِ ذمہ بطریقہ اولیٰ اس میں داخل ہیں۔ اسی طرح کچھ خاص قسم کی اذیتوں سے تو خصوصی

طور پر منع کیا گیا ہے جن پر تمام اذیتوں کو قیاس کیا گیا ہے، ابو داؤد نے ابن عباسؓ کے حوالے سے نبی ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اہل نجران سے صلح کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: **«عَلَى أَنْ لاَ تُهْدَمَ لَهُمْ بَيْعَةٌ، وَلا يُخْرَجَ لَهُمْ قَسٌّ، وَلا يُفْتَنُوا عَنْ دِينِهِمْ، مَا لَمْ يُحْدِثُوا حَدَثًا أَوْ يَأْكُلُوا الرِّبَا»** "اس شرط پر کہ ان کی عبادت گاہ کو نہیں گرایا جائے گا اور ان کے پادری کو نہیں نکالا جائے گا اور ان کو انکے دین کے معاملے میں امتحان میں نہیں ڈالا جائے گا اور یہ سب اس وقت تک ہے جب تک وہ کوئی جرم نہ کریں یا سود نہ کھائیں"۔

جب ذمی پر ظلم ہو جائے یا حکمران سے اسے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کو اپنی شکایت کے اظہار کا حق ہے تاکہ اس پر ہونے والے ظلم کو ختم کیا جا سکے اور ظالم کو سزا دی جائے۔ ابن ابی دنیا کی کتاب الاھوال میں روایت ہے، جس کی اسناد سعید بن مسیب تک صحیح ہیں اور جس کو الحافظ نے فتح الباری کے مقدمے میں بھی ذکر کیا ہے کہ ابو بکر صدیقؓ کو فنحاص نامی ایک یہودی نے یہ جواب دیا کہ "اللہ کی قسم اے ابو بکر! ہم اللہ کی محتاج نہیں اللہ ہمارا محتاج ہے، ہم اس کے سامنے اس قدر نہیں گڑ گڑاتے جتنا وہ ہمارے سامنے گڑ گڑاتا ہے، ہم اس سے بے نیاز ہیں وہ ہم سے بے نیاز نہیں۔ اگر وہ غنی ہوتا تو ہم سے ہمارے اموال نہ مانگتا جیسا کہ وہ تمہارے ساتھ کہتا ہے۔ تمہیں سود سے منع کرتا ہے اور ہمیں دیتا ہے"۔ یہاں فنحاص نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ کیا تھا **مَّنْ ذَا الَّذِىْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً** "ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے، پس اللہ تعالیٰ اسے بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے گا" (البقرہ:245)۔ ابو بکرؓ یہودی کے اس جواب پر صبر نہ کر سکے اور غضبناک ہو گئے اور اس کے منہ پر مارا اور بہت بری طرح اس کو پیٹا اور کہا: اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اے اللہ کے دشمن! اگر ہمارے اور تمہارے درمیان عہد نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن اڑا دیتا۔ فنحاص نے رسول اللہ ﷺ سے ابو بکرؓ کی شکایت کر دی اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی شکایت سنی اور ابو بکرؓ سے سوال کیا تو ابو بکرؓ نے وہ سب بتا دیا جو اس نے کہا تھا۔ لیکن جب فنحاص سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے اللہ کی شان میں جو گستاخی کی تھی، اس سے منکر ہو

گیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی **لَّقَدْ سَمِعَ اللّٰہُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ ۘ سَنَکْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَھُمُ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ** ”یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بات سن لی جنھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فقیر اور ہم مالدار ہیں اور ان کی اس بات کو ہم لکھ لیں گے اور ان کا انبیاء کو بلاوجہ قتل کرنا بھی اور ہم (قیامت کے دن) ان سے کہیں گے کہ اب جلنے والا عذاب چکھو“ (آل عمران:181)۔ اس آیت کا یہی سببِ نزول ابن ابی حاتم اور ابنِ منذر نے حسن اسناد کے ساتھ ابن عباس ؓ سے نقل کیا ہے جیسا کہ الحافظ نے بھی فتح الباری میں ذکر کیا ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ ابو بکر ؓ رسول اللہ ﷺ کے وزیر یعنی معاون تھے، اس لیے حکمران تھے۔ اور فنحاص معاہد تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف سے ابو بکر ؓ کے خلاف شکایت یہ جانتے ہوئے بھی سن لی کہ وہ ناحق ہے۔ جب معاہد سے شکایت سنی جاتی ہے تو ذمی سے تو بدرجہ اولیٰ سنی جائے گی کیونکہ اس سے امن و تحفظ کا وعدہ کیا گیا ہے۔

رہی بات اسلام کو اچھے انداز سے نافذ نہ کرنے کی شکایت کی تو یہ بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کا حق ہے۔ بعض مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے معاذ بن جبل ؓ کی یہ شکایت پیش کی کہ وہ نماز میں لمبی قرات کرتے ہیں۔ بخاری نے جابر بن عبد اللہ ؓ سے روایت کی ہے کہ: **«أَقْبَلَ رَجُلٌ بِنَاضِحَيْنِ وَقَدْ جَنَحَ اللَّيْلُ، فَوَافَقَ مُعَاذًا يُصَلِّي، فَتَرَكَ نَاضِحَهُ وَأَقْبَلَ إِلَى مُعَاذٍ، فَقَرَأَ بِسُورَةِ الْبَقَرَةِ أَوْ النِّسَاءِ، فَانْطَلَقَ الرَّجُلُ - وَبَلَغَهُ أَنَّ مُعَاذًا نَالَ مِنْهُ - فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَشَكَا إِلَيْهِ مُعَاذًا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: يَا مُعَاذُ أَفَتَّانٌ أَنْتَ ؟! أَوْ أَفَاتِنٌ ؟! ثَلَاثَ مِرَارٍ، فَلَوْلَا صَلَّيْتَ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ، وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا، وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى، فَإِنَّهُ يُصَلِّي وَرَاءَكَ الْكَبِيرُ وَالضَّعِيفُ وَذُو الْحَاجَةِ»** ”رات کے وقت ایک آدمی دو لاٹھیاں ہاتھ میں لے کر آیا۔ معاذ ؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ اس نے اپنی لاٹھی رکھی اور معاذ ؓ کے پیچھے نماز میں کھڑا ہو گیا۔ معاذ نے نماز میں سورہ بقرہ یا سورہ النساء پڑھی۔ تو وہ آدمی چل پڑا۔ اس آدمی کو بتایا گیا کہ معاذ ناراض ہوئے ہیں، تو وہ شکایت لے کر نبی ﷺ کے پاس آگیا۔ نبی ﷺ نے معاذ ؓ سے فرمایا اے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنے

میں مبتلا کرتے ہو؟ یہ تین مرتبہ فرمایا۔ پھر فرمایا تم سورۃ اعلیٰ یا سورۃ الشمس یا سورت الیل سے کیوں نماز نہیں پڑھاتے ہو۔ تمہارے پیچھے بزرگ کمزور اور ضرورت مند نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں"۔ نبی ﷺ نے شکایت سن لی اور معاذؓ کو ڈانٹا اور فرمایا تم لوگوں کو فتنے میں ڈالتے ہو وہ بھی تین مرتبہ۔ معاذ یمن کے گورنر تھے اور اپنی قوم کے امام بھی تھے۔ یہ حدیث کئی روایات کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ یہ شکایت یا تو اس وقت کی ہے جب وہ یمن میں گورنر تھے یا اپنی قوم کی امامت کرتے ہوئے، بہر حال یہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے اس ذمہ داری کو سونپے کے بعد کی شکایت ہے اور یہ حکمران کے خلاف شکایت ہے اور شریعت کو اچھی طرح نافذ نہ کرنے کی شکایت ہے، کیونکہ شریعت کا حکم ہے کہ امام ہلکی نماز پڑھائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: **«إِذَا أَمَّ أَحَدُكُمْ النَّاسَ فَلْيُخَفِّفْ»** "تم میں سے کوئی امام بنے تو ہلکی نماز پڑھائے" یہ حدیث متفق علیہ ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ اس لیے یہ اسلام کو اچھی طرح نافذ نہ کرنے کی شکایت ہے، پس شکایت جس طرح نماز کے حوالے سے کسی مسلمان سے سنی جائے گی بالکل اسی طرح تمام اسلامی احکامات کے بارے میں سنی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کو بہترین انداز سے نافذ نہ کرنا ظلم ہے اور ہر ظلم کے خلاف شکایت کرنے کا حق مسلمان اور ذمی دونوں کو حاصل ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: **«وَإِنِّي لأَرْجُو أَنْ أَلْقَى رَبِّي وَلَيْسَ أَحَدٌ مِنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلِمَةٍ»** "مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب سے ایسے حال میں ملوں گا کہ تم میں سے کسی کو بھی مجھ سے ظلم کی شکایت نہ ہو گی"۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اس میں 'احد' (کوئی بھی) سے مراد مسلمان اور ذمی دونوں ہیں یہ نہیں فرمایا کہ کسی مسلمان کو مجھے سے شکایت نہ ہو گی بلکہ فرمایا کہ کسی کو بھی مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو اور یہی سب اس دفعہ کی دلیل ہے۔

دفعہ نمبر 21: حکام کے احتساب یا امت کے ذریعے حکومت تک پہنچنے کے لیے سیاسی جماعتیں بنانے کا حق مسلمانوں کو حاصل ہے، بشرطیکہ ان پارٹیوں کی بنیاد اسلامی عقیدہ ہو اور یہ جماعتیں جن احکامات کی تبنی کرتی ہوں وہ اسلامی احکامات ہوں۔ کوئی پارٹی بنانے کے لیے کسی N.O.C (اجازت) کی ضرورت نہیں، ہاں ہر وہ پارٹی ممنوع ہوگی جس کی اساس اسلام نہ ہو۔

اس دفعہ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ** ''اور تم میں سے ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے اور یہی لوگ نجات پانے والے ہیں'' (آل عمران:104)۔ سیاسی جماعت بنانے کے حوالے سے اس آیت سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ''تم میں ضرور ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے'' ایک منظم جماعت بنانے کا حکم ہے، اور 'تم میں سے' کے الفاظ استعمال کر کے اس طرف اشارہ کیا کہ یہ جماعت مسلمانوں میں سے ہونی چاہیے۔ اور یہ نہیں فرمایا کہ مسلمان ایک جماعت ہو کر کام کریں بلکہ آیت میں لفظ ''من'' تبعیض [بعض یا کچھ کو ظاہر کرنے (portioning) کے لیے ہے] بیان (clarification) کے لیے نہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ اس ''من'' کے لفظ کی جگہ ''بعض'' کے لفظ کو لایا جائے تو اس کا استعمال صحیح ہوگا۔ مثلاً مندرجہ ذیل آیت میں موجود ''من'' کو بعض سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا: **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ** ''اللہ تم میں سے اُن لوگوں سے وعدہ فرما چکا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، کہ انہیں ضرور زمین میں اِن حکمرانوں کی بجائے حاکم بنائے گا'' (النور:55) یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ 'اللہ تم ایمان والوں میں سے بعض لوگوں سے وعدہ فرما چکا ہے' گویا یہاں ''من'' جنس کے بیان کے لیے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ صرف صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ ان تمام لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک

اعمال کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ **وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ** میں " مِّنْ " تبعیض کے لیے ہے، یعنی تم میں سے کچھ لوگ ایک جماعت بنا کر یہ کام کریں۔ اس سے دو باتیں معلوم ہو گئیں: ایک یہ کہ مسلمانوں میں ایک جماعت (پارٹی) کا وجود فرضِ کفایہ ہے اور یہ فرضِ عین نہیں، اور دوسری بات یہ کہ ایک ایسے گروہ کی موجودگی جس کو جماعت (پارٹی) کہا جا سکے، وہ اس کام کو کرنے پر قادر ہو یعنی اس فرض ادائیگی پر قادر ہو۔ یعنی اس آیت میں تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے تم اپنے میں سے ایک جماعت قائم کرو، جس کے دو کام ہوں گے: ایک اسلام کی طرف دعوت اور دوسرا کام امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ یہ ہے اس جماعت کو بنانے کا حکم اور اس حکم سے اس جماعت کا کام بھی واضح ہو گیا۔ یہ مطالبہ اگرچہ ایک امر ہے لیکن امر کے ساتھ ساتھ طلبِ جازم (کسی کام کو کرنے کا حتمی مطالبہ) کا قرینہ بھی موجود ہے، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مطالبہ ایک حتمی مطالبہ یعنی فرض ہے۔ وہ قرینہ یہ ہے کہ جس کام کا اس آیت میں ذکر ہے جو یہ جماعت انجام دے گی، وہ کام تمام مسلمانوں پر فرض ہے جیسا کہ دوسری کئی آیات اور احادیث سے ثابت ہے، اور یہی اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ مطالبہ جازم (حتمی) ہے اور یہاں امر وجوب کے لیے ہے۔ پس یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک ایسی جماعت بنائیں جو اسلام کی طرف دعوت دے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے۔

یہ تو اس حوالے سے تھا کہ ایک ایسی جماعت کا قیام مسلمانوں پر فرض ہے جو مذکورہ دو کام کرے جنہیں اس آیت میں مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا ہے، اور اگر ایسی جماعت موجود نہ ہو تو سارے مسلمان گناہ گار قرار پائیں گے۔ اب آتے ہیں اس بات کے ثبوت کی طرف کہ یہ جماعت ایک سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔ اس کی دلیل دو باتیں ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ سب اسلام کی طرف دعوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے اٹھ کھڑے ہوں بلکہ ان دونوں کاموں کو کرنے کے لیے ایک جماعت قائم کرنے کا حکم دے دیا، اس لیے مطلوب یہ نہیں کہ ان دونوں کاموں کو کرو بلکہ مطلوبِ حکم یہ ہے کہ ایسی جماعت قائم کرو جو یہ دونوں کام کرے۔ اس لیے حکم ایک ایسی جماعت کے قیام کے

اوپر ہے نہ کہ محض ان دونوں کاموں کے اوپر۔ اور یہ دونوں اعمال اس جماعت کے کام کی نوعیت بیان کر رہے ہیں کہ جس کے قیام کا حکم دیا جا رہا ہے۔ جماعت کے بطورِ جماعت ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس جماعت کے اعضاء (ممبران) کے درمیان ایسا ربط و تعلق ہو جو ان کو ایک لڑی میں پروئے اور وہ یک جان ہو کر ایک جسم کی مانند ہو جائیں۔ اس ربط کے بغیر وہ گروہ نہ تو مطلوبہ جماعت بن سکتا ہے اور نہ ہی ایک جماعت کے طور پر کام کر سکتا ہے۔ اور دوسری چیز جو ایک گروہ کو بطور ایک جماعت زندہ رکھتی ہے وہ ایک امیر کا وجود ہے جس کی اطاعت فرض ہے کیونکہ شرع نے ہر اس جماعت کے بارے میں حکم دیا جس کے افراد کی تعداد تین سے زیادہ ہو کہ ان کا ایک امیر ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«وَلا يَحِلُّ لِثَلاثَةِ نَفَرٍ يَكُونُونَ بِأَرْضِ فَلاةٍ إِلاَّ أَمَّرُوا عَلَيْهِمْ أَحَدَهُمْ»** ”روئے زمین کے کسی بھی حصے پر موجود تین مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ بغیر امیر کے رہیں بلکہ وہ اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر بنا لیں“، اسے احمد نے عبد اللہ بن عمروؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ پھر اطاعت کو ترک کرنے سے انسان جماعت سے خارج ہو جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **«مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ فَمِيتَةٌ جَاهِلِيَّةٌ»** ”جو شخص اپنے امیر سے کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو اسے صبر کرنا چاہیے۔ کیونکہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا اور اسی حال میں مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا“۔ اس میں امیر کی اطاعت سے نکلنے کو جماعت سے علیحدگی قرار دیا گیا، اس لیے جماعت کی بقاء کے لیے جو چیز لازمی ہے، وہ جماعت کے امیر کی اطاعت ہے۔ ان دونوں کاموں کو کرنے والی جماعت کے وجود کے لیے یہ دو صفات ضروری ہیں یعنی جماعت کے افراد کے درمیان رابطہ اور جماعت کے لیے واجب الاطاعت امیر کی موجودگی، جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے کہ **وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ** ”تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہیے“۔ اللہ کے اس فرمان کا یہ مطلب ہے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہیے جس کے ارکان کے درمیان مضبوط رابطہ ہو اور اس کا ایک واجب الاطاعت امیر ہو۔ یہ ہے وہ حزب، گروہ، جمعیت یا تنظیم یا جماعت یا پھر اس کو کوئی اور نام دیا جا سکتا ہے۔ یہی جماعت باقی رہ سکتی ہے اور کام کر سکتی

ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اس آیت میں اس قسم کی جماعت، جمعیت یا تنظیم وغیرہ کو وجود میں لانے کا حکم ہے۔ یہ سیاسی جماعتیں بنانے کی دلیل اس لیے ہے کہ اس میں ایک ایسی مخصوص جماعت قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کے لیے مخصوص اور متعین کام بھی مقرر کیا گیا ہے۔ یہاں صرف جماعت بنانے کا حکم نہیں، آیت نے اس کام کی نوعیت بھی بیان کر دی ہے جسے وہ جماعت بحیثیت جماعت کے انجام دے گی۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ یہ جماعت کس طرح کی ہونی چاہیے اور یہ کیسے کام کرے گی۔ یعنی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ یہ اس جمعیت کی صفت ہو گی اور یہ مقرر کردہ صفت ہے یعنی یہاں جماعت سے مراد وہ جماعت ہے جو صرف یہ کام کرے تب ہی یہ فرض ادا ہو گا ورنہ کوئی بھی جماعت بنانے سے یہ فرض ادا نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک خیر کی طرف یا اسلام کی طرف دعوت دینے کا تعلق ہے تو کوئی بھی حزب، کوئی بھی جمعیت یا کوئی بھی تنظیم یہ عمل کر سکتی ہے لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام کے لیے لازمی طور پر ایک سیاسی جماعت کی ضرورت ہے، کیونکہ اس میں حکمرانوں کو بھی بھلائی کرنے کا حکم اور برائی سے روکنے کا حکم دینا شامل ہے بلکہ دراصل یہی امر بالمعروف اور نہی المنکر ہے جو کہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے کیونکہ یہ آیت **وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں" عام ہے۔ اس میں، "المعروف" اور "المنکر" میں الف اور لام اسم جنس کے مظہر ہیں جو عمومیت کا صیغہ ہے۔ یہی کام سیاسی جماعت کے سب سے اہم کاموں میں سے ایک کام ہے اور یہی کام کرنے سے کوئی حزب یا جمعیت یا تنظیم سیاسی جماعت یا سیاسی تنظیم کہلائے گی۔ چونکہ یہ کام یعنی حکمرانوں کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کاموں میں سے اہم ترین کام ہے۔ اور آیت میں جن دو کاموں کو کرنے کے لیے جماعت سازی کا حکم دیا گیا ہے ان میں سے ایک کام یہی ہے، چنانچہ آیت میں جس مخصوص جماعت کو بنانے کا حکم ہے اس جماعت کا کام اسلام کی طرف دعوت دینا، حکمرانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور باقی تمام انسانوں کو بھی معروف کا حکم کرنا اور منکرات سے روکنا ہے۔ یہ ہے وہ جماعت جس کے

بنانے کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حکم دیا ہے یعنی اس جماعت کے اندر وہ تمام صفات ہونی چاہیے جو اس آیت میں مذکورہ ہیں اور ایسی جماعت ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس فرض کی ادائیگی کے لیے ایک ایسی جماعت بنانا کافی ہے جو اسلام کی طرف دعوت دے، اور لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے لیکن حکمرانوں سے پہلو تہی کرے۔ جی ہاں! یہ کہنا غلط ہے کیونکہ یہ مطلوبہ فرض اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک وہ جماعت ایسی جماعت نہ ہو جو ان تمام صفات کی حامل ہو جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ جماعت خیر کی طرف دعوت کے ساتھ مکمل طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے۔ یہ اس لئے کہ آیت میں یہ کام لفظ "و" کے ساتھ آیا ہے جو کہ عطف (واؤ کی ایک قسم) کو ظاہر کرتا ہے اور شمولیت کا فائدہ دیتا ہے، اور اس لئے بھی کہ جو الفاظ امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کے لئے استعمال ہوئے وہ عام ہیں اور عمومیت کے صیغے کے ساتھ ہیں۔ اسلئے لازمی طور پر وہ اپنی عمومیت پر ہی رہے گی اور اپنی عمومیت کو مکمل کرے گی، یوں یہ فرض اس وقت تک ادا نہیں ہو گا جب تک اس جماعت کا کام عام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ ہو اور کوئی چیز اس سے مستثنیٰ نہ ہو جیسا کہ آیت میں مذکورہ ہے۔ اگر حکمرانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کو اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا جائے یعنی سیاسی عمل کو اس سے الگ کر دیا جائے تو ایسی جماعت وہ جماعت نہیں ہو گی جو اس آیت میں مطلوبہ ہے۔ یوں یہ کوئی اور جماعت ہو سکتی ہے لیکن اس آیت میں جس جماعت کے بنانے کا حکم دیا گیا ہے یہ وہ جماعت نہیں ہو گی کیونکہ اس جماعت نے حکمرانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کو اس عمل سے مستثنیٰ کر دیا، اس لیے اس کے اندر وہ صفت نہیں رہی جو مذکورہ آیت میں بیان کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھر وہ فرض ادا نہیں ہو گا جس کی ادائیگی کا حکم ایک سیاسی جماعت بنا کر کرنے کی صورت میں دیا گیا ہے یعنی ایک سیاسی حزب یا سیاسی جمعیت یا پھر سیاسی تنظیم کو وجود میں لا کر ہی اس فرض کو ادا کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک ایسی جماعت کے قیام کا حکم ہے جو بغیر کسی استثناء کے، عام امر بالمعروف نہی عن المنکر کرے اور یہ کام ایک سیاسی حزب یا سیاسی جمعیت بنائے بغیر نہیں ہو سکتا۔

یوں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایسی سیاسی پارٹیوں کے قیائم کا حکم دے دیا جو اسلامی دعوت کا بیڑہ اٹھائیں گی، حکمرانوں کے محاسبے کے ذریعے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں گی اور تمام انسانوں کو بلا استثناء بھلائی کا حکم دیں گی اور برائی سے منع کریں گی، یہ تھا اس دفعہ کے لیے اس آیت سے استدلال کرنے کا سبب۔

یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آیت میں ''اُمۃ'' یعنی ایک حزب کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد جماعتیں نہیں بلکہ صرف ایک جماعت ہونی چاہیے ، جی ہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ آیت نے ''امۃ واحدۃ'' نہیں کہا نہ ہی ''جماعۃ واحدۃ'' کہا بلکہ نکرہ کا صیغہ استعمال کرتے ہو بغیر صفت کے ''اُمۃ'' کہا جسکا مطلب ہے جماعت کا قیام فرض ہے اور ایک ہی جماعت قائم کرنے پر فرض ادا ہو گا لیکن ایک سے زیادہ جماعتیں بنانے سے روکا نہیں جاسکتا۔ جماعت کا لفظ یہاں اسم جنس ہے یعنی یہاں جماعت کے لفظ کا استعمال جنس کے طور پر ہے نہ کہ واحد اکائی کے طور پر۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ** ''تم بہترین امت ہو جو کہ انسانوں کے لئے اٹھائے گئے ہو'' اور اس سے مراد جنس ہے۔ اور اسی طرح کی ایک اور مثال رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے **«مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ»** ''تم میں سے کوئی بھی کوئی منکر دیکھے تو اس کو تبدیل کرے (روک دے)'' یہاں کوئی ایک منکر مراد نہیں بلکہ جنس یعنی ہر طرح کا منکر مراد ہے، اور اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ یوں یہ حکم جنس میں سے ایک اکائی پر بھی لاگو ہے اور کئی اکائیوں پر بھی لاگو ہے۔ اس لیے امت میں ایک سیاسی جماعت کا ہونا بھی جائز ہے اور کئی ایک سیاسی جماعتوں کا ہونا بھی جائز ہے۔ تاہم جس وقت ایک ایسی سیاسی جماعت وجود میں آگئی جو آیت میں مذکورہ مطلوبہ کام کر رہی ہو تو فرض کفایہ ادا ہو گیا لیکن پھر بھی دوسری سیاسی جماعت بنانے سے نہیں روکا جائے گا۔ کیونکہ سیاسی جماعت بنانا مسلمانوں پر فرض کفایہ تھا۔ ایک سیاسی جماعت بن گئی تو یہ فرض تو ادا ہو گیا لیکن دوسرے مسلمان چاہیں تو وہ بھی سیاسی جماعت بنا کر یہ فرض ادا کر سکتے ہیں۔ ان کو روکنا جائز نہیں کیونکہ کسی کو فرض کی ادائیگی سے روکنا حرام ہے۔ تاہم کسی بھی سیاسی جماعت کا وہی کام ہو سکتا ہے جو اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ اس جماعت کو بنانے کی اجازت بھی اس شرط پر ہو گی کہ وہ یہی کام کرے یعنی اسلام کی طرف دعوت اور امر بالمعروف و نہی عن

المنکر اور حکمرانوں کا محاسبہ۔ اس کے علاوہ اگر کوئی کسی قسم کی جماعت بناتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ وہ کوئی حرام کام تو نہیں کر رہی ہے۔ اگر کوئی حرام کام کر رہی ہے جیسے قومیت کی طرف دعوت یا غیر اسلامی افکار کی اشاعت وغیرہ تو ایسی کسی بھی جماعت کو بنانا یا اس میں شامل ہونا حرام ہے اور ریاست اسے منع کرے گی اور جو بھی ایسا کام کرے گا اس کو سزا ملے گی۔ اگر کوئی ایسی جماعت بناتا ہے جو کوئی حرام کام تو نہیں کرتی بلکہ اس کی بنیاد مباح کام پر رکھی گئی ہو تو یہ کام تو مباح ہو گا لیکن اس سے آیت میں مذکورہ فرض ادا نہیں ہو گا۔ یہ فرض صرف اسوقت ادا ہو گا جب ایک ایسی سیاسی جماعت بنائی جائے جس کی صفات اس آیت میں مذکورہ ہیں۔

چونکہ فرض کی ادائیگی کے لیے حکمران کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ فرض کی ادئیگی کو حکمران کی اجازت پر موقوف کرنا حرام ہے چنانچہ سیاسی جماعتیں قائم کرنے کے لیے اور ان کو پروان چڑھانے کے لیے کسی اجازت (لائسنس یا پرمٹ وغیرہ) کی ضرورت نہیں۔

دفعہ نمبر 22: نظامِ حکومت مندرجہ ذیل چار بنیادوں پر قائم ہوتا ہے:

ا۔ بالادستی حاکمیت اعلیٰ (Sovereignity) شرع کو حاصل ہے عوام کو نہیں۔
ب۔ اقتدار امت کا ہے۔
ج۔ ایک ہی خلیفہ کا تقرر مسلمانوں پر فرض ہے۔
د۔ صرف خلیفہ کو ہی احکام شرعیہ کی تبنی کا حق حاصل ہے اور وہی دستور اور قوانین مرتب کر سکتا ہے۔

اس دفعہ میں حکمرانی کے ان قواعد کا ذکر ہے جن کے بغیر حکمرانی کا تصور نہیں۔ یہ وہ قواعد اور بنیادیں ہیں جن میں سے ایک بھی نہ ہو تو حکمرانی کا وجود باقی نہیں رہتا۔ یہاں حکمرانی سے مراد اسلام کی حکومت یا اسلام کی اتھارٹی ہے، کوئی سی بھی حکمرانی نہیں۔ یہ قواعد ادلہ شرعیہ کی چھان بین سے ماخوذ ہیں۔

پہلا قاعدہ (اصول) یعنی شریعت کی بالا دستی، کی ایک حقیقت ہے اور جو لفظ 'سیادت یا حاکمیتِ اعلیٰ' سے ظاہر ہے۔ اس حقیقت کے لیے دلیل موجود ہے کہ یہ حاکمیت اعلیٰ شریعت کی ہے اور عوام کی نہیں۔ جہاں تک حاکمیتِ اعلیٰ (Sovereignity) کی حقیقت کا تعلق ہے تو یہ لفظ ایک مغربی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب ہے کہ اپنے ارادوں کا مالک اور اپنے ارادوں کے مطابق چلنے والا۔ اگر فرد اپنے ارادے کا مالک ہے اور اپنے ارادے کے مطابق چلتا ہے تو بالا دستی یا حاکمیتِ اعلیٰ اسی کی ہے۔ اگر اس کے ارادے پر کسی اور کا اختیار ہے اور وہ ایک غلام کی طرح اس مالک کے اختیار کے مطابق چلتا ہے تو وہ ارادے میں بالا دست نہیں۔ اگر ایک امت اپنے ارادے یعنی اپنے افراد کے مجموعے کے ارادے مطابق چلتی ہے اور اپنی خوشی سے اپنے امور کی باگ دوڑ اپنے میں سے چند افراد کو دیتی ہے تو وہ امت اپنے آپ پر بالا دست ہے یعنی بالا دستی عوام کی ہے اور اگر ایک امت کو اس کے علاوہ کوئی اور اس کے ارادے کے بغیر چلاتا ہے تو یہ اس چلانے والے کی غلام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری نظام میں یہ کہا جاتا ہے کہ بالا دستی عوام کو حاصل ہے یعنی عوام خود اپنے ارادوں کے مالک ہیں اور جس کو چاہیں اپنے امور کی باگ ڈور چلانے کا حق دے دیں۔ یہ ہے اس بالا دستی کی حقیقت کہ جس کے متعلق حکم کو ہم بیان کریں گے۔ بالا دستی یا حاکمیت اعلیٰ کے متعلق شرعی حکم یہ ہے کہ بالا دستی شرع کی ہے عوام کی نہیں۔ فرد اپنے ارادے کا مالک نہیں کہ جیسے چاہے ویسے چلے بلکہ وہ اپنے ارادوں میں اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کا پابند ہے بالکل اسی طرح امت بھی اپنی مرضی کی مالک نہیں کہ جو چاہے ویسا کرے بلکہ امت بھی اپنے ارادے میں اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی پابند ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ** "سو قسم ہے آپ (ﷺ) کے رب کی! یہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپس کے تمام اختلاف میں آپ کو حاکم نہ مان لیں" (النساء:65)۔ اور رسول اللہ

ﷺ کا فرمان ہے کہ: **«لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُونَ هَوَاهُ تَبعاً لِمَا جِئْتُ بِهِ»** "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی تمام خواہشات اس دین کے تابع نہ ہو جو میں لے کر آیا ہوں"۔ اس کو ابن ابی عاصم نے السنۃ میں نقل کیا ہے۔ النووی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس کو انہوں نے اربعین میں عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کیا ہے۔ امت اور فرد کے ارادے پر جو چیز بالادست ہے اور ان کے ارادوں کو چلاتی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت ہے۔ امت اور فرد دونوں شریعت کے سامنے سرِ تسلیم ختم کرتے ہیں۔ اس لیے بالادستی شریعت کو حاصل ہے۔ لہٰذا امت کی جانب سے خلیفہ کی بیعت اس لیے نہیں کی جاتی کہ وہ امت کی خواہش کے مطابق حکومت کرے یا جو وہ چاہتے ہیں وہ ان پر نافذ کرے جیسا کہ جمہوری نظام میں ہوتا ہے بلکہ خلیفہ کی بیعت اس شرط پر کی جاتی ہے کہ وہ امت پر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ یعنی شریعت کو نافذ کرے اور لوگوں کی خواہش کی پیروی نہ کرے حتی کہ جن لوگوں نے خلیفہ کا تقرر کیا اگر وہ بھی اسلام سے بغاوت کریں گے تو ان سے لڑا جائے گا یہاں تک کہ وہ باز آ جائیں۔

شریعت کی جانب سے خلیفہ کو مقرر کرنے کی ذمہ داری امت کو سونپنا بیعت والی احادیث میں واضح ہے، عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ: **«بَايَعْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ»** "ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی کہ ہم خوشی اور غمی (یعنی ہر حال میں) سنیں گے اور اطاعت کریں گے" (متفق علیہ)۔ اور جریر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے **«بَايَعْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ»** "میں نے نبی ﷺ کی بیعت کی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے"۔ اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«ثَلاثَةٌ لا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: رَجُلٌ عَلَى فَضْلِ مَاءٍ بِالطَّرِيقِ يَمْنَعُ مِنْهُ ابْنَ السَّبِيلِ، وَرَجُلٌ بَايَعَ إِمَامًا لا يُبَايِعُهُ إِلاَّ لِدُنْيَاهُ إِنْ أَعْطَاهُ مَا يُرِيدُ وَفَى لَهُ وَإِلاَّ لَمْ يَفِ لَهُ، وَرَجُلٌ يُبَايِعُ رَجُلاً بِسِلْعَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ فَحَلَفَ بِاللَّهِ لَقَدْ أُعْطِيَ بِهَا كَذَا وَكَذَا فَصَدَّقَهُ فَأَخَذَهَا وَلَمْ يُعْطَ بِهَا»** "تین آدمی ایسے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات

بھی نہیں کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ایک وہ آدمی جو مسافروں کو راستے میں موجود ضرورت سے زیادہ پانی نہیں دیتا، وہ آدمی جو خلیفہ کی بیعت دنیا کی وجہ سے کرتا ہے جب وہ اس کو کچھ دیتا ہے تو بیعت کو پورا کرتا ہے ورنہ بے وفائی کرتا ہے، ایک وہ آدمی جو دوسرے آدمی کے کسی چیز کا سودا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مجھے اتنے میں ملی ہے حالانکہ اس کو اتنے میں نہیں ملی لیکن وہ آدمی اس کو سچا جان کر خرید لیتا ہے" (متفق علیہ)۔ پس بیعت مسلمانوں کی جانب سے خلیفہ کی ہوتی ہے، خلیفہ کی جانب سے مسلمانوں کی نہیں، مسلمان ہی خلیفہ کو بیعت دیتے ہیں یعنی اس کو حکمران بناتے ہیں۔ خلفائے راشدینؓ کے ساتھ یہی ہوا، امت نے ان کو بیعت دی اور اس بیعت کی وجہ سے ہی وہ امت کے حکمران بنے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بیعت کے ذریعے ہی خلیفہ کو اتھارٹی حاصل ہوتی ہے تو یہ بھی اطاعت اور وحدت والی احادیث سے واضح ہے۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: **«وَمَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ فَلْيُطِعْهُ إِنِ اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ، فَاضْرِبُوا عُنُقَ الآخَرِ»** "جس نے خلیفہ کو بیعت دی اور اسے اپنے ہاتھ کا سودا اور اپنے دل کا پھل (یعنی خلوص) اس کو دیا، تو اس کو چاہیے کہ اب حسب استطاعت اس کی اطاعت بھی کرے، اور اگر کوئی آکر اس سے لڑتا ہے تو دوسرے کی گردن اڑا دو"۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ نافع کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن عمرؓ نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: **«مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللَّهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لا حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً»** "جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا، وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہوگی، اور جو اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں خلیفہ کی بیعت کا طوق نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا"۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَنْ كَرِهَ مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا فَلْيَصْبِرْ عَلَيْهِ، فَإِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِبْرًا فَمَاتَ عَلَيْهِ إِلاَّ مَاتَ مِيتَةً**

جَاهِلِيَّةً» ”کسی کو اپنے امیر کی کوئی بات پسند نہ آئے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس پر صبر کرے کیونکہ لوگوں میں سے جو سلطان سے بالشت بھر بھی الگ ہو گیا اور اسی حال میں مر گیا، تو وہ جاہلیت کی موت مرا“ (متفق علیہ)۔

اور ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا **«كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لا نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُونَ، قَالُوا: فَمَا تَأْمُرُنَا ؟ قَالَ: فُوا بِبَيْعَةِ الأَوَّلِ فَالأَوَّلِ، أَعْطُوهُمْ حَقَّهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ»** ”بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وفات پاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا، جبکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے‘ بلکہ بڑی کثرت سے خلفاء ہوں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: آپ ﷺ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’تم ایک کے بعد دوسرے کی بیعت کو پورا کرو اور انہیں ان کا حق ادا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کی رعایا کے بارے میں پوچھے گا، جو اُس نے انہیں دی“ (مسلم)۔ یہ تمام احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خلیفہ کو اختیار واقتدار اس بیعت کی وجہ سے حاصل ہوا جو اسے دی گئی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اطاعت کو بیعت کے بعد ہی فرض قرار دیا ہے، پس فرمایا کہ جو امام کی بیعت کرے تو اسے چاہیئے کہ اس کی اطاعت بھی کرے۔ پس ایک شخص بیعت لینے کی وجہ سے خلیفہ بن گیا اور اس کی اطاعت فرض ہو گئی کیونکہ وہ ایسا خلیفہ بن گیا جس کو بیعت دی گئی، یوں بیعت کے ذریعے اس نے امت سے اقتدار (اتھارٹی) اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی رسول ہونے کے باوجود لوگوں سے بیعت لی۔ آپ ﷺ نے مردوں اور عورتوں سے یہ بیعت لی لیکن اُن بچوں سے نہیں لی جو ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے خلیفہ کو بیعت کے ذریعے مقرر کرنے کا حق مسلمانوں کے پاس ہی ہے اور وہ اس شرط پر خلیفہ کی بیعت کرتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کو ان پر نافذ کرے اور اس بیعت کے ذریعے خلیفہ کو اقتدار ملنے کا یہ واضح مطلب ہے کہ اقتدار امت کے پاس ہے، وہ جس شخص کو چاہے گی دے دے گی۔

اب یہ قاعدہ یعنی ایک خلیفہ کا تقرر مسلمانوں پر فرض ہے تو یہ حدیث سے ثابت ہے کہ خلیفہ کو مقرر کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوسنا کہ **«مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللَّهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لا حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ**

مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً» ''جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہو گی اور جو اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں خلیفہ کی بیعت کا طوق نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا''۔ اس کو مسلم نے عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تمام مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ ان کی گردن پر خلیفہ کی بیعت کا طوق ہو۔ ہر مسلمان کے لیے بذاتِ خود فرداً فرداً خلیفہ کی بیعت کرنا فرض نہیں بلکہ فرض یہ ہے کہ ہر ایک کی گردن پر خلیفہ کی بیعت موجود ہو یعنی تمام مسلمانوں کا خلیفہ موجود ہو۔ خلیفہ کی موجودگی سے یہ فرض ادا ہو جائے گا خواہ ہر مسلمان عملاً اس کی بیعت کرے یا نہ کر سکے۔ اور خلیفہ کا ایک ہی ہونے کی دلیل وہ روایت ہے جو ابو سعید حذریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الآخَرَ مِنْهُمَا» ''جب دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو بعد والے کو قتل کر دو''، اس کو مسلم نے روایت کیا ہے، یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ مسلمانوں کا ایک سے زیادہ خلیفہ ہونا حرام ہے۔

چوتھا قاعدہ یعنی صرف خلیفہ کو احکامات کی تبنی کا حق حاصل ہے۔ یہ اجماع صحابہؓ سے ثابت ہے کہ صرف خلیفہ ہی احکامات کی تبنی کر سکتا ہے اور اس اجماع سے یہ مشہور قاعدہ نکالا گیا ہے کہ ''امام کا حکم اختلاف کو ختم کرتا ہے'' یا یہ قاعدہ کہ ''خلیفہ پیدا ہونے والے مسائل کا حل دیتا ہے''۔

دفعہ نمبر 23: ریاست خلافت کے تیرہ ادارے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ **خلیفہ (ریاست کا سربراہ)**
2۔ **معاونین (وزراء تفویض)**
3۔ **وزراء تنفیذ**
4۔ **والی (گورنرز)**
5۔ **امیر جہاد**
6۔ **اندرونی سلامتی (داخلی سیکورٹی)**
7۔ **خارجہ (خارجہ امور)**
8۔ **صنعت**

9۔ قضاء (عدلیہ) 10۔ مفاد عامہ (انتظامی ادارہ)

11۔ بیت المال 12۔ میڈیا

13۔ مجلسِ امت (شوریٰ اور محاسبہ)

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فعل ہے کیونکہ آپ ﷺ نے خود ریاست کے ادارے قائم کیے جو کہ مذکورہ شکل میں تھے۔ آپ ﷺ خود ریاست کے سربراہ تھے۔ مسلمانوں کو بھی ریاست کے لیے سربراہ مقرر کرنے کا حکم دیا یعنی ان کو خلیفہ اور امام منتخب کرنے کا حکم دیا ہے، فرمایا **«مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللَّهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لا حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً»** "جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہوگی اور جو اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں خلیفہ کی بیعت کا طوق نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا"۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور اس حدیث کا مطلوب خلیفہ کی بیعت کرنا ہے۔ صحابہ رضوان اللہ نے اس بات پر اجماع کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ان کا خلیفہ مقرر کرنا لازمی ہے اور اس بات کی تائید اور اس اجماع کی تاکید اس وقت ظاہر ہوگئی جب آپ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہؓ آپ ﷺ کی تدفین کو موئخر کر کے خلیفہ کے تقرر میں مشغول ہوگئے۔

معاونین کی دلیل وہ حدیث ہے جو ابوداؤد نے عمدہ اسناد کے ساتھ عائشہؓ سے روایت کی ہے، وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **(إِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِالأَمِيرِ خَيْرًا جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ صِدْقٍ، إِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهُ وَإِنْ ذَكَرَ أَعَانَهُ. وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهِ غَيْرَ ذَلِكَ جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ سُوءٍ، إِنْ نَسِيَ لَمْ يُذَكِّرْهُ وَإِنْ ذَكَرَ لَمْ يُعِنْهُ)** "جب اللہ تعالیٰ کسی امیر (حکمران) کے لیے بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو ایک ایسا وزیر دیتے ہیں جو بھولنے پر اس کو یاد دلاتا ہے اور یاد آنے پر اس کی مدد کرتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی امیر کے لیے بھلائی کا ارادہ نہیں فرماتے تو اس کو ایسا وزیر دیتے ہیں جو بھولنے پر یاد بھی نہیں دلاتا اور یاد آنے پر مدد بھی نہیں کرتا"۔ اور ترمذی نے ابو سعید خدریؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: (مَا مِنْ نَبِيٍّ إِلاَّ لَهُ وَزِيرَانِ مِنْ أَهْلِ السَّمَاءِ وَوَزِيرَانِ مِنْ أَهْلِ الأَرْضِ فَأَمَّا وَزِيرَايَ مِنْ أَهْلِ السَّمَاءِ فَجِبْرِيلُ وَمِيكَائِيلُ وَأَمَّا وَزِيرَايَ مِنْ أَهْلِ الأَرْضِ فَأَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ) "ہر نبی کے دو آسمانی وزیر ہوتے ہیں اور دو زمین میں سے۔ آسمان والوں میں سے میرے وزیر جبریل اور میکائیل ہیں جبکہ اہلِ زمین میں سے ابو بکر اور عمر ہیں"۔ یہاں لفظ وزیر کا معنی معاون ہے کیونکہ یہی اس کا لغوی معنی ہے اور وزیر سے آج کل لوگ جو مطلب سمجھتے ہیں، وہ ایک مغربی تصور ہے، مسلمانوں اس سے واقف نہ تھے اور یہ اسلام کے نظام حکومت کے خلاف ہے، جسکا بیان اپنی جگہ پر آئے گا۔

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کے عہد میں وزیر تنفیذ کو کاتب کہا جاتا تھا اور اس کا کام تنفیذ میں خلیفہ کی معاونت اور خلیفہ کی جانب سے دیئے گئے احکامات کی تنفیذ کے حوالے سے پیروی (Follow up) اور کارکردگی کو دیکھنا ہوتا تھا۔ بخاری نے اپنی صحیح میں زید بن ثابتؓ سے روایت کیا ہے کہ «أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمَرَهُ أَنْ يَتَعَلَّمَ كِتَابَ الْيَهُودِ حَتَّى كَتَبْتُ لِلنَّبِيِّ ﷺ كُتُبَهُ وَأَقْرَأْتُهُ كُتُبَهُمْ إِذَا كَتَبُوا إِلَيْهِ». "نبی ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ یہودیوں کی زبان سیکھو یہاں تک میں رسول ﷺ کے لیے آپ ﷺ کے خطوط لکھنے لگا اور ان (یہودیوں) کے خطوط نبی ﷺ کو پڑھ کر سنانے لگا"۔ ابنِ اسحاق نے عبد اللہ بن زبیرؓ سے روایت کیا ہے کہ (أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ اسْتَكْتَبَ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ الأَرْقَمِ بْنِ عَبْدِ يَغُوثَ، وَكَانَ يُجِيبُ عَنْهُ الْمُلُوكَ ...) " رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن ارقم بن عبد یغوث کو لکھوایا کرتے تھے۔ وہ رسول ﷺ کی طرف سے بادشاہوں کو جواب دیا کرتے تھے"۔ حاکم نے اپنی مُستدرَک میں روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا اور ذھبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے کہ عبد اللہ بن عمرؓ نے بیان کیا: (أَتَى النَّبِيَّ ﷺ كِتَابُ رَجُلٍ، فَقَالَ لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ الأَرْقَمِ: أَجِبْ عَنِّي. فَكَتَبَ جَوَابَهُ ثُمَّ قَرَأَهُ عَلَيْهِ، فَقَالَ: أَصَبْتَ وَأَحْسَنْتَ، اللَّهُمَّ وَفِّقْهُ، فَلَمَّا وَلِيَ عُمَرُ كَانَ يُشَاوِرُهُ) "نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی کا خط آیا تو آپ ﷺ نے عبد اللہ الارقم سے فرمایا: میرے طرف سے جواب دو۔ انہوں نے جواب لکھا اور پڑھ کر رسول ﷺ کو سنایا تو فرمایا: تم نے بہت اچھا

جواب دیا، اے اللہ! اس کو توفیق دے۔ اسلئے جب عمرؓ خلیفہ بنے تو عبد اللہ بن الارقم سے مشورہ کیا کرتے تھے"۔

والیوں کی دلیل بخاری اور مسلم میں ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے:«**بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَبَا مُوسَى وَمُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ إِلَى الْيَمَنِ، قَالَ: وَبَعَثَ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَلَى مِخْلافٍ، قَالَ: وَالْيَمَنُ مِخْلافَانِ**» "رسول اللہ ﷺ نے ابو موسیٰؓ اور معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا۔ راوی کہتا ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو الگ علاقے (صوبے) میں بھیجا کیونکہ یمن کے دو علاقے تھے۔ مسلم میں ہی ابو موسیٰؓ کی روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: «**لَنْ أَوْ لاَ نَسْتَعْمِلُ عَلَى عَمَلِنَا مَنْ أَرَادَهُ، وَلَكِنِ اذْهَبْ أَنْتَ يَا أَبَا مُوسَى أَوْ يَا عَبْدَ اللَّهِ بْنَ قَيْسٍ، فَبَعَثَهُ عَلَى الْيَمَنِ ثُمَّ أَتْبَعَهُ مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ**» "ہم یہ معاملہ (حکمرانی) اس شخص کو نہیں دیتے جو مانگتا ہے، لیکن تم جاؤ اے ابو موسیٰ یا عبد اللہ بن قیس۔ پس آپ ﷺ نے ان کو یمن روانہ کیا۔ اس کے بعد معاذ بن جبلؓ کو بھی ان کے پیچھے روانہ فرمایا"۔ بخاری اور مسلم نے عمرو بن عوف انصاریؓ سے روایت کیا ہے کہ (**... وَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ هُوَ صَالَحَ أَهْلَ الْبَحْرَيْنِ وَأَمَّرَ عَلَيْهِمُ الْعَلاءَ بْنَ الْحَضْرَمِيِّ**) " رسول ﷺ نے جب اہلِ بحرین کے ساتھ صلح کرلی تو علاء بن حضرمی کو ان پر گورنر مقرر کیا۔ اور ابنِ عبد البر نے الاستیعاب میں کہا ہے کہ«**وَوَلَّى رسولُ اللَّهِ ﷺ عَمْرَو بنَ العاصِ على عُمانَ فلم يَزَلْ عليها حتى قُبِضَ رسولُ الله ﷺ**» " اور رسول ﷺ نے عمرو بن العاصؓ کو عمان پر والی مقرر کیا اور وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک گورنر تھے"۔

امیرِ جہاد کی دلیل سنت سے ہے۔ ابنِ سعد نے طبقات میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (**أَمِيرُ النَّاسِ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ، فَإِنْ قُتِلَ فَجَعْفَرُ بْنُ أَبِي طَالِبَ، فَإِنْ قُتِلَ فَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ رَوَاحَةَ، فَإِنْ قُتِلَ فَلْيَرْتَضِ الْمُسْلِمُونَ بَيْنَهُمْ رَجُلاً فَيَجْعَلُوهُ عَلَيْهِمْ**) "لوگوں کے امیر زید بن حارثہ ہوں گے، اگر ان کا انتقال ہو جائے تو جعفر بن ابی طالب امیر ہوں

گے اور وہ بھی شہید کئے جائیں تو عبداللہ بن رواحہ اور اگر وہ بھی جام شہادت نوش کریں تو مسلمان اپنی رضامندی سے کسی شخص کو اپنا امیر منتخب کرلیں"۔ بخاری نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ موتہ میں زید بن حارثہؓ کو امیر مقرر فرمایا۔ بخاری نے ہی سلمہ بن الاکوعؓ کی حدیث روایت کی ہے کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ سات غزوات میں شریک ہوا اور زید بن حارثہؓ کے ساتھ بھی غزوہ میں شریک ہوا، جن کو رسول اللہ ﷺ نے ہمارا امیر مقرر کیا تھا۔ بخاری اور مسلم نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جہاد کے لیے لشکر روانہ فرمایا اور اسامہ بن زیدؓ کو اس لشکر کا امیر مقرر کیا۔ کچھ لوگوں نے اسامہؓ کی امارت پر ناگواری دکھائی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو ان کی امارت پسند نہیں جیسا کہ ان کے باپ کی امارت تمھیں ناگوار تھی۔ اللہ کی قسم! یہ تو پیدائشی امیر ہے (یعنی امارت کے لیے بہترین آدمی ہے)۔ مسلم نے بریدہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی شخص کو لشکر یا مجاہدین کے کسی گروہ کا امیر منتخب کرتے تو اسے نصیحت فرماتے۔

امن داخلی کا سربراہ پولیس افسر ہوتا ہے اور اس کا کام دار الاسلام میں امن و امان برقرار رکھنا ہے اگر وہ امن و امان برقرار رکھنے سے عاجز آتا ہے تو خلیفہ کے حکم سے فوج اس کی ذمہ داری قبول کرے گی۔ اس کی دلیل بخاری میں موجود انسؓ کی روایت ہے کہ **"كَانَ قَيْسُ بْنُ سَعْدٍ مِنْ النَّبِيِّ ﷺ بِمَنْزِلَةِ صَاحِبِ الشُّرَطِ مِنْ الأَمِيرِ".** "قیس بن سعد نبی ﷺ کے ساتھ ایسے ہوتے تھے جیسے امیر کے ساتھ پولیس کا سربراہ ہوتا ہے"۔

جہاں تک خارجہ امور کی بات ہے تو رسول اللہ ﷺ نے دوسری ریاستوں اور قوتوں کے ساتھ خارجہ تعلقات قائم کیے۔ آپ ﷺ نے عثمان بن عفانؓ کو قریش کے پاس مذاکرات کے لئے بھیجا۔ آپ ﷺ نے خود قریش کے ایلچی سے مذاکرات کیے، کئی بادشاہوں کی طرف اپنے نمائندے روانہ کئے اور خود بھی بادشاہوں اور حکمرانوں کے ایلچیوں کو قبول کیا اور کئی معاہدے اور صلح بھی کیں۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفاء بھی دوسری ریاستوں اور ملکوں کے ساتھ خارجہ تعلقات استوار کرتے رہے اور

خارجہ تعلقات قائم کرنے کے لئے اپنے نمائندے بھی مقرر کرتے تھے کیونکہ جو شخص خود کوئی کام کر سکتا ہے تو وہ اس کام کے لیے دوسرے کو بھی اپنا وکیل اور نمائندہ بنا سکتا ہے۔

صنعت و حرفت کی دلیل کتاب و سنت میں موجود ہے، کتاب اللہ میں ارشاد ہے: **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ** "اور ان کے مقابلے کے لئے اپنی مقدور بھر قوت اور گھوڑوں کو تیار رکھو تاکہ اس سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور اُن کے سوا دوسروں کو بھی، جنہیں تم نہیں جانتے لیکن اللہ انہیں خوب جان رہا ہے۔ تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں صرف کرو گے وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمھارا حق نہیں مارا جائے گا"۔

جہاں تک سنت کی بات ہے، تو ابن سعد نے طبقات میں مکحول سے روایت کیا ہے کہ **(أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَصَبَ الْمِنْجَنِيقَ عَلَى أَهْلِ الطَّائِفِ أَرْبَعِينَ يَوْماً)** "نبی ﷺ نے چالیس دن تک اہل طائف کے خلاف منجنیق نصب کئے رکھی"۔ واقدی نے المغازی میں بیان کیا ہے "کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحابؓ سے مشورہ کیا تو سلمان فارسیؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں سمجھتا ہوں کہ آپ ان کے قلعے پر منجنیق (کے گولے) برسائیں۔ جب ہم فارس میں تھے تو ہم قلعے پر منجنیق سے گولے داغتے تھے اور دشمن بھی ہمارے قلعوں پر منجنیق (کے گولے) داغتے تھے۔ ہم دشمن کو نشانہ بناتے تھے اور کبھی دشمن ہمارے قلعوں کو نشانہ بناتے تھے۔ اور جب منجنیق نہیں ہوتی تھی تو لڑائی طول پکڑتی تھی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کو منجنیق بنانے کا حکم دیا اور انہوں نے اپنے ہاتھ سے منجنیق تیار کیا اور اس کو طائف کے قلعے کی طرف نصب کیا"۔ ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں کہا کہ " جس دن طائف کی چار دیواری میں دڑار پڑ گئی تو رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ بکتر بند کے نچلے حصے میں چھپ کر دیوار تک پہنچے تاکہ اسے توڑ دیا جائے"۔ نیز ان اشیاء کی تیاری واجب ہے جس سے دشمن حواس باختہ اور خوف زدہ ہو اور ان اشیاء کی تیاری صنعت (انڈسٹری) کے بغیر نہیں ہو

سکتی اس لئے اس قاعدے کی رو سے کہ **(ما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب)** "جس کام کے بغیر فرض ادا نہ ہوتا ہو وہ بھی فرض ہے "صنعت کا قیام بھی فرض ہے۔ صنعت (بھاری صنعت) کی نگرانی خود خلیفہ یا اس کا کوئی نائب کرے گا۔

جہاں تک قضاء (عدلیہ) کی بات ہے تو رسول اللہ ﷺ خود بھی فیصلے کرتے تھے اور کسی اور کو بھی لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کی ذمہ داری سونپتے تھے۔ خود فیصلے کرنے کی دلیل ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **(إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَإِنَّكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ وَأَقْضِيَ لَهُ عَلَى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ مِنْ حَقِّ أَخِيهِ شَيْئًا فَلاَ يَأْخُذْ، فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِنْ النَّارِ)** "میں بھی انسان ہوں اور تم تنازعے لے کر میرے پاس آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم سے کوئی گفتار کی قوت میں دوسرے سے بہتر ہو۔ میں تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں جو میں فریقین سے سنتا ہوں۔ تو جو میرے فیصلے کے ذریعے اپنے بھائی کے حق میں سے لے لیتا ہے، تو گویا وہ میرے سے اپنے لیے آگ (جہنم) کا ٹکڑا لیتا ہے"، اس کو شیخین نے روایت کیا ہے اور الفاظ بخاری کے ہیں۔ ابوہریرہؓ اور زید بن خالد الجہنی نے روایت کیا: **(جَاءَ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، اقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللَّهِ. فَقَامَ خَصْمُهُ فَقَالَ: صَدَقَ، اقْضِ بَيْنَنَا بِكِتَابِ اللَّهِ ...)** " ایک دیہاتی آیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کیجئے، اس کا مدمقابل بھی کھڑا ہو گیا اور کہا کہ اس نے سچ کہا کہ ہمارے درمیان اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کیجئے..." اس کو بھی شیخین نے روایت کیا ہے اور الفاظ بخاری کے ہیں۔ جہاں تک دوسروں کو فیصلے کرنے کی ذمہ داری دینے کی بات ہے تو حاکم نے یہ حدیث روایت کی اور کہا ہے کہ یہ شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح ہے اور ذھبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے کہ **(بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ إِلَى اليَمَنِ عَلِيّاً فَقَالَ: عَلِّمْهُمُ الشَّرَائِعَ وَاقْضِ بَيْنَهُمْ. قَالَ: لاَ عِلْمَ لِي بِالقَضَاءِ. فَدَفَعَ فِي صَدْرِهِ فَقَالَ: اللَّهُمَّ اهْدِهِ لِلْقَضَاءِ)** " نبی ﷺ نے علیؓ کو یمن روانہ کیا اور فرمایا: ان کو شرائع (احکامِ شریعت) کی تعلیم دو اور ان کے درمیان فیصلے کیا کرو۔ علیؓ نے کہا: میں فیصلے کرنا نہیں جانتا، نبی ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ

رکھ کر فرمایا: اے اللہ فیصلے کرنے میں اس کے موافقت فرما"۔ اور حاکم نے ایک اور حدیث روایت کی جو مسلم اور بخاری کی شرط پر صحیح ہے اور ذھبی نے اس سے اتفاق کیا ہے کہ **"بَعَثَنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَى اليَمَنِ فَقُلْتُ: تَبْعَثُنِي إِلَى قَوْمٍ ذَوِي أَسْنَانٍ وَأَنَا حَدَثُ السِّنِّ! قَالَ: إِذَا جَلَسَ إِلَيْكَ الخَصْمَانِ فَلاَ تَقْضِ لأَحَدِهِمَا حَتَّى تَسْمَعَ مِنَ الآخَرِ كَمَا سَمِعْتَ مِنَ الأَوَّلِ. قَالَ عَلِيٌّ: فَمَا زِلْتُ قَاضِياً"** "علیؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن روانہ فرمایا تو میں نے کہا: آپ ﷺ مجھے ایک جنگجو اور سخت قوم کی طرف بھیج رہے ہیں، میں تو ابھی کم عمر ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب دو فریق دعویٰ لیکر تمہارے سامنے بیٹھیں تو ان کے درمیان اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک تم پہلے کی طرح دوسرے آدمی کی بات نہ سنو۔ علیؓ کہتے ہیں کہ: اس دن سے میں قاضی بن گیا"۔

جہاں تک اجماع صحابہؓ کی بات ہے تو امام ماوردی نے الحاوی میں کہا ہے کہ **(وقدْ حكَمَ الخلفاءُ الراشدون بين الناسِ وقَلَّدوا القُضاةَ والحُكّامَ... فصارَ ذلك من فِعْلِهم إجماعاً).** "خلفائے راشدینؓ نے خود بھی لوگوں کے درمیان فیصلے کئے اور قاضی اور حاکم بھی مقرر کئے ہیں۔ ان کے اس فعل پر اجماع ہوا ہے"۔ ابن قدامہ نے المغنی میں اس کا ذکر کیا ہے کہ "مسلمانوں نے قاضی مقرر کرنے کے جواز پر اجماع کیا ہے"۔

مفاد عامہ (انتظامی ادارے) کی جہاں تک بات ہے، تو رسول اللہ ﷺ خود مفادِ عامہ کے کاموں کی نگرانی فرماتے تھے اور انتظامی امور کے لیے کاتب (معاون) مقرر کرتے تھے۔ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ لوگوں کے مفادات (مصالح) کی براہ راست نگرانی فرماتے تھے، ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے، اس کے مسائل کو حل کرتے تھے، ان کے درمیان تعلقات کو منظم کرتے تھے، ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی ضمانت (گارنٹی) دیتے تھے، ان کی توجہ ان کاموں کی طرف مبذول کراتے تھے جن میں ان کی بھلائی ہے، لوگوں کی زندگی کے یہ تمام انتظامی امور بغیر کسی قسم کی پیچیدگی اور مشکلات کے انجام پاتے تھے۔

تعلیمی امور میں رسول اللہ ﷺ نے کفار کے قیدیوں کا فدیہ دس مسلمانوں کو تعلیم دینا مقرر کیا، حالانکہ فدیہ مالِ غنیمت میں شمار ہوتا ہے جو کہ تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے، یوں تعلیم کی ضمانت دینا مسلمانوں کے مفادات عامہ کے کاموں میں سے ہے۔

علاج معالجے کے حوالے سے اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک ڈاکٹر ہدیہ کے طور پر دیا گیا آپ ﷺ نے اس ڈاکٹر کو صرف اپنے لیے نہیں رکھا، نہ ہی اسے اپنے پاس رکھا بلکہ اسے تمام مسلمانوں کے علاج کی ذمہ داری دے دی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ علاج معالج بھی مسلمانوں کے مفاد عامہ کے کاموں میں سے ہے، عائشہؓ کی ایک صحیح حدیث ہے جو متفق علیہ بھی ہے وہ کہتی ہیں کہ **«أُصِيبَ سَعْدٌ يَوْمَ الْخَنْدَقِ رَمَاهُ رَجُلٌ مِنْ قُرَيْشٍ يُقَالُ لَهُ ابْنُ الْعَرِقَةِ رَمَاهُ فِي الأَكْحَلِ فَضَرَبَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خَيْمَةً فِي الْمَسْجِدِ يَعُودُهُ مِنْ قَرِيبٍ ...»** "خندق کے دن سعدؓ زخمی ہو گئے جن کو قریش میں سے ابن العَرِقَہ نامی ایک شخص نے تیر مارا تھا جو ان کے بازو کی رگ میں پیوست ہو گیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں ان کے لیے اپنے قریب ہی ایک خیمہ نصب کیا جہاں ان کی عیادت فرماتے تھے"۔ ریاست کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ ﷺ کا خود مسجد کے اندر خیمہ لگا کر سعد کی دیکھ بھال کرنا اس بات کی دلیل ہے کے علاج معالجہ بھی مسلمانوں کے مفاد عامہ کے کاموں میں سے ہے جو کہ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ خلفائے راشدین نے بھی یہی کام کیے۔ حاکم نے اپنی مُستدرَک میں زید بن اسلم سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ "عمر بن خطابؓ کے زمانے میں سخت بیمار ہو گیا تو عمرؓ نے میرے لیے ڈاکٹر بلایا جس نے کھانے سے مجھے روکا حتی کہ میں بھوک کی وجہ سے گھٹلیاں چوسنے لگا"۔

روزگار کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کی اس طرح رہنمائی کی کہ جاؤ ایک رسی اور کلہاڑی خرید کر لاؤ اور سوال کرنے کی بجائے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور بیچا کرو، جیسا کہ اس حدیث میں ہے جس کو ابو داؤد اور ابنِ ماجہ نے روایت کیا ہے: **«... وَاشْتَرِ بِالدِّرْهَمِ الآخَرِ قَدُوماً فَائْتِنِي بِهِ، فَأَتَاهُ بِهِ، فَشَدَّ فِيهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عُوداً بِيَدِهِ ثُمَّ قَالَ: اذْهَبْ وَاحْتَطِبْ وَبِعْ، فَلاَ**

أَرَيَنَّكَ خَمْسَةَ عَشَرَ يَوْماً، فَفَعَلَ، فَجَاءَ وَقَدْ أَصَابَ عَشْرَةَ دَرَاهِمَ ...» ''دوسرے درہم سے کلہاڑی خرید کر لاؤ، وہ لیکر آگیا تو خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس میں لکڑی کا دستہ لگا دیا اور فرمایا: جاؤ لکڑیاں کاٹ کر بیچا کرو اور پندرہ دن تک مجھے نظر نہ آؤ، اس شخص نے ایسا ہی کیا اور دس درھم کما کر خدمت میں حاضر ہوا۔'' بخاری کی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا: **«لَأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ فَيَأْتِيَ بِحُزْمَةِ الْحَطَبِ عَلَى ظَهْرِهِ فَيَبِيعَهَا فَيَكُفَّ اللَّهُ بِهَا وَجْهَهُ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ أَعْطَوْهُ أَوْ مَنَعُوهُ»** ''تم میں سے کوئی آدمی رسی لیکر لکڑیوں کی گٹھڑی اپنے پشت پر اٹھا کر لائے اور بیچ دے تاکہ اس کے ذریعے اللہ اس کی ضرورت پوری کرے۔ یہ اس کے لیے اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرتا پھرے کوئی دے اور کوئی منع کرے''۔ یوں روزگار کے مسئلے کو حل کرنا مسلمانوں کے مفادِ عامہ کے کے کاموں میں سے ہوتا تھا۔

راستوں کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ نے یوں کیا کہ اپنے زمانے میں ان کو منظم کیا اور کسی اختلاف کے وقت راستے کی چوڑائی کو سات بازو قرار دیا، بخاری میں پرانے راستوں کے باب میں روایت ہے کہ جس کے راوی ابوہریرہؓ ہیں کہ : **«قَضَى النَّبِيُّ ﷺ إِذَا تَشَاجَرُوا فِي الطَّرِيقِ بِسَبْعَةِ أَذْرُعٍ»** ''راستے کے بارے میں جب اختلاف ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی چوڑائی سات بازو مقرر کر دی''۔ جبکہ مسلم کی روایت میں بھی یہی ہے کہ **«إِذَا اخْتَلَفْتُمْ فِي الطَّرِيقِ جُعِلَ عَرْضُهُ سَبْعَ أَذْرُعٍ»** ''جب راستے کے حوالے سے تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کی چوڑائی سات بازو مقرر کی گئی ہے''۔ یہ اس وقت کے لحاظ سے ادارتی انتظام تھا اگر اس سے بھی وسیع راستے کی ضرورت ہو تو وہ بھی جائز ہے جیسا کہ مذھبِ شافعی میں ہے۔

زراعت کے حوالے سے یہ ہے کہ زبیرؓ اور ایک انصاری آدمی کے درمیان اس نہر کے پانی سے سیراب کرنے پر اختلاف ہوا جو ان کی زمینوں سے ہو کر گزرتا تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«اسْقِ يَا**

زُبَيْرُ ثُمَّ أَرْسِلِ الْمَاءَ إِلَى جَارِكَ» ''اے زبیر تم (کھیتوں کو) پانی دے کر پھر پانی اپنے ہمسائے کی طرف بھیجو''، متفق علیہ ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اس طرح لوگوں کی نگرانی فرماتے تھے اور آپ ﷺ کے بعد تمام خلفائے راشدینؓ یا وہ لوگ جن کو وہ یہ ذمہ داری سونپتے تھے لوگوں کے مفادات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

جہاں تک بیت المال کا سوال ہے تو اس کی تو بے تحاشہ دلائل ہیں کہ بیت المال براہ راست رسول اللہ ﷺ یا خلیفہ کے ماتحت ہوا کرتا تھا، یا جس کو انہوں نے یہ ذمہ داری دی ہو وہ بیت المال کا نگران ہوتا تھا۔ کبھی تو رسول اللہ ﷺ خود ہی براہ راست اموال کو جمع کرتے تھے اور آپ ﷺ کا اسٹاک ہوتا تھا، اور آپ ﷺ مال کو حاصل کرنے، اس کو تقسیم کرنے اور اس کو اپنی جگہ ترتیب کرنے کی خود نگرانی فرماتے تھے اور کبھی کسی اور شخص کو یہ ذمہ داری دیتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدینؓ بھی یہی کرتے تھے کبھی براہ راست نگرانی کرتے تھے کبھی کسی شخص کو یہ کام سونپتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ مال کو کبھی مسجد میں ہی رکھتے تھے، جیسا کہ بخاری نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ **«أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِمَالٍ مِنَ الْبَحْرَيْنِ فَقَالَ: انْثُرُوهُ فِي الْمَسْجِدِ»** ''رسول اللہ ﷺ کے پاس بحرین سے مال آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو مسجد میں جمع کرو''۔ یا اس مال کو اپنی ازواج کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع کرتے، جیسا بخاری نے عقبہ سے روایت کی ہے کہ: ''میں نے مدینہ منورہ میں عصر کی نماز نبی ﷺ کے ساتھ پڑھی، جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو جلدی اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کے گردنوں کو پھلانگ کر کسی زوجہ کے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ دیکھ کر لوگ فکر مند ہو گئے لیکن پھر آپ ﷺ گھر سے نکل کر آ گئے اور سمجھ گئے کہ لوگوں کو آپ کی اس جلدی پر تعجب ہوا ہے، تو فرمایا **«ذَكَرْتُ شَيْئًا مِنْ تِبْرٍ عِنْدَنَا، فَكَرِهْتُ أَنْ يَحْبِسَنِي، فَأَمَرْتُ بِقِسْمَتِهِ»** ''میرے پاس کچھ سونا پڑا تھا، جو مجھے یاد آ گیا، اس کو اپنے پاس رکھنا مجھے بُرا لگا اس لیے میں نے اس کو تقسیم کرنے کا حکم دیا''۔

خلفائے راشدینؓ کے عہد میں جس جگہ مال اکٹھا کر کے رکھا جاتا تھا اس کا نام بیت المال رکھا گیا۔ ابنِ سعد نے طبقات میں سُہیل بن ابی حثمہ وغیرہ سے روایت کی ہے کہ: "سنح کے مقام پر ابو بکرؓ کا بیت المال تھا، جس کا کوئی چوکیدار نہیں تھا، تو ان سے کہا گیا: آپ اس پر کوئی چوکیدار کیوں مقرر نہیں کرتے؟ فرمایا: اس میں تالا لگا ہے۔ آپ اس میں سے مال لوگوں کو دیا کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ خالی ہو جاتا تھا۔ جب آپؓ مدینہ منتقل ہو گئے تو بیت المال کو اپنے گھر میں منتقل کر لیا"۔ ھناد نے الزھد میں جید اسناد کے ساتھ انسؓ سے روایت کیا ہے کہ "ایک آدمی نے عمرؓ کے پاس آکر کہا: اے امیر المومنین مجھے سواری دیجئے میں جہاد کے لیے جانا چاہتا ہوں، عمر نے ایک آدمی سے کہا: اس کا ہاتھ پکڑ کر بیت المال لے جاؤ تاکہ یہ جو چاہے لے لے"۔

میڈیا کی دلیل کتاب اور سنت میں موجود ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ** "جب انہیں کوئی خبر امن کی یا خوف کی ملی تو انہوں نے اسے مشہور کرنا شروع کر دیا، حالانکہ اگر یہ لوگ اسے رسول اللہ ﷺ کے یا اپنے حکمرانوں کے حوالے کرتے تو اس کی حقیقت وہ لوگ معلوم کر لیتے، جو باتوں کی تہہ تک پہنچ کر نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔(سورۃ النساء: 83) اس آیت کا موضوع خبریں ہیں۔

سنت سے اس کی دلیل ابن عباسؓ کی وہ حدیث ہے جو فتحِ مکہ کے حوالے سے ہے جسے حاکم نے مُستدرَک میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے اور ذھبی نے بھی اس کے موافقت کی ہے: "قریش کو بے خبر رکھا گیا ان کے پاس رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی، ان کو پتہ نہیں چل سکا کہ آپ ﷺ کیا کرنے والے ہیں"۔ ابو سلمہ کی ایک مرسل حدیث بھی ہے جس میں فرمایا «**جَهِّزِيني وَلاَ تُعْلِمِي بِذَلِكَ أَحداً، ... ثُمَّ أَمَرَ بِالطُّرُقِ فَحُبِسَتْ، فَعَمَّى عَلَى أَهْلِ مَكَّةَ لاَ يَأْتِيهِمْ خَبَرٌ**» "مجھے تیار کرو لیکن کسی کو خبر نہ ہونے پائے --- پھر راستوں کو آمد ورفت

کے لیے بند کرنے کا حکم دیا، جس کی وجہ سے قریش (مسلمانوں کی روانگی کے متعلق) اندھیرے میں رہے اور ان کے پاس کوئی خبر نہیں پہنچی"۔

یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ریاستی امن و امان سے متعلق میڈیا خلیفہ یا اس ادارے کے ساتھ منسلک ہے جو اس غرض کے لیے بنایا گیا ہو۔

مجلسِ شوریٰ کا جہاں تک تعلق ہے رسول اللہ ﷺ کی کوئی معین مجلس شوریٰ نہیں تھی بلکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے مختلف اوقات میں مسلمانوں سے مشورہ لیتے تھے **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ** " اور اس معاملے (حکومتی) میں ان سے مشورہ کیجیے"۔(سورۃ آل عمران:159)

مشوروں کے حوالے سے مسلم نے انسؓ سے بدر کے دن کے حوالے سے روایت کی ہے کہ **(أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ شَاوَرَ حِينَ بَلَغَهُ إِقْبَالُ أَبِي سُفْيَانَ. قَالَ: فَتَكَلَّمَ أَبُو بَكْرٍ فَأَعْرَضَ عَنْهُ، ثُمَّ تَكَلَّمَ عُمَرُ فَأَعْرَضَ عَنْهُ، فَقَامَ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ فَقَالَ: إِيَّانَا تُرِيدُ يَا رَسُولَ اللَّهِ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَوْ أَمَرْتَنَا أَنْ نُخِيضَهَا الْبَحْرَ لَأَخَضْنَاهَا، وَلَوْ أَمَرْتَنَا أَنْ نَضْرِبَ أَكْبَادَهَا إِلَى بَرْكِ الْغِمَادِ لَفَعَلْنَا. قَالَ فَنَدَبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَانْطَلَقُوا حَتَّى نَزَلُوا بَدْرًا)** " جب ابو سفیان کی آمد کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو ملی، تو آپ ﷺ نے مشورہ طلب کیا۔ راوی کہتا ہے کہ ابو بکرؓ نے بات کی تو آپ ﷺ نے اس پر توجہ نہیں دی، پھر عمرؓ نے بات کی اس پر بھی آپ ﷺ نے توجہ نہیں دی۔ پھر (انصار میں سے) سعدؓ بن عبادہ کھڑے ہو گئے اور کہا: کیا آپ ﷺ ہماری بات سننا چاہتے ہیں۔ تو اے اللہ کے رسول ﷺ اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر آپ ﷺ ہمیں سمندر میں کودنے کا حکم دیں تو ہم کود جائیں گے۔ رسول ﷺ کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی پھر سب چل پڑے یہاں تک کہ بدر میں جا کر رکے"۔

اسی طرح بخاری نے حدیبیہ کے دن کے حوالے سے مِسْوَر اور مروان سے روایت کی ہے کہ **(وَسَارَ النَّبِيُّ ﷺ حَتَّى كَانَ بِغَدِيرِ الأَشْطَاطِ أَتَاهُ عَيْنُهُ، قَالَ إِنَّ قُرَيْشًا جَمَعُوا**

لَكَ جُمُوعًا، وَقَدْ جَمَعُوا لَكَ الأَحَابِيشَ، وَهُمْ مُقَاتِلُوكَ وَصَادُّوكَ عَنِ الْبَيْتِ، وَمَانِعُوكَ. فَقَالَ: أَشِيرُوا أَيُّهَا النَّاسُ عَلَيَّ، أَتَرَوْنَ أَنْ أَمِيلَ إِلَى عِيَالِهِمْ وَذَرَارِيِّ هَؤُلاءِ الَّذِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَصُدُّونَا عَنِ الْبَيْتِ؟ فَإِنْ يَأْتُونَا كَانَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ قَطَعَ عَيْنًا مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَإِلاَّ تَرَكْنَاهُمْ مَحْرُوبِينَ. قَالَ أَبُو بَكْرٍ: يَا رَسُولَ اللَّهِ خَرَجْتَ عَامِدًا لِهَذَا الْبَيْتِ لَا تُرِيدُ قَتْلَ أَحَدٍ وَلا حَرْبَ أَحَدٍ، فَتَوَجَّهْ لَهُ فَمَنْ صَدَّنَا عَنْهُ قَاتَلْنَاهُ. قَالَ امْضُوا عَلَى اسْمِ اللَّهِ ...) "نبی ﷺ روانہ ہوگئے یہاں تک کہ غدر الاشطاط کے مقام پر پہنچے، تو آپ ﷺ کے جاسوس آئے اور بتایا کہ قریش نے آپ ﷺ کے خلاف بڑی تعداد میں لوگوں کو جمع کیا ہے۔ ان میں حبشی بھی ہیں جو آپ ﷺ سے جنگ کریں گے اور آپ ﷺ کو بیت اللہ جانے سے روکیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! مجھے مشورہ دو تمھاری کیا رائے ہے۔ کیا جو لوگ ہمیں بیت اللہ سے روک رہے ہیں ہم ان سے لڑیں یا ان کو رہنے دیں کہ اگر وہ ہم پر حملہ آور ہوں تو اللہ ان کا راستہ روکے گا۔ ابو بکرؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ بیت اللہ کے ارادے سے نکلے ہیں اور کسی کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے، نہ ہی جنگ کرنا چاہتے ہیں، بیت اللہ کی طرف رخ کریں۔ اگر کوئی ہمیں روکتا ہے تو پھر اس سے لڑیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا نام لے کر چلو..."۔

اگرچہ آپ ﷺ مسلمانوں کے مجمع سے مشورہ طلب کرتے تھے لیکن کچھ خاص افراد بھی تھے جن سے آپ ﷺ مستقل طور پر مشورہ لیتے تھے، یہ قوم کے لیڈران تھے اور یہ لوگ حمزہؓ، ابو بکرؓ، جعفرؓ، عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، سلیمانؓ، عمارؓ، حذیفہؓ، ابو ذرؓ، مقدادؓ اور بلالؓ تھے۔ دائمی مشورے کے لئے مخصوص ہونے کی وجہ سے یہ مجلسِ شوریٰ کی مانند تھے۔ خلفاء راشدینؓ بھی عام مسلمانوں سے مشورے لیتے تھے اور کچھ لوگوں سے خاص طور پر مشورہ لیتے تھے، چنانچہ ابو بکرؓ نے مہاجرین اور انصار میں سے کچھ لوگوں کو مخصوص کر رکھے تھے۔ کوئی بھی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو ابو بکرؓ مشورے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے اور ان کی رائے لیتے۔ یہ لوگ ان کے نزدیک اہلِ شوریٰ تھے۔ ابو بکرؓ کے عہد کے یہ اہلِ شوریٰ صاحبِ علم اور صاحبِ فتویٰ لوگ تھے۔ ابن سعد نے القاسم سے روایت کیا ہے کہ ابو بکر صدیقؓ کو کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا کہ جس میں آپؓ کو اہلِ

رائے اور اہلِ فقہ کے مشورے کی ضرورت ہوتی تو آپ ؐ انصار اور مہاجرین کے کچھ آدمیوں کو بلاتے جن میں، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبدالرحمنٰ بن عوفؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ شامل تھے"۔ ابو بکرؓ کی خلافت میں یہ سارے لوگ فتوے دیا کرتے تھے، لوگ فتویٰ کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ ابو بکرؓ کے زمانے میں یہی ہوتا رہا، جب عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے بھی انہی کو بلایا۔

یہ ساری بحث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایک ایسی خاص مجلس جو شوریٰ میں امت کی نمائندگی کرتی ہو قرآن وسنت سے ثابت ہے اور اس کا کام (حکمرانوں کا) محاسبہ بھی ہے جس کے دلائل موجود ہیں۔ جیسا کہ مسلم کی روایت ہے کہ **«سَتَكُونُ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ، فَمَنْ عَرَفَ بَرِئَ، وَمَنْ أَنْكَرَ سَلِمَ، وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ، قَالُوا: أَفَلاَ نُقَاتِلُهُمْ ؟ قَالَ: لاَ مَا صَلَّوْا»** "اور تمھارے حکمران ہوں گے جن کے اچھے اعمال کو تم پسند کروگے اوران کے برے اعمال کو تم ناپسند کروگے۔ تو جس نے ان کی برائی کو پہچانا، وہ بری الذمہ ہو گیا اور جس نے اس برائی کا انکار کیا وہ سلامت رہا، لیکن جس نے راضی ہو کر ان کی اطاعت کی (وہ نہ بری الذمہ ہوا اور نہ ہی سلامت رہا)۔ صحابہؓ نے عرض کی: کیا ہم ان حکمرانوں کے قتال نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں"۔ اس حدیث میں نماز کو قائم رکھنے سے مراد اسلام کی حکمرانی کو قائم رکھنا ہے۔

حکمرانوں کے محاسبے کی مثال مسلمانوں کی جانب سے خاص کر عمرؓ کی جانب سے مرتدین کے خلاف جہاد کے حوالے سے ابو بکرؓ کی مخالفت کرنا ہے۔ بخاری اور مسلم نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ " جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو گیا اور ابو بکرؓ خلیفہ بنے تو عرب میں سے بہت سے لوگ کافر (مرتد) ہو گئے، جن کے ساتھ ابو بکرؓ نے جہاد کا ارادہ کیا، تو عمرؓ نے کہا: آپ کیسے لوگوں سے لڑیں گے جبکہ رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ مجھے لوگوں کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہیں۔ اور جس نے یہ کہا، اس نے مجھ سے اپنی جان ومال محفوظ کرلی، سوائے اس کے جو اسکا حق ہے اور اس کا حساب تو اللہ کے پاس ہی ہے۔ ابو بکرؓ نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس شخص سے ضرور لڑوں گا جس نے نماز اور زکوٰۃ میں فرق کیا۔ زکوٰۃ مال کا حق

ہے۔ اللہ کی قسم! اگر وہ رسول ﷺ کے زمانے میں ایک چھوٹی رسی بھی زکوٰۃ میں دیتے تھے اور انہوں نے یہ مجھے دینے سے انکار کیا تو میں ان سے لڑوں گا۔ عمرؓ نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ابو بکرؓ کا دل اس فیصلے کے لیے کھول دیا اور میں سمجھ گیا کہ یہی بات حق ہے۔ اسی طرح بلال بن رباحؓ اور زبیرؓ نے عمرؓ کی جانب سے عراق کی زمین کو لڑنے والے مجاہدین کے درمیان تقسیم نہ کرنے کی مخالفت کی۔ ایک بدو (دیہاتی) نے بھی عمرؓ کی جانب سے کچھ زمین (ریاست) کیلئے محفوظ کرنے کی مخالفت کی۔ ابو عبید نے الاموال میں عامر بن عبد اللہ بن زبیر سے اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ "ایک دیہاتی عمرؓ کے پاس آیا اور کہا: اے امیر المومنین! یہ ہماری زمین ہے جاہلیت میں بھی ہم اس کے لیے لڑتے رہے اور جب اسلام آیا تو ہم اس پر رہتے ہوئے مسلمان ہو گئے۔ آپ کس طرح اس کو حمیٰ (حکومت کی) قرار دیتے ہو؟ راوی کہتا ہے کہ عمرؓ نے سر جھکایا اور سانس لیتے ہوئے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ جب دیہاتی نے عمرؓ کو اس حال میں دیکھا تو اپنی بات دہرائی۔ عمرؓ نے کہا مال اللہ کا ہے، بندے اللہ کے ہیں اور اللہ کی قسم! اگر اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے مجھے اس زمین کو حمیٰ بنانے (ریاست کے لیے حاصل کرنے) کی ضرورت نہ ہوتی تو میں کبھی بالشت بھر زمین کو بھی حمیٰ نہ بناتا"۔ عمرؓ نے عام ملکیت کی کچھ زمین مسلمانوں کے گھوڑوں کے لئے خاص کر رکھی تھی۔ اسی طرح جب عمرؓ نے عورتوں کے مہر کو چار سو درہم سے زیادہ نہ کرنے کا حکم دیا تو ایک عورت نے انکار کر دیا اور آپؓ کی مخالفت کر دی اور کہا کہ تمھیں ایسا کرنے کو کوئی حق حاصل نہیں اے عمر، کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا ہے **وَاٰتَيْتُمْ اِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا** " اور اگر تم نے ان میں سے کسی کو خزانے کا خزانہ مہر کے طور پر دیا ہو، تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو"۔ (سورۃ النساء: 20) یہ سن کر عمرؓ نے کہا عورت نے صحیح بات کہی ہے اور عمر نے غلطی کی۔

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول ﷺ نے ریاست کے لئے ایک خاص قسم کے ادارے بنائے اور اپنے رفیق اعلیٰ سے ملنے تک ان اداروں کو اس نہج پر چلاتے رہے اس کے بعد آپ ﷺ

کے خلفاء ان اداروں کو اسی نہج پر چلاتے رہے اور تمام صحابہ یہ دیکھتے اور سنتے رہے، اسلئے یہی اسلامی ریاست کا مخصوص ڈھانچہ ہے اور اسلامی ریاست کو اسی پر استوار ہونا چاہیئے۔

خلیفہ

دفعہ نمبر 24: خلیفہ ہی اختیار اور شریعت کے نفاذ میں امت کا نمائندہ ہوتا ہے۔

خلافت دنیا کے تمام مسلمانوں کی عام قیادت ہے، تاکہ شریعت کو نافذ کیا جائے اور دنیا تک اسلامی دعوت کو لے جایا جائے۔ اس لیے اس کے سربراہ یعنی خلیفہ کا تقرر صرف مسلمان کرتے ہیں۔ چونکہ اختیار (اقتدار) امت کا ہے اور شریعت کا نفاذ مسلمانوں پر فرض ہے اور خلیفہ ان کا سربراہ ہوتا ہے چنانچہ وہ اختیار میں اور شریعت کے نفاذ میں امت کا نمائندہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ خلیفہ صرف اس وقت خلیفہ بنتا ہے جب امت اس کی بیعت کرے۔ امت کی جانب سے اس کی بیعت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ امت کا نمائندہ ہے۔ یوں اس کی اطاعت کا واجب ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بیعت جس کے ذریعے خلافت کا انعقاد ہوگیا، اسی نے اس کو اختیار یا اتھارٹی عطا کی، یوں وہ اختیار یا اتھارٹی میں امت کا نمائندہ بن گیا۔ اسی اساس پر اس دفعہ کو وضع کیا گیا ہے۔

دفعہ نمبر 25: خلیفہ رضامندی اور اختیار کا عقد ہے، اس لیے کسی کو اس کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا نہ ہی کسی کو اس بات پر مجبور کیا جاسکتا ہے کہ فلاں شخص کو ہی تم نے خلیفہ منتخب کرنا ہے۔

اس کی دلیل وہ ہے جو کسی بھی شرعی عقد (معاہدے) کی دلیل ہے، جو دو معاہدے کرنے والوں کے درمیان انجام پاتا ہے۔ کیونکہ خلافت بھی تمام شرعی معاہدوں کی طرح ایک شرعی معاہدہ ہے۔ علاوہ ازیں اعرابی کی وہ حدیث جس میں اس نے آکر رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی پھر آکر اس نے اپنی بیعت کو واپس لینے کی درخواست کی، جس کو رسول اللہ ﷺ نے مسترد کر دیا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ خلافت ایک معاہدہ ہے۔ جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نے رسول ﷺ کو بیعت دی بعد میں مدینہ میں رہتے ہوئے اس کو خارش کی بیماری لگی تو وہ نبی ﷺ کی خدمت آکر کہا: اے محمد ﷺ مجھے بیعت سے آزاد کر دو۔ رسول ﷺ نے انکار کر دیا۔ وہ پھر آیا اور کہا کہ اے محمد ﷺ، مجھے بیعت سے آزاد کر دو۔ رسول اللہ ﷺ نے انکار کر دیا۔ اس پر وہ اعرابی نکل کر چلتا بنا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّمَا الْمَدِينَةُ كَالْكِيرِ تَنْفِي خَبَثَهَا وَيَنْصَعُ طَيِّبُهَا»** "مدینہ بھٹی کے مانند ہے خبیث چیزوں کو نکال باہر کرتا ہے اور پاک چیزوں کو نکھارتا ہے" (متفق علیہ)۔

چونکہ خلافت کی بیعت خلیفہ کی اطاعت کی بیعت ہے جسے ولی امر ہونے کی وجہ سے اطاعت کا حق ہے، چنانچہ یہ رضامندی اور اختیار کا عقد ہے۔ اور یہ زبردستی سے نہیں ہو سکتا نہ اس شخص پر زبردستی کی جا سکتی ہے جس کی بیعت کی جا رہی ہو اور نہ ہی بیعت دینے والوں پر زبردستی کرنا جائز ہے کیونکہ رسول ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّ اللَّهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»** "اللہ تعالیٰ نے میری امت سے غلطی، بھول چوک اور وہ کام جو زبردستی کے ذریعے اس سے کروایا گیا ہو، معاف کر دیا ہے"۔ اس کو ابن ماجہ نے ابن عباسؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور یہ عام ہے اور اس میں ہر قسم کا معاہدہ اس میں شامل ہے جس میں خلافت کا معاہدہ بھی شامل ہے۔ ہر وہ معاہدہ جو زبردستی کیا گیا ہو باطل ہے وہ منعقد ہی نہیں ہوتا۔ اسی طرح خلافت کا معاہدہ بھی اس وقت تک وقوع پذیر نہیں ہوتا جب تک اطراف باہمی رضامندی سے معاہدہ نہ کریں۔ اس لئے کوئی شخص اس وقت تک خلیفہ نہیں بن سکتا جب تک اس کو نامزد کرکے اس کی بیعت نہ کی جائے۔ کوئی شخص بغیر بیعت کے اپنے آپ کو خلیفہ کہے یا خلیفہ مقرر کرے تو وہ خلیفہ نہیں بن سکتا۔ جس

وقت لوگ اپنی رضامندی اور اختیار سے اس کی بیعت کریں تب ہی وہ خلیفہ ہے اس سے پہلے نہیں۔ اگر وہ لوگوں کو مجبور کرے اور زبردستی بیعت لے تو وہ خلیفہ نہیں بنے گا۔ اس کی خلافت کا انعقاد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہ ایک عقد ہے جو زبردستی یا جبر سے منعقد نہیں ہوتا کیونکہ رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ: **«إِنَّ اللَّهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»** "بے شک اللہ نے میرے لیے میری اُمت کو معاف کر دیا؛اُن کی غلطیاں، بھول چوک اور جو کچھ (گناہ)اُن سے زور زبردستی سے کروایا جائے۔" یعنی وہ اس کی ذمہ دار نہیں اور جب وہ اس عقد کی ذمہ دار ہی نہیں تو وہ عقد باطل ہے۔

دفعہ نمبر26: ہر مسلمان بالغ عاقل، مرد ہو یا عورت، کو ریاست کا سربراہ منتخب کرنے اور اس کی بیعت کرنے کا حق حاصل ہے، غیر مسلم ذمی کو یہ حق حاصل نہیں۔

خلافت کی حقیقت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ہر مسلمان کو خلیفہ کی بیعت اور اسکے انتخاب کا حق حاصل ہے کیونکہ احادیث میں بھی یہی ہے کہ مسلمان مرد اور عورتیں ہی خلیفہ کی بیعت کریں گے۔ عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے کہ: **«بَايَعْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ ...»** "ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی"، یہ بخاری کی حدیث ہے، اور ام عطیہؓ سے روایت ہے وہ کہتی ہیں کہ **«بَايَعْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ ...»** "ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی"، اس حدیث کو بھی بخاری نے ہی روایت کیا ہے، اور ابنِ کثیر نے البدایۃ والنہایۃ میں بیان کیا ہے کہ عبدالرحمن بن عوفؓ نے اس وقت خلیفہ کے انتخاب کے لئے مردوں اور عورتوں کی رائے لی جب مسلمانوں کی رائے لینے کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی اور کسی صحابی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔ اس لئے ہر مسلمان خواہ مرد ہو یا عورت کو خلیفہ کے انتخاب اور اس کی بیعت کا حق حاصل ہے۔ کسی غیر مسلم کو یہ حق حاصل نہیں کیونکہ بیعت کتاب وسنت پر عمل پر کرنا ہے اور غیر مسلم ان دونوں پر ایمان ہی نہیں رکھتا، اگر وہ ان پر ایمان لاتا ہے تب وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔

دفعہ نمبر 27: جن لوگوں کی بیعت سے خلافت کا انعقاد ہوتا ہے اگر وہ لوگ بطور خلیفہ کسی ایک شخص کی بیعت کر لیں تب باقی لوگوں کی طرف سے دی جانے والی بیعت، اطاعت کی بیعت ہو گی، انعقاد کی نہیں۔ اس لیے جس شخص کے اندر سرکشی کے امکانات نظر آئیں اور مسلمانوں کی وحدت کو توڑنے کی کوشش کرے، تو اسے بیعت پر مجبور کیا جائے گا۔

اس کی دلیل وہ ہے جو چاروں خلفائے راشدینؓ کی بیعت کے وقت ہوا کیونکہ یہ اجماع صحابہؓ ہے۔ ابو بکرؓ کی بیعت میں صرف مدینہ کے اہل حل وعقد پر اکتفا کیا گیا۔ عمرؓ کی بیعت میں بھی یہی ہوا۔ جبکہ عثمانؓ کی بیعت کے لیے مدینہ کے مسلمانوں سے رائے لی گئی اور انہوں نے بیعت دی۔ علیؓ کی بیعت میں اہل مدینہ کی اکثریت کے ساتھ ساتھ اہلِ کوفہ کی اکثریت نے بھی آپ کی بیعت کی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلمانوں کی بیعت خلافت کے انعقاد کے لیے ضروری نہیں بلکہ اگر ان کے نمائندوں کی اتنی تعداد بیعت دے دے جس سے خلافت کی بیعت کا نعقاد ہو جائے تو یہ کافی ہے۔ اگر اس کے بعد دوسرے لوگ بیعت کریں تو یہ بیعت اطاعت ہو گی۔ جہاں تک اس شخص کو بیعت دینے پر مجبور کرنے کی بات ہے جس کے اندر سرکشی کے آثار ہوں تو یہ اس وقت ہو گا جب امت کے نمائندوں کی اتنی تعداد بیعت دے دے جس سے خلافت کی بیعت کا نعقاد ہو جائے۔ اسی لیے سیدنا علیؓ نے امیر معاویہ سے بیعت لینے پر اصرار کیا اور کہا کہ وہ بھی آکر ایسے بیعت کریں جیسا کہ عام لوگوں نے کی۔ اسی طرح طلحہؓ اور زبیرؓ کو بھی اپنی بیعت پر مجبور کیا۔ صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے آپؓ کے اس عمل کی مخالفت نہیں کی، البتہ بعض صحابہؓ نے آپؓ کو یہ نصیحت کی کہ امیر معاویہ کو شام کی گورنری سے معزول مت کریں۔ صحابہؓ کی جانب سے ان میں سے کسی ایک کے کسی عمل پر خاموشی اختیار کرنا جیسا کہ وہ علیؓ کی جانب سے زبردستی بیعت لینے پر خاموش رہے حالانکہ یہ بیعت مرضی اور اختیار کا عقد ہے، اس کو اجماعِ سکوتی (اجماع کی بنا پر سکوت) کہا جاتا ہے اور یہ شرعی دلیل ہے۔

دفعہ نمبر28: صرف وہی شخص خلیفہ بن سکتا ہے جسے مسلمان منتخب کریں۔ کسی بھی شخص کو خلیفہ کے اختیارات اس وقت حاصل ہوں گے جب دوسرے شرعی عقود کی طرح اس کی بیعت کا عقد شرعی طور پر مکمل ہو جائے۔

اس کی دلیل خلافت کا رضامندی اور اختیاری عقد ہونا ہے، یہ عقد (معاہدہ) دو معاہدہ کرنے والوں کے ذریعے ہی پورا ہوتا ہے اس لیے صرف وہی شخص خلیفہ ہو گا جس کے ساتھ وہ لوگ خلافت کا معاہدہ کریں جن کو شرعاً یہ اختیار حاصل ہے۔ کوئی شخص اس معاہدے کے بغیر خود اپنے آپ کو خلیفہ مقرر کرنے سے وہ خلیفہ نہیں بنتا۔ بلکہ جب اہل حل وعقد اپنی رضامندی اور اختیار سے اس کی بیعت کریں تب ہی وہ خلیفہ کہلائے گا کیونکہ خلافت کا معاہدہ منعقد ہونے کا تقاضا ہے کہ دو معاہدہ کار ہوں جن کے اندر شرعی اہلیت ہو، تاکہ یہ معاہدہ انجام پائے اور مکمل ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی جابر شخص (آمر) حکومت پر زبردستی قبضہ کرنے سے خلیفہ نہیں بنے گا، اگرچہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا خلیفہ کہے اور اعلان کرے۔ کیونکہ مسلمانوں کی طرف سے اس کی خلافت منعقد ہی نہیں ہوئی خواہ کوئی جبراً اور زبردستی مسلمانوں سے بیعت لے تب بھی وہ خلیفہ نہیں ہو سکتا کیونکہ بیعت جبراً یا زبردستی نہیں ہو سکتی اس لئے اس طرح خلافت کا انعقاد ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہ مرضی اور اختیار کا معاہدہ ہے، زبردستی اور جبر کا نہیں۔ تاہم یہ مسلط شخص اگر مسلمانوں کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کا مفاد اس کی بیعت میں ہے اور مسلمان کی جانب سے بیعت کرنے کی صورت میں مکمل طور پر حکمِ شرعی نافذ کیے جائیں گے اور مسلمان اس بات پر راضی ہو جائیں اور اپنی مرضی واختیار سے اس کی بیعت کریں تب جس وقت مرضی اور اختیار سے اس کی بیعت ہوئی اس لمحے سے اس کو خلیفہ قرار دیا جائے گا کیونکہ اب شرط پوری ہو گئی یعنی بیعت ہو گئی خواہ جس کی بیعت کی گئی وہ (پہلے سے) حاکم اور سلطان (اقتدار کا مالک) ہو یا نہ ہو۔

دفعہ نمبر 29: وہ ملک یا خطہ جو خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت انعقاد کرے، کے لیے شرط ہے کہ اس ملک کا اقتدار اس کا اپنا ہو، جس کا انحصار صرف مسلمانوں پر ہو اور کسی کافر ریاست کا اقتدار میں کوئی عمل دخل نہ ہو اور اس ملک کی داخلی وخارجی امان اور مسلمانوں کی امن وسلامتی اسلام کی وجہ سے ہو نہ کہ کفار کے بل بوتے پر۔ جو علاقے صرف خلیفہ کی اطاعت کی بیعت کریں ان کے لیے یہ شرط لازم نہیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ کافروں کا مسلمانوں پر اقتدار اور اختیار ممنوع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** ''اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ایمان والوں پر ہرگز غلبہ نہ دے گا'' (النساء:141)۔ جس اسلامی علاقے پر کفار کا اقتدار ہو اس علاقے کو خلیفہ مقرر کرنے کا حق نہیں کیونکہ خلافت کو قائم کرنے کا مطلب سلطان (اسلامی اقتدار) کا قیام ہے اور اس علاقے کا اپنا اقتدار ہے ہی نہیں تو اس کو یہ حق بھی نہیں کیونکہ وہاں کا اقتدار کفر کا ہے اور کفر کے اقتدار کے بل پر خلافت قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ تو سلطان (اقتدار) کے حوالے سے تھا اور جہاں تک امان کا تعلق ہے تو اس کی دلیل وہی ہے جو دارالکفر اور دارالاسلام کی ہے کیونکہ خلیفہ کو مقرر کرنے کا مطلب اس دار کو دار الاسلام میں تبدیل کرنا ہے اور دار صرف اسلام کی حکومت قائم کرنے سے دار الاسلام نہیں بنتا بلکہ اس دار کی امان بھی اسلام کے امان سے ہونا چاہیے کفر کے امان سے نہیں کیونکہ کسی بھی دار کے دارالاسلام ہونے کی دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ اسلام کی حکمرانی ہو دوسری شرط یہ کہ وہاں کی امان اسلام کی وجہ سے ہو کفر کی وجہ سے نہیں۔

دفعہ نمبر 30 : خلیفہ کے طور پر جس شخص کی بیعت کی جارہی ہو اس کے اندر انعقاد خلافت کی تمام شرائط کا ہونا لازمی ہے اگرچہ اس کے اندر افضلیت کے شرائط نہ ہوں کیونکہ اعتبار شروط انعقاد کا ہے۔

اس کی دلیل وہ دلائل ہیں جن میں خلیفہ کی صفات کا بیان ہے۔ خلیفہ کی صفات کے بارے میں ایسے دلائل بھی ہیں جن میں طلب غیر جازم ہے جیسا کہ رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ **«إِنَّ هَذَا الأَمْرَ فِي قُرَيْشٍ»** "یہ معاملہ قریش میں ہی رہے گا"، اس کو بخاری نے معاویہؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے، یہ خبر ہے اور خبر کا صیغہ اگرچہ طلب کا فائدہ دیتا ہے لیکن وہ طلبِ جازم (حتمی طلب) نہیں ہوتی جب تک کہ وہ ایسے قرینے کے ساتھ نہ ہو جو تاکید کا فائدہ دے۔ یہاں تاکید پر دلالت کرنے والا کوئی قرینہ نہیں اور اس حوالے سے کسی بھی روایت میں تاکید پر دلالت کرنے والا کوئی قرینہ موجود نہیں، مثال کے طور پر حدیث میں ہے کہ **«لاَ يُعَادِيهِمْ أَحَدٌ إِلاَّ كَبَّهُ اللَّهُ عَلَى وَجْهِهِ مَا أَقَامُوا الدِّينَ»** "جب تک کہ قریش دین کو قائم رکھیں گے، یہ معاملہ (خلافت) ان میں ہے۔ اور جو ان سے دشمنی کرے گا اسے اللہ اوندھے منہ جہنم میں پھینکے گا"۔ اس میں قریش سے دشمنی سے منع کیا گیا ہے اور رسول ﷺ کے اس قول میں اس بات کی کوئی تاکید نہیں کہ یہ معاملہ قریش میں رہے گا۔ اس سے بڑھ کر یہ "قریش" کا لفظ ایک اسم ہے صفت نہیں۔ علمِ اصول میں اس کو لقب کہا جاتا ہے، اسم کا مفہوم یعنی لقب صفت نہیں ہوتا، اس لیے قریش کے اس حصر کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ معاملہ قریش کے علاوہ کسی اور میں نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ حدیث افضلیت کی شرط پر دلالت کرتی ہے انعقاد کی شرط پر نہیں کیونکہ اس طلب کے جازم ہونے کا کوئی قرینہ نہیں بلکہ یہاں تو اس بات کا قرینہ موجود ہے کہ یہ طلبِ جازم کے لئے نہیں ہے۔ رسول ﷺ نے جب اپنے آپ کو قبیلہ عامر بن صعصعہ کے سامنے پیش کیا، تو انہوں نے کہا "آپ کے بعد کیا حکومت ہمیں ملے گی"، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: **«إِنَّ الأَمْرَ للّهِ يَضَعُهُ حَيْثُ يَشَاءُ»** "یہ معاملہ اللہ کا ہے وہ جس کو چاہے دے گا"۔ اس کو ابنِ اسحاق نے زھری میں روایت کیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ قریشی ہونے کی طلب غیر جازم ہے کیونکہ رسول ﷺ کا جواب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ کے بعد ان (عامر بن صعصعہ) کو حکمرانی ملنا جائز ہے یا کسی اور کو ملنا بھی جائز ہے جو اس بات پر دلالت ہے کہ اس معاملے کا قریش میں رہنا افضلیت کی شرط ہے۔

انعقاد کی شرط وہ شرط ہے کہ جس میں طلبِ جازم ہو یعنی اس شرط کے نہ پائے جانے کی صورت میں اس کا انعقاد ہی نہ ہو جیسا کہ اس کی تعریف سے بھی ظاہر ہے یعنی پھر مطلب یہ ہو گا کہ اگر خلافت قریش میں نہ ہو تو خلافت ہی صحیح نہیں اور قریش میں ہونا طلب جازم کے ساتھ ہے حالانکہ رسول ﷺ کی جانب سے بنو عامر کو دیا گیا جواب اس طلب جازم کو ختم کرتا ہے۔ یہ اس کے بر خلاف ہے جو خلافت کے انعقاد کی شروط میں ہے مثلاً انعقاد کی ایک شرط بلوغت ہے کیونکہ رسول ﷺ نے بچے کی بیعت لینے سے انکار فرمایا اور عبد اللہ بن ھشام کی بیعت نہیں لی اور فرمایا کہ یہ ابھی بچہ ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ کے لیے بالغ ہونا شرط ہے۔ جب بچے کی بیعت ہی صحیح نہیں تو اس کا خلیفہ بننا تو بطریقہ اولیٰ صحیح نہیں۔ جن صفات کے لیے طلبِ جازم موجود ہے ان کو شروطِ انعقاد کہا جائے گا اور اِن کے علاوہ جتنی بھی شرائط بغیر طلب جازم کے ہیں ان کو شروطِ افضلیت کہا جائے گا۔

دفعہ نمبر 31: خلیفہ کے لیے سات شرائط، کہ جن کے پائے جانے سے ہی اس کی خلافت کا انعقاد ہوتا ہے، مندرجہ ذیل ہیں: مرد ہونا، مسلمان ہونا، بالغ ہونا، عاقل ہونا، آزاد ہونا، عادل ہونا اور خلافت کی ذمہ داری سے عہدہ برآء ہونے کے قابل ہونا۔

خلافت چونکہ حکمرانی (ولایتِ امر) ہے بلکہ یہ ولایتِ عظمیٰ ہے، اس لئے دفعہ نمبر 19 بیان کی گئی شرائط ہی خلیفہ کے لیے شرائط ہیں یعنی خلیفہ کے اندر بھی ان سات شرائط کا پایا جانا لازمی ہے۔

خلیفہ کیلئے مرد ہونے کی شرط کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی وہ روایت ہے کہ جب آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ اہلِ فارس نے کسریٰ کے بیٹی کو اپنا حکمران مقرر کر دیا تو فرمایا کہ **«لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً»** "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے عورت کو اپنا حکمران بنا لیا"۔ اس کو بخاری نے ابی بکرۃ کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ یہ عورت کو خلیفہ بنانے کے حوالے سے نہی جازم (حتمی ممانعت) ہے کیونکہ اس

میں تعبیر کا جو انداز لفظ " لَنْ " کے ذریعے اختیار کیا گیا ہے، وہ امر کی ابدیت (دوام) کا فائدہ دیتا ہے اور یہ فلاح (بھلائی) کے نفی میں مبالغہ ہے اوراس میں مذمت بھی ہے اس لئے اس کا ترک کرنا یعنی عورت کو حکمران نہ بنانا طلبِ جازم کے ساتھ ہے، اس لئے خلیفہ کے لیے شرط ہے کہ وہ مرد ہو۔

مسلمان ہونے کی شرط کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے **وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** "اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ایمان والوں پر ہر گز غلبہ نہ دے گا"(النساء:141)۔ اس میں بھی طلبِ جازم ہے کیونکہ اس میں بھی لفظ " لَنْ " لایا گیا، یعنی ابدی تاکید کی گئی۔ یہ خبر ہے لیکن طلب کے معنی میں۔ جب اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر کافروں کے غلبے کو حرام قرار دیا تب کافر کو مسلمان پر حکمران بنانا حرام ہے کیونکہ حکمران بنناہی تو اصل غلبہ حاصل کرنا ہے۔یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خلیفہ ولی امر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ولی امر کے مسلمان ہونے کی شرط رکھی ہے، ارشاد ہے **اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ** "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے ولی امر لوگوں کی "(النساء:59)۔ اس طرح اللہ سبحانہ وتعالی نے فرمایا **وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۚ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ** "جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آتی ہے تو فوراً اس کی اشاعت کر دیتے ہیں اگر وہ اس (خبر) کو رسول اللہ ﷺ کی طرف یا اپنے میں سے ولی امر لوگوں کی طرف لوٹا دیتے"(النساء:83)۔ قرآن میں ہمیشہ اولوامر کے کلمے کے ساتھ اس کے مسلمان ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور خلیفہ بھی ولی امر ہے اور یہی دوسرے اہلِ امر کا تقرر کرتا ہے، اس لئے اس کا مسلمان ہونا بھی شرط ہے۔

آزاد شخص ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ غلام خود کسی کی ملکیت میں ہوتا ہے اور اپنے آپ کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تو دوسروں کے معاملات کو کیسے چلائے گا، اس لئے وہ لوگوں کا والی ہو ہی نہیں سکتا۔ بالغ ہونے کی شرط کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ **«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ عَنْ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ وَعَنْ**

الصَّغِيرِ حَتَّى يَكْبَرَ وَعَنْ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَعْقِلَ أَوْ يُفِيقَ» ''تین لوگوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے (وہ مکلف نہیں)، سوتے ہوئے شخص سے جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو جائے، بچے سے جب تک کہ بالغ نہ ہو جائے اور مجنون (پاگل) سے جب تک کہ اس کی عقل واپس لوٹ نہ آئے''۔ دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ **«وَعَنْ الْمُبْتَلَى حَتَّى يَبْرَأَ»** ''بے ہوش شخص سے یہاں تک کہ اس کا ہوش واپس آجائے''۔ اس کو ابنِ ماجہ اور حاکم نے عائشہؓ سے روایت کیا ہے اور الفاظ ابنِ ماجہ کی ہیں، ابنِ خزیمہ اور ترمذی نے بھی علیؓ سے اس قسم کی روایت کی ہے۔

جس سے قلم کو اٹھالیا گیا ہو اس کا اپنے معاملات میں تصرف بھی صحیح نہیں تو خلیفہ بننا کہاں درست ہو سکتا ہے۔ ابو ہریرہؓ سے یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«تَعَوَّذُوا بِاللَّهِ مِنْ رَأْسِ السَّبْعِينَ وَإِمَارَةِ الصِّبْيَانِ»** ''ستر سروں (ستر فرقوں) اور بچوں کی امارت سے اللہ کی پناہ مانگو''، اسے احمد نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بچے کی خلافت صحیح نہیں اور ابو عقیل زھرہ بن معبد اپنے دادا عبد اللہ بن ھشام سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ کا زمانہ پایا اور ان کی ماں زینب بنتِ حمید ان کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گئی اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ اس سے بیعت لیجئے، آپ ﷺ فرمایا: **«هُوَ صَغِيرٌ، فَمَسَحَ رَأْسَهُ وَدَعَا لَهُ»** ''یہ چھوٹا ہے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے لیے دُعا کی''، اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ جب بچے کی بیعت ہی صحیح نہیں تو اس کا خلیفہ بننا یا بیعت لینا تو بطریقہ اولیٰ صحیح نہیں۔

عاقل ہونے کی شرط کی دلیل وہی حدیث ہے جو ابھی گزری ہے کہ تین آدمی غیر مکلف ہیں ان میں سے مجنون بھی ہے اور اس کا اپنے معاملات میں تصرف درست نہیں وہ کیسے خلیفہ بن کر لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔

عادل ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گواہ کے لیے عادل کی شرط رکھ دی اور فرمایا **وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ** ”اور اپنے (مسلمانوں) میں سے دو عادل لوگوں کو گواہ بناؤ“ (الطلاق:2)۔ جب گواہ کے لیے عادل ہونا شرط ہے، تو خلافت تو اس سے عظیم کام ہے اس لیے اس کا عادل ہونا تو لازمی ہے۔

قادر اور باصلاحیت ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ یہ بیعت کا ہی تقاضا ہے کیونکہ عاجز اور صلاحیت سے عاری شخص لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کی قدرت نہیں رکھتا اور کتاب وسُنت کو نافذ نہیں کر سکتا کہ جس کے لیے اس کو بیعت دی جاتی ہے۔ اس کے دلائل یہ ہیں:

1) مسلم نے ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپؓ نے سوال کیا ”اے اللہ کے رسول ﷺ آپ مجھے کیوں عامل (حکمران) نہیں بناتے۔ ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اے ابوذر، آپ کمزور ہو اور یہ ایک امانت ہے اور یہ قیامت کے دن شرمندگی اور ندامت کا باعث ہو گی، ماسوائے اس کے، جو اس کا حق ادا کرے“۔ اس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنا حق لے سکتا ہے اور دوسروں کا حق ادا کر سکتا ہے وہی اس کا حقدار اور اہل ہے۔ یہ قرینہ طلبِ جازم کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”یہ قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا سبب ہو سکتا ہے سوائے اس شخص کے لیے جو اس کا حق ادا کرے“۔

2) بخاری نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«إِذَا ضُيِّعَتِ الأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ، قَالَ: كَيْفَ إِضَاعَتُهَا يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: إِذَا أُسْنِدَ الأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ»**. ”اور جب امانت کو ضائع کیا جائے تو قیامت کا انتظار کرو، پوچھا: اے اللہ کی رسول ﷺ کس طرح امانت کو ضائع کیا جائے گا؟ فرمایا: جب نااہل لوگوں کو حکمران بنایا جائے تو قیامت کا انتظار کرو“۔

یہ حدیث بھی نہی جازم کا فائدہ دیتی ہے جس کا مطلب ہے نا اہل لوگوں کو حکومت دینا حرام ہے۔ جازم ہونے کا قرینہ یہ ہے کہ ایسا کرنا امانت کو ضائع کرنا ہے اور یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بہت بڑا احرام ہے۔

رہی یہ بات ہے کہ اہل اور نا اہل کا فیصلہ کیسے کیا جائے۔ اس کے لیے زمینی حقائق کی چھان بین کی ضرورت ہوگی کہ یہ شخص جسمانی یا ذہنی مریض تو نہیں یا کوئی اور کمزوری تو نہیں، اس لیے اس کام کو محکمۃ المظالم پر چھوڑا جائے گا وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ خلافت کے امیدواروں کے اندر شروطِ انعقاد پائی جاتی ہیں یا نہیں۔

دفعہ نمبر32: خلافت کا منصب خلیفہ کی موت، سبکدوشی یا اس کو معزول کیے جانے سے خالی ہو جائے تو تین دن (بشمول انکی راتوں کے) کے اندر اندر دوسرا خلیفہ مقرر کرنا فرض ہے۔

خلیفہ کا تقرر اسی لمحے سے فرض ہو جاتا ہے جس لمحے پہلے خلیفہ کا انتقال ہو جائے یا وہ معزول ہو جائے، لیکن اس کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے تین دن تک تاخیر جائز ہے۔ اگر تین دن سے زیادہ وقت گزر جائے اور مسلمانوں نے خلیفہ مقرر نہیں کیا تو دیکھا جائے گا کہ اگر مسلمان خلیفہ کے تقرر کے کام میں مشغول ہیں لیکن ایسی ناگفتہ بہ حالت کی وجہ سے اس کام کو انجام نہیں دے پائے ہیں جن میں وہ بے بس ہیں تو ان سے گناہ ساقط ہو جائے گا کیونکہ وہ برابر اس فرض کی ادائیگی میں لگے ہوئے ہیں لیکن مجبوری کی وجہ سے تاخیر کا شکار ہیں۔ ابنِ حبان اور ابنِ ماجہ نے ابنِ عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّ اللَّهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ»** ''بے شک اللہ نے میری اُمت کو معاف کر دیا؛ اُن کی غلطیاں، بھول چوک اور جو کچھ (گناہ) اُن سے زور زبردستی سے کروایا جائے''۔ اگر مسلمان خلیفہ کی تقرری کے کام میں مشغول ہوں تو اس کی معیاد تین دن کی ہے۔

خلافت کے منصب کے خالی ہوتے ہی براہ راست دوسرے خلیفہ کی فوراً بیعت کرنے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے فوراً بعد اسی دن آپ ﷺ کو دفنانے سے پہلے صحابہؓ سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت کے لیے اکٹھے ہو گئے، اسی دن ابو بکرؓ کی بیعت ہو گئی جو کہ بیعت انعقاد تھی، پھر دوسرے دن مسجد میں جمع ہو گئے اور ابو بکرؓ کو بیعتِ اطاعت دی۔

خلافت کے منصب کے خالی ہونے کے بعد تین دن (بشمول راتوں کے) کے اندر اندر خلیفہ کا تقرر اور تین دن کے آخری حد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جب عمرؓ زخمی ہو گئے اور ان کو اپنی وفات یقینی نظر آئی تو انہوں نے اہل شوریٰ سے یہ عہد لیا کہ ان کی وفات کے تین دن کے اندر اندر اپنا خلیفہ منتخب کریں اور انتہائی حد تین دن مقرر کی اور یہ وصیت کی کہ جو کوئی تین دن تک خلیفہ پر متفق نہ ہو ایسے مخالفت کرنے والے کو تین دن کے بعد قتل کیا جائے اور اپنے اس حکم کو نافذ کرنے کے لیے پچاس مسلمانوں کو ذمہ داری سونپ دی، یعنی تین دن کے بعد مخالفت کرنے والے کو قتل کریں، حالانکہ یہ لوگ اہل شوریٰ میں سے تھے اور اکابر صحابہ تھے اور یہ سب کچھ صحابہ کرامؓ کے سامنے ہو رہا تھا اور کسی کی طرف سے بھی اس کی مخالفت یا اس کا انکار منقول نہیں۔ یوں یہ صحابہ کا اجماع ٹھہرا کہ تین دن کے بعد بغیر خلیفہ کے رہنا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں اور اجماع صحابہؓ کتاب وسنت کی طرح شرعی دلیل ہے۔

بخاری نے مِسوَر بن مخرمہ سے نقل کیا ہے کہ **«طَرَقَنِي عَبْدُ الرَّحْمَنِ بَعْدَ هَجْعٍ مِنْ اللَّيْلِ، فَضَرَبَ الْبَابَ حَتَّى اسْتَيْقَظْتُ، فَقَالَ أَرَاكَ نَائِمًا، فَوَاللَّهِ مَا اكْتَحَلْتُ هَذِهِ اللَّيْلَةَ بِكَبِيرِ نَوْمٍ»** ’’آدھی رات کے بعد عبد الرحمن بن عوفؓ نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا جس سے میں اٹھ گیا، انہوں نے کہا تم سو رہے ہو جبکہ اللہ کی قسم! میں آج رات ذرا بھی نہیں سویا ہوں‘‘۔ ابنِ کثیر نے ’البدایہ والنہایہ‘ میں اس کا ذکر کیا ہے کہ عمرؓ کی وفات کے بعد چوتھے دن کی صبح طلوع ہونے ہی والی تھی کہ عبد الرحمن بن عوفؓ اپنے بھانجے مِسوَر بن مخرمہ کے گھر میں آ گئے اور کہا: ارے مسور! تم سو رہے ہو؟ اللہ کی قسم تین دن (راتوں سے) میں بالکل نہیں سویا ہوں۔ پس جب لوگوں نے فجر پڑھی تو عثمانؓ کی بیعت ہو گئی۔

دفعہ نمبر 33: (نئے خلیفہ کے تقرر کے سلسلے میں) ایک عبوری (وقتی) امیر مقرر کیا جائے گا جو مسلمانوں کے امور کی دیکھ بھال کرے اور منصبِ خلافت کے خالی ہونے کے بعد نئے خلیفہ کے تقرر کے عمل کا آغاز کرے، جو یہ ہو گا:

ا) سابق خلیفہ جب یہ محسوس کرے کہ اس کی موت قریب ہے یا وہ سبکدوش ہونے کا ارادہ کرے تو اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ایک عبوری امیر مقرر کرے۔

ب) اگر عبوری امیر کے تقرر سے قبل خلیفہ کا انتقال ہو جائے یا وہ مستعفی ہو جائے یا خلیفہ کے انتقال یا استعفیٰ کے علاوہ کسی اور وجہ سے منصب خلافت خالی ہو جائے تو وہ معاون جو معاونین میں سب سے عمر رسیدہ ہو گا وہ عبوری امیر ہو گا سوائے اس کے کہ وہ معاون بذاتِ خود خلافت کا امیدوار ہو۔ ایسی صورت میں وہ معاون عبوری امیر ہو گا جو عمر میں اس سے کم ہو، علیٰ ھذا القیاس۔

ج) اگر تمام معاونین خلافت کے امیدوار ہوں تب وزراء تنفیذ میں سے سب سے عمر رسیدہ وزیر (معاون) عبوری امیر ہو گا اگر وہ بھی خلافت کا امیدوار ہو تو اس کے بعد والا، علیٰ ھذا القیاس۔

د) اگر تمام تر وزراءِ تنفیذ خلافت کے امیدوار ہوں تو وزراء تنفیذ میں سے سب سے کم عمر وزیر عبوری امیر ہو گا۔

ھ) عبوری امیر کو احکام کی تبنی کا اختیار نہیں ہو گا۔

و) عبوری امیر تین دن کے اندر اندر نئے خلیفہ کے تقرر کے لیے ہر ممکن اقدامات کرے گا اور اس مدت میں توسیع کی اجازت نہیں سوائے اس کہ محکمہ المظالم کسی شدید سبب کی بناء پر اس مدت میں توسیع کر دے۔

خلیفہ کو چاہیے کہ جیسے ہی اسے یہ احساس ہو کہ اب دنیا سے جانے کا وقت قریب آ گیا ہے تو خلافت کا منصب خالی ہونے سے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک ایسا وقتی (عبوری) امیر مقرر کرے جو مسلمانوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرے اور تین دن کے اندر نئے خلیفہ کا تقرر کرے اور ان تین دنوں میں وہ خلیفہ کی جگہ مسلمانوں کا عبوری امیر ہو اور نئے خلیفہ کے تنصیب کے ساتھ ہی اس کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔

عبوری امیر کے لیے احکامات کی تبنی جائز نہیں کیونکہ یہ اختیار صرف اس خلیفہ کے پاس ہوتا ہے جس کو امت بیعت دے۔ عبوری امیر کے لیے خود خلافت کا امیدوار بننا یا کسی امیدوار کی طرف داری کرنا جائز نہیں، کیونکہ عمرؓ نے ایسے شخص کو عبوری امیر مقرر کیا جو خود خلافت کا امیدوار نہیں تھا۔

عبوری امیر کی امارت نئے خلیفہ کے تقرر کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی کیونکہ اس کی وقتی ذمہ داری یہاں تک ہی تھی۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ جب عمرؓ زخمی ہو گئے انہوں نے ایسا ہی کیا اور یہ تمام صحابہ کے سامنے کیا، کسی نے انکار یا مخالفت نہیں کی اس لیے یہ اجماعِ صحابہؓ ہے۔

جب عمرؓ زخمی ہو گئے تو خلافت کے چھ امیدواروں سے کہا: "تین دن صلاح مشورہ کرنا اور اس دوران صہیبؓ نماز میں لوگوں کی امامت کرائیں"۔ پھر عمرؓ نے صہیبؓ سے کہا جیسا کہ تاریخ طبری میں ہے " تم تین دن کے لیے نماز میں لوگوں کی امامت کرنا، پھر فرمایا کہ اگر پانچ ایک آدمی پر متفق ہو جائیں اور ایک انکار کرے تو تلوار سے اس کی گردن اڑا دینا"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے صہیبؓ کو ان پر عبوری امیر مقرر کیا کیونکہ انہی کو نماز کا امیر مقرر کیا، نماز کی امارت کا مطلب لوگوں کی امارت ہے اور ان کو یہ کہہ کر کہ 'گردن اڑا دینا'، سزا دینے کی صلاحیت بھی دے دی اور واضح رہے کہ امیر کے علاوہ کوئی قتل کا حکم نہیں دے سکتا۔

یہ واقعہ صحابہؓ کے سامنے پیش آیا کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی، اس لیے یہ اس بات پر اجماع ہے کہ خلیفہ ایک عبوری امیر مقرر کر سکتا ہے جو نئے خلیفہ کے تقرر کے سارے معاملے کی نگرانی کرے گا۔ اس بنا پر یہ بھی جائز ہے کہ خلیفہ اپنی زندگی میں دستور میں ایک ایسے دفعہ کی تبنی کر سکتا ہے، جس کی رُو سے جب خلیفہ کا اس حال میں انتقال ہو جائے کہ اس نے ایسا عبوری امیر مقرر نہیں کیا ہو جو خلیفہ کے تقرر کے معاملے کی نگرانی کرے، تو ایک شخص عبوری امیر ہو سکتا ہے۔

اسی بنا پر یہ تبنی بھی کی جاسکتی ہے کہ اگر خلیفہ نے اپنے مرض موت میں کوئی عبوری امیر مقرر نہیں کیا تو معاونین میں سے سب سے عمر رسیدہ عبوری امیر ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ خلافت کا امیدوار نہ ہو، اگر وہ خلافت کا امیدوار ہے تو اس سے کم عمر اور اسی طرح اگر سارے معاونین امیدوار ہیں تو بالکل اس ترتیب پر وزراء تنفیذ عبوری امیر بن سکتے ہیں۔

خلیفہ کے معزول ہونے کی صورت میں بھی یہ طریقہ کار اپنایا جائے گا کہ سب سے زیادہ عمر والا معاون عبوری امیر ہو گا بشرطیکہ وہ خلافت کا امیدوار نہ ہو گا اگر وہ امیدوار ہو تو اس سے کم عمر والا ہو گا اور اگر سارے وزراء تفویض ہی امیدوار ہوں تو سب سے زیادہ عمر رسیدہ وزیر تنفیذ عبوری امیر ہو گا، اوراگر سارے وزراء تنفیذ امیدوار ہوں تو سب سے کم عمر وزیر تنفیذ وقتی امیر ہو گا۔

یہ معاملہ اُس سے مختلف ہے کہ جب خلیفہ جہاد کے لئے نکلتا ہے تو کسی کو اپنا قائم مقام مقرر کرتا ہے یا کسی سفر میں جاتا ہے تو اپنا جانشین نامزد کرتا ہے جیسا کہ رسول ﷺ جہاد کے لئے نکلتے وقت کرتے تھے یا حجۃ الوداع کے وقت یا ایسے موقعوں پر جس کو خلیفہ ایسی صورت میں اپنا نائب مقرر کرتا ہے، اس کے اختیارات کا تعین بھی اس عرصے کے لئے خلیفہ خود کرتا ہے۔

دفعہ نمبر 34: خلیفہ کے تقرر کا طریقہ بیعت ہے خلیفہ کے تقرر اور اس کو بیعت دینے کے عملی اقدامات کچھ اس طرح ہوں گے:

ا۔ محکمۂ المظالم خلافت کے منصب کے خالی ہونے کا اعلان کرے گا۔

ب۔ عبوری امیر اپنی ذمہ داری سنبھالے گا اور فوراً نامزدگیاں شروع ہونے کا اعلان کرے گا۔

ج۔ شروط انعقاد کو پورا کرنے والے امیدواروں کی نامزدگیاں قبول کی جائیں گی اور محکمۃ المظالم کے مطابق ان شرائط پر پورنہ اترنے والوں کی نامزدگی مسترد کر دی جائے گی۔

د۔ وہ امیدوار جن کی نامزدگی کو محکمۂ المظالم نے قبول کیا ہو مجلس امت کے مسلمان اراکین دو مرتبہ مختصر کریں گے: پہلے اختصار میں وہ ووٹ کی اکثریت کی بنیاد پر چھ امیدواروں کو منتخب کریں گے اور دوسرے مرحلے میں ووٹ کی اکثریت کی بنیاد پر ان میں سے دو کا انتخاب کریں گے۔

ھ۔ ان دو امیدواروں کا اعلان کیا جائے گا اور مسلمانوں کو ان میں سے ایک کو منتخب کرنے کا کہا جائے گا۔

و۔ انتخابی نتائج کا اعلان کیا جائے گا اور مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے گا کہ کس نے زیادہ ووٹ لیے۔

ز۔ جس شخص نے زیادہ ووٹ لئے ہوں مسلمان کتاب وسنت پر عمل کرنے کی شرط پر اس کی خلافت کی بیعت کریں گے۔

ح۔ بیعت کے مکمل ہونے کے بعد لوگوں کے سامنے یہ اعلان کیا جائے گا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ بنا، تاکہ تمام مسلمانوں کو خلیفہ کے تقرر کا علم ہو، اس کے نام کے اعلان کے ساتھ اس کی صفات کا بھی

اعلان کیا جائے گا جن کی بنیاد پر وہ انعقاد کی شرائط پر پورا اترا۔

ط۔نئے خلیفہ کے تقرر کے معاملات سے فارغ ہوتے ہی عبوری امیر کی امارت ختم ہو جائے گی۔

جب شرع نے مسلمانوں پر اپنے لئے ایک خلیفہ مقرر کرنے کو فرض قرار دیا تو اس طریقہ کار کا بھی تعین کر دیا جس کے مطابق خلیفہ کا تقرر ہو گا۔ یہ طریقہ کار کتاب، سنت اور اجماع صحابہؓ سے ثابت ہے اور یہ طریقہ کار بیعت ہے اور یہ بیعت مسلمانوں کی جانب سے کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ پر عمل کرنے کی شرط پر ہو گی۔ مسلمانوں سے مراد سابق خلیفہ کی رعایا ہے اگر خلافت موجود ہو یا اس ملک کے مسلمان مراد ہیں جہاں خلافت قائم ہو رہی ہو اور پہلے سے خلافت موجود نہ ہو۔

اس طریقہ کار کا بیعت ہونا اس سے ثابت ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کو بیعت دی اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں امام کو بیعت دینے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ جو بیعت دی وہ نبوت کی بیعت نہیں تھی بلکہ حکمرانی کی بیعت تھی کیونکہ یہ عمل کی بیعت تھی، آپ ﷺ پر ایمان کی بیعت نہیں۔ یعنی بطور حکمران کے آپ ﷺ کی بیعت کی گئی نبی یا رسول کے اعتبار سے نہیں کیونکہ نبوت اور رسالت کا اقرار ایمان کہلاتا ہے بیعت نہیں، اس لئے یہ بیعت صرف ریاست کے سربراہ ہونے کے اعتبار سے تھی۔ قرآن وسنت میں بیعت کا حکم موجود ہے ،ارشاد ہے: **يَآ اَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّـٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٝ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِىْ مَعْرُوْفٍ ۙ فَبَايِعْهُنَّ** ”اے نبی ﷺ! جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زناکاری نہ کریں گی، نہ اپنی اولاد کو مار ڈالیں گی اور کوئی ایسا بہتان نہ باندھیں گیں جو خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑ لیں اور کسی نیک کام میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی تو آپ ان سے بیعت کر لیا کریں“(الممتحنۃ:12)۔ پھر فرمایا **اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّـٰهَ ؕ يَدُ اللّـٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِـمْ ۚ** ”جو لوگ آپ ﷺ سے بیعت کرتے ہیں وہ یقیناً اللہ سے

بیعت کرتے ہیں ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے" (الفتح:10)۔ اور بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ: اسماعیل نے بیان کیا اور انہوں نے کہا کہ مالک نے روایت کیا کہ یحیی بن سعید نے کہا کہ عبادہ بن الولید نے کہا کہ مجھے میرے والد نے عبادہ بن صامتؓ سے یہ روایت سنائی کہ **«بَايَعْنَا رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، فِي الْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ، وَأَنْ لاَ نُنَازِعَ الأَمْرَ أَهْلَهُ، وَأَنْ نَقُومَ أَوْ نَقُولَ بِالْحَقِّ حَيْثُمَا كُنَّا، لا نَخَافُ فِي اللَّهِ لَوْمَةَ لائِمٍ»** "ہم نے رسول اللہ ﷺ کو اچھے اور برے ہر حال میں سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت دی اور اس بات کی کہ اہلِ امر سے جھگڑا نہیں کریں گے اور جہاں جس حال میں بھی ہوں گے حق بات کریں گے اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈریں گے"۔ اور مسلم میں عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«...وَمَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ، فَلْيُطِعْهُ إِنِ اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الآخَرِ»** "جس نے امام (خلیفہ) کی بیعت کر لی اور اپنے ہاتھ کا سودا اور اپنے دل کا پھل اس کو دے دیا، تو اس کو چاہیئے کہ وہ اس کی اطاعت بھی کرے، اگر کوئی اور آکر اس سے (حکمرانی پر) تنازعہ کرتا ہے تو اس کی گردن اڑادو"۔ مسلم میں ہی روایت یہ بھی ہے جو کہ ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الآخَرَ مِنْهُمَا»** "اور جب دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو دوسرے کو قتل کرو"۔ مسلم نے ابو حازم سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں پانچ سال تک ابوہریرہؓ کے ساتھ رہا اور انھیں رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا کہ **«كَانَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمْ الأَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لا نَبِيَّ بَعْدِي، وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُونَ، قَالُوا: فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: فُوا بِبَيْعَةِ الأَوَّلِ فَالأَوَّلِ، أَعْطُوهُمْ حَقَّهُمْ، فَإِنَّ اللَّهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ»** "بنی اسرائیل کی سیاست (حکمرانی) ان کے انبیاء کرتے تھے۔ ایک نبی کا انتقال ہوتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین بنتا، میرے بعد کوئی نبی نہیں بلکہ بڑی کثرت سے خلفاء ہوں گے۔ صحابہؓ نے کہا: آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: تم ایک کے بعد دوسرے کی بیعت کو پورا کرو اور انھیں ان کا حق ادا کرو کیونکہ اللہ تعالی ان سے ان کی رعایا کے بارے میں پوچھے گا، جو اس نے انہیں دی"۔

قرآن و سنت کی نصوص میں انتہائی صراحت کے ساتھ ہے کہ خلیفہ کے تقرر کا طریقہ کار بیعت ہے۔ تمام صحابہؓ نے اس کو سمجھا اور اس پر عمل کرتے رہے۔ خلفاء راشدینؓ کی بیعت اس کی واضح مثال ہے۔ وہ عملی اقدامات جن کے ذریعے بیعت سے قبل خلیفہ کے تقرر کی کاروائی مکمل ہوتی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد پے در پے خلفائے راشدین کے حوالے سے رونما ہونے والے واقعات سے سمجھا جا سکتا ہے، یعنی ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کے تقرر میں تمام صحابہؓ اس پر خاموش رہے اور اس کی تائید کی، اگر یہ شرع کے خلاف ہوتا تو وہ ضرور اس کی مخالفت کرتے کیونکہ یہ انتہائی اہم معاملہ ہے، اس کا تعلق مسلمانوں کے وجود سے ہے اور اس پر اسلامی حکومت کا دارومدار ہے۔ ان خلفاء کے تقرر کے وقت جو کچھ ہوا اس کی چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے سقیفہ بنو ساعدہ میں گرما گرم بحث کی اور اس وقت خلافت کے امیدوار ابو عبیدہ بن جراحؓ، سعد بن عبادہؓ، ابو بکرؓ اور عمرؓ تھے۔ تاہم عمرؓ اور ابو عبیدہؓ ابو بکرؓ کے مد مقابل امیدوار بننے پر راضی نہ ہوئے، تب معاملہ ابو بکرؓ اور سعد بن عبادہؓ کے درمیان رہ گیا اور کوئی امیدوار سامنے نہیں آیا، اور بحث و تمحیص کے بعد ابو بکرؓ کی بیعت کی گئی۔ دوسرے دن مسلمانوں کو مسجد میں بلایا گیا اور مسلمانوں نے ابو بکرؓ کو بیعت دی چنانچہ سقیفہ بنو ساعدہ کی بیعت انعقاد خلافت کی بیعت تھی جس سے ابو بکرؓ مسلمانوں کے خلیفہ بنے جبکہ دوسرے دن مسجد میں مسلمانوں کی جانب سے بیعت، اطاعت کی بیعت تھی۔ جب ابو بکرؓ کو احساس ہوا کہ ان کہ بیماری مرض موت ہے خاص کر اسلامی لشکر بڑی طاقتوں سے فارس اور روم میں لڑائی میں مصروف تھے تو مسلمانوں کو مشورے کے لئے بلایا اور ان سے کہا کہ میرے بعد کون خلیفہ بنے گا۔ آخر تین مہینے تک مشوروں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب مشورہ مکمل کر لیا اور مسلمانوں کی اکثریت کی رائے معلوم کر لی تو ان سے عہد لیا یعنی آج کل کی اصطلاح میں نامزد کر دیا کہ ان کے بعد عمرؓ مسلمانوں کے خلیفہ ہوں گے۔ تاہم اس نامزدگی کی وجہ سے عمرؓ مسلمانوں کے خلیفہ نہیں بنے بلکہ ابو بکرؓ کی وفات کے بعد مسلمان مسجد میں جمع ہو گئے اور عمرؓ کو بیعت دی اور ان کو اپنا خلیفہ بنایا اور اس بیعت کے نتیجے میں وہ خلیفہ بنے۔ ان مشوروں یا ابو بکرؓ کی جانب سے نامزد کرنے سے وہ خلیفہ نہیں بنے تھے کیونکہ اگر ابو بکرؓ کی جانب سے نامزد کرنے سے وہ خلیفہ بنتے

تومسلمانوں سے بیعت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا کہ نصوص کے مطابق کوئی بھی شخص صرف مسلمانوں کی جانب سے بیعت دینے سے ہی خلیفہ بنتا ہے۔ جب عمرؓ زخمی ہوگئے تو مسلمانوں نے ان کو جانشین نامزد کرنے پر مجبور کیا، تو آپؓ نے چھ افراد کو نامزد کیا اور صہیبؓ کو نماز پڑھانے کی ذمہ داری سونپ دی اور ان سے کہا کہ تین دن کے اندر یہ چھ آدمی اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کریں گے اور ان کی نگرانی کرنا اور پھر فرمایا: **«... فإن اجتمع خمسة، ورضوا رجلاً، وأبى واحد، فاشدخ رأسه أو اضرب رأسه بالسيف ...»** "اگر پانچ آدمی ایک آدمی پر متفق ہو جائیں اور ایک نے مخالفت کی تو تلوار سے اس کی گردن کاٹ دو..."۔ طبری نے اپنی تاریخ میں اس کا ذکر کیا ہے اور ابنِ قتیبہ نے بھی اپنی کتاب امامت اور سیاست میں جو کہ تاریخ الخلفاء کے نام سے مشہور ہے اس کا ذکر کیا ہے، ابنِ سعد نے بھی طبقات الکبریٰ میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ پھر ابو طلحہ انصاریؓ کو ان لوگوں کی سیکورٹی پر مقرر کردیا اور مقداد بن الاسودؓ کو امیدواروں کے لئے جمع ہونے کی جگہ کا انتظام کرنے کی ذمہ داری دی۔ پھر آپؓ کی وفات کے بعد جب امیدوار ایک مجلس میں اکٹھے ہوگئے تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا: تم میں سے کون اس معاملے سے دستبردار ہو کر اپنے سے افضل شخص کو یہ ذمہ داری دینا چاہتا ہے یہ سن کر سب خاموش ہوگئے پھر خود عبدالرحمن بن عوفؓ نے کہا: میں دستبردار ہوتا ہوں، یہ کہہ کر آپ نے ایک ایک کرکے ان سے مشورہ لینا شروع کیا اور پوچھا کہ تم کس کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتے ہو، سب کا جواب علیؓ اور عثمانؓ کے گرد گھومنے لگا۔ اس کے بعد عبدالرحمنؓ نے دوسرے مسلمانوں سے رائے لینا شروع کی اور ان سے پوچھا گیا کہ ان دونوں میں سے کس کو تم لوگ اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہتے ہو۔ آپؓ نے مردوں اور عورتوں دونوں سے رائے لی اور آپؓ صرف دن کو ہی نہیں بلکہ رات کو بھی ایسا کرتے رہے جیسا کہ بخاری میں ہے کہ مِسوَر بن مخرمہ کہتے ہیں کہ: "رات کہ آخری حصے میں عبدالرحمٰن نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا تو میری آنکھ کھلی، انہوں نے کہا تم سو رہے ہو؟ اللہ کی قسم میں تو رات بھر نہیں سویا ہو" ۔ جب فجر کی نماز ہوگئی تب لوگوں نے عثمانؓ کی بیعت کرلی، یوں عثمانؓ مسلمانوں کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ پس عمرؓ کی جانب سے چھ آدمیوں کی نامزدگی سے عثمانؓ خلیفہ نہیں بنے

بلکہ لوگوں کی جانب سے بیعت کرنے سے خلیفہ بنے۔ جب عثمانؓ شہید کیے گئے تو مدینہ کے لوگوں نے علیؓ کو بیعت دی یوں وہ خلیفہ بنے۔ خلفائے راشدینؓ کی بیعت کو باریک بینی سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کے امیدواروں کا پہلے اعلان ہوتا تھا اور ہر امیدوار کے اندر انعقاد خلافت کی شرائط موجود ہوتی تھیں اس کے بعد مسلمانوں میں اہل وعقد یعنی مسلمانوں کے نمائندوں کی رائے لی جاتی تھی۔ خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں مسلمانوں کے نمائندے جانے پہچانے حضرات یعنی صحابہ کرامؓ ہوتے تھے یا پھر اہل مدینہ۔ پھر صحابہ یا ان کی اکثریت جس شخص کو چاہتے اس کی بیعت کرتے جو بیعت انعقاد ہوتی اور یوں وہ شخص خلیفہ بن جاتا اور پھر مسلمان اس کی بیعت اطاعت کرتے تھے اور اس کی اطاعت ہو جاتی۔ خلیفہ کے تقرر اور خلافت کے منصب پر فائز کرنے کا اختیار امت کے پاس ہوتا ہے اور اس اختیار کو امت کے نمائندے امت کی جانب سے استعمال کرتے ہیں۔

جہاں تک امیدواروں کی بات ہے تو خلفائے راشدینؓ کے دور کی کیفیت کے تفصیلی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ امیدوار بھی محدود ہوتے تھے۔ سقیفہ بنو ساعدہ میں امیدوار ابو بکرؓ، عمرؓ، ابو عبیدہؓ اور سعد بن عبادہؓ تھے اور کوئی امیدوار نہیں تھا، لیکن عمرؓ اور ابو عبیدہؓ بھی ابو بکرؓ کے مقابلے میں آنے کو تیار نہ ہوئے اور ان کے مد مقابل بننے سے انکار کیا، یوں عملی طور پر مقابلہ ابو بکرؓ اور سعد بن عبادہؓ کے درمیان تھا اور سقیفہ بنو ساعدہ میں موجود اہل حل وعقد نے ابو بکرؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا اور ان کو بیعت دے دی جس سے ان کی خلافت کا انعقاد ہو گیا، جبکہ دوسرے دن مسلمانوں نے مسجد میں ابو بکرؓ کی بیعت کی جو کہ بیعت اطاعت تھی۔

ابو بکرؓ نے اپنے بعد عمرؓ کی خلافت کی تجویز دی اور ان کو نامزد کیا۔ عمرؓ کے ساتھ کوئی اور امیدوار نہیں تھا اس لئے مسلمانوں نے انعقاد خلافت کے لئے ان کی بیعت کی پھر اطاعت کے لئے ان کی بیعت کی۔

عمرؓ نے مسلمانوں کے لئے چھ آدمیوں کو نامزد کیا اور فرمایا کہ ان میں سے ایک کو خلیفہ بنالو۔ پھر ان چھ میں سے عبد الرحمٰن بن عوفؓ کو باقیوں نے اپنا وکیل مقرر کیا، آپؓ نے باقی پانچ امیدواروں سے بحث کرنے

کے بعد دو امیدوار برقرار رکھے یعنی عثمانؓ اور علیؓ۔ اس کے بعد عبد الرحمنؓ نے لوگوں کی رائے معلوم کر کے اکثریت کی رائے کے مطابق عثمانؓ کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ علیؓ جب خلیفہ بنے تو ان کے ساتھ کوئی اور امیدوار تھا ہی نہیں، اس لئے جمہور مسلمانوں نے ان کی بیعت کر لی، مدینہ میں بھی اور کوفہ میں بھی، یوں وہ مسلمانوں کے خلیفہ مقرر ہو گئے۔

عثمانؓ کی بیعت کے وقت خلیفہ کے تقرر کی وہ انتہائی مدت لگی جو خلیفہ کے انتخاب کے لیے مقرر رہے اور اس کی اجازت دی گئی ہے یعنی تین دن اور تین راتیں، اور امیدوار بھی چھ افراد تھے جو بعد میں کم ہو کر دو رہ گئے اس لئے اس واقعے کو ہم ذرا تفصیل سے بیان کریں گے کیونکہ اس میں بہت سے فوائد پوشیدہ ہیں۔

1) عمرؓ کی وفات اتوار کے دن صبح کے وقت پہلی محرم 24 ہجری کو ہوئی۔ اس سے پہلے سیدنا عمرؓ، ابی لؤلؤ، لعنتُ اللّٰہ کے حملے سے زخمی ہو گئے تھے، جب آپؓ بدھ کے دن فجر کی نماز پڑھا رہے تھے، جب ذی الحجۃ کے مہینے کے ختم ہونے میں چار دن باقی تھے اور یہ 23 ہجری کا سال تھا۔ آپؓ کی وصیت کے مطابق صہیبؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

2) جب عمرؓ کو دفنایا گیا تو مِقداد نے ان چھ اہل شوریٰ کو ایک گھر میں جمع کیا جن کو پہلے عمرؓ نامزد کر چکے تھے۔ ابو طلحہؓ کھڑے ہو کر ان کی حفاظت کرنے لگے اور وہ مشورے کے لئے بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے اپنی رضامندی سے عبد الرحمن بن عوفؓ کو اپنا وکیل بنایا کہ ان میں سے ایک کو خلیفہ منتخب کریں۔

3) عبد الرحمنؓ نے ان میں سے ہر ایک سے سوالات کیے ان سے بحث کی اور ان سے پوچھا کہ اپنے علاوہ تم کس کو خلیفہ بنانا چاہو گے؟ سب کا جواب علیؓ اور عثمانؓ کے گرد ہی گھومتا رہا۔ اس لئے عبد الرحمنؓ نے ان دونوں کو ہی امیدوار بنایا۔

4) اس کے بعد عبد الرحمنؓ نے لوگوں سے مشورہ لینا شروع کیا جیسا کہ مشہور ہے۔

5) بدھ کی رات یعنی عمرؓ کی وفات سے تیسرے دن کی رات کو عبد الرحمٰن بن عوفؓ اپنے بھانجے مِسوَر بن مخرمہ کے گھر گئے۔ یہاں ہم وہی نقل کرتے ہیں جو البدایہ والنہایہ میں ابنِ کثیر نے لکھا ہے: ''چوتھے دن کی صبح، جب عمرؓ کی وفات کے تیسرے دن کی رات اختتام پزیر ہونے والی تھی، عبد الرحمٰن بن عوفؓ اپنے بھانجے مسور بن مخرمہ کے گھر آئے اور کہا: اے مسور تم سو رہے ہو؟ اللہ کی قسم! تین دن سے، مجھے زیادہ دیر سونے کا وقت ہی نہیں ملا (یعنی عمرؓ کی وفات کے بعد پیر، منگل اور بدھ کی رات) جاؤ علیؓ اور عثمانؓ کو بلاؤ... پھر ان دونوں کو لیکر مسجد کی طرف روانہ ہوئے.... صلاۃُ جامعہ کی منادی کی گئی'' ۔ یہ بدھ کے دن کا فجر کا وقت تھا، پھر آپؓ نے علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ کیا آپ کتابُ اللہ، سنتِ رسول ااور ابو بکرؓ اور عمرؓ کے فعل پر بیعت کرانے کے لئے تیار ہیں، تو علی کرم اللہ وجھہ نے فرمایا کتاب و سنت پر تو ٹھیک ہے اور ابو بکرؓ اور عمرؓ کا فعل ان کا اپنا اجتہاد تھا اور یہ ان کی رائے تھی۔ یہ سن کر عبد الرحمنؓ نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا اور عثمانؓ کا ہاتھ پکڑ کر وہی سوال دہرایا تو انہوں نے ہاں میں جواب دیا، یوں عثمانؓ کی بیعت کی گئی۔

صہیبؓ نے اس دن بھی لوگوں کو فجر اور ظہر کی نماز پڑھائی، پھر عثمانؓ نے بحیثیت خلیفہ عصر کی نماز پڑھائی۔ یعنی فجر کی نماز کے وقت عثمانؓ کے لئے بیعتِ انعقاد کے شروع ہونے کے باوجود صہیبؓ کی امارت ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ مدینہ میں موجود اہل حل و عقد کی بیعت کے بعد ہی ان کی امارت ختم ہوئی، اور یہ بیعت عصر سے تھوڑی دیر پہلے مکمل ہوگئی، کیونکہ اس دن کے سہ پہر تک صحابہ کو عثمانؓ کی بیعت کے لیے بلایا گیا اور عصر سے ذرا پہلے بیعت مکمل کر لی گئی، یوں صہیبؓ کی امارت ختم ہوگئی اور عثمانؓ نے خلیفہ بن کر لوگوں کو نماز پڑھائی۔

صاحبِ البدایہ والنہایہ اس واقع کو یوں بیان کرتے ہیں کہ یہ جاننے کے باوجود صہیبؓ نے لوگوں کو ظہر کی نماز کیوں پڑھائی جبکہ عثمانؓ کی بیعت تو فجر کے وقت ہی ہو چکی تھی چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مسجد میں لوگوں نے عثمانؓ کی بیعت کی اور وہ دار الشوریٰ (وہ گھر جس میں اہل شوریٰ جمع ہوگئے تھے) چلے گئے اور پھر باقی ماندہ

لوگوں نے بھی بیعت دی گویا بیعت ظہر کے بعد ہی مکمل ہوئی، اس لئے صہیبؓ نے اس دن بھی مسجد نبوی میں ظہر کی نماز پڑھائی اور خلیفہ بننے کے بعد عثمانؓ نے پہلی نماز عصر کی پڑھائی۔

اس بنا پر (خلیفہ کی وفات یا معزولی کی وجہ سے) خلافت کے منصب کے خالی ہونے کے بعد نئے خلیفہ کی نامزدگی کے لیے مندرجہ ذیل امور کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے

1) دی گئی مہلت (تین دن) کے اندر نامزدگی کے موضوع پر دن رات کام ہونا چاہیے۔

2) شروط انعقاد کے لحاظ سے امیدواروں کی محدود تعداد ہونی چاہیے اور یہ کام محکمۂ المظالم کا ہے۔

3) اہل امیدواروں کی فہرست کو دو مرتبہ مختصر کیا جائے گا، یعنی پہلے چھ اور دوسری مرتبہ دو امیدواروں تک فہرست کو محدود کیا جائے گا۔ یہ کام کرنے کا حق مجلسِ امت کو حاصل ہے کیونکہ وہی امت کی نمائندہ ہے۔ امت نے ہی یہ کام عمرؓ کو سونپ دیا اس لئے انہوں نے چھ امیدوار نامزدگی کر دی۔ پھر ان چھ افراد میں سے عبد الرحمنؓ نے خود کو علیحدہ کر لیا، جنہوں نے بحث ومباحثے کے بعد امیدواروں کی تعداد کو دو تک مختصر کر دیا۔ اس پورے کام کا مرجع امت یعنی اس کے نمائندے تھے۔

4) انتخابات اور بیعت کی تکمیل کے بعد لوگوں کے سامنے یہ اعلان کیا جائے گا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ بنا ہے تاکہ خلیفہ کے تقرر کا تمام مسلمانوں کو علم ہو جائے ان کے نام کا بھی ذکر ہو گا اور وہ صفات بیان کی جائیں گی جن کی بنا پر وہ خلافت کے اہل قرار پایا۔

5) عبوری امیر کی مدت صرف انتخابات کے نتائج کے بعد نہیں بلکہ بیعت کی کاروائی مکمل اور خلیفہ کے تقرر کے بعد ختم ہو گی کیونکہ صہیبؓ کی امارت عثمانؓ کے منتخب ہوتے ہی ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کی بیعت کے مکمل ہونے کے بعد ختم ہوئی۔ یہ اس وقت ہے جب ایک خلیفہ موجود تھا لیکن اس کا انتقال ہو گیا یا وہ سبکدوش ہو گیا اور اس کی جگہ دوسرے خلیفہ کے تقرر کا معاملہ درپیش ہے۔

اگر خلیفہ موجود ہی نہیں اور خلیفہ مقرر کرنا مسلمانوں پر فرض ہے تا کہ وہ ان پر احکام شرعیہ کو نافذ کرے اور اسلامی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کرے جیسا کہ استنبول میں خلافت کے خاتمے کے بعد آج تک مسلمانوں کی حالت ہے، یعنی 28 رجب 1342ھ بمطابق 3 اپریل 1924ء سے لیکر آج تک، اس وقت مسلمانوں کے ممالک میں سے کوئی بھی ملک اس بات کا اہل ہے کہ خلیفہ کو بیعت دے اور اس کی خلافت منعقد ہو جائے گی۔ موجودہ ممالک میں سے کسی بھی مسلمان ملک میں خلیفہ کی بیعت ہو جائے اور اس کی خلافت کا انعقاد ہو جائے تب دوسرے ممالک یا علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں پر بھی اس کی اطاعت کی بیعت فرض ہو جائے گی یعنی اس کی فرمانبرداری کی بیعت، بشرطیکہ اس کی خلافت کے انعقاد کی بیعت ایسے ملک یا علاقے کے لوگ کریں، جس میں یہ چار شرائط موجود ہوں:

اول: وہ ملک اپنی اتھارٹی میں خود مختار ہو یعنی اس ملک میں اقتدار مسلمانوں کے ذریعے ہو، کسی کافر ریاست یا کفار کے اثرورسوخ کے بل بوتے پر نہ ہو۔

دوم: اس ملک میں مسلمانوں کی امان (تحفظ) اسلام کی امان سے ہو، نہ کہ کفر کی امان سے۔ یعنی اس علاقے کا داخلی وخارجی تحفظ اسلامی تحفظ ہو، جو مسلمانوں کی قوت کے بل بوتے پر قائم ہو، جو ایک خالص اسلامی طاقت ہے۔

سوم: وہ بیک وقت اسلام کو مکمل اور انقلابی شکل میں نافذ کرے اور اسلامی دعوت کا علمبردار بن جائے۔

چہارم: جس خلیفہ کی بیعت کی گئی ہے اس کے اندر خلافت کے انعقاد کی تمام شرائط مکمل طور پر پائی جاتی ہو، اگرچہ افضلیت کی شرائط نہ بھی ہوں کیونکہ اعتبار انعقاد کی شرائط کا ہے۔

جس ملک کے اندر یہ چار باتیں پوری طرح پائی جائیں تو وہاں کے لوگوں کی جانب سے خلیفہ کی بیعت کرنے سے خلافت قائم ہو جائے گی اور وہاں کے باشندوں کی جانب سے یہ بیعت، انعقاد کی شرعی بیعت ہو گی اور وہ خلیفہ صحیح شرعی خلیفہ ہو گا۔ اس کے بعد کسی اور شخص کی بیعت صحیح نہیں ہو گی۔ اس کے بعد کسی اور

علاقے میں کسی بھی دوسرے شخص کی بیعت کی جائے تو یہ دوسری بیعت باطل ہو گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَتَيْنِ فَاقْتُلُوا الآخَرَ مِنْهُمَا» ''جب دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو بعد والے کو قتل کرو''۔ یہ بھی فرمایا: «... فُوا بِبَيْعَةِ الأَوَّلِ فَالأَوَّلِ» ''پہلے خلیفہ کی بیعت کو پورا کرو''۔ اور فرمایا «وَمَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ، فَلْيُطِعْهُ إِنِ اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الآخَرِ» ''جس نے امام (خلیفہ) کی بیعت کی اور اپنے ہاتھ کا سودا اور اپنے دل کا پھل اس کو دے دیا تو اس کو چاہیئے کہ وہ اس کی اطاعت بھی کرے اگر کوئی اور آکر اس سے لڑتا ہے تو دوسرے کی گردن اڑادو''۔

بیعت کی کیفیت:

ہم پہلے بیعت کے دلائل بیان کر چکے ہیں اور یہ بھی کہ اسلام میں خلیفہ کے تقرر کا یہی طریقہ ہے، رہی یہ بات کہ بیعت کس طرح کی جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بیعت ہاتھ کے مصافحہ (ہاتھ ملاکر) بھی ہو سکتی ہے یا لکھ کر بھی ہو سکتی ہے۔ عبد اللہ بن دینار نے بیان کیا ہے کہ میں نے ابن عمرؓ کو دیکھا کہ جب لوگ عبد الملک کی بیعت کے لئے جمع ہو گئے تو لکھا کہ '' میں اللہ کے بندے عبد الملک امیر المومنین کی کتابُ اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی شرط پر بات سننے اور اطاعت کرنے کا اقرار کرتا ہوں جہاں تک میں کر سکوں''۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بیعت کے لئے کوئی بھی وسیلہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

تاہم یہ شرط ہے کہ بیعت دینے والا بالغ ہو کیونکہ بچے کی بیعت درست نہیں۔ ابو عقیل زھرة بن معبد نے اپنے دادا عبد اللہ بن ھشام سے روایت کی ہے کہ ان کی ماں زینب بنت حمید ان کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئی اور کہاں اے اللہ کے رسول ﷺ! اس سے بیعت لیجئے، تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ چھوٹا ہے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے لیے دُعا کی''۔

بیعت کے لیے کوئی خاص الفاظ کی قید نہیں تاہم ان الفاظ میں خلیفہ کے حوالے سے یہ بات ہونی چاہیے کہ یہ بیعت کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ پر عمل کرنے کی شرط پر ہے اور بیعت دینے والے کے لئے تنگی و خوشحالی اور پسند و ناپسند ہر حال میں اطاعت کرنے کا اظہار ہو۔ ان الفاظ کو متعین کرنے کے لئے قانون کا اجراء کیا جاسکتا ہے۔

جس وقت بیعت دینے والے نے خلیفہ کو بیعت دے دی اس وقت سے یہ بیعت اس کی گردن پر امانت بن گئی اوراس سے رجوع کرنا جائز نہیں۔ خلافت کے انعقاد تک تو یہ حق ہے لیکن جیسے ہی بیعت دے دی اب اس کی پابندی لازمی ہے، اگر اس سے رجوع کا ارادہ کرے تو جائز نہیں۔ بخاری میں جابر بن عبد اللہ ؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی آکر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرلی، پھر اسے خارش کی بیماری ہو گئی، اس نے رسول اللہ ﷺ سے کہا **«أَقِلْنِي بَيْعَتِي»**"میری بیعت مجھے واپس کیجئے"۔ رسول ﷺ نے انکار کر دیا وہ پھر آیا اور کہا میری بیعت واپس کیجئے۔ آپ ﷺ نے پھر انکار فرمایا۔ اس کے بعد وہ یونہی چلا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّمَا الْمَدِينَةُ كَالْكِيرِ تَنْفِي خَبَثَهَا وَيَنْصَعُ طَيِّبُهَا»**" مدینہ بھٹی کے مانند ہے خبیث چیزوں کو نکال پھینکتا ہے اور پاک چیزوں کو نکھار دیتا ہے" (متفق علیہ)۔ نافع سے روایت ہے عبد اللہ بن عمرؓ نے ان سے کہا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ **«مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ، لَقِيَ اللَّهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لا حُجَّةَ لَهُ»** "جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا قیامت کے دن اس حال میں اللہ سے ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہو گی" اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ خلیفہ کی بیعت کو توڑنا اللہ کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لینا ہے۔ اس سے مراد وہ بیعت ہے جو بیعت انعقاد ہو یا پھر بیعت اطاعت ہو یعنی ایسے خلیفہ کی بیعت جس کی خلافت قائم ہو گئی ہو۔ اگر ابتدائی طور پر خلافت کے لئے کسی شخص کی بیعت کرے لیکن اس کی بیعت مکمل نہیں ہو سکی تب اس بیعت سے رجوع کر سکتا ہے یعنی دوسرے مسلمانوں نے اس شخص کی خلافت کے لئے بیعت نہیں دی اور وہ خلیفہ نہیں بن سکا کیونکہ حدیث میں نہ بن سکا۔

دفعہ نمبر35: امت ہی خلیفہ کا تقرر کرتی ہے۔ لیکن جس وقت شرعی طریقے سے خلیفہ کو بیعت انعقاد دے دی جائے اس کے بعد امت کو اُس خلیفہ کو معزول کرنے کا اختیار نہیں۔

اس دفعہ کی دو شقیں ہیں ایک یہ کہ خلیفہ کو خلافت کے منصب پر فائز کرنا امت کا حق ہے دوسرا یہ ہے کہ امت خلیفہ کو معزول نہیں کر سکتی۔ پہلے شق کے دلائل بیعت والی احادیث ہیں۔ کوئی بھی شخص بیعت کے بغیر خلافت کے منصب تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ بیعت ہی خلیفہ کے تقرر کا طریقہ ہے، یہ مسلمانوں کی جانب سے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ہمیں بیعت کا حکم دینے سے ثابت ہے۔ پھر یہ بات کہ تمام خلفائے راشدینؓ بیعت کے ذریعے ہی خلافت کے منصب تک پہنچے۔ دوسرے شق کی دلیل وہ احادیث ہیں جن میں خلیفہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے خواہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہو، جب تک کھلم کھلا کفر نہ کرے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ فَمِيتَةٌ جَاهِلِيَّةٌ»** "جو شخص اپنے امیر میں کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو اس کو صبر کرنا چاہیے کیونکہ جو جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہوا اور اسی حالت میں مر گیا، وہ جاہلیت کی موت مرا"، اس کو مسلم نے ابنِ عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ یہاں اپنے امیر کا لفظ عام ہے اور خلیفہ بھی اس میں شامل ہے کیونکہ وہ بھی مومنین کا امیر ہے۔ مسلم میں سلمہ بن یزید الجعفی کی روایت ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر ہمارے حکمران ہمیں ہمارا حق نہ دیں تو آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اُس سے منہ موڑ لیا، اس نے پھر وہی سوال کیا: آپ ﷺ نے پھر اعراض کیا۔ اس نے تیسری مرتبہ یہی دوہرایا تو اشعث بن قیسؓ نے ان کو ڈانٹا، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«اسْمَعُوا وَأَطِيعُوا فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ»** "سنو اور اطاعت کرو کیونکہ تمہارا (گناہ کا) بوجھ تمہارا ہے اور ان کا بوجھ ان کا ہے"۔ بخاری اور مسلم سے روایت ہے، اور الفاظ مسلم کے ہیں اور راوی عبادہ بن صامتؓ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ **«دَعَانَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَبَايَعْنَاهُ فَكَانَ فِيمَا أَخَذَ عَلَيْنَا أَنْ بَايَعَنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي**

مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا وَأَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَأَنْ لاَ نُنَازِعَ الأَمْرَ أَهْلَهُ قَالَ: إِلاَّ أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللَّهِ فِيهِ بُرْهَانٌ». "اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بلایا، ہم نے آپ ﷺ کی بیعت کی۔ آپ ﷺ نے ہم سے پسند ناپسند، خوش حالی اور تنگدستی، اور ہم پر ترجیح دینے کی صورت میں بھی سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت لی اور اس بات پر کہ ہم اپنے اہلِ امر سے تنازعہ نہیں کریں گے اور آپ ﷺ نے فرمایا: سوائے اس وقت کہ جب تم کھلم کھلا کفر دیکھو جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس دلیل موجود ہو"۔ ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«يَا أَبَا ذَرٍّ، كَيْفَ أَنْتَ عِنْدَ وُلاَةٍ يَسْتَأْثِرُونَ عَلَيْكَ بِهَذَا الْفَيْءِ ؟ قَالَ: وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ، أَضَعُ سَيْفِي عَلَى عَاتِقِي فَأَضْرِبُ بِهِ حَتَّى أَلْحَقَكَ، قَالَ: أَفَلاَ أَدُلُّكَ عَلَى خَيْرٍ لَكَ مِنْ ذَلِكَ ؟ تَصْبِرُ حَتَّى تَلْقَانِي»** "اے ابو ذرؓ! تم ان والیوں کے ساتھ کیا کرو گے جو اس مال فئے میں دوسروں کو تم پر ترجیح دیں گے؟ ابو ذرؓ نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر مبعوث فرمایا، اپنی تلوار کندھے پر رکھ کر ان کی گردن مارنے کے لیے نکلوں گا اور ان سے اس وقت تک لڑوں گا جب تک آپ ﷺ سے آکر مل نہ لوں (شہادت تک) فرمایا: کیا میں آپ کو اس سے بہتر کام نہ بتادوں؟ صبر کرو یہاں تک کہ آکر مجھ (قیامت کے دن) سے مل لو"۔ اس کو احمد نے روایت کیا ہے اور زین العراقی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ابو داؤد نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ یہ تمام احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ خلیفہ ایسا کام بھی کرے جسے آپ ناپسند کرتے ہوں تب بھی رسول اللہ ﷺ نے اس کی اطاعت کا حکم دیا اور اس کے ظلم پر صبر کرنے کا حکم دیا جس کا مطلب ہے کہ امت خلیفہ کو معزول یا برطرف نہیں کر سکتی۔

یہ بات بھی پہلے گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دیہاتی کی بیعت واپس کرنے سے انکار فرمایا، جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ: ایک دیہاتی نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی۔ مدینہ میں اس کو خارش کی بیماری لگ گئی اور اس نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آکر کہا: اے محمد ﷺ میری بیعت واپس کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے انکار فرمایا، وہ دیہاتی مدینہ سے چلا گیا، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّمَا الْمَدِينَةُ**

كَالْكِيرِ تَنْفِي خَبَثَهَا وَيَنْصَعُ طَيِّبُهَا» ”مدینہ بھٹی کے مانند ہے خبیث چیزوں کو نکال باہر کرتا ہے اور پاک چیزوں کو نکھار دیتا ہے“(متفق علیہ)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت بیعت ہو جائے اس کی پاسداری دونوں طرف سے لازم ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے امت کو خلیفہ کی برطرفی کا کوئی حق نہیں کیونکہ وہ اس کو دی گئی اپنی بیعت واپس نہیں لے سکتی۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ دیہاتی تو اپنی بیعت واپس لے کر اسلام سے واپس نکلنا چاہتا تھا ریاست کی سربراہ کی اطاعت سے نہیں، جی ہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ معاملہ ہوتا تو یہ ارتداد ہوتا اور رسول اللہ ﷺ ضرور اس کو قتل کر دیتے اس لئے کہ مرتد کو قتل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بیعت بھی اسلام کی نہیں بلکہ اطاعت کی بیعت تھی اس لیے وہ اطاعت سے نکلنا چاہتا تھا اسلام سے نہیں۔ پس مسلمان اپنی بیعت سے نہیں نکل سکتے اور نہ ہی خلیفہ کو معزول کر سکتے ہیں۔

تاہم شرع نے خود یہ بتا دیا کہ خلیفہ کس وقت اور کس حال میں خود بخود معزول ہوتا ہے، اس کو معزول کرنے کی ضرورت نہیں، کب وہ برطرفی کا مستحق ہوتا ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ امت کے پاس خلیفہ کو برطرف کرنے کا حق نہیں۔ جب وہ ظلم کرے تو امت صرف بھرپور انداز میں اس کا محاسبہ کر سکتی ہے اور اس سے اُس وقت لڑ سکتی ہے جب وہ کھلم کھلا کفر پر اُتر آئے۔ اور جوں ہی وہ معزول کیے جانے کا مستحق ہو جائے تو شرع نے محکمۂ المظالم کو اس کو معزول کرنے کا حق دے دیا ہے۔

دفعہ نمبر 36: خلیفہ کے پاس درجہ ذیل اختیارات ہوتے ہیں:

ا) خلیفہ ہی ان احکامات کی تبنی کرتا ہے جو لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کے لیے ضروری ہیں اور یہ تبنی کتاب وسُنت سے صحیح اجتہاد کے ذریعے مستنبط کردہ احکامات کی ہوتی ہے تاکہ یہ احکامات قوانین بن جائیں پھر ان پر عمل کرنا فرض ہو جاتا ہے اور ان کی مخالفت جائز نہیں۔

ب) خلیفہ ہی ریاست کی داخلی اور خارجی پالیسی کے بارے میں جواب دہ ہے، وہی فوج کا قائد اعلیٰ ہے اور اسی کو اعلانِ جنگ، صلح، جنگ بندی اور دوسرے معاہدے کرنے کا اختیار ہے۔

ج) خلیفہ کو ہی غیر ملکی سفیروں کو قبول کرنے، ان کو مسترد کرنے، مسلمان سفیروں کو تعینات کرنے اور ان کو معزول کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

د) وہی والیوں اور معاونین کو مقرر یا معزول کر سکتا ہے یہ سارے لوگ جس طرح مجلسِ امت کے سامنے جوابدہ ہیں بالکل اسی طرح خلیفہ کے سامنے بھی جوابدہ ہیں۔

ھ) خلیفہ ہی قاضی القضاۃ اور دوسرے قاضیوں کو مقرر اور برطرف کر سکتا ہے اس میں صرف یہ استثناء ہے کہ خلیفہ صرف اس حالت میں قاضی المظالم کو برطرف نہیں کر سکتا جب قاضی المظالم کسی معاملے میں خلیفہ یا اس کے معاونین یا اس کے قاضی القضاہ کے خلاف کسی شکایت کا جائزہ لے رہا ہو۔ خلیفہ ہی تمام ڈائریکٹرز، فوجی کمانڈروں اور جرنلوں کو مقرر یا برطرف کر سکتا ہے اور یہ سارے لوگ صرف خلیفہ کے سامنے جوابدہ ہیں مجلس امت کے سامنے نہیں۔

و) خلیفہ ہی ان احکام شرعیہ کی تبنی کرتا ہے جن کی رو سے ریاست کا بجٹ تیار کیا جاتا ہے وہی بجٹ کے حصوں اور ہر شعبے کے لیے رقم مختص کرتا ہے خواہ اس کا تعلق آمدن سے ہو یا اخراجات سے۔

اس دفعہ میں مذکورہ چھ نکات کے دلائل درجہ ذیل ہیں:

پیراگراف (ا) کی دلیل اجماع صحابہ ہے۔ قانون کا لفظ ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں، وہ حکم جو سلطان (صاحب اختیار) صادر کرتا ہے تاکہ لوگ اس کے مطابق چلیں۔ قانون کی یہ تعریف بھی کی جاتی ہے کہ "ان قواعد کا مجموعہ کہ جن پر حکمران لوگوں کو اپنے باہمی تعلقات میں پیروی کرنے پر مجبور کرتا ہے"۔ یعنی

سلطان نے جب کچھ متعین احکامات دیئے تو یہ احکامات قانون کہلاتے ہیں، جن کی پابندی لوگوں پر لازم ہے۔ اگر سلطان نے ان کا حکم نہیں دیا تو پھر وہ قانون نہیں اس لئے وہ لوگوں پر لازم بھی نہیں۔ مسلمان تو شرعی احکامات کی پیروی کرتے ہیں اللہ کے اوامر ونواہی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں نہ کہ سلطان (صاحب اقتدار) کے اور اوامر ونواہی کے مطابق، اس لئے وہ جس چیز کے پابند ہیں وہ احکام شرعیہ ہیں، سلطان کے اوامر نہیں۔ تاہم ان شرعی احکامات میں صحابہؓ کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ بعض نے شرعی نصوص سے جو کچھ سمجھا دوسروں نے اسی شرعی نص سے کچھ اور سمجھا اور ہر ایک اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق عمل بھی کرتا رہا اور ہر ایک کی سمجھ اور اس کا فہم اس کے لیے اللہ کا حکم تھا۔ لیکن بعض شرعی احکامات ایسے ہیں کہ امت کے معاملات کے دیکھ بھال کے تقاضے کی وجہ سے تمام مسلمانوں کا ان کے متعلق ایک رائے پر متفق ہونا لازمی ہے، ان احکامات میں ہر کوئی اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق نہیں چل سکتا اور عملی طور پر ایسا ہو بھی چکا ہے۔ مالِ غنیمت کے بارے میں ابو بکرؓ کی رائے تھی کہ مسلمانوں کے مابین مساوی طور پر تقسیم کیا جائے کیونکہ حقوق میں تمام مسلمان برابر ہیں۔ جبکہ عمرؓ کی رائے تھی کہ جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کی اور جس نے آپ ﷺ کے ساتھ ہو کر اسلام کے لیے لڑائی کی، دونوں کو کیسے برابر سمجھا جائے، یا فقیر اور مالدار کو کس طرح برابر حصّہ دیا جائے بلکہ اسلام میں سبقت اور فقیری اور مالداری کو مدِ نظر رکھ کر تقسیم کرنا چاہیے۔ لیکن ابو بکرؓ چونکہ خلیفہ تھے انہوں نے اپنی رائے پر عمل کرنے کا حکم دیا یعنی مال کو مساوی بنیادوں پر تقسیم کرنے کی تبنی کی، اس مسئلے میں تمام مسلمانوں نے ان کا اتباع کیا اور قاضیوں اور والیوں نے بھی اسی رائے کے مطابق فیصلے کیے اور عمرؓ نے اس رائے پر سر جھکایا اور ابو بکرؓ کی رائے کو ہی اختیار کیا۔ اور جب عمرؓ خلیفہ بنے تو اپنی رائے کے مطابق مالِ غنیمت کو افضلیت کی بنیاد پر تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے آپؓ کی پیروی کی اور قاضیوں اور والیوں نے بھی آپ کی رائے پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں پر خلیفہ کے تبنی شدہ رائے کی اطاعت واجب ہے خواہ یہ ان کے اجتہاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، ان کو اپنی آراء اور اجتہادات کو ترک کرنا پڑے گا۔ یہ

تبنی کردہ احکامات قوانین ہوں گے۔اس لئے صرف خلیفہ ہی قوانین کا اجراء کر سکتا ہے اس کے علاوہ کسی کو اس کا اختیار نہیں۔

پیراگراف (ب) کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے۔ آپ ﷺ ہی گورنرز اور قاضیوں کو مقرر کرتے تھے، ان کا محاسبہ بھی کرتے، تجارتی امور کی نگرانی بھی خود فرماتے تھے۔خرید وفروخت پر نظر رکھتے تھے۔ ملاوٹ اور دھوکہ دہی سے روکتے تھے، اموال کو لوگوں میں خود تقسیم کرتے تھے، بے روزگار کو خود روزگار مہیا کرتے تھے، ریاست کے تمام داخلی معاملات کی نگرانی کرتے تھے۔ اسی طرح بادشاہوں سے خود مخاطب ہوتے تھے اور خود ان کا استقبال بھی کرتے تھے اور ریاست کے تمام خارجی معاملات کی نگرانی بھی خود کرتے تھے۔ آپ ﷺ خود ہی عملی طور پر فوج کی قیادت کرتے تھے اور جنگی معرکوں میں بھی قیادت خود کرتے تھے جبکہ سرایا میں کسی کو کمانڈر مقرر کر کے روانہ کرتے تھے۔جب آپ ﷺ نے اسامہ بن زیدؓ کو ایک لشکر کا کمانڈر مقرر کر کے شام روانہ فرمایا تو یہ بات صحابہؓ کو پسند نہ آئی کیونکہ اسامہؓ کم عمر تھے لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کو اسامہؓ کی قیادت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہی قریش کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ اسی طرح بنو قریظہ، بنو نصیر، بنو قینُقاع، خیبر اور حتیٰ کہ روم کے خلاف اعلان جنگ بھی خود کیا۔ جب بھی کوئی جنگ ہوئی آپ ﷺ نے خود اعلان کیا۔ یہ اس بات دلیل ہے کہ خلیفہ ہی اعلان جنگ کر سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تمام معاہدات جیسے یہود کے ساتھ معاہدات، بنو مدلج اور بنی ضمرہ میں سے ان کے حلیف قبائل کے ساتھ معاہدے بھی خود کیے۔ ایلہ کے حکمران یوحنہ بن رؤبہ کے ساتھ بھی خود معاہدہ کیا اور معاہدہ حدیبیہ بھی خود کیا حالانکہ مسلمان اس پر رضامند نہیں تھے مگر آپ ﷺ نے ان کی بات نہیں سُنی اور ان کی رائے مسترد کرتے ہوئے معاہدہ کی تکمیل کر دی۔ یہ سب اس بات کے دلائل ہیں کہ کسی بھی قسم کا معاہدہ، خواہ صلح کا ہو یا کوئی اور خلیفہ کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔

رہی بات پیراگرف (ج) کی تو اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود مسیلمہ کذاب کے ایلچیوں سے ملاقات کی، آپ ﷺ ہی نے قریش کے پیغام رساں ابو رافع سے ملاقات کی، آپ ﷺ نے

خود ہرقل، کسریٰ، مقوقس، حیرہ کے بادشاہ حارث غسانی، یمن کے بادشاہ حارث حمیری اور حبشہ کے نجاشی کی طرف سفیروں کو روانہ کیا۔ آپ ﷺ نے ہی حدیبیہ میں عثمان بن عفانؓ کو سفارت کار کے طور پر قریش کے پاس بھیجا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ ہی سفیروں کو قبول اور مسترد کر سکتا ہے، وہی سفیر مقرر کر سکتا ہے۔

جہاں تک پیراگراف (د) کا تعلق ہے تو رسول اللہ ﷺ ہی والیوں کا تقرر کرتے تھے، چنانچہ معاذؓ کو یمن کا والی مقرر کیا۔ آپ ﷺ خود ہی والیوں کو معزول بھی کرتے تھے چنانچہ علاء بن حضرمی جو بحرین کے والی تھے، کو معزول کیا کیونکہ اہلِ بحرین نے ان کی شکایت کی تھی، جو اس بات کی بھی دلیل ہے کہ والیان ولایہ (صوبہ) کے لوگوں کے سامنے بھی جوابدہ ہیں جیسا کہ وہ خلیفہ کے سامنے جوابدہ ہیں۔ وہ مجلسِ امت کے سامنے بھی جوابدہ ہیں کیونکہ یہ تمام ولایات کی نمائندہ ہوتی ہے۔

یہ تو تھا والیوں کے حوالے سے، رہی بات معاونین کی تو رسول اللہ ﷺ کے دو معاون تھے جو ابو بکرؓ اور عمرؓ تھے۔ آپ ﷺ نے ساری زندگی ان کو معزول نہیں کیا، نہ ہی ان کی جگہ کسی کو معاون مقرر کیا۔ آپ ﷺ ہی نے ان کو تعینات کیا تھا لیکن ان کو معزول نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ معاون کے اختیارات خلیفہ والے ہی ہیں۔ معاون خلیفہ کا نائب ہوتا ہے، اس لیے وکیل پر قیاس کرتے ہوئے خلیفہ کو اسے معزول کرنے کا حق تو حاصل ہے، کیونکہ مؤکل اپنے وکیل کو معزول کر سکتا ہے، سوائے مخصوص حالات میں کہ جب ان کو معزول کرنے سے منع کرنے کے بارے میں نص موجود ہو۔

جہاں تک پیراگراف (ھ) کا تعلق ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علیؓ کو یمن کی عدلیہ کا سربراہ بنایا اور استیعاب میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کے ایک علاقے الجند کا قاضی مقرر کیا۔

عمرؓ والیوں اور قاضیوں کا تقرر بھی کرتے تھے اور ان کو معزول بھی کرتے تھے، چنانچہ شریح کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا، ابو موسیٰ کو بصرہ کا قاضی مقرر کیا، شُرَحبیل بن حسنہ کو شام میں ولایت سے معزول کیا اور یزید

بن ابی سفیانؓ اور اس کے بعد معاویہ کو والی مقرر کیا۔ اس پر شُرَحبیل بن حسنہ نے آپؓ سے کہا: "اے امیر المومنین کیا میں نے کمزوری دکھائی یا کوئی خیانت کی، فرمایا نہیں تم نے نہ تو کمزوری دکھائی اور نہ ہی کوئی خیانت کی، انہوں نے کہا کہ پھر مجھے معزول کیوں کیا، فرمایا میں نے اس میں حرج سمجھا کہ تم سے بھی مضبوط آدمی کے ہوتے ہوئے میں تم پر امارت کا بوجھ ڈال دوں"۔ اسی طرح مصنف عبد الرزاق میں ہے کہ "علیؓ نے ابو الاسود کو والی مقرر کیا پھر ان کو معزول کر دیا، تو انہوں نے کہا: آپ نے مجھے کیوں معزول کیا میں نے کوئی خیانت یا جرم کیا ہے؟ علیؓ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ تمہاری گفتگو فریقین کی گفتگو سے اونچی ہوتی ہے"۔ عمرؓ اور علیؓ نے صحابہ کرام کے دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں یہ کیا، لیکن کسی نے دونوں کے اس فعل کی مخالفت نہیں کی۔ یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ کو عمومی طور پر قاضیوں کے تقرر کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح وکالت پر قیاس کرتے ہوئے اس کو قاضیوں کے تقرر کے لیے کسی کو اپنا نائب بنانے کا بھی حق حاصل ہے کیونکہ خلیفہ کو اپنے تمام اختیارات میں اپنا نائب مقرر کرنے کا حق ہے، اسی کو ان تمام تصرفات میں اپنا وکیل مقرر کرنے کا حق ہے جو اس کے لیے جائز ہیں۔

رہی بات اس حالت میں قاضی مظالم کو معزول نہ کرنے کے استثناء کی، جب وہ کسی ایسے مقدمے کو دیکھ رہا ہو جو خلیفہ، اس کے معاونین یا اس کے قاضی القضاء کے خلاف داخل کیا گیا ہو، تو یہ اس قاعدے کی رُو سے ہے کہ "حرام کا وسیلہ بھی حرام ہے"۔ چونکہ اس حال میں اس کو معزول کرنے کا اختیار خلیفہ کو دینا قاضی کے فیصلے پر اثر انداز ہو سکتا ہے، جس کے نتیجے میں حکم شرعی معطل ہو سکتا ہے جو کہ حرام ہے۔ یوں قاضی المظالم کو معزول کرنے کا اختیار خلیفہ کو دینا حرام کا وسیلہ بن سکتا ہے، خاص کر جب اس قاعدے میں قطعیت کی ضرورت نہیں بلکہ غلبۂ ظن کافی ہے۔ جبکہ دوسرے حالات میں حکم اپنے اصل پر ہی رہے گا یعنی تعیناتی اور برطرفی کا حق خلیفہ کو حاصل ہے۔

جہاں تک محکموں کے سربراہوں کا تعلق ہے رسول اللہ ﷺ نے ریاستی ڈھانچے میں ہر ادارے کے لیے سیکرٹیری مقرر کیا، جو محکموں کے ڈائریکٹر کے طور پر تھے۔ چنانچہ معیقیب بن ابی فاطمہؓ الدوسی کو مہر

لگانے کا ذمہ دار مقرر کیا، جیسا کہ ان کو غنائم کا انچارج مقرر کیا تھا۔ حذیفہ بن یمانؓ کو حجاز کے پھلوں کے فصلوں کا حساب کتاب رکھنے کی ذمہ داری دی، زبیر بن عوامؓ کو صدقات کے اموال کا حساب کتاب رکھنے کا عہدہ دیا، مغیرہ بن شعبہؓ کو قرضوں اور معاملات کا حساب کتاب رکھنے کا منصب دیا، وغیرہ۔

رہی بات فوجی کمانڈروں اور بریگیڈیروں کی تو رسول اللہ ﷺ نے حمزہ بن عبد المطلبؓ کو تین افراد کا کمانڈر بنا کر سمندر کے ساحل پر قریش پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ عبیدہ بن حارثؓ کو ساٹھ (60) آدمیوں کے دستے کا کمانڈر بنا کر قریش پر حملہ آور ہونے کے لیے وادی رابغ بھیجا۔ سعد بن ابی وقاصؓ کو بیس (20) افراد کے دستے کا کمانڈر بنا کر مکہ روانہ کیا۔ اسی طرح آپ ﷺ فوجی کمانڈرز مقرر کرتے رہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ ہی کمانڈرز اور بریگیڈیئرز کا تقرر کر سکتا ہے۔

یہ سب صرف رسول اللہ ﷺ کے سامنے جوابدہ تھے کسی اور کے سامنے جوابدہ نہیں تھے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ قاضی، اداروں کے سربراہان، فوجی کمانڈر اور چیف آف اسٹاف، سارے ملازمین خلیفہ کے علاوہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔ یہ مجلس امت کے سامنے بھی جوابدہ نہیں، سوائے معاونین، والیوں اور عُمّال کے کوئی مجلس امت کے سامنے جوابدہ نہیں کیونکہ یہی حکمران ہیں اور ان کے علاوہ کوئی مجلس امت کے سامنے جوابدہ نہیں، بلکہ سب خلیفہ کے سامنے جوابدہ ہیں۔

جہاں تک پیراگراف (و) کا تعلق ہے تو آمدن (محصولات) اور خرچ کے شعبوں کے لحاظ سے ریاستی بجٹ احکام شرعیہ میں محصور ہے۔ کوئی ایک دینار بھی حکمِ شرعی کے خلاف حاصل نہیں کیا جا سکتا، نہ ہی کوئی ایک دینار حکم شرعی کے خلاف خرچ کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اخراجات کی تفصیلات یا جس کو بجٹ سیکشن (ابواب) کہا جاتا ہے یہ خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر منحصر ہے، اسی طرح محصولات کے سیکشن بھی، مثال کے طور پر خلیفہ ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ خراجی زمین کا خراج اتنا ہو گا، لیا جانے والا جزیہ اتنا ہو گا، یہ چیزیں محصولات کے سیکشن کی مثالیں ہیں۔ وہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ سڑکوں کے لیے کتنا خرچ کیا جائے، ہسپتالوں پر کتنا خرچ کیا جائے۔ یہ

اخراجات کے سیکشن کی مثالیں ہیں۔ خلیفہ ہی اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق فیصلہ کرے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ بھی خود عمال سے محصولات وصول کرتے تھے اور ان کو خرچ کرتے تھے، بعض والیوں کو مال وصول کرنے اوران کو خرچ کرنے کی اجازت دیتے تھے جیسا کہ معاذؓ کو یمن کا والی مقرر کر کے انہیں یہ اجازت دی۔اس کے بعد خلفائے راشدینؓ بھی شخصی طور پر خلیفہ ہونے کی وجہ سے مال وصول کرتے تھے اور اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق اس کو خرچ کرتے تھے، کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔خلیفہ کے علاوہ کوئی شخص کوئی ایک دینار بھی نہیں لے سکتا تھا اور نہ ہی اس کو خلیفہ کی اجازت کے بغیر خرچ کر سکتا تھا، جیسا کہ عمرؓ کی جانب سے معاویہ کو والی مقرر کرنے پر ہوا کہ آپؓ نے ان کو والیٔ عام مقرر کیا چنانچہ وہ مال وصول بھی کرتے تھے اور خرچ بھی۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ ریاستی بجٹ کے سیکشن خلیفہ یا اس کے نائب ہی کی جانب سے مقرر کیے جاتے ہیں۔

یہ تھیں خلیفہ کے اختیارات کی تفصیلات کے بارے میں تفصیلی دلائل۔ان سب کو بخاری میں عبد اللہ عمرؓ کی اس روایت میں یکجا کیا گیا ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے **«... الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»** ”اور امام نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا“۔ احمد، بیہقی اور ابو عوانہ کی روایت میں عبد اللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ: ”امام نگہبان ہے اور وہ اپنی رعایا کے بارے میں جوابدہ ہے“۔یعنی رعایا کی دیکھ بھال کے حوالے سے تمام معاملات کی ذمہ داری صرف خلیفہ کی ہے اور وہ جسے چاہے اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے اور جس معاملے میں چاہے اپنا نمائندہ مقرر کر سکتا ہے، اس کو وکالت (وکیل بنانے) پر قیاس کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 37: خلیفہ تبنی میں احکام شرعیہ کا پابند ہے چنانچہ اس کیلئے کسی ایسے حکم کی تبنی حرام ہے جس کا اس نے 'ادِلّہ شریعہ' سے صحیح طریقے سے استنباط نہ کیا ہو۔وہ اپنے تبنی کردہ احکامات اور طریقہ استنباط

کا بھی پابند ہے۔ چنانچہ اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی ایسے حکم کی تبنی کرے جس کے استنباط کا طریقہ اس سے متناقض ہو جسے وہ تبنی کر چکا ہے، اور نہ ہی اس کے لیے جائز ہے کہ وہ کوئی ایسا حکم دے جو اس کے تبنی کردہ احکامات سے متناقض ہو۔

اس دفعہ میں دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ خلیفہ احکامات کی تبنی میں احکامِ شرعیہ کا پابند ہے، یعنی آئین اور قانون بنانے میں وہ اسلامی شریعت کا پاپند ہے اس لیے اس کی کسی قسم کی خلاف ورزی اس کے لیے جائز نہیں کیونکہ اس کے خلاف ورزی کرنے کا مطلب کفر احکامات کی تبنی ہے۔ ایسا کرنے کی صورت میں اس پر اللہ تعالٰی کا یہ ارشاد صادق آئے گا **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ** ''اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں'' (المائدہ:44)۔

اگر اس نے اس تبنی کردہ (غیر اسلامی) حکم پر اعتقاد بھی رکھا تو کفر کیا اور اسلام سے مرتد ہو گیا۔ اگر وہ اس پر اعتقاد نہ رکھے لیکن یہ سمجھ کر اختیار کرے کہ یہ اسلام کے مخالف نہیں جیسا کہ خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور میں بعض خلفاء نے کیا تو یہ حرام ہے لیکن اس سے وہ کافر نہیں ہو گا۔ اگر اس کے پاس شبہہ دلیل ہو جیسا کہ کوئی ایسا حکم اختیار کرے جس میں وہ مصلحت سمجھتا ہے لیکن اس کے پاس کوئی دلیل نہیں بلکہ وہ المصالح المرسلة، یا قاعدة سد الذرائع (ذریعے کو مسدود کرنا) یامآلات الأفعال (کام کے انجام کو مد نظر رکھنا) یا پھر اسی طرح کا کوئی اور فقہی قاعدہ دیکھ کر کوئی حکم اختیار کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ شرعی قواعد ہیں یا شرعی ادلہ ہیں تو یہ اس کے لئے حرام نہیں اور نہ ہی وہ کافر ہو گا، البتہ وہ غلطی پر ہے لیکن جو استنباط اس نے کیا ہے بہر حال وہ تمام مسلمانوں کی نظر میں حکم شرعی ہی ہیں، اس لئے اس کی اطاعت بدستور فرض ہے۔ کیونکہ اس نے اس کو حکم شرعی سمجھ کر تبنی کیا ہے اور اس کے پاس شبہہ دلیل بھی ہے اگرچہ وہ غلط ہے لیکن وہ اس شخص کی مانند ہے جو دلیل سے استنباط میں غلطی کرے۔ بہر حال خلیفہ کی اپنی تبنی میں احکامِ شرعیہ

کی پابندی لازمی ہے اور تبنی کے لیے بھی ان احکامِ شرعیہ کی پابندی لازم ہے جو ادلہ شرعیہ سے صحیح استنباط کے ذریعے مستنبط کئے گئے ہوں۔ اس کی دلیل یہ ہے:

اول: اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر خواہ خلیفہ ہو یا کوئی اور فرض کر دیا ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال کو احکامِ شرعیہ کے مطابق سر انجام دے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: **فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ** "آپ کے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ آپ ﷺ کو اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں" (النساء:65)۔

جہاں احکامِ شرعیہ کے کئی ایک مفہوم نکلتے ہوں یعنی کئی ایک احکام شرعی نکلتے ہوں وہاں خلیفہ ایک متعین حکم کی تبنی کرے گا۔ احکام کے متعدد ہونے کی صورت میں ایک متعین حکم کی تبنی کرنا عمل کے انجام دہی کے واسطے مسلمان پر فرض ہے اور خلیفہ جس وقت کسی حکم کی تطبیق (تنفیذ) کا ارادہ کرے تو اس پر فرض ہے کہ وہ متعین حکم کی تبنی کر کے اس کو نافذ کرے۔

دوم: بیعت کے اندر موجود کتاب و سنت پر عمل کرنے کی شرط ہی خلیفہ کو احکامِ شرعیہ کی پابندی پر مجبور کرتی ہے۔ چونکہ یہ بیعت کتاب سنت پر عمل کرنے کی شرط پر ہوتی ہے اس لیے وہ اس سے باہر نہیں نکل سکتا یہ اس لیے حرام ہے بلکہ اگر وہ اعتقاداً اس سے باہر نکلے تو کافر ہو جائے گا جبکہ بغیر اعتقاد کے اس سے باہر نکلے تو سرکش اور مجرم بن جائے گا۔

سوم: خلیفہ کا تقرر ہی شریعت کو نافذ کرنے کیلئے ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں پر نافذ کرنے کے لئے شریعت سے باہر کسی چیز کو اختیار کرنا اس کیلئے جائز نہیں کیونکہ شرع نے اس کو قطعی شکل میں حرام قرار دیا ہے بلکہ اسلام کے علاوہ کچھ نافذ کرنے کی صورت میں ایمان سے ہاتھ دھونے کی وعید سنائی ہے جو کہ اس کے قطعی حرام ہونے کی دلیل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ احکامات کی تبنی یعنی قانون کو طے کرنے میں صرف اور

صرف احکام شرعیہ کا پابند ہے۔ جوں ہی اس نے اسلام کے علاوہ کوئی قانون بنایا تو اعتقاد کی صورت میں تو کافر ہو گیا، ورنہ گناہگار بن گیا۔

یہ تھیں اس دفعہ میں موجود پہلے امر کی تین دلائل۔ اب آتے ہیں دوسرے امر کی طرف اور وہ یہ ہے کہ خلیفہ اپنے تبنی کردہ احکامات کا پابند ہے اور وہ اس طریقے کا بھی پابند ہے جو اس نے استنباط کے لئے اختیار کیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خلیفہ جو حکمِ شرعی نافذ کرتا ہے وہ اس کے حق میں حکم شرعی ہے اس کے علاوہ کسی کے حق میں نہیں، یعنی وہ حکمِ شرعی جس کو خلیفہ نے اپنے اعمال کی انجام دہی کیلئے تبنی کیا ہے۔ چنانچہ خلیفہ نے جس وقت کسی حکم کا استنباط کیا یا کسی حکم میں تقلید کرلی تو یہ حکم شرعی اس کے حق میں اللہ کا حکم ہے۔ اب وہ اس بات کا پابند ہے کہ مسلمانوں کیلئے اپنی تبنی میں اس حکم شرعی کی پابندی کرے وہ اس کے برخلاف کسی دوسرے حکم کی تبنی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ حکم اس کے حق میں اللہ کا حکم نہیں اس لئے وہ مسلمانوں کیلئے بھی ایسا حکمِ شرعی نہیں کہ جس پر عمل کرنا لازم ہے۔ لہٰذا وہ رعایا کیلئے جن اوامر (قوانین) کا اجراء کرتا ہے ان میں اس حکم شرعی کا پابند ہے جو اس نے تبنی کر رکھا ہے۔ اپنی اس تبنی کے خلاف احکامات صادر کرنا اس کے لیے جائز نہیں کیونکہ اس کے خلاف حکم خود اس کے حق میں اللہ کا حکم نہیں تو مسلمانوں کے حق میں کیونکر حکم شرعی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا کیا تو گویا اس نے غیر شرعی حکم صادر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تبنی کردہ احکامات کے خلاف حکم صادر نہیں کر سکتا۔

یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ طریقہ استنباط کی تبدیلی سے حکم شرعی کی فہم میں بھی تبدیل واقع ہو جاتی ہے۔ خلیفہ اگر یہ سمجھتا ہو کہ حکم کی علت اس وقت شرعی علت ہے جب وہ شرعی نص سے ماخوذ ہو اور مصلحت کوئی شرعی علت نہیں یا مصالحہ مرسلہ شرعی دلیل ہی نہیں تب اس نے اپنے لیے استنباط کا ایک طریقہ مختص کر دیا۔ اب وہ کسی دوسرے طریقے کو اختیار نہیں کر سکتا یا ایسی علت پر قیاس نہیں کر سکتا جو شرعی نص سے ماخوذ نہ ہو کیونکہ اب یہ حکم اگر اس کے حق میں حکم شرعی نہیں ہو سکتا تو وہ اس کو کس طرح حکم شرعی قرار دے سکتا ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو گویا اس نے غیر اسلامی حکم کی تبنی کرلی جو کہ حرام ہے۔ اگر خلیفہ مقلد ہے

یا ایک مسئلے کا مجتہد ہے، مجتہد مطلق نہیں، یا مجتہد فی المذھب بھی نہیں اور اس کا اپنا کوئی مخصوص طریقہ استنباط بھی نہیں تو وہ اپنی تبنی میں اس مجتہد کی پیروی کرے گا جس کا وہ مقلد ہے یا اس ایک مسئلے میں اپنے اجتہاد کے مطابق تبنی کرے گا، بشرطیکہ اس کیلئے دلیل یا شبہ دلیل موجود ہو۔ اس حالت میں وہ اپنے جاری کردہ اوامر کا پابند ہو گا اور اپنے تبنی کردہ احکامات کے موافق ہی احکامات جاری کرے گا۔

دفعہ نمبر 38: خلیفہ کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کا پورا حق حاصل ہے۔ اس کو ان مباحات میں بھی تبنی کا حق حاصل ہے جو ریاستی امور کو چلانے اور لوگوں کی دیکھ بھال کیلئے ضروری ہیں۔ تاہم مصلحت کو دلیل بنا کر کسی حکم شرعی کی خلاف ورزی اس کے لیے بالکل جائز نہیں مثال کے طور پر غذائی قلت کو دلیل بنا کر وہ کسی ایک خاندان کو بھی کثرت اولاد سے منع نہیں کر سکتا، اسی طرح مصلحت یا لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کو بہانہ بنا کر کسی کافر یا عورت کو والی مقرر نہیں کر سکتا یا اس کے علاوہ بھی کوئی بھی خلاف شرع کام نہیں کر سکتا اور اس کیلئے کسی حال میں حرام کو حلال کرنا یا حلال کو حرام کرنا جائز نہیں۔

خلفیہ کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق معاملات کی دیکھ بھال کا مکمل حق حاصل ہے تاہم وہ مصلحت کو جواز بنا کر کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا مثال کے طور پر ملکی صنعت کو تحفظ دینے کو جواز بنا کر رعایا کو سامان درآمد (امپورٹ) کرنے سے نہیں روک سکتا سوائے اس صورت کہ اس کی وجہ سے ملکی معیشت پر کاری ضرب لگ رہی ہو۔ اسی طرح استحصال اور غلط فائدہ اٹھانے کو بہانہ بنا کر لوگوں کیلئے اشیاء کی قیمتیں متعین نہیں کر سکتا اور نہ ہی لوگوں کے لیے رہائش کو آسان بنانے کے لیے گھر کے مالک کو اپنا گھر کرائے پر دینے پر مجبور کر سکتا ہے سوائے یہ کہ اس کی اشد ضرورت ہو۔ اس قسم کا کوئی بھی کام جو احکام شرعیہ کے خلاف ہو اس کے لئے کسی مباح کو حرام قرار دینا یا حرام کو مباح قرار دینا ہے اور یہ بالکل جائز نہیں۔ اس کی دلیل رسول اللہ

ﷺ کا فرمان ہے کہ «الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ» "امام نگہبان ہے اور اپنی رعایا کے بارے میں جوابدہ ہے" ،اس کو بخاری نے عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ اس کی دلیل وہ احکام بھی ہیں جو شرع نے خلیفہ کو دیئے ہیں جیسا کہ بیت المال کے اموال میں اپنی رائے اوراجتہاد کے مطابق تصرف کرنا یا کسی ایک مسئلے میں لوگوں کو ایک خاص رائے پر عمل پیرا ہونے کا پابند بنانے کا اختیار وغیرہ۔ اس حدیث کی رُو سے خلیفہ کو اپنی رعایا کی دیکھ بھال کا مکمل اور مطلق اختیار ہے اس میں کوئی قید یا شرط نہیں،وہ بیت المال کے حوالے سے بھی اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق لوگوں پر مال خرچ کر سکتا ہے، اپنی مرضی سے فوج تیار کر سکتا ہے اور گورنر مقرر کر سکتا ہے اس قسم کے کاموں میں اس کے لیے کوئی قید یا پابندی نہیں بلکہ وہ مکمل آزادی سے کام کر سکتا ہے۔ ان معاملات میں اس کی اطاعت فرض اور نافرمانی حرام ہے۔ تاہم ان تمام معاملات کو وہ احکامِ شرعیہ یعنی نصوص شرعیہ کے مطابق انجام دینے کا پابند ہے۔ اگرچہ اس کے اختیار مکمل ہیں لیکن یہ اختیارات احکامِ شرعیہ کے مطابق ہیں،مثال کے طور پر اس کو گورنر مقرر کرنے کا مکمل اختیار ہے لیکن وہ کافر، بچے یا عورت کو گورنر مقرر نہیں کر سکتا کیونکہ یہ شرع میں ممنوع ہے اور دوسری مثال یہ ہے کہ اس کے پاس کافر ملکوں کو سفارت خانے کھولنے کی اجازت دینے کا اختیار ہے لیکن وہ اس کافر ریاست کو اسلامی ریاست میں سفارتخانہ کھولنے کی اجازت نہیں دے سکتا جو سفارتخانے کو اسلامی ریاست پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ذریعے کے طور پر استعمال کرتی ہے کیونکہ یہ شرعاً حرام ہے۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ بجٹ کے شعبے مقرر کرے اور ہر شعبے کے لیے ایک معقول مقدار میں رقم مختص کرے لیکن اس کو یہ اجازت نہیں کہ بجٹ میں پانی کو ذخیرہ کرنے کے لیے ڈیم بنانے کے ایک خاص شعبہ مقرر کرے اوراس ڈیم کی ضرورت بھی نہ ہو اور بیت المال کی آمدن اس کے لیے کافی بھی نہ کیونکہ اس قسم کے کاموں کے لیے اگر بیت المال میں رقم نہ ہو تو ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ یہ انتہائی ضرورت کے کاموں میں سے نہیں یعنی اس کے بغیر بھی کام چل رہا ہے۔ لہٰذا خلیفہ کو رعایا کی دیکھ بھال کا مکمل حق اوراختیار حاصل ہے لیکن شرعی احکامات کے مطابق اس کے پاس مکمل اختیارات ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ لوگوں کی دیکھ بھال کے لیے جیسے چاہے

قانون کا اجراء کرے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ شریعت نے جس چیز کو اس کے لیے مباح قرار دیا ہے اس میں وہ اپنی رائے اور صوابدید کے مطابق طرز عمل اختیار کر سکتا ہے اور جس وقت کسی مباح امر کے بارے میں وہ قانون سازی کرتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تب اس معاملے میں اس کی اطاعت بھی واجب ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر شرع نے اس کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق بیت المال کے امور کی تدبیر کرنے کا اختیار دیا ہے اور اس معاملے میں لوگوں کو اس کی اطاعت کا حکم دیا ہے اس لئے وہ بیت المال کے حوالے سے قانون سازی کر سکتا ہے اور لوگوں پر ان قوانین کی پاسداری لازم ہے۔ ایک اور مثال یہ ہے کہ شرع اس کو فوج کی قیادت کرنے اور اس کے ادارتی امور کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق چلانے کا حکم دیا ہے اور لوگوں کو اس سے متعلقہ امور میں اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ فوجی قیادت اور فوج کے ادارے کے لیے قوانین کا اجراء کر سکتا ہے اور ان قوانین پر عمل سب پر واجب ہو گا۔ اسی طرح اس کو لوگوں کے مفادات کی نگرانی کے لیے اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت ہے اس کو اختیار ہے کہ وہ اداروں کے لیے ڈائریکٹرز متعین کرے، مفاد عامہ کے اداروں کے لیے اور ان میں کام کرنے والے ملازمین کے لیے قوانین مرتب کر سکتا ہے اور ان قوانین پر عمل کرنا ہر ایک پر لازم ہے۔ یوں ہر اس معاملے میں جس کو شرع نے اس کی رائے اور اجتہاد پر چھوڑا ہے، اس میں قانون جاری کرنے کا اختیار اس کو حاصل ہے، پھر شرع نے ان قوانین پر عمل کرنا لوگوں پر واجب قرار دیا ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ قوانین تو اسالیب ہیں اور اسلوب مباح ہوتا ہے اور یہ تمام مسلمانوں کے لیے مباح ہے پھر خلیفہ کے لیے کس طرح جائز ہے کہ وہ ایک اسلوب کو متعین کرے اور اس کو واجب قرار دے، یہ تو مباح عمل کو واجب کرنا ہے اور دوسرے مباح اسالیب کو ممنوع قرار دینا ہے یعنی مباح چیز کو حرام کرنا ہے جو کہ جائز نہیں۔ جی ہاں! یہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ مباح تو اسالیب بحیثیت اسالیب تھے اب یہ اسالیب چونکہ بیت المال کے انتظامی اسالیب بن گئے یہ خلیفہ کے لیے تو مباح ہیں لیکن لوگوں کے لیے مباح نہیں اور مفاد عامہ کے اسالیب بھی خلیفہ کے لیے مباح ہیں لیکن تمام لوگوں کے لیے مباح نہیں کیونکہ خلیفہ نے ان مباح اسالیب کو اختیار کر لیا اب اس پر عمل واجب ہے۔ خلیفہ کے حکم پر عمل

فرض ہے کیونکہ خلیفہ کے پاس اپنی رائے اور اجتہاد سے کوئی خاص طرزِ عمل اختیار کرنے کا حق ہے۔ یہ کام اصل میں اگرچہ مباح تھا لیکن خلیفہ نے اس کی خلاف ورزی کرنے سے منع کر دیا اس لئے خلیفہ کے لیے تو یہ کام مباح ہے لیکن رعایا کے لیے اس پر عمل خلیفہ کی اطاعت کی وجہ سے واجب ہے۔ اس بنا پر خلیفہ کی جانب سے کسی مباح چیز کو اختیار کرنا مباح کو فرض بنانا نہیں نہ ہی کسی مباح چیز کو حرام کرنا ہے بلکہ اس کو ایک خاص اسلوب اختیار کرنے کی شرع نے اجازت دی ہے کہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد سے ایسا کر سکتا ہے اور اس کی اطاعت واجب ہے۔ خلیفہ کوئی بھی مباح کام کی پابندی کا حکم دے تو رعایا پر اس کی پابندی لازم ہے۔ اسی اختیار کی بنیاد پر عمر بن خطابؓ نے محکمے بنائے اور خلفاء نے اپنے عمال (افسران) اور رعایات کے لیے کچھ خاص قوانین لاگو کر دیئے اور سب پر اس کی پابندی کو لازمی قرار دیا۔ اس بنیاد پر انتظامی قوانین کا اجراء جائز ہے اور ان تمام قوانین میں خلیفہ کی اطاعت واجب ہے کیونکہ شرع نے اس کو یہ حق دیا ہے۔

خلیفہ کو اپنی رائے اور اجتہاد سے امور کی دیکھ بھال میں مباحات کا جو حق دیا گیا ہے، یہ اداروں کی تنظیم اور فوجی کی تربیت وغیرہ تک محدود ہے۔ سارے مباحات کا یہ حکم نہیں کیونکہ یہ خلیفہ کے لیے بحیثیت خلیفہ ہونے کے مباح ہیں۔ باقی جتنے احکام ہیں جیسے فرض، مندوب، مکرہ، حرام اور مباح ان میں خلیفہ بھی تمام لوگوں کی طرح احکام شرعیہ کا پابند ہے، اس کو کسی بھی حال میں کسی حکم کی خلاف ورزی کا اختیار نہیں۔ بخاری اور مسلم میں عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»** ''جو شخص ہمارے اس دین کے معاملے میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کرے جو اس میں سے نہیں تو وہ کام مردود ہے''۔ یہ ایک عام حکم ہے جو کہ خلیفہ کے لیے بھی ہے۔ اس وجہ سے جس چیز میں خلیفہ کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت نہیں بلکہ وہ عمل تمام لوگوں کے لیے مباح ہے اس کے بارے میں قانون سازی کر کے لوگوں کو اس پر عمل کرنے پر مجبور کرنا خلیفہ کے لیے جائز نہیں۔ مثال کے طور پر فوج کی قیادت کے اسالیب کے حوالے سے خلیفہ کو اختیار ہے کہ اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق قانون سازی کرے لیکن اس کے پاس یہ اختیار نہیں کہ وہ مباح لباس میں سے کسی خاص قسم کا لباس

پہننے پر لوگوں کو مجبور کرے اور اس خاص لباس کے علاوہ دوسرے لباس کو حرام قرار دے یا لوگوں کو ایک خاص قسم کے مکانات بنانے پر مجبور کرے اور اس کی علاوہ مکانات بنانے کی اجازت نہ دے۔ ان سارے مباح امور میں لوگوں کو مجبور کرنا خلیفہ کے لیے جائز نہیں اگر وہ ایسا کرتا ہے تب ان کاموں میں اس کی اطاعت واجب نہیں بلکہ اس کے خلاف محکمۃ المظالم میں شکایت درج کی جائے گی۔ خلیفہ کے لیے صرف ان امور میں اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق مخصوص طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت اور صلاحیت ہے جن کو شرع اس کے لیے مباح اور لوگوں کے لیے اس کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے جیسے فوجی قیادت وغیرہ، ان امور میں لوگوں کو اپنی رائے اور اجتہاد سے اختیار کئے ہوئے طرز عمل پر مجبور کر سکتا ہے اور لوگوں پر بھی اس کی اطاعت واجب ہے اور وہ اس حوالے سے قوانین وغیرہ بھی بنا سکتا ہے، ان کے علاوہ دوسرے امور میں اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں۔ اس لیے خلیفہ لوگوں کی دیکھ بھال کو جواز بنا کر حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہیں کر سکتا، مثلاً وہ یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں نے ملکی مفاد کو مد نظر رکھ کر کپاس کی بر آمد کو حرام کر دیا کیونکہ خرید و فروخت تمام لوگوں کے لیے مباح ہے اس لیے اس کو حرام کہنا یا منع کرنا جائز نہیں تاہم کپاس کی بر آمد یا اسلحہ بر آمد کرنا یعنی کوئی مباح کام ایسا ہو کہ جس سے بڑے ضرر (نقصان) کا خطرہ ہو تب ایسا کوئی مباح کام حرام ہو گا کیونکہ یہ ضرر کا سبب بن رہا ہے لیکن باقی چیز اس قاعدے پر عمل کرتے ہوئے مباح ہی رہے گی کہ مباح کا کوئی عمل ضرر کا سبب بنتا ہو تو وہ حرام ہے باقی چیز مباح ہی ہے۔ یہ قاعدہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے فوج کو قوم ثمود کے کنویں سے پانی پینے سے منع کرنے سے اخذ کیا گیا ہے۔

دفعہ نمبر 39: خلیفہ کے لیے کوئی محدود مدت نہیں، جب تک خلیفہ شریعت کی حفاظت اور اس کے احکامات کو نافذ کرتا ہے، ریاستی امور کی انجام دہی پر قادر ہے تب تک خلیفہ ہے اور اس وقت تک خلیفہ

رہے گا جب تک اس کی حالت میں ایسی کوئی تبدیلی رونما ہو جائے جو اس کو خلافت کے منصب سے خارج کر دے۔ جیسے ہی اس کی حالت بدل گئی تو فوراً اس کو برطرف کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ احادیث میں موجود بیعت کی نص مطلق ہے اور اس میں کسی معینہ مدت کی قید نہیں ہے۔ خلفائے راشدینؓ کی بھی مطلق بیعت کی گئی تھی جو احادیث میں مذکور ہے اور اس بیعت کی مدت غیر محدود تھی۔ ان میں سے ہر ایک بیعت کے بعد خلافت کے منصب پر فائز ہوئے اور تاحیات خلیفہ رہے۔ یوں یہ اجماع صحابہؓ ہے کہ خلیفہ کے لیے کوئی خاص محدود مدت نہیں بلکہ یہ مطلق ہے۔ جیسے ہی بیعت ہو جائے ایک شخص خلیفہ بنے گا اور یہ موت تک خلیفہ رہے گا ماسوائے کہ ایسی کوئی ایمرجنسی یا ہنگامی حالت بن جائے جس سے وہ معزول ہو جائے یا اس کو فوراً برطرف کرنا واجب ہو جائے۔ تاہم یہ بھی خلافت کی مدت کی دلیل نہیں بلکہ اس کی شرائط میں نقص کا پیدا ہونا ہے کیونکہ شرعی نص سے ثابت بیعت کا صیغہ اور اجماع صحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدت غیر محدود اور غیر معینہ ہے۔ تاہم یہ اس لحاظ سے محدود اور متعین ہے کہ خلیفہ اس وقت بنے گا جب اس کو بیعت دی جائے اور اس وقت تک رہے گا جب تک وہ کتاب و سُنت پر عمل کرے اور ان کے احکامات کو نافذ کرے۔ اگر وہ شرع کی حفاظت نہیں کرتا یا اس کو نافذ نہیں کرتا تب گویا وہ کفر بواح (کھلم کھلا کفر) کا ارتکاب کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے خلاف لڑنا واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ احادیث میں ہے کہ «**إِلاَّ أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا**» "مگر جس وقت تم کھلم کھلا کفر دیکھو" (متفق علیہ)۔ یہ حدیث عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے۔

دفعہ نمبر 40: وہ امور جن سے خلیفہ کی حالت بدل جاتی ہے اور وہ خلیفہ کے منصب سے خارج ہو جاتا ہے وہ تین ہیں۔

ا) انعقاد خلافت کی شرائط میں سے کسی شرط میں خلل (نقص) آجائے، جیسا کہ وہ مرتد ہو جائے، کھلم کھلا فسق پر اتر آئے، پاگل ہو جائے یا اسی قسم کی کوئی دوسری صورت پیش آئے۔ کیونکہ یہ شرائط انعقاد کی شرائط بھی ہیں اور شرائطِ دوام (تسلسل کی شرائط) بھی ہیں۔

ب) کسی بھی سبب سے وہ خلافت کی ذمہ داری سے عاجز ہو جائے۔

ج) وہ اس قدر مغلوب ہو جائے یا دباؤ میں آجائے کہ اپنی رائے سے شریعت کے موافق مسلمانوں کے مفادات کے لیے اقدامات نہ کر سکے، چنانچہ جب کوئی اس پر اس حد تک غالب آجائے کہ وہ احکام شرعیہ کے مطابق رعایا کے مفادات کی نگرانی بذاتِ خود اپنے اختیار و ارادے اور اپنی رائے کے مطابق کرنے سے عاجز ہو جائے تو اسے حکماً فرائض خلافت کی ادائیگی سے عاجز سمجھا جائے گا۔ ایسی صورت میں وہ اس منصب کا اہل نہیں رہے گا۔ یہ دو صورتوں میں ممکن ہے:

پہلی حالت: اس کے حاشیہ برداروں میں سے کوئی فرد یا افراد اس پر اس طرح مسلط ہو جائیں کہ اس پر اپنی رائے ٹھونس دیں اور وہ امور کی انجام دہی میں ان کے سامنے مجبور ہو جائے۔ اگر ان کے تسلط سے چھٹکارا اس کے لئے ممکن ہو تو اس کو تنبیہ کی جائے گی اور ایک معینہ مدت تک اس کو مہلت دی جائے گی پھر بھی اگر وہ ان کے غلبہ سے باہر نہیں نکلتا تو اس کو برطرف کیا جائے گا۔ اگر چھٹکارے کی کوئی امید نہ ہو تو فوراً اس کو برطرف کر دیا جائے گا۔

دوسری حالت: وہ کسی ایسے زبردست دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے۔ یہ گرفتاری بالفعل ہو یا وہ دشمن خلیفہ پر تسلط حاصل کرلے۔ اس حال میں بھی دیکھا جائے گا کہ اگر اسے چھٹکارا پانے کی امید ہو تو اس

وقت تک اس کو مہلت دی جائے گی ورنہ اسے معزول کر دیا جائے گا۔ اور اگر شروع ہی سے امید نہ ہو تو اسی وقت اس کو برطرف کر دیا جائے گا۔

اس کی دلیل وہ نصوص ہیں جو خلیفہ کی شرائط کے بارے میں ہیں کیونکہ یہ نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ شرائط صرف خلافت کا منصب سنبھالنے کی شرائط نہیں بلکہ اس منصب کے دوام اور بقاء کی بھی شرائط ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ «لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً» ''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جو عورت کو اپنا حکمران بنالیں''، اس کو بخاری نے ابی بکرۃ کے حوالے سے نقل کیا ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح اگر حکمران کسی بھی سبب سے عورت بن جائے تو اس کی شرط ختم ہو گئی اور اس کو اس منصب سے ہٹانا فرض ہو گیا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ''اے ایمان والوں اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولی الامر (شرعی حکمران) کی''(النساء:59)۔ اس میں '' مِنْكُمْ ''یعنی ''تم میں سے'' کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ اولی الامر کی اطاعت اسلام کے ساتھ مشروط ہے اور وہ اس وقت تک حکمران رہ سکتا ہے جب تک یہ شرط موجود ہے جوں ہی قرآن میں بیان کی گئی یہ شرط مفقود ہو جائے یعنی وہ مسلمان نہ رہے بلکہ کافر ہو جائے تو وہ اس منصب سے برطرف ہو گیا۔ تمام شروط کی صورتِ حال یہ ہے کہ ان کے حوالے سے وارد ہونے والی نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شروط صرف انعقاد کے لئے نہیں بلکہ یہ دوام اور تسلسل کے لئے بھی ہیں اگر انعقاد کے وقت شرط پائی جاتی تھی تو خلافت کا انعقاد ہو جائے گا بعد میں شرط مفقود ہو گئی تو یہ منصب بھی ختم ہو جائے گا یعنی انعقاد خلافت کی یہ شرائط بقائے خلافت کے لئے بھی شرائط ہیں اگر یہ شرائط باقی نہ رہیں تو خلافت باقی نہیں رہے گی۔ یہ اس پیرگراف (ا) کی دلائل ہیں۔

پیراگراف (ب) اس کی دلیل یہ ہے کہ خلافت کا عقد خلافت کی ذمہ داری کی انجام دہی کے لئے تھا اور جس وقت خلیفہ اس کام کی انجام دہی سے عاجز آ گیا جس کے لئے عقد (معاہدہ) کیا گیا تھا تو اس کو معزول کرنا

واجب ہے کیونکہ اب وہ ایسا ہے جیسا کہ اس کے ساتھ عقد ہوا ہی نہیں تھا۔ اس کے عاجز آنے سے مسلمانوں کے دین کے امور اور ان کے مفادات کو نقصان پہنچے گا اور یہ ایک منکر ہے جس کو ختم کرنا واجب ہے اور یہ منکر اس کو برطرف کر کے ہی ختم کیا جا سکتا ہے، اور اس کی جگہ دوسرا خلیفہ مقرر کیا جائے گا تاکہ وہ مسلمانوں کے معاملات کی دیکھ بھال کرے، یعنی اس حال میں اس کو برطرف کرنا واجب ہے۔ تاہم یہ جاننا چاہیے کہ آیا وہ خاص سبب اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں رکاوٹ بن تو نہیں رہا۔ اگر وہ سبب اس کی ذمہ داریوں میں رکاوٹ نہیں بن رہا تو اس کو برطرف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ (عضو) ضائع ہو جائے تو اس کو برطرف کرنا واجب ہے یا وہ کسی خاص قسم کے مرض میں مبتلا ہو جائے تو اس کو معزول کرنا لازمی ہو جائے گا، اس کے بارے میں کوئی نص موجود نہیں۔ حکم شرعی صرف یہ ہے کہ وہ کسی بھی وجہ سے اپنے فرائض کی انجام دہی سے عاجز آجائے یعنی وہ کام نہ کر سکے جس کے لیے اس منصب پر بٹھایا گیا تو اس کو برطرف کرنا فرض ہے پھر یہ حکم صرف خلیفہ کے لیے نہیں بلکہ یہ عام حکم ہے۔ اگر ملازم یا کسی ادارے کا سربراہ وغیرہ اپنی ذمہ داری کی انجام دہی سے عاجز آجائے تو اس کو برطرف کیا جائے گا۔

پیراگراف:(ج) کی دلیل بھی وہی ہے جو پیراگراف (ب) کی ہے خلیفہ کو جس کام کے لیے اس منصب پر فائز کیا گیا ہے اس سے عاجز آنے کی دو صورتیں ہیں:

حقیقتاً عاجز ہو جانا یا حکماً عاجز ہو جانا۔ حقیقی عاجزی جسمانی لحاظ سے بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی وہ جسمانی طور پر اس کام کو کرنے سے عاجز آجائے اس کا ذکر پیراگراف (ب) میں تھا حکماً عاجزی یہ ہے کہ وہ جسمانی لحاظ سے تو کام کرنے پر قادر ہو لیکن عملی اقدامات کرنے سے عاجز ہو اس لئے اس کا حکم بھی عاجز کا ہے کیونکہ وہ براہ راست وہ عملی اقدامات نہیں کر سکتا ہے جس کے لیے اس کو اس منصب پر فائز کیا گیا ہے اس لیے وہ ایسا ہے جیسا کہ اس منصب کا اہل ہی نہیں اور اس کو برطرف کرنا واجب ہے۔ اس کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں پہلی حالت رکاوٹ عارضی کی ہے جبکہ دوسری حالت مغلوبیت کی یعنی پہلی حالت ایک رکاوٹ کی وجہ سے ہے جیسے کہ اس کے حاشیہ برداروں میں سے کوئی اس پر مسلط ہو جائے اور امور کو نافذ کرنے سے منع کرے اور خود براہِ راست

منصب خلافت کو استعمال کرے اس انداز سے کہ گویا خلیفہ کے ہاتھ باندھے ہوئے ہیں اور وہ اپنے قول و عمل میں آزاد نہیں رہا۔ چونکہ خلافت کا عقد اس شخص کے ساتھ تھا اس کو چاہیے تھا کہ وہ خود براہِ راست اپنی ذمہ داری انجام دے، چنانچہ اس رکاوٹ یا حاشیہ برداروں کے اس تسلط سے وہ اپنے فرائض کی براہ راست ادائیگی پر قادر نہیں رہا جس کے لیے اس کو اس منصب پر بیٹھایا گیا تھا اس لیے اس کو برطرف کرنا واجب ہو گیا۔ تاہم یہ دیکھا جائے گا کہ کیا اس رکاوٹ کو ختم کر کے اس تسلط سے نکالنا اس کے لئے ممکن ہے اگر ایسا ہے تو اس کو ایک معینہ مدت تک مہلت دی جائے گی ورنہ اس کو فوراً برطرف کر دیا جائے گا۔

مغلوبیت کی دوسری حالت یہ ہے کہ خلیفہ کسی زبردست شخص کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے اور اس سے جان چھڑانے پر قادر نہ ہو اس لیے وہ اس عقد (معاہدے) کو جاری رکھنے کا اہل نہیں رہا جو اس کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ دشمن خواہ کفار ہوں یا باغی اس حال میں تمام امت پر اس کو چھڑانا اور آزاد کرنا واجب ہے خواہ فدیہ دے کر ہو یا قتال (لڑائی) کے ذریعے ہو۔ اگر اس کی آزادی کی امید ختم ہو گئی اور وہ کفار کے قید میں تھا تو اس کو فوراً معزول کیا جائے گا۔ اور اگر وہ باغیوں کے قبضے میں تھا تو دیکھا جائے گا کہ اگر ان کا امام ہے اور اس سے امید ختم ہو گئی کہ وہ خلیفہ کو رہا کرے تو اس کو برطرف کیا جائے گا، اور اگر باغیوں کا کوئی امام نہیں تو خلیفہ کو ایک مدت تک مہلت دی جائے گی، اگر اس کی آزادی ممکن نہ ہو سکی تو اس کو معزول کر دیا جائے گا۔

یہ ان تینوں نکات کی دلائل ہیں اور یہی خلافت کی شرائط کے دلائل ہیں کہ جس کام کے لیے خلیفہ کا تقرر کیا گیا ہے اس کام پر قادر ہونا بھی شرط ہے اور جس کام کے لئے اس کا تقرر ہوا ہے اس کام کو انجام دینے سے عاجز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر یہ شرف نہیں پایا جاتا۔ تاہم اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ بعض شرائط کا فقدان جیسے مرتد ہونا، مکمل پاگل ہو جانا یا جسمانی طور پر کفار کے ہاتھوں گرفتار ہو جانا اور اس سے نکلنے کی کوئی امید بھی نہ ہو تو ان تین حالتوں میں خلیفہ فوراً معزول تصور ہو گا، اگرچہ اس کو برطرف کرنے کا کوئی حکم صادر نہیں کیا گیا ہو۔ ان حالتوں میں اس کی اطاعت واجب نہیں اور نہ ہی اس کے اوامر نافذ ہوں گے بلکہ اس

کے ساتھ کیا گیا خلافت کا عقد ہی فسخ ہو گیا۔ جہاں تک اس کی صفت عدل کا مجروح ہونا ہے جیسے کہ کھلم کھلا فسق و فجور کا ارتکاب کرنا، اسی طرح اگر خلیفہ مونث بن جائے یا ہیجڑا بن جائے گا یا اسکو وقتی پاگل پن کے دورے آئیں یا وہ حقیقی طور پر خلافت کے فرائض کی انجام دہی سے عاجز ہو جائے یا اس کے حاشیہ برداروں میں کچھ افراد یا ایک فرد اس پر مسلط ہو جائے اور امور کی تنفیذ کے حوالے سے اس پر اپنی رائے ٹھونس دے یا وہ جسمانی طور پر ایسا گرفتار ہو جائے کہ اس کی آزادی کی امید ہو یا وہ کافروں کے اثر ورسوخ کے اندر آجائے اور کفار اس پر اثر انداز ہو کر اپنے اشاروں پر چلائیں تو ان سات حالتوں میں اس کو برطرف کرنا واجب ہے لیکن ان حالتوں میں وہ خود بخود برطرف نہیں ہو تا بلکہ اس کی اطاعت بدستور واجب رہے گی اور اس کے اوامر بھی نافذ العمل ہوں گے کیونکہ ان سات حالتوں میں اس کے ساتھ کیا گیا عقد خود بخود منسوخ نہیں ہو تا بلکہ اس کے لیے حکم صادر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان شروط کے درمیان یہ فرق ہے کہ بعض وہ شرائط ہیں کہ ان کے ناپائیدار ہونے سے وہ خلیفہ کے منصب سے خارج ہو جاتا ہے اور بعض شرائط ایسی ہیں کہ ان کے فقدان سے وہ فوراً خلافت کے منصب سے خارج تو نہیں ہو تا بلکہ معزولی کا مستحق ہو جاتا ہے۔ جن شرائط کے ناپائیدار ہونے سے وہ فوراً منصب خلافت سے برطرف ہو جاتا ہے ان کا تعلق عقد سے ہے یا اس عقد کے ارکان میں سے کسی ایک رکن کے ساتھ ہے یعنی عقد کے وقت اگر یہ شرط نہیں پائی جاتی تو عقد ہی باطل تھا۔ اسی طرح عقد ہونے کے بعد بھی ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ یہ شرائط مفقود ہو جائیں تب یہ عقد باطل ہو گا اور خود بخود فسخ ہو جائے گا جیسا کہ خلیفہ کے لیے مسلمان ہونے کی شرط ہے یا عاقل اور قدرت رکھنے کی شرط ہے۔ رہی وہ شرائط جن کے ناپائیدار ہونے سے عقد تو ہو جاتا ہے لیکن فاسد ہو جاتا ہے کیونکہ یہ شرائط اس کے ارکان میں سے کسی رکن سے تعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق اس عقد کی صفات سے ہے تو جب خلافت کے انعقاد کے وقت یہ شرائط مفقود ہوں تب بھی خلافت کا انعقاد ہو جاتا ہے لیکن یہ انعقاد فاسد ہے اور اس کو فسخ کرنے کے لئے حکم کی ضرورت ہوتی ہے اور خلافت کے دوران ان شرائط میں سے کوئی شرط مفقود ہو جائے تب بھی عقد خود بخود فسخ نہیں ہو تا بلکہ حاکم (محکمۂ المظالم) کے حکم کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ شرائط خلیفہ کے مرد ہونے کی شرط وغیرہ سے ہیں۔ اس سے یہ

واضح ہو گیا کہ خلیفہ کی حالت میں کچھ تبدیلیوں سے وہ خلافت سے ہی خارج ہو جاتا ہے اور کچھ تبدیلیوں سے وہ برطرفی کا مستحق ہو جاتا ہے۔

دفعہ نمبر 41: صرف محکمۃ المظالم ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ آیا خلیفہ کی حالت اس قدر بگڑ چکی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ خلافت سے خارج ہے یا نہیں۔ صرف محکمۃ المظالم کے پاس خلیفہ کو تنبیہ کرنے یا اس کو برطرف کرنے کا اختیار ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ ان امور میں سے کسی بھی امر کا وقوع پذیر ہونا جن کی وجہ سے خلیفہ برطرف کئے جانے کا مستحق بن جاتا ہے ایک ظلم ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ اور یہ ان امور میں سے ہے جن کو ثابت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے قاضی کے سامنے اس کو ثابت کرنا لازمی ہے اور محکمۃ المظالم ہی وہ ادارہ ہے جو ظلم کے ازالے کا حکم صادر کر سکتا ہے۔ اس لیے اس ادارے کے قاضی کو ہی یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ظلم کو ثابت کرے اور اس کے بارے میں حکم صادر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ محکمۃ المظالم ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ گزشتہ دفعہ میں مذکورہ حالات میں سے کوئی حالت واقع ہوئی ہے یا نہیں، پھر اس بنیاد پر وہ خلیفہ کو معزول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اگر خلیفہ کی حالت مذکورہ حالتوں میں کسی حالت کے مشابہہ ہو جائے اور وہ خود اس منصب سے کنارہ کش ہو جائے تو بات ہی ختم ہو گئی۔ تاہم اگر مسلمانوں نے دیکھا کہ اس کی حالت ایسی ہو گئی کہ اس کو برطرف کرنا واجب ہے لیکن وہ انکار کرتا ہے اور مزاحمت کرتا ہے تب معاملے کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف لوٹا جائے گا کہ: **فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ** "اگر کسی معاملے میں تم آپس میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو" (النساء:59)۔ یعنی جب تمھارا اور تمھارے حکمرانوں کا اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول ﷺ یعنی محکمہ المظالم کے قاضی کی طرف لوٹاؤ جو اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے گا۔

محکمۂ المظالم کے پاس اس کو تنبیہ کرنے اور ایک معینہ مدت تک اس کو مہلت دینے کا بھی اختیار ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو تسلط سے آزاد کرے یا قید سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔ اس دوران عبوری امیر کام کرتا رہے گا۔ پھر اگر خلیفہ بغیر کسی کے تسلط اور ڈکٹیشن کے یا آزادی سے اپنا کام جاری رکھنے کے قابل ہو جائے تو عبوری امیر کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی اور اگر اس کی مغلوبیت یا قید ختم نہ ہو سکی تو اس کو معزول کیا جائے گا اور عبوری امیر نئے خلیفہ کے تقرر کی کاروائی شروع کرے گا۔

معاونین

دفعہ 42: خلیفہ اپنے لیے ایک یا ایک سے زیادہ معاونِ تفویض مقرر کرے گا جو حکمرانی کی ذمہ داری اٹھائیں گے۔ خلیفہ اس کو اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق امور کی تدبیر کا اختیار دے گا۔

خلیفہ کی وفات کے ساتھ ہی معاونین کی مدت بھی ختم ہو جائے گی وہ صرف عبوری امیر کے دور میں اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں اس کے بعد نہیں۔

اس کی دلیل وہ حدیث ہے جسے ترمذی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**وَأَمَّا وَزِيرَايَ مِنْ أَهْلِ الأَرْضِ فَأَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ**» "اہل زمین میں سے میرے دو وزیر (معاون) ابو بکر اور عمر ہیں"۔ اس کو حاکم اور ترمذی نے ابو سعید حذریؓ سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو عام فقہاء اور اکثر علماء نے استعمال کیا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے اس لیے یہ اس بات کی شرعی دلیل ہے کہ خلیفہ کو معاون مقرر کرنے کا اختیار ہے۔ حدیث میں لفظ وزیر کا اطلاق لغوی معنی یعنی معاون پر ہے اور قرآن نے بھی وزیر کے لفظ کو معاون

کے معنی میں استعمال کیا ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ''میرے اہل میں سے میرا معاون مقرر کر دے'' (طٰہٰ:29)۔

یہ وزارت (معاونت) رسول اللہ ﷺ کے عہد سے موجود ہے جیسا کہ ترمذی کی مذکورہ حدیث میں ہے تاہم حکمران خود رسول اللہ ﷺ تھے اور اس بات کی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بکرؓ یا عمرؓ کو اپنی طرح حکمرانی کرنے کی اجازت دی ہو بلکہ دونوں کو صرف اپنا وزیر یعنی معاون مقرر کیا اور ان کو معاونت کا اختیار دیا تھا یعنی اپنے احکامات کو نافذ کرنے کا اختیار۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد عمرؓ، ابو بکرؓ کے وزیر تھے اور ان کے ساتھ حکومت کرتے تھے اور یہ اس قدر ظاہر اور واضح ہو گیا تھا کہ بعض لوگ ابو بکرؓ سے یہ سوال کرتے تھے کہ اللہ کی قسم! ہمیں نہیں معلوم کہ آپ خلیفہ ہیں یا عمرؓ اور اسے ابنِ حنبل نے فضائلِ صحابہ میں نافع سے روایت کیا ہے۔ ابو بکرؓ کی وفات کے بعد عثمانؓ اور علیؓ، عمرؓ کے وزراء تھے۔ وہ دونوں عمرؓ کے ساتھ مل کر حکومت کر سکتے تھے تاہم عمرؓ کی انتہائی طاقتور شخصیت کی وجہ سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ آپ کی معاونت کے لئے کوئی وزیر ہے جیسا کہ ابو بکرؓ کے زمانے میں نظر آتا تھا۔ علیؓ اپنی طاقتور شخصیت کی وجہ سے عمرؓ کے زمانے میں بعض امور انجام دیتے ہوئے نظر آتے تھے۔ عمرؓ کی وفات کے بعد علیؓ اور مروان بن حکم عثمانؓ کے وزراء تھے تاہم علیؓ بعض معاملات سے راضی نہیں تھے، اس لیے عثمانؓ کے ساتھ معاملات انجام دیتے ہوئے زیادہ سامنے نہیں ہوتے تھے بلکہ کسی حد تک دور دور رہتے تھے لیکن مروان کی وزارت یعنی حکمرانی کے کام واضح تھے۔ خلیفہ وزیر کو امور کی تدبیر کا اختیار دیتے تھے۔ تمام خلفائے راشدینؓ کا یہی معاملہ تھا یعنی سب کے معاونین ہوا کرتے تھے تاہم معاملات کی تدبیر کے حوالے سے معاونین کی سرگرمیاں مختلف ہوا کرتی تھیں۔ لفظ وزیر کے لغوی معنی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ کا معاون ہوتا ہے یعنی خلافت کے کاموں میں اس کی اعانت کرتا ہے۔ چونکہ یہ لفظ مطلق ہے اس میں کوئی قید نہیں اس لئے وزیر تمام اعمال میں خلیفہ کا معاون ہو گا۔ حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے اور ابو بکرؓ و عمرؓ کا جو معاملہ تھا اس سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اس لئے شرع میں وزیر کے معنی وہ شخص ہے جس کو خلیفہ وزیر بنائے اور اس کو تمام امور میں اختیارات دے، مثال کے

طور پر خلیفہ یوں کہے کہ میں نے فلاں کو وزیر منتخب کر لیا یا اپنا معاون مقرر کر لیا یا فلاں میرا نائب ہے وغیرہ۔ ماوردی نے احکام السلطانیہ میں اس کو وزارت تفویض کہا ہے اور اسی معنی کے لحاظ سے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ وزارت تفویض وہ ہے کہ امام کسی کو اپنا وزیر بنائے اور اس کو یہ اختیار دے کہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق امور کی تدبیر کرے، تاہم یہ ضروری ہے کہ وہ جو بھی قدم اٹھائے خلیفہ کو مطلع کرے کیونکہ وہ صرف معاون ہے خلیفہ نہیں، وہ خود خلیفہ کو خبر دیئے بغیر فیصلے نہیں کر سکتا بلکہ ہر چھوٹے اور بڑے معاملے میں خلیفہ کو باخبر کرنا ضروری ہے۔

معاون یا وزیر کی یہ حقیقت شرع کے لحاظ سے ہے اور یہ جمہوری نظام کی وزارت سے بالکل مختلف ہے۔ جمہوری نظام میں وزارت (وزراء کی مجلس) ہی حکومت ہے۔ یہ افراد کا ایک مجموعہ ہے اور ایک خاص اور متعین مجموعہ ہونے کی حیثیت سے یہ حکمران ہیں کیونکہ اس نظام میں حکمرانی ایک فرد کی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتی ہے سارے وزیروں کے پاس حکمرانی کے اختیارات ہوتے ہیں۔ یعنی وزراء کا مجموعہ جو اجتماعی طور پر حکومت چلاتے ہیں ان میں سے کوئی ایک اکیلے حکمران نہیں ہوتا بلکہ حکمرانی کے اختیارات وزراء کے مجموعے، مجلس (پارلیمنٹ) کے پاس ہوتے ہیں۔ پھر یہی مجلس ان وزیروں میں سے ایک وزیر کو حکمرانی کے ایک خاص حصے کے حوالے سے اختیارات سونپتی ہے اور جب تک اس کو اس خاص پہلو میں خصوصی اختیارات نہیں دیئے گئے ہوں یہ اختیار اس مجموعے (پارلیمنٹ) کے پاس ہی رہتے ہیں۔

اسلام میں وزراء کی ایسی کوئی مجلس نہیں ہوتی جس کے ہاتھ میں اجتماعی طور پر حکومت ہو (جیسا کہ جمہوری نظام میں ہوتا ہے) بلکہ حکمرانی اس خلیفہ کی ہوتی ہے، جس کی بیعت امت کتابُ اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی شرط پر کرتی ہے۔ پھر خلیفہ اپنے لیے معاونین (وزرائے تفویض) مقرر کرتا ہے جو خلیفہ کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اس کے عام نائب ہوتے ہیں اس لیے وہ لغوی معنی کے لحاظ سے وزیر ہیں، یعنی خلیفہ کے معاونین، یوں اسلام میں اور جمہوری نظام میں وزیر کے مفہوم کے اندر واضح فرق موجود ہے۔ چونکہ صرف وزیر کہنے سے لوگوں کا ذہن جمہوری نظام کے وزیر اور وزارتوں کی طرف جاتا ہے اس لیے اس شبہات اور غلط

فہمی کو دور کرنے کے لیے صرف وزیر کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے بلکہ معاون یا پھر وضاحت کے ساتھ وزیر تفویض کہنا چاہیئے تا کہ اس کا اسلامی معنی واضح ہو جائے۔

معاونین کا تقرر اور ان کی برطرفی خلیفہ کے حکم سے ہوتی ہے۔ خلیفہ کی وفات کے ساتھ ہی معاونین کی مدت بھی ختم ہو جاتی ہے وہ صرف عبوری امیر کے دور میں اپنے کام کو کو جاری رکھ سکتے ہیں اس کے بعد نہیں۔ پھر اگر نئے خلیفہ ان معاونین میں سے کسی کو اپنا معاون مقرر کرنا چاہے تو ان کو پہلے برطرف کرنے کا حکم جاری کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ خلیفہ کی وفات کے ساتھ ہی ان کی مدت بھی ختم ہو گئی تھی اور وہ خود بخود فارغ ہو چکے تھے۔ نیا خلیفہ صرف نئے حکم نامے کے ذریعے ان کو اپنا معاون مقرر کر سکتا ہے۔

دفعہ نمبر 43: معاون کے لیے بھی وہی شرائط ہیں جو خلیفہ کے لیے ہیں یعنی وہ مرد ہو، آزاد ہو، مسلمان ہو، بالغ ہو، عاقل ہو، عادل ہو، قادر ہو اور اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اس کے دلائل وہی ہیں جو خلیفہ کی شرائط کے دلائل ہیں:

معاون کا مرد ہونا واجب ہے کیونکہ روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی کہ اہلِ فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنی ملکہ بنالیا تو فرمایا **«لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً»** "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جس نے عورت کو اپنا حکمران بنادیا"، اس کو بخاری نے ابی بکرۃ سے روایت کیا ہے۔

اس کا مسلمان ہونا بھی واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** "اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ایمان والوں پر ہر گز غلبہ نہ دے گا" (النساء: 141)۔ اس لیے کافر کا مسلمانوں کا حکمران بننا حرام ہے کیونکہ یہ تو بڑا غلبہ ہے۔

آزاد ہونے کی شرط اس لئے ہے کہ غلام خود اپنے افعال میں آزاد نہیں تو دوسروں کے معاملات کی دیکھ بھال کا تو سوال ہی نہیں۔

بالغ ہونے کی شرط اس لئے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ **«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ عَنْ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ وَعَنْ الصَّغِيرِ حَتَّى يَكْبَرَ وَعَنْ الْمَجْنُونِ حَتَّى يَعْقِلَ أَوْ يُفِيقَ»** ”تین لوگوں سے قلم کو اٹھایا گیا ہے، سوئے ہوئے آدمی سے جب تک وہ بیدار نہ ہو، بچے سے جب تک وہ بڑا نہ ہو اور مجنون سے جب تک اس کو عقل نہ آئے“۔ دوسری روایت ہے کہ **«وَعَنْ الْمُبْتَلَى حَتَّى يَبْرَأَ»** ”بے ہوش شخص سے یہاں تک کہ اسے ہوش آجائے“ اس کو ابنِ ماجہ اور حاکم نے عائشہؓ سے روایت کیا ہے، اور الفاظ ابنِ ماجہ کے ہیں۔ ترمذی اور ابنِ خزیمہ نے بھی اسی قسم کی روایت علیؓ سے روایت کی ہے۔ جس سے قلم کو اٹھالیا گیا ہو اس کا اپنے معاملات میں تصرف ہی صحیح نہیں دوسروں کے معاملات میں تصرف تو بطریقہ اولیٰ صحیح نہیں۔ ابو عقیل زھرہ بن معبد کا واقعہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ وہ اپنے دادا عبد اللہ بن ھشام سے روایت کرتے ہیں کہ ان کو رسول اللہ ﷺ کا زمانہ نصیب ہوا تھا اور ان کی ماں زینب بنت حمید ان کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئیں اور کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ اس سے بیعت لیجئے تو فرمایا: ”یہ چھوٹا ہے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے لیے دُعا کی“۔ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے چونکہ بچے کی بیعت ہی نہیں تو اس کی بیعت لینا صحیح نہیں ہے۔

عاقل ہونے کی شرط اس لئے کہ ابھی حدیث میں گزر گیا کہ تین آدمیوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے، یعنی وہ مکلف ہی نہیں ان میں ایک مجنون پاگل بھی ہے اور جو شخص مکلف ہی نہیں ہے تو وہ لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کس طرح کر سکتا ہے۔

عادل ہونے کی شرط اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گواہی کے لیے عادل ہونے کی شرط رکھی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے **وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ** ”اور اپنے (مسلمانوں) میں سے دو عادل

لوگوں کو گواہ بناؤ"(الطلاق:2)۔ حکمرانی کا کام گواہی کے کام سے یقیناً بہت بڑا کام ہے اس لیے عادل ہونے کی شرط بطریقہ اولیٰ ہے۔

قادر اور باصلاحیت ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ یہ حکمرانی کا تقاضا ہے جو شخص عاجز اور کمزور ہوگا وہ اس ذمہ داری کو انجام نہیں دے سکتا، نیز اس حوالے سے دلائل بھی ہیں جیسا کہ مسلم نے ابوذرؓ سے روایت کیا ہے کہ: **«قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَلاَ تَسْتَعْمِلُنِي ؟ قَالَ: فَضَرَبَ بِيَدِهِ عَلَى مَنْكِبِي ثُمَّ قَالَ: يَا أَبَا ذَرٍّ، إِنَّكَ ضَعِيفٌ، وَإِنَّهَا أَمَانَةُ، وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ، إِلاَّ مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا وَأَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا»** "میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! آپ مجھے کیوں عامل (حکمران) نہیں بناتے، ابوذرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اے ابوذر، آپ کمزور ہو۔ یہ ایک امانت ہے اور یہ قیامت کے دن شرمندگی اور ندامت ہے سوائے اس کے جو اسے حق انداز سے حاصل کرے اور اس کی ذمہ داری کو ادا کرے"۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کا حق ادا نہ کرنے کو نااہلیت قرار دیا اور فرمایا کہ یہ قیامت کے دن ندامت اور رسوائی کا سبب بن سکتا ہے اور یہ جازمیت (حتمیت) کا قرینہ ہے۔

دفعہ نمبر 44: معاون تفویض کو اختیارات سونپنے کی یہ شرط ہے کہ اختیارات دیتے وقت دو باتوں کو مدِ نظر رکھنا چاہیے، پہلی بات یہ کہ اختیارات عمومی ہونے چاہیے، دوسری بات یہ کہ وہ خلیفہ کا نائب بنا دیا جائے یا خلیفہ اس سے ملتے جلتے اور کوئی الفاظ استعمال کرے جن سے یہ واضح ہوتا ہو کہ معاون کو ایک جگہ سے دوسری جگہ یا ایک ذمہ داری سے دوسری ذمہ داری کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے اور اس کام کے لیے نئے سرے سے اختیارات منتقل کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ان کی اصلی ذمہ داری میں شامل ہیں۔

اس کی دلیل خود معاون کے کام کی حقیقت ہے کیونکہ وزیر تفویض یا معاون تفویض وہ وزیر ہوتا ہے جس کو خلیفہ اس لئے مقرر کرتا ہے کہ وہ خلیفہ کے ساتھ مل کر حکومت اور اقتدار کی ذمہ داریوں کو انجام دے۔ چنانچہ خلیفہ اس کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنی رائے اور اجتہاد سے احکام شرعیہ کے مطابق امور کی تدبیر کرے اور خلیفہ اس کو عمومی اختیارات دے کر اپنا نائب بناتا ہے۔ یہ نائب بنانا ایک عقد ہے اور کوئی بھی عقد صریح قول کے بغیر صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اختیارات منتقل کرتے وقت خلیفہ کی جانب سے واضح الفاظ میں یہ کہنا شرط ہے کہ میں نے فلاں کو اپنا معاون اور نائب بنا دیا اور اس کے پاس عمومی اختیارات ہیں، یا اس شخص کو یہ کہے کہ میں نے تمہیں اپنے نائب کے اختیارات دے دیئے یا یوں کہے کہ میں نے تمہیں وزیر مقرر کر دیا اور تم میرے نائب ہو۔ یعنی اختیارات کی یہ منتقلی ایسے عام اور سمجھ میں آنے والے الفاظ کے ساتھ ہو جس میں معاون کے کام کی اصلیت بھی واضح ہو اور اس میں یہ دونوں شرطیں پائی جاتی ہوں ایک تو 'عمومیت' اور دوسری 'نیابت'۔ جب تک یہ عقد ایسے واضح الفاظ کے ساتھ اور ان دو شرطوں کے ساتھ نہ ہو، تو اس کی وزارت کا انعقاد ہی نہیں ہو گا۔

اگرچہ معاون کے اختیارات میں عمومیت اور نیابت ضروری ہے لیکن خلیفہ کے لیے یہ جائز ہے کہ معاون کو کوئی خاص کام یا کسی خاص وقت کے لیے متعین کرے اس کے بعد اس کو دوسری جگہ یا دوسرے کام کی ذمہ داری سونپے۔ شیخین نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ **«بَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ عُمَرَ عَلَى الصَّدَقَةِ»** "رسول اللہ ﷺ نے عمر کو صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرنے کے لیے بھیجا"۔ نسائی اور دارمی نے روایت کی ہے کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ حِينَ رَجَعَ مِنْ عُمْرَةِ الْجِعْرَانَةِ بَعَثَ أَبَا بَكْرٍ عَلَى الْحَجِّ»** "نبی ﷺ جب عمرہ جعرانہ (ایک جگہ کا نام) سے واپس آئے تو ابو بکرؓ کو امیر حج بنا کر روانہ کیا"۔

یعنی ابو بکرؓ اور عمرؓ جو کہ نبی ﷺ کے عمومی وزیر تھے کبھی کچھ خاص اور معین ذمہ داریاں بھی ادا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہمیشہ تمام اعمال میں نیابت نہیں کرتے تھے حالانکہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے عمومی اختیار سونپا گیا تھا جیسا کہ وزارتِ تفویض کا تقاضا ہے۔ اسی طرح عمرؓ کے عہد میں

علیؓ اور عثمانؓ بھی یہی کیا کرتے تھے، ابو بکرؓ کے عہد میں عمرؓ کی نیابت اور عام نمائندگی واضح تھی اور یہ اس حد تک تھی کہ بعض صحابہ نے ابو بکرؓ سے پوچھا کہ ہمیں نہیں معلوم آپؓ خلیفہ ہیں یا عمرؓ۔ اور جیسا کہ ابو بکرؓ نے بعض موقعوں پر عمرؓ کو عدلیہ کی ذمہ داری سونپی جیسا کہ بیہقی نے ایسی اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے جن کو الحافظ نے قوی قرار دیا ہے۔

اس وجہ سے نبی ﷺ اور خلفائے راشدینؓ کی سیرت سے یہ معلوم ہوتا کہ کہ معاونین کی ذمہ داری اور اختیار عمومیت اور نیابت کے طور پر تھے لیکن بسااوقات معاون کو کوئی خاص کام یا کسی خاص جگہ میں ذمہ داری انجام دینے کا کام سونپا جاتا تھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بکرؓ اور عمرؓ کے ساتھ کیا یا ابو بکرؓ نے عمرؓ کے ساتھ کیا۔ مثلاً ایک معاون کو شمالی علاقوں کی ذمہ داری دی جائے اور دوسرے کو جنوبی علاقوں پر تعینات کیا جائے یا ایک کو ہٹا کر دوسرے کو اس کی جگہ اور دوسرے کو پہلے کی جگہ تعینات کیا جائے اور اس کے لیے نئے سرے سے اختیارات دینے کی ضرورت نہیں بلکہ بحیثیت معاون اسی کی ذمہ داری ایک جگہ سے دوسری جگہ لگائی جاسکتی ہے کیونکہ معاون ہونے کی وجہ سے اس کے اختیارات عمومی ہیں۔ یہاں معاون اور والی میں فرق ہے والی کو ایک خاص جگہ میں عمومی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اس کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل یا تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اگر اس کو ہی کہیں اور تعینات کرنا ہو تو اس کو نئے سرے سے ذمہ داری دی جائے گی کیونکہ نئی جگہ پہلی جگہ والے اختیارات میں داخل نہیں۔ اس کے برعکس معاون کے اختیارات عمومی اور نیابت کے ہیں اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کرنے کے لیے نئی تعیناتی کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تمام اعمال میں خلیفہ کا نائب ہے۔

دفعہ نمبر 45: معاون تفویض پر لازم ہے کہ وہ اپنی تدبیر اور احکامات کے نفاذ کے بارے میں خلیفہ کو باخبر رکھے تاکہ وہ اپنے اختیارات کی وجہ سے خلیفہ کی طرح نہ بن جائے بلکہ برابر خلیفہ کو اطلاع دیتا رہے اور خلیفہ اس کو جو حکم دے وہ اسی کو نافذ کرے۔

اس کی دلیل بھی معاون کے کام کی حقیقت ہے کہ وہ خلیفہ کا نائب ہے اور وہ خلیفہ کی طرف سے دیئے گئے اوامر کا پابند ہے۔ نائب کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ جس کا وہ نائب ہے، وہ اس کی طرف سے دیئے گئے اختیارات کی پیروی کرے۔ وہ خلیفہ سے آزاد ہو کر کچھ بھی نہیں کر سکتا بلکہ وہ تمام اقدامات کے بارے میں خلیفہ کو برابر آگاہ کرتا رہے گا جیسا کہ عمرؓ جب ابو بکرؓ کے وزیر تھے اور وہ یہی کیا کرتے تھے، وہ جو بھی قدم اٹھاتے ابو بکرؓ کو آگاہ کرتے تھے۔ خلیفہ کو اطلاع دینے کا ہرگز یہ مطلب بھی نہیں کہ انتہائی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں ان سے اجازت طلب کرے یہ تو معاون کے کام کی حقیقت کے خلاف ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مختلف معاملات میں اس کو یاد دہانی کراتا ہے جیسے فلاں صوبے کی کیا ضرورت ہے، کہاں گورنر مقرر کرنا ہے یا مارکیٹ میں کسی چیز کی کمی کی وجہ سے عوام کو شکایت ہے، اس کا ازالہ کرنا ضروری ہے وغیرہ یا ان معاملات کو خود درست کر کے خلیفہ کو ان کے بارے میں باخبر رکھے، ان کی انجام دہی کرنے کا حکم صادر کرے۔ خبر دینے کا یہی مطلب ہے کہ جو بھی کام کرے یا جو بھی فیصلے کرے خلیفہ کو بتائے لیکن ہر فیصلے سے پہلے خلیفہ کی اجازت کی ضرورت نہیں لیکن خلیفہ کسی کام سے منع کرے تو اس کے بعد اس کام کو نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ کے آخر میں اس جملے "کہ اس کو حکم دے اسی کو نافذ کرے" کا مطلب یہ ہے کہ معاون کی حکمرانی یا اس کے اختیارات ذاتی نہیں جیسا کہ خلیفہ کے اختیارات ذاتی ہیں بلکہ یہ اختیارات اس کو خلیفہ کی جانب سے دیئے گئے ہیں۔ اس لئے خلیفہ کسی کام کی تنفیذ کا حکم دے تو اس کو نافذ کرنا پڑے گا اور کسی کام سے روکے تو رک جانا پڑے گا کیونکہ معاون کی اپنی رائے اور اجتہاد سے امور کی تدبیر ان معاملات میں ہے جہاں خلیفہ نے

کوئی خاص حکم نہ دیا ہو جہاں خلیفہ ایک حکم دے دے اس کا نافذ کرنا معاون پر فرض ہے اور اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں۔

دفعہ نمبر46: خلیفہ پر فرض ہے کہ وہ معاونِ تفویض کے اعمال اور اس کی جانب سے امور کی تدبیر کا جائزہ لیتا رہے تا کہ صحیح کی توثیق کرے اور غلطی کا ازالہ کرے، کیونکہ امت کے معاملات کی تدبیر کی ذمہ داری خلیفہ کی ہے اور اسی کی رائے اور اجتہاد پر موقوف اور منحصر ہے۔

خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ معاون تفویض کے کاموں اور اس کی طرف سے امور کی تدبیر کی نگرانی کرے تا کہ وہ درست اعمال کو برقرار رکھ سکے اور غلطیوں کا تدارک کر سکے کیونکہ امت کے امور کی دیکھ بھال خلیفہ کی ذمہ داری ہے اور اس کے اجتہاد پر منحصر ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق امام ہی رعایا کے بارے میں ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ معاون تفویض رعایا کی دیکھ بھال کے لیے جوابدہ نہیں بلکہ وہ صرف ان اعمال اور ذمہ داریوں کے بارے میں جوابدہ ہے جو اس کو خلیفہ کی جانب سے سونپے گئے ہیں تا کہ خلیفہ حقیقی معنوں میں لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے حوالے سے اپنی ذمہ داری انجام دے سکے۔ پھر یہ بھی امکان ہے کہ معاونِ تفویض سے کوئی غلطی سرزد ہو اس لیے اس کی غلطی کی تصحیح کرنا بھی خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا رعایا کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اور معاون کی غلطی کا تدارک کرنے کے لیے اس کی تدابیر کی نگرانی خلیفہ پر لازم ہے۔

دفعہ نمبر47: جب معاونِ تفویض کسی معاملے کی تدبیر کرے اور خلیفہ اس کو برقرار رکھے تو معاون کو چاہیے کہ جس طرح خلیفہ نے اس کام کو برقرار رکھا تھا اسی طرح اس کو نافذ بھی کرے اس میں کوئی کمی

بیشی نہ کرے، اس کے بعد اگر خلیفہ اس کا دوبارہ جائزہ لے کر اپنی رائے بدلے اور معاون کی مخالفت کرے اور اس نے جو کچھ نافذ کیا تھا اس کو مسترد کرے تو دیکھا جائے گا کہ اگر معاون نے اس کو خلیفہ کے حکم کے عین مطابق نافذ کیا ہو جیسے کوئی مال تھا جس کو صحیح مصرف پر خرچ کیا ہو تب معاون کی رائے کو نافذ سمجھا جائے گا کیونکہ دراصل یہی خلیفہ کی رائے تھی اور خلیفہ احکامات کو نافذ کرنے کے بعد اس سے رجوع نہیں کر سکتا۔ اگر معاون نے ان امور کے علاوہ کوئی حکم نافذ کیا ہو تو اس کی رائے کو مسترد کر کے اپنی رائے نافذ کرنا جائز ہے کیونکہ ان معاملات میں خلیفہ کو اپنی رائے تبدیل کرنے کا حق ہے لہٰذا وہ اپنے معاون کے فعل کو بھی تبدیل کر سکتا ہے۔

اس دفعہ میں معاون کی جانب سے اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خلیفہ کس طرح معاون کے اعمال کی نگرانی کرے گا۔ یہ اس سے ماخوذ ہے کہ خلیفہ اپنے کسی عمل سے رجوع کر سکتا ہے اور کسی عمل سے نہیں۔ چونکہ معاون تفویض کا عمل بھی خلیفہ کا ہی عمل سمجھا جاتا ہے اس لیے معاون تفویض کیلئے یہ جائز ہے کہ کسی کام کو خود کرے یا وہ ذمہ داری حکمرانوں (گورنر وغیرہ) کے سپرد کر دے۔ کیونکہ خلیفہ کیلئے بھی یہ جائز تھا اور معاون کے اندر بھی حکمرانی کی شرائط پائی جاتی ہیں اس لیے وہ مظالم پر نظر بھی رکھ سکتا ہے اور ان کی تدارک کیلئے کسی کو اپنا نائب بھی بنا سکتا ہے۔ یہ شرائط بھی اس کے اندر پائی جاتی ہیں، وہ خود جہاد کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہے اور کسی دوسرے کو بھی اس حوالے سے ذمہ داری دے سکتا ہے کیونکہ جنگ کے اعلان کی شرائط بھی اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح اس نے جن امور کی تدبیر کی ہے ان کے نفاذ کی براہ راست نگرانی بھی کر سکتا ہے اور اس میں کسی اور کو اپنا نائب بھی مقرر کر سکتا ہے کیونکہ اس کے اندر رائے اور تدبیر کی شرائط بھی پائی جاتی ہیں۔ تاہم اس سب کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ معاون نے جو بھی اقدامات کیے اور خلیفہ کو آگاہ بھی کیا اور اس نے تائید بھی کر دی پھر خلیفہ ان کاموں کو کالعدم قرار نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ معاون بھی ان اعمال میں خلیفہ کی طرح بااختیار ہے جو اس کے سپرد کیے گئے ہیں لیکن اس کا اختیار بطور خلیفہ کے نائب ہونے کے ہے، اس کے اختیارات اپنے ذاتی نہیں اس لیے خلیفہ کیلئے جائز

ہے کہ وہ معاون کے اعمال کی مخالفت کرے اور ان کو کالعدم قرار دے کر مسترد کر دے۔ لیکن اس عمل کی حدود یہ ہیں کہ خلیفہ صرف ان کاموں میں یہ کر سکتا ہے جن کو اگر وہ خود بھی کر چکا ہوتا تو ان سے رجوع کرنا اس کے لیے جائز تھا۔ اس لیے معاون اگر خلیفہ کی تائید اور تصدیق کے بعد کسی حکم کو نافذ کرے یا کوئی مال صحیح جگہ خرچ کرے اس کے بعد خلیفہ پھر اس کی مخالفت کرے تب اس مخالفت کی کوئی قیمت نہیں بلکہ معاون کے عمل کو نافذ سمجھ کر خلیفہ کی مخالفت اور رائے کو مسترد کر دیا جائے گا کیونکہ یہ رائے دراصل اسکی تھی اور اس طرح کے حالات میں وہ اپنی رائے سے رجوع نہیں کر سکتا یا جو کچھ نافذ کیا گیا ہے اس کو کالعدم نہیں کر سکتا، اس لیے وہ معاون کے عمل کو بھی کالعدم نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر معاون نے کسی کو والی مقرر کیا ہو یا کسی کو ملازمت دی ہو، کسی کو فوجی کمانڈر مقرر کیا ہو یا اسی قسم کی کوئی ذمہ داری سونپ دی ہو یا پھر اقتصادی پالیسی ترتیب دی ہو، کوئی عسکری حکمت عملی مرتب کی ہو یا صنعتی پروگرام وغیرہ تیار کیا ہو تب خلیفہ کیلئے جائز ہے کہ وہ اس کو منسوخ یا ملتوی کر سکتا ہے کیونکہ یہ اگرچہ خلیفہ کی رائے اور تائید کے مطابق ہے لیکن یہ کام اگر خود خلیفہ نے بھی کیا ہو تو وہ بھی اس سے رجوع کر سکتا ہے اس لیے اپنے نائب کے اقدامات کو بھی منسوخ کر سکتا ہے۔ اس لیے قاعدہ یہ ہے کہ خلیفہ اپنے جن اعمال سے رجوع کر سکتا ہے اپنے نائب کے انہی اعمال کو بھی مسترد کر سکتا ہے، اس کے برعکس اپنے جن اعمال سے رجوع نہیں کر سکتا اپنے معاون کے بھی انہی اعمال کو منسوخ نہیں کر سکتا۔

دفعہ نمبر 48: معاون تفویض کو کسی خاص انتظامی ادارے یا محکمے کے ساتھ خاص نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی نگرانی عام ہو گی۔ کیونکہ جو لوگ براہِ راست انتظامی امور چلاتے ہیں وہ ملازم ہوتے ہیں حکمران نہیں جبکہ معاون تفویض حکمران ہے۔ اسی طرح اس کو کوئی خصوص کام یا ذمہ داری نہیں دی جائے گی کیونکہ اس کا منصب نیابت عمومی کا ہے۔

اس کی دلیل ترمذی کی حدیث میں موجود لفظ 'وزیرای' یعنی 'دو وزیر' کی حقیقت ہے، پھر یہ کہ خلیفہ کا معاون خلافت میں اس کا معاون ہوتا ہے یعنی حکومت کرنے میں اس لئے وہ حکمران ہے ملازم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ براہ راست انتظامی امور چلانا اس کے لیے جائز نہیں، کیونکہ جو لوگ عملی طور پر کام کرتے ہیں وہ ملازمین ہیں حکمران نہیں جبکہ معاون حاکم ہے ملازم نہیں، اس لیے اس کا کام معاملات کی دیکھ بھال ہے نہ کہ ان کاموں کی انجام وہی جو اجرت دے کر کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کسی قسم کا انتظامی کام کرنا اس کے لئے ممنوع ہے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کو انتظامی کاموں کے لئے کسی ادارے کے لئے خاص نہیں کیا جائے گا، اس کا کام عمومی نگرانی ہے۔

اس کو کوئی خاص کام کی ذمہ داری نہ دینے کی صورت کی وجہ یہ ہے کہ وہ معاون ہے اور معاون کا کام عمومی نگرانی اور نیابت کا ہوتا ہے، اس لیے ہر کام کو کرنے کے لئے خلیفہ کی جانب سے نئے سرے سے تقرری کی بھی ضرورت نہیں ہوتی کہ کسی جگہ بھیجنے کے لئے نئی تقرری کرنا پڑے کیونکہ اس کی ذمہ داری عام ہے البتہ جن کی ذمہ داری خاص ہوتی ہے جیسے کسی خاص صوبے کا گورنر، قاضی القضاء، فوجی کمانڈر یا والی صدقات (زکوٰۃ اکھٹا کرنے والا) اس کے لئے ہر مرتبہ نئے علاقے میں جانے کے لئے نئے سرے سے تقرر اور ذمہ داری دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

معاون (وزیر) تنفیذ

دفعہ نمبر 49: خلیفہ معاون تنفیذ مقرر کرے گا اور اس کا کام انتظامی ہو گا حکومتی نہیں۔ اس کا محکمہ خلیفہ کی جانب سے داخلی اور خارجی امور سے متعلق صادر ہونے والے احکامات کو نافذ کرنے کا ادارہ ہوتا ہے اور داخلی و خارجی معاہدات کو خلیفہ تک پہنچاتا ہے گویا وہ خلیفہ اور دوسروں کے درمیان واسطہ ہوتا ہے،

خلیفہ کے احکامات لوگوں تک پہنچاتا ہے اور لوگوں کے مسائل خلیفہ تک پہنچاتا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل امور میں پیغام رسانی کرتا ہے:

ا)رعایا کے ساتھ تعلقات

ب) بین الاقوامی تعلقات

ج)فوج اور سپاہ کے امور

د)فوج کے علاوہ دیگر ریاستی اداروں کے بارے میں

وزیر تنفید وہ وزیر ہوتا ہے جس کو خلیفہ مقرر کرتا ہے تاکہ وہ تنفیذ یعنی احکامات کا پیچھا کرنے (Follow up)اور احکامات کی بجا آوری میں خلیفہ کا معاون بنے۔ وہ خلیفہ اور ریاستی اداروں، رعایا اور خارجہ تعلقات کے درمیان واسطہ ہوتا ہے، خلیفہ کے احکامات کو متعلقہ شعبوں تک پہنچاتا ہے اور وہاں سے پیغامات خلیفہ تک لاتا ہے۔یوں وہ امور کی تنفید میں معاون ہوتا ہے ان پر نگران نہیں اور نہ ہی اختیارات منتقل کرتا ہے۔اس کا کام انتظامی نوعیت کا ہوتا ہے حکمرانی نہیں۔اس کا محکمہ داخلی وخارجی حوالے سے خلیفہ کی جانب سے صادر کئے گئے احکامات کو نافذ کرنے کا ادارہ ہوتا ہے اور اسی طرح وہ داخلی اور خارجی حوالے سے خلیفہ تک پیغامات پہنچاتا ہے اور خلیفہ کی جانب سے ان سے متعلق احکامات وصول کر کے پہنچاتا ہے گویا وہ خلیفہ اور دوسروں کے درمیان واسطہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور پھر خلفائے راشدین کے زمانے میں وزیر تنفیذ کو "کاتب" کہا جاتا تھا پھر اس کا نام بدل کر محکمہ پیغامات کا انچارج (صاحبِ دیوان الرسائل و مکاتبات) ہو گیا، اس کے بعد اس کو محکمہ تالیف کا انچارج کہا جانے لگا، اس کے بعد فقہاء نے اس کا نام وزیر تنفیذ رکھ دیا۔

رسول اللہ ﷺ ، خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ کے زمانے میں اس کے کام کو باریک بینی سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مندرجہ ذیل چار کام کرتا تھا:

الف) رعایا کو براہِ راست خطوط پہنچانا، ان خطوط میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

1) رسول اللہ ﷺ کا خط اہل نجران کے نام: اس کو ابو عبید نے کتابُ الاموال میں ابو ملیح ھذلی سے روایت کیا ہے اور اس کے آخر میں ہے کہ: «شَهِدَ بِذَلِكَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ وَمُعَيْقِيبُ، وَكَتَبَ» "اس کی گواہی عثمان بن عفانؓ اور معیقیب نے دی ہے اور لکھا ہے "۔ اس کو ابو یوسف نے الخراج میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ "کاتب" مغیرہ بن شعبہ ہیں۔ پھر ابو یوسف نے ابو بکرؓ کی جانب سے ان کو لکھے گئے خط کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کے "کاتب" بھی مغیرہ ہی تھے، پھر عمرؓ کے خط کا ذکر کیا ہے کہ ان کے کاتب (لکھنے والے) معیقیب تھے، پھر عثمانؓ کی جانب سے ان کو لکھے گئے خط کا ذکر کیا ہے کہ ان کے "کاتب" ان کا آزاد کردہ غلام حمران تھے اور علیؓ کے کا ذکر کیا ہے کہ ان کے "کاتب" عبد اللہ بن ابی رافع تھے۔

2) رسول اللہ ﷺ کی جانب سے تمیم الداری کو لکھا گیا خط۔ ابو یوسف نے کتاب الخراج میں کہا ہے کہ: " تمیم الداری جن کا پورا نام تمیم بن اوس ہے، اور ان کا تعلق قبیلہ لخم سے تھا، انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ ، فلسطین میں میری رومی پڑوسی ہیں ان کا ایک گاؤں جس کو حبری کہا جاتا ہے اور دوسرا گاؤں ہے جس کو بیت عینون کہا جاتا ہے، اگر اللہ تعالی شام کو آپ ﷺ کے لئے کھول دے تو یہ دونوں گاؤں مجھے ھبہ کر دیجئے گا" فَقَالَ: هُمَا لَكَ فرمایا: وہ دونوں تمھارے ہوئے۔ تمیم الداری نے کہا آپ ﷺ مجھے یہ لکھ کر دیجئے، تو آپ ﷺ نے ان کے لئے لکھا بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، هَذَا كِتَابٌ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُولِ اللَّهِ لِتَمِيمِ بْنِ أَوْسِ الدَّارِيِّ، أَنَّ لَهُ قَرْيَةَ حِبْرَى وَبَيْت عَيْنُون قَرْيَتَهَا كُلَّهَا، وَسَهْلَهَا وَجَبَلَهَا وَمَاؤُهَا وَحَرْثَهَا وَأَنْبَاطَهَا وَبَقَرُهَا وَلِعَقِبِهِ مِنْ بَعْدِهِ، لاَ يُحَاقُّهُ فِيهَا أَحَدٌ، وَلاَ يُلْحِدُ عَلَيْهِمْ أَحَدٌ بِظُلْمٍ، فَمَنْ ظَلَمَ وَأَخَذَ مِنْهُمْ شَيْئاً فَإِنَّ عَلَيْهِ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالمَلاَئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ. وَكَتَبَ عَلِيٌّ» " بسم اللہ الرحمن الرحیم یہ خط (تحریر) اللہ کے رسول

محمد ﷺ کی جانب سے تمیم بن اوس داری کے لیے ہے، حبری و عینون دونوں گاؤں اس کے ہیں، ان کی کھلیانیں، ان کے پہاڑ، ان کا پانی، ان کی کھیتی، ان کا چارہ اور ان کے گائے اس کے لئے اور اس کے بعد اس کی نسلوں کیلئے ہے۔ یہ کوئی اس سے نہیں چھین سکتا اور نہ ہی ان پر کوئی ظلم کر سکتا ہے۔ اگر کسی نے ان پر ظلم کیا اور ان سے کچھ چھین لیا تو ایسے شخص پر اللہ کی، فرشتوں کی اور لوگوں کی لعنت ہو۔ اس کو علیؓ نے لکھا"۔

جب ابو بکرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے تمیم الداری کے لئے ایک تحریر لکھی کہ " بسم اللہ الرحمن الرحیم، یہ خط ابو بکر کا ہے جو کہ اللہ کے رسول ﷺ کے امین اور زمین پر ان کے خلیفہ ہیں۔ اس خط کو ان دونوں دیہاتوں کے رہنے والوں کے بارے میں لکھا گیا، جن کے ہاتھ میں حبری اور عینون کا گاؤں ہے کہ اس میں کوئی فساد نہ کریں، جو کوئی اللہ کا حکم سنتا ہے اور اطاعت کرتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ وہاں کسی چیز کو خراب نہ کرے اور ان دونوں بستیوں میں عمودی دروازے نہ لگائے اور مفسدین کو وہاں جانے سے روکے"۔

ب) بین الاقوامی تعلقات اور اس کی کچھ مثالیں :

صلح حدیبیہ کی متعلق بخاری میں مِسوَر اور مروان کی روایت میں ہے کہ : «**فَدَعَا النَّبِيُّ ﷺ الكَاتِبَ ...**» "رسول اللہ ﷺ نے کاتب (وزیر تنفیذ) کو بلایا" ۔ ابو یوسف نے کتاب الخراج میں روایت کی ہے اور کہا ہے کہ:" محمد بن اسحاق اور کلبی نے بتایا، اور ایک نے حدیث میں دوسرے سے کچھ اضافہ کیا ہے اور اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ فرمایا: "لکھو"، لیکن کاتب کے نام کا ذکر نہیں۔ ابنِ کثیر اس کو روایت کر کے کہتے ہیں کہ " ابنِ اسحاق نے کہا ہے کہ زُھری نے کہا ہے"... کہ پھر رسول ﷺ نے علی بن ابی طالبؓ کو بلایا اور فرمایا: 'لکھو...'۔ اسی کو ابو عبید نے الاموال میں ابن عباسؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ " پھر علیؓ سے فرمایا کہ "اے علیؓ لکھو"۔ حاکم نے بھی اس کو ابن عباسؓ سے روایت کی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ذھبی نے بھی اس کے موافقت کی ہے اس میں بھی ہے کہ " اے علیؓ لکھو" ۔ اس صلح کا واقعہ بہت مشہور ہے اس کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

ج) فوج اور سپاہ اور ان کے حوالے سے تحریریں :

ابو بکرؓ نے خالدؓ کو لکھا اور ان کو حکم دیا کہ شام کی طرف روانہ ہو جاؤ "۔ ابو یوسف نے کتاب الخراج میں کہا ہے کہ "خالدؓ نے حیرہ میں ٹھہرنے اور قیام کرنے کا ارادہ کیا، تب ابو بکرؓ کا خط ان کو ملا، جس میں انہوں نے ان کو شام کی طرف روانگی کا حکم دیا اور ابو عبیدہؓ کی مدد کرنے کو کہا..." ۔

د) فوج کے علاوہ ریاست کے دوسرے اداروں کے حوالے سے لکھے گئے خطوط اور مراسلے:

رسول ﷺ نے معاذؓ کو عشر کے حوالے سے خط لکھا۔: یحیی بن آدم نے کتاب الخراج میں حسن سے روایت کیا ہے کہ «كَتَبَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِلَى مُعَاذٍ بِالْيَمَنِ: **فِيمَا سَقَتِ السَّمَاءُ أَوْ سُقِيَ غَيْلاً الْعُشْرُ، وَمَا سُقِيَ بِالْغَرْبِ فَنِصْفُ الْعُشْرِ**» "رسول ﷺ نے یمن میں موجود معاذؓ کو لکھا کہ وہ بارش اور دریا کہ کنارے سے سیر اب کی گئی کھیتی پر عشر اور رہٹ (کنوئیں وغیرہ) سے سیر اب کی گئی فصل پر نصف عشر لیں"۔ شعبی نے بھی اس قسم کہ روایت نقل کی ہے اور ابنِ ابی شیبہ نے اپنی تصنیف الحکم میں نقل کیا ہے۔

خلیفہ اپنی ضرورت کے حساب سے کاتب (وزیر تنفیذ) مقرر کر سکتا ہے بلکہ ضرورت کی صورت میں زیادہ مقرر کرنا واجب ہے۔ سیرت کی کتابوں میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کم و بیش دس کاتب تھے۔

دفعہ نمبر 50: معاون تنفیذ مسلمان مرد ہوتا ہے کیونکہ وہ خلیفہ کا دستِ راست ہوتا ہے اور راز دان ہوتا ہے۔

چونکہ معاون تنفیذ براہِ راست خلیفہ سے رابطے میں ہوتا ہے جیسا کہ معاون تفویض ہے اور یہ خلیفہ کا نمائندہ ہوتا ہے اس لئے اس کا کام خلیفہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے کام کا تقاضا ہے کہ وہ ہر کام سے خلیفہ کو باخبر رکھے اور دن یارات کے کسی بھی وقت خلیفہ کے ساتھ خفیہ میٹنگ کر سکے اس لئے یہ عہدہ اسلامی احکامات کے مطابق عورت کے لئے مناسب نہیں، لہٰذا معاون تنفیذ مرد ہو گا۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ معاون تنفید کافر ہو بلکہ اس کا مسلمان ہونا لازمی ہے کیوں وہ خلیفہ کا رازدار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًاۗ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيَاتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ** ”اے ایمان والو! تم اپنے سوا کسی کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ کیا تم نہیں دیکھتے دیگر لوگ تمھاری تباہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے وہ تو چاہتے ہے کہ تم دکھ میں پڑو، ان کی عداوت تو خود ان کی زبان سے بھی ظاہر ہو چکی ہے اور جو ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے زیادہ ہے۔ ہم نے تمہارے لئے آیتیں بیان کر دیں اگر تم عقل رکھتے ہو“(آل عمران:118)

اس آیت میں انتہائی صراحت سے منع کیا گیا ہے کہ خلیفہ کسی غیر مسلم کو راز دار بنائے۔ اس لئے معاون تنفیذ کا کافر ہونا بالکل جائز نہیں بلکہ اس کا مومن ہونا فرض ہے کیونکہ اس کا تعلق بلاواسطہ خلیفہ کے ساتھ ہوتا ہے وہ بھی معاون تفویض کی طرح خلیفہ سے کبھی دور نہیں ہوتا۔ حسب ضرورت ایک سے زیادہ معاون تنفیذ مقرر کیے جاسکتے ہے۔

دفعہ نمبر 51: معاون تنفیذ بھی معاون تفویض کی طرح بلاواسطہ براہِ راست خلیفہ سے رابطے میں ہوتا ہے وہ بھی معاون ہے لیکن حکمرانی میں نہیں صرف تنفیذ میں۔

خلیفہ حکمران ہے اس کا کام حکومت کرنا اور احکامات کو نافذ کرنا ہے اسی طرح لوگوں کے معاملات کے دیکھ بھال کرنا ہے۔ حکمران کو لوگوں کے معاملات کے دیکھ بھال کے لیے انتظامی کاموں کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لئے ایک خاص ڈھانچے کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے خلیفہ کو لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ایک معاون تنفیذ مقرر کرنا چاہیئے تاکہ وہ انتظامی امور کو انجام دے۔ اس کا کام حکومت کرنا نہیں بلکہ انتظامی امور میں خلیفہ کی معاونت کرنا ہوتا ہے۔ وہ حکمرانی کا کوئی کام نہیں کرے گا جیسا کہ معاون تفویض کرتا ہے، اس لئے وہ گورنر مقرر نہیں کر سکتا نہ ہی کوئی عامل تعینات کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے لوگوں کے معاملات کی نگرانی کر سکتا ہے اس کا کام حکومت کے کاموں کو نافذ کرنے کے لیے انتظام اور منتظم کا ہوتا ہے۔ وہ خلیفہ یا معاون تفویض کی جانب سے صادر کے گئے احکامات کو نافذ کرتا ہے اس لئے اس کو معاون تنفیذ کہا جاتا ہے۔ فقہاًاس کو وزیر تنفیذ کہتے تھے جو ایک ہی بات ہے، وزیر لغت میں معاون کو کہتے ہیں اور وزیر تنفیذ کو معاون تنفیذ۔ فقہاء نے کہا ہے کہ یہ وزیر خلیفہ اور رعایا کے درمیان اور اسی طرح خلیفہ اور والیوں کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔ خلیفہ کو باخبر رکھتا ہے اور خلیفہ کے احکامات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور خلیفہ کے احکامات کو نافذ کرتا ہے۔ وہ گورنروں کی تقرری، فوج کی تیاری وغیرہ کے بارے میں خبر دیتا ہے اور ان کی طرف سے کوئی خبر ہو تو خلیفہ کو بتاتا ہے۔ کوئی بھی نئی بات ہو اس کے حوالے سے خلیفہ کے احکامات لے کر متعلقہ اداروں کو پہنچاتا ہے۔ دور حاضر میں بڑے ملکوں میں سیکریٹری آف اسٹیٹ اور وزیر تنفیذ میں مشابہت ہے۔

والی (گورنر)

دفعہ نمبر52: جن علاقوں پر اسلامی ریاست کی حکمرانی ہوتی ہے ان علاقوں کو کئی ایک اکائیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ہر اکائی کو ولایہ (صوبہ) کہا جاتا ہے پھر ہر ولایہ کو کئی ایک اکائیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور

ہر اکائی کو عمالہ (ضلع) کہا جاتا ہے۔ ہر ولایہ کے سربراہ کو والی یا امیر کہا جاتا ہے اور ہر عمالہ کے سربراہ کو عامل یا حاکم کہا جاتا ہے۔

والی حکمران ہوتے ہیں کیونکہ ولایت حکمرانی ہے، المحیط ڈکشنری میں کہا گیا ہے کہ "ولایہ مصدر ہے کسرہ یعنی زیر کے ساتھ، یہ امارت اور سلطان ہے"۔ یہ منصب خلیفہ یا خلیفہ کا نائب ہی کسی کو دے سکتا ہے یعنی خلیفہ کے علاوہ کوئی والی مقرر نہیں کر سکتا۔ ولایت یا امارت، دوسرے لفظوں میں والی یا امراء، کی دلیل اصل میں رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے۔ نبی ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے مختلف علاقوں میں والی مقرر کیے تھے اور ان کو حکمرانی کا حق دیا تھا۔ چنانچہ معاذ بن جبلؓ کو الجند، زیاد بن لبیدؓ کو حضرموت اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو زبید اور عدن کا والی مقرر کیا۔ والی بھی خلیفہ کا نائب ہوتا ہے اور وہ نیابت کے طور پر ہی خلیفہ کے احکامات کے مطابق اقدامات کرتا ہے۔ شرع میں والیوں کے لیے کوئی حد مقرر نہیں جس کو بھی خلیفہ حکمرانی کے کاموں میں سے کسی کام میں اپنا نائب مقرر کرے اس کام میں وہ والی ہوتا ہے اور اس کی تعیناتی کے وقت جس قسم کے الفاظ استعمال کرتا ہے وہی اس کے کام کی نوعیت ہوتی ہے۔ لیکن والی کی ولایہ (دائرہ عمل) مخصوص اور متعین ہوتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ جس کو والی مقرر کرتے تھے اس کے لیے علاقہ بھی مخصوص کرتے تھے یعنی کسی خاص علاقے کے لیے ایک شخص کو امیر مقرر کرتے تھے۔ یہ ولایت دو اقسام کی ہوتی ہیں یعنی عام اور خاص۔ عام امارت یا ولایت حکمرانی سے متعلق تمام امور پر مشتمل ہوتی ہے اس میں خلیفہ کسی شخص کو ایک امارت یا صوبے میں مکمل حکمرانی یعنی وہاں کے تمام رعایا پر حکمرانی کا عام اختیار دیتا ہے اور والی وہاں کے تمام امور کا ذمہ دار ہوتا ہے اس کو عام ولایت کہا جاتا ہے۔ جبکہ خاص ولایت یا خاص امارت یہ ہے کہ خلیفہ کسی شخص کو صرف فوج کیلئے امیر اور والی بنائے اور اس کا کام صرف فوج کے لیے تدابیر اختیار کرنا، اس کی دیکھ بھال کرنا اور مسلمانوں کی قوت کو متحد رکھنا ہو۔ وہ وہاں سیکیورٹی کا ذمہ دار ہوتا ہے اور اس علاقے یا صوبے میں فوج کو مستعد رکھتا ہے، لیکن قضاً (عدلیہ) یا خراج وزکوٰۃ وغیرہ کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے عام ولایت بھی دی چنانچہ عمرو بن حزم کو یمن کا عام والی مقرر کیا اور کبھی خاص ولایت بھی

عطا کی جیسے علی بن ابی طالبؓ کو یمن میں صرف قضاء (عدلیہ) پر مقرر فرمایا۔ آپ ﷺ کے بعد کے خلفاء بھی اس منہج پر چلتے رہے وہ بھی عام ولایت دیتے تھے چنانچہ عمر بن خطابؓ نے معاویہ بن ابی سفیان کو عام ولایت دی۔ اور خاص ولایت بھی دی جاتی تھی چنانچہ علی بن ابی طالبؓ نے عبد اللہ بن عباسؓ کو مالی امور کے علاوہ تمام امور کے بارے میں بصرہ کا والی مقرر کیا اور زیاد کو مالی امور کا والی مقرر کیا۔ قرون اولیٰ میں ولایت کی دو قسمیں ہوا کرتی تھیں، ''ولایۃ الصلاۃ'' اور 'ولایۃ الخراج'۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں ان دونوں قسم کی ولایتوں یا امارتوں کا ذکر ہے، پہلے کو امارۃ علی الصَلاۃ (نماز کی امارت) اور دوسرے کو امارت علی الصلاۃ والخراج (نماز اور خراج دونوں کی امارت) کہا گیا ہے، یعنی امیر یا تو صلاۃ اور خراج دونوں کا ہو گا یا صرف صلاۃ کا ہو گا۔ لیکن امارۃ الصلاۃ کا یہ معنی نہیں کہ صرف نماز پڑھانا بلکہ یہ ولایت اور حکمرانی میں امارت یا امامت ہے، اس کا یہ مطلب ہے کہ مالی معاملات کے علاوہ تمام معاملات میں امارت (حکمرانی) ۔ لفظ الصلاۃ سے مراد مالی معاملات کے سوا تمام امور میں امارت ہے، اس لیے اگر والی صلاۃ اور خراج دونوں کا والی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی ولایت عام ہے۔ اگر وہ صرف صلاۃ یا صرف خراج کا والی ہے تو اس کی ولایت خاص ہے۔ ان تمام صورتوں میں حتمی فیصلہ خلیفہ کا ہوتا ہے کہ وہ کسی شخص کو کسی ولایہ میں خراج کے لیے خاص کرے، قضاء کے لیے خاص کرے یا وہ مال، قضاء اور فوج کے علاوہ اس کو کسی کام کے لیے خاص کرے۔ خلیفہ جس طرح ریاست اور اس کے اداروں اور ولایہ کے لیے بہتر سمجھے گا ویسا کرے گا کیونکہ شرع نے والی کے لیے کوئی خاص اعمال متعین نہیں کیے ہے اور نہ ہی یہ واجب قرار دیا ہے کہ حکمرانی کے تمام معاملات میں اس کو اختیار حاصل ہے ہو۔ بلکہ صرف یہ تحدید کی ہے کہ اس کا کام حکمرانی کا ہے وہ حاکم یا سلطان ہے اور خلیفہ کا نائب ہے اور یہ بھی تحدید کی ہے کہ وہ ایک خاص علاقے کا ہو سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا ہے۔ لیکن شرع نے خلیفہ کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ والی کی ولایت کو عام کرے یا خاص رکھے۔ خلیفہ جو مناسب سمجھے ویسا ہی کرے یہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہ ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے امیر کی امارت کو یا والی کی ولایت کو ایک خاص علاقے اور صوبے

کے ساتھ مخصوص کیا ہے اسی بنیاد پر ریاست کو صوبوں اور عمالات کی مختلف اکائیوں کی شکل میں تقسیم کیا گیا ہے۔

دفعہ نمبر 53: خلیفہ کی جانب سے ہی والیوں کا تقرر ہوتا ہے اور عمال کا تقرر بھی خلیفہ ہی کرتا ہے یا اگر وہ والیوں کو یہ ذمہ داری دے تو وہ بھی عمال مقرر کر سکتے ہیں۔ والیوں اور عمال کے لیے بھی وہی شرائط ہیں جو معاونین کے لیے ہیں اس لئے ان کا مسلمان، مرد، آزاد، بالغ، عاقل، عادل، اور اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کی صلاحیت رکھنے والا ہونا ضروری ہے۔ ان کا انتخاب متقی اور طاقتور شخصیت والوں میں سے کیا جائے گا۔

اس دفعہ کی دلیل رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد صحابہؓ کا عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود ہی والیوں اور علاقائی امیروں کا تقرر کرتے تھے۔ کبھی آپ ﷺ کسی کو پورے ولایہ کا اختیار اور ذمہ داری سونپتے تھے جیسا کہ عمرو بن حزم کو پورے یمن کا والی مقرر کیا اور بعض دفعہ کئی افراد کو ایک ہی ولایہ کے مختلف حصوں میں امیر مقرر کرتے تھے جیسا کہ معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰؓ کو یمن کے دو مختلف حصوں میں امیر بنا کر ایک ساتھ روانہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ **«يَسِّرَا وَلا تُعَسِّرَا، وَبَشِّرَا وَلا تُنَفِّرَا، وَتَطَاوَعَا»** "آسانی پیدا کرو سختی مت کرو، خوشخبری دو متنفر مت کرو اور ایک دوسرے سے تعاون کرنا"۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور راوی ابو موسیٰؓ ہیں۔

جہاں تک والی کے لیے عمال مقرر کرنے کے جواز کا سوال ہے تو یہ اس سے ماخوذ ہے کہ خلیفہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ والی کو تعینات کرتے وقت اس کو یہ اختیار دے سکتا ہے کہ وہ عمال مقرر کرے۔ والیوں کے لیے بھی وہی شرائط ہیں جو معاونین کے لیے ہیں کیونکہ والی بھی معاون کی طرح خلیفہ کا نائب ہوتا ہے اس

لیے وہ بھی حکمران ہے اور اس کے لیے بھی وہی شرائط ہیں جو خلیفہ کے لیے ہیں۔ کیونکہ معاون کیلئے بھی وہی شرائط ہیں جو خلیفہ کے لیے ہیں چنانچہ اس کے لیے بھی شرط ہے کہ وہ مرد ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ «**لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً**» "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جس نے عورت کو اپنا حکمران بنایا"، اس کو بخاری نے ابو بکرۃ کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں ولایت سے حکمرانی ہی مراد ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے معاملے کو عورت کے سپرد کیا اور 'ولی' کے ساتھ 'امر' کا لفظ آجائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد حکم اور سلطان ہے۔

دوسری شرط آزاد ہونے کی ہے کیونکہ غلام تو اپنی ذات کا بھی مالک نہیں وہ کیسے حکمران بن سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے لیے شرط ہے کہ وہ مسلمان ہو کیونکہ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ دینا حرام ہے۔ اس کے لیے بالغ ہونا لازمی ہے کیونکہ حدیث کی رُو سے نابالغ غیر مکلف اور مرفوع القلم ہے، اس حدیث کو ابو داؤد نے علی بن ابی طالبؓ سے روایت کیا ہے، جس میں یہ الفاظ ہیں کہ «**رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلاثَةٍ : عَنْ الصَّبِيِّ حَتَّى يَبْلُغَ... وَعَنْ الْمَعْتُوهِ حَتَّى يَبْرَأَ** » "تین لوگوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے... بچے سے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے"۔ دوسری روایت ابو داؤد ہی نے علی بن ابی طالبؓ سے روایت کی ہے کہ «**رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلاثَةٍ عَنِ الْمَجْنُونِ الْمَغْلُوبِ عَلَى عَقْلِهِ حَتَّى يَفِيقَ، وَعَنِ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ، وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتَّى يَحْتَلِمَ**» "تین طرح کے لوگوں سے قلم کو اٹھالیا گیا ہے، مجنون دیوانے سے اس وقت تک جب تک کہ اس کی عقل واپس لوٹ نہ آئے، سوتے ہوئے سے یہاں تک کہ وہ بیدار نہ ہو جائے اور بچے سے جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائے"۔ اسی طرح احمد نے عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ «**رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَةٍ عَنْ الصَّبِيِّ حَتَّى يَحْتَلِمَ وَعَنْ النَّائِمِ حَتَّى يَسْتَيْقِظَ وَعَنْ الْمَعْتُوهِ حَتَّى يَعْقِلَ...**» "تین آدمیوں سے قلم کو اٹھالیا گیا ہے بچے سے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے، سوتے ہوئے سے جب تک وہ بیدار نہ ہو جائے اور پاگل سے جب تک وہ ہوش میں نہ آجائے"۔ جس

سے قلم کو اٹھالیا گیا وہ غیر مکلف ہے اور قلم کے اٹھانے کا مطلب اس پر کسی حکم کی ذمہ داری نہیں تو پھر وہ کیسے شرعی احکامات کو نافذ کرے گا یعنی حکمران بنے گا۔

اسی طرح عادل ہونا بھی اس کے لیے ایک شرط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو گواہی میں بھی عادل ہونے کی شرط رکھی ہے اس لیے حکمران کے لیے تو بطریقہ اولیٰ عادل ہونا شرط ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا** ”اے ایمان والو تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو“ (الحجرات:6)۔ یہ آیت اچھی طرح تحقیق کرکے فاسق کی بات کو قبول کرنے کا حکم دیتی ہے جبکہ حکمران کوئی حکم دے تو اس کو قبول کرنا واجب ہے، اس لئے حکمران ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ اس کے حکم کو اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد قبول کیا جائے بلکہ وہ ایسا آدمی ہونا چاہیے کہ اس کی بات کو فوراً قبول کیا جاسکے۔ یہ بھی شرط ہے کہ وہ باصلاحیت اور اپنی ذمہ داری کو انجام دینے کے قابل ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ابوذرؓ سے اس وقت فرمایا جب انھوں نے ولایت طلب کی کہ اے ابوذرؓ تم کمزور آدمی ہو۔ اس کو مسلم نے خود ابوذرؓ سے روایت کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایسا ضعیف اور کمزور شخص جو اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کا اہل نہ ہو اس کو والی بنانا صحیح نہیں۔ رسول اللہ ﷺ باصلاحیت لوگوں میں سے والی منتخب کرتے تھے۔ علم اور تقویٰ والے لوگوں کو والی بناتے تھے اور ان میں بھی اچھی طرح کام کرنے والوں کو ترجیح دیتے تھے۔ ایسے لوگوں کا انتخاب کرتے تھے جو رعایا کے دلوں پر ایمان اور ریاست کی دھاک بٹھا دیں۔ سلیمان بن بریدہ نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی شخص کو فوج کا امیر مقرر کرتے اور جہاد کے لیے روانہ فرماتے تو تنہائی میں اس کو اللہ سے ڈرنے اور اپنے ساتھی مسلمانوں کی خیر خواہی کی وصیت کرتے تھے، اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ والی بھی اپنی ولایہ کا امیر ہوتا ہے اس لیے وہ بھی اس حدیث کے ضمن میں داخل ہے۔

دفعہ نمبر54: والی کو خلیفہ کے نائب ہونے کی وجہ سے اپنے ولایہ میں حکمرانی اور ولایہ کے محکموں کی نگرانی کا اختیار حاصل ہے۔اس کو اپنے ولایہ میں محکمہ مالیات، قضاء (عدلیہ) اور فوج کو چھوڑ کر باقی تمام محکموں کے بارے میں تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ وہ ولایہ کے لوگوں کا امیر ہے اور ولایہ سے متعلق تمام امور کا نگران ہے تاہم پولیس بحیثیت ادارہ اس کے ماتحت نہیں ہو گی لیکن احکامات کی تنفیذ کے لیے اس کے ماتحت ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ والی اس علاقے میں خلیفہ کا نائب ہے جہاں خلیفہ نے اس کو تعینات کر دیا۔ اس لیے وہ بھی معاون کی طرح عمومی اختیارات کا مالک ہے لیکن صرف اپنے ولایت میں اور اپنے علاقے سے باہر اس کا کوئی کام نہیں۔ اگر دوسری جگہ یا دوسرے ولایہ میں اس کی خدمات کی ضرورت ہو تو اس کے لیے نئے سرے سے اختیارات دینے اور تقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کی ولایت خاص ہے تو اس کا کام ان امور پر نظر رکھنا ہے جن کے بارے میں اس کو اختیارات دیئے گئے ہیں اور اس کے علاوہ کسی کام سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔

رسول اللہ ﷺ بعض والیوں کو ہر چیز کے لیے عام ولایت دیتے تھے جیسا کہ معاذ بن جبلؓ کو یمن کا والی مقرر کیا اور ان کو صلاۃ اور صدقات (یعنی مالی معاملات) کی ولایت دی اور بعض دفعہ خاص ولایت دیتے تھے جیسا کہ فروہ بن مُسَیک کو مراد اور مذحج اور زبید کے علاقوں کا والی مقرر کیا اور اس کے ساتھ خالد بن سعید کو صدقہ (مالیات) کے لیے روانہ کیا۔ یوں معاذ بن جبلؓ کی ولایت عام تھی یعنی صلاۃ اور صدقہ دونوں پر اور فروہ بن مسیک کی ولایت خاص تھی یعنی صرف صلاۃ (یعنی مالیات کے علاوہ دیگر امور پر) اور خالد بن سعید کی ولایت بھی خاص تھی یعنی صدقہ (یعنی مالیاتی امور پر)۔

اسی طرح رسول ﷺ بعض والیوں کا تقرر کر کے ان کو کچھ سمجھائے اور سکھائے بغیر روانہ فرماتے تھے جیسا کہ علیؓ کو یمن روانہ فرمایا اور ان میں سے کچھ کو روانہ فرماتے تو ان کو سمجھاتے کہ کس طرح معاملات کو

چلانا ہے جیسا کہ معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کرتے وقت فرمایا کہ "اگر کوئی معاملہ تمہارے سامنے پیش ہو تو تم کس طرح اس کا فیصلہ کروگے ؟، کہا کہ کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔ فرمایا کہ کتاب اللہ میں بھی نہ ملے تو، کہا سنت سے فیصلہ کروں گا، فرمایا کہ سنت میں بھی نہ ملے تو کہا کہ اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کسی کی طرف مائل نہیں ہوں گا۔ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے پیغمبر کے ایلچی کو ایسی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول خوش ہوا"، اس کو احمد، ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ ابو داؤد نے بھی اسے نقل کیا ہے یہ الفاظ احمد کے ہیں ابنِ قدامہ نے بھی المغنی میں اور آمدی نے الاحکام میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث بہت مشہور ہے، معتبر مجتہدین نے اس کو لیا ہے، اس لیے یہ حسن ہے۔

یوں عام ولایت اور خاص ولایت دینا دونوں جائز ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ والی کو اس کی ذمہ داری کے بارے میں تفصیلاً یا اجمالاً تعلیمات مہیا کی جائیں۔ اگرچہ خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی والی کو عام ولایت دے اور کسی کو خاص ولایت دے مگر امیر معاویہ کو عام ولایت دینے سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ عثمانؓ کے دور میں خلیفہ کے اختیار سے نکل گئے اور خود مختار بن گئے۔ امیر معاویہ کے اوپر عثمانؓ کا اختیار نظر نہیں آتا تھا، پھر عثمانؓ کی وفات کے بعد بلادِ شام میں اس مکمل اختیار کی وجہ سے وہ فتنے پیدا ہوئے جو ناقابل بیان ہیں۔ پھر عباسی خلفاً کے دور میں بھی خلفاً کی کمزوریوں کی وجہ سے کئی صوبے خود مختار اور آزاد ہوگئے۔ حالات اتنے خراب ہوئے کہ خلیفہ کا ان کے اوپر کوئی کنٹرول نہیں رہا سوائے اس کے کہ خلیفہ کا نام لیکر دعائیں کی جاتی تھیں اور نقدی خلیفہ کے نام سے چھپتی تھی۔ اس لئے عام ولایت دینا ریاست کے لیے ضرر (نقصان) کا باعث بن سکتا ہے۔ لہٰذا ہر والی کو خاص ولایت دینی چاہیے تاکہ وہ خلیفہ سے آزاد نہ ہو سکے۔ خلیفہ سے آزاد ہونے میں فوج، مالیات اور قضاء (عدلیہ) کا بنیادی کردار ہوتا ہے کیونکہ فوج ہی طاقت ہے، مال زندگی کی شہ رگ ہے اور قضاء کے ذریعے حقوق کی حفاظت اور حدود کو قائم کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست والیوں کو خاص ولایت یعنی فوج، مالیات اور قضاء کو چھوڑ کر باقی امور پر اختیارات دے گی کیونکہ ان چیزوں کا والی کے ہاتھ میں ہونا خطرے سے خالی نہیں اور اس میں ریاست کے لیے ضرر کا اندیشہ ہے۔ اسی بنیاد پر اس دفعہ کی دوسرے حصے کو وضع کیا گیا ہے۔ اس دفعہ کی آخری حصے کا

جہاں تک تعلق ہے تو والی حکمران ہے اس لیے اس کے پاس قوتِ نافذہ ہونی چاہیے، لہٰذا پولیس اس کے احکامات کے تابع ہے تاہم پولیس بطور ایک ادارہ محکمہ داخلی امن کے ماتحت ہوتی ہے اس کا انتظام محکمہ امن داخلی کی ذمہ داری ہے اور والی پولیس کو استعمال کر سکتا ہے۔

دفعہ نمبر 55: والی کے اوپر ان امور کے بارے میں خلیفہ کو مطلع کرنا واجب نہیں جو اس کی امارت کے دائرہ اختیار میں ہیں اور وہ اپنے اختیارات کے مطابق ان امور کے متعلق اقدامات کرے، ان کے بارے میں خلیفہ کو آگاہ کرنا اختیاری ہے لازمی نہیں۔ اگر ایسا کوئی مسئلہ در پیش ہو جو پہلے کبھی نہیں ہوا تو اس کے بارے میں خلیفہ کو آگاہ کرنا ضروری ہے اور خلیفہ کو آگاہ کرنے کے بعد ہی اس کے بارے میں قدم اٹھا سکتا ہے تاہم انتظار کی صورت میں فساد کا خطرہ ہو تو خود اس کام کو نمٹائے گا اور اس کے بعد لازمی طور پر خلیفہ کو آگاہ کرے گا اور اس کام کی انجام دہی سے قبل خلیفہ کو خبر نہ دینے کی وجہ بھی بتائے گا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے والیوں کو ذمہ داریاں سپرد کیں اور کسی سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اپنے ہر کام کے بارے میں مجھے آگاہ کیا کرو اور وہ بھی ہر فیصلے کی خبر نہیں دیتے تھے بلکہ مکمل آزادی اور خود مختاری سے فیصلے کیا کرتے تھے اور ہر ایک اپنی امارت میں اپنی رائے کے مطابق حکومت کرتا تھا۔ معاذؓ یہی کیا کرتے تھے، عتاب بن اُسیدؓ یہی کرتے تھے، علاء بن الحضرمیؓ یہی کرتے تھے، بلکہ آپ ﷺ کے تمام والی اسی طرح حکومت کرتے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ والی کے لئے ہر چیز کے بارے میں خلیفہ کو باخبر رکھنا ضروری نہیں۔ اس معاملے میں والی معاون سے مختلف ہے، معاون کے لیے ہر چھوٹے اور بڑے معاملے میں خلیفہ کو باخبر رکھنا ضروری ہے جبکہ والی کے لیے ایسا کرنا لازمی نہیں۔ معاون کے حوالے سے خلیفہ پر بھی یہ لازم ہے کہ وہ معاون کی نگرانی کرے جبکہ والی کے حوالے سے خلیفہ کا اس پر نظر رکھنا فرض نہیں۔ والی اپنے اقدامات کے حوالے سے آزاد ہے یعنی اپنی ولایہ میں وہ با اختیار ہے یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے معاذؓ کو یمن روانہ فرمایا تو انہوں کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ والی ہر

معاملے میں خلیفہ سے رجوع نہیں کرے گا بلکہ اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کرے گا۔ تاہم اہم مسائل میں خلیفہ کی رائے لینا ممنوع نہیں لیکن غیر اہم مسائل میں وہ خلیفہ کی رائے کا انتظار نہیں کرے گا تاکہ لوگوں کے مفادات تعطل کا شکار نہ ہوں۔ جب کوئی ایسا واقعہ پیش ہو جو پہلے کبھی نہ ہوا ہو تب اس کے بارے میں فیصلہ خلیفہ کی رائے پر موقوف ہے کیونکہ والی کا اختیار اس کی ولایہ اور صوبے میں رہنے والے عوام، رعایا کے حوالے سے عام اور روزمرہ کے معاملات تک ہے۔ جب کوئی نئی اور انہونی چیز درپیش ہو تو خلیفہ سے رجوع کرنا ضروری ہے ہاں اگر تاخیر کی صورت میں فساد کا خطرہ ہو تو والی فوراً عملی اقدامات اٹھا کر بعد میں اس حوالے سے خلیفہ سے رجوع کرے گا اور تاخیر کا سبب بھی بتائے گا۔

دفعہ نمبر 56 : ہر ولایہ میں اہل ولایہ کی ایک منتخب اسمبلی ہوگی جس کا سربراہ خود والی ہوں گے اور اس اسمبلی کے پاس صرف انتظامی امور کے حوالے سے رائے دینے کا اختیار ہوگا حکمرانی کے معاملات میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یہ اختیار بھی دو مقاصد کے لیے ہوگا۔

پہلا مقصد: ولایہ کی زمینی حقائق اور ضروریات کے بارے میں والی کو ضروری معلومات مہیا کرنا اور اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا۔

دوسرا مقصد: والی کی حکمرانی کے حوالے سے اپنی رضامندی یا ناراضگی کا اظہار کرنا۔

پہلے مقصد کے حوالے سے اس اسمبلی کی رائے لازمی نہیں جبکہ دوسرے مقصد میں اس اسمبلی کی رائے لازمی اور واجب العمل ہے، جب اس مجلس نے والی کی شکایت کی تو اس کو معزول کر دیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ کے والیوں کے بارے میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ ان کی کوئی مجلس ولایہ ہوا کرتی تھی نہ ہی رسول اللہ ﷺ کے عمل سے کہیں یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے کوئی کمیٹی (مجلس ولایہ) منتخب کی ہو۔ خلفائے راشدینؓ کے حوالے سے بھی ایسی کوئی روایت نہیں کہ کسی نے مجلسِ ولایہ بنائی ہو اس لئے یہ

منتخب اسمبلی حکمرانی سے الگ ہے اور یہ کوئی حکمِ شرعی بھی نہیں کیونکہ حکومتی ادارہ حکومتی اعمال میں سے ہر وہ عمل ہے کہ جس کے لیے حکم شرعی کی ضرورت ہے اور جس کے لیے کوئی شرع دلیل نہیں وہ کام حکمرانی میں شامل نہیں۔ بلکہ اس کام کو دیکھا جائے گا اگر وہ کوئی ایسا فروعی کام ہو جس کی دلیل کا وجود ہو تو اس کو بغیر شرعی دلیل کے انجام دینا صحیح نہیں۔ حکومتی اعمال کو صرف شرعی دلیل کے مطابق ہی انجام دیا جاسکتا ہے۔ مجلسِ ولایہ ایک فروعی عمل ہے جو ولایہ کے کاموں کا جزو ہے۔ والی حکومت بھی کرے گا اور انتظام بھی کرے گا۔ اہل ولایہ اپنے ولایہ کے بارے میں والی سے بھی زیادہ بہتر جانتے ہیں وہاں کیا کچھ ہوتا ہے ان کو بہتر معلوم ہوتا ہے اس لیے والی کو ایسی معلومات کی ضرورت رہتی ہے جن سے معاملات کی دیکھ بھال اس کے لیے آسان بن جاتی ہے اور یہ معلومات اہلِ ولایہ ہی والی کو دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران اس کو اہل ولایہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ یہ تو ایک پہلو سے ہے جبکہ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ والی کی حکومت ایسی ہونی چاہیے کہ جس سے اہل ولایہ ناراض نہ ہوں کیونکہ اگر اہل ولایہ ناراض ہو جائیں تو خلیفہ اس والی کو برطرف کردے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے بحرین میں اپنے عامل علاء بن الحضرمیؓ کو اس لیے معزول کر دیا کہ عبد قیس کے وفد نے ان کی شکایت کی، اس کو ابن سعد نے الطبقات میں ذکر کیا ہے۔ لہٰذا والی کو حکومت کرتے ہوئے اہل ولایہ کی رائے سے ہر وقت باخبر رہنا چاہیے۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا وہ راضی ہیں یا ناراض اور اس کے لیے بھی اس کو اہل ولایہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔ ان دو وجوہات کی بنا پر یعنی ضروری معلومات کے حصول اور اہل ولایہ کی رائے لینے کے لیے اہل ولایہ کی طرف رجوع ضروری ہے۔ اس رجوع کو آسان بنانے کے لیے اہل ولایہ کی مجلس ان کی نمائندگی کرے گی۔ اس مجلس کی رائے پہلے معاملے میں لازم نہیں جبکہ دوسرے معاملے میں اس کی رائے لازمی ہے اور ان کی طرف سے شکایت کی صورت میں والی کو معزول کیا جائے گا۔ اس مجلس کی بنیاد عمر بن عبد العزیزؒ نے رکھی وہ خلیفہ بننے سے قبل مدینہ منورہ کے والی تھے وہ جب بھی حکومتی امور کے لیے مجلس لگاتے تھے اہل رائے اور علاقائی قائدین میں سے دو افراد کو اپنے پاس بٹھاتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ یہ آزمائش اور امتحان کی مجلس ہے تمہارا اس کے علاوہ کوئی کام نہیں کہ تم مجھ

پر نظر رکھو (یعنی میری نگرانی کرو) تم میرے بارے میں ایسی کوئی چیز دیکھو جو حق کے موافق نہیں تو مجھے ڈراؤ اور مجھے اللہ عزوجل کی یاد دلاؤ۔ اہم کام اہل ولایہ کی طرف رجوع کرنا ہے اور ان کی جانب سے والی کی نگرانی ہے اور اس رجوع تک پہنچنے کے لیے والی کے ساتھ ایک مجلس ولایہ ہونی چاہیے۔

دفعہ 57 : ایک ولایہ پر ایک ہی شخص کا طویل مدت تک والی رہنا مناسب نہیں۔ خاص طور پر کسی ایک ولایہ میں وہ مرکزی شخصیت بن جائے یا اس کی وجہ سے لوگوں کے فتنے میں پڑنے کا خطرہ ہو۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ والی مقرر کرتے پھر کچھ عرصے کے بعد ان کو معزول کرتے۔ کم ہی کوئی والی رسول اللہ ﷺ کے پورے عہد میں بر سر اقتدار رہا ہو۔ ابن عبد البر نے الاستیعاب میں واقعہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات تک عثمان بن ابی العاص طائف کے عامل رہے آپ ﷺ کے بعد ابو بکرؓ کی خلافت میں بھی وہ عامل رہے پھر عمرؓ کی خلافت میں بھی دو سال تک عامل رہے پھر عمرؓ نے ان کو معزول کیا۔ ولایت کا یہ معاملہ شاذونادر ہے کیونکہ زیادہ تر ایسا ہی ہوتا تھا کہ آپ ﷺ کسی کو طویل مدت تک والی برقرار نہیں رکھتے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی کی ولایت دائمی نہیں ہوتی بلکہ ایک مدت کے بعد اس کو سبکدوش کیا جاتا ہے۔ تاہم کسی والی کی مدت ولایت کتنی لمبی یا کتنی تھوڑی ہوتی ہے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے فعل سے کوئی ثبوت نہیں ملتا، صرف اتنا معلوم ہے کہ آپ ﷺ والی مقرر کرتے تھے اور کچھ عرصے بعد ان کو معزول کرتے تھے۔ عثمان بن ابی العاص کی طویل ولایت سے اگرچہ اس کا جواز ثابت ہوتا ہے کہ والی ایک طویل مدت کے لیے ہو سکتا ہے لیکن عمرؓ اور عثمانؓ کے دور میں معاویہ کی طویل ولایت نے ایسے فتنے کو جنم دیا جس نے مسلمانوں کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا اور اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ کسی والی کی ولایت کو طول دینا مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے لیے نقصان اور ضرر کا باعث ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ والی کو مدت ولایت طویل نہیں ہوگی اور اسی بنیاد پر اس دفعہ کو وضع کیا گیا ہے۔

دفعہ نمبر 58: والی کا ایک ولایہ سے دوسرے ولایہ میں تبادلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی ولایت ایک خاص جگہ کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔ہاں یہ ہو سکتا ہے کی اس کو برطرف کرکے دوبارہ کسی دوسرے صوبے کا والی مقرر کیا جائے۔

اس کی دلیل رسول ﷺ کا عمل ہے۔ آپ ﷺ والیوں کو معزول تو کرتے تھے لیکن کبھی کسی والی کو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں منتقل نہیں کیا۔ یہ بات بھی ہے کہ ولایت بھی دوسرے عقود کی طرح ایک عقد ہے جو صریح الفاظ سے مکمل ہوتا ہے۔اس لیے ولایت کے عقد میں صوبے یا علاقے کا واضح طور پر ذکر ہوتا ہے اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ کہاں سے کہاں تک حکمران ہے اور اس وقت تک اس کو اس علاقے پر حکمران کا اختیار حاصل ہے جب تک خلیفہ اس کو معزول نہ کرے۔ اگر وہ اس کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل کرتا ہے تو وہ اپنی پہلی جگہ سے معزول نہیں ہوتا اور دوسرے علاقے میں والی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ پہلی جگہ سے اس کو فارغ کرنے کے لیے صریح الفاظ میں اس کو ولایت سے معزول کرنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر دوسرے علاقے میں اس کی تعیناتی کے لیے بھی نئے سرے سے اس کے ساتھ ولایت کا عقد کرنا پڑتا ہے جس میں اس نئے علاقے کا ذکر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ والی کا ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبادلہ نہیں ہوتا بلکہ نئے سرے سے تقرری کی ضرورت ہوتی ہے اور پہلے صوبے سے معزول کرنا بھی ضروری ہے اور نئے صوبے کے لیے نئی تقرری بھی ضروری ہے۔

دفعہ نمبر 59: خلیفہ جب چاہے والی کو سبکدوش کر سکتا ہے یا پھر مجلس امت اس پر عدم اعتماد کا اظہار کر دے، یا مجلس ولایہ اس سے ناراضگی کا اظہار کرے، تو اسے معزول کیا جائے گا۔ بہر حال اس کو معزول خلیفہ ہی کرے گا۔

اس کی دلیل بھی رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے۔ آپ ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کا والی مقرر فرمایا پھر بغیر وجہ بتائے ان کو معزول کر دیا۔ اسی طرح بحرین میں اپنے عامل علاء بن حضرمی کو اس لیے معزول کر دیا کہ بنو قیس کے وفد نے ان کی شکایت کر دی۔ عمر بن خطابؓ بھی کسی سبب سے یا بغیر کسی سبب کے والیوں کو معزول کیا کرتے تھے، چنانچہ زیاد بن ابی سفیان کو معزول کر دیا لیکن کوئی وجہ نہیں بتائی جبکہ سعد بن ابی وقاصؓ کو اس لیے معزول کر دیا کیونکہ لوگوں نے ان کی شکایت کی تھی، تب آپؓ نے فرمایا میں نے کسی کمزوری یا خیانت کی وجہ سے ان کو معزول نہیں کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ جب چاہے والی کو معزول کر سکتا ہے۔ اگر مجلس ولایہ اس کی شکایت کرے تب بھی اس کو معزول کر سکتا ہے کیونکہ مجلس ولایہ اہل ولایہ کی نمائندہ ہوتی ہے اسی طرح اگر مجلس امت یا (مجلس شوریٰ) اس کی شکایت کرے تب بھی اس کو معزول کرے گا کیونکہ یہ مجلس تمام صوبے کی نمائندہ ہوتی ہے۔

دفعہ نمبر 60: خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ والیوں کے اعمال پر نظر رکھے اور ان کی کڑی نگرانی کرے۔ وہ ان پر نظر رکھنے کے لیے نائب بھی مقرر کر سکتا جو ان کے حالات سے خلیفہ کو باخبر رکھے اور ان کے بارے میں تفتیش کرتا رہے۔ کبھی کبھار ان سب والیوں کا اجتماعی یا پھر الگ الگ اجلاس بلاتا رہے اور ان کے بارے میں رعایا کی شکایتوں سے ان کو باخبر کرتا رہے۔

یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کو والی مقرر کرتے تھے تو اس کا امتحان بھی لیتے تھے جیسا کہ معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰؓ کا امتحان لیا اور ان کو یہ بھی بتاتے تھے کہ کیسے حکمرانی کرو گے جیسا کہ عمر بن حزم کو بتایا اور ان کو وہ مشہور تحریر لکھ دی جو اہل علم جانتے ہیں۔ جیسا کہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اور الحافظ نے الأصابہ میں کہا ہے کہ (**... واستعمل النبي ﷺ عمرو بن حزم على نجران..**)"... نبی ﷺ نے عمرو بن حزم کو نجران کا عامل مقرر کیا..." پھر اس تحریر (خط) کو بھی نقل کیا ہے جو ان کو فرائض اور دیت کے بارے میں بھیجا تھا۔ اس کو ابو داؤد، نسائی، ابنِ حبان اور دارمی وغیرہ نے نقل

کیا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ بعض اہم امور کے بارے میں ان کو تنبیہ بھی کرتے رہتے تھے، جیسا کہ ابان بن سعید کو بحرین کا والی مقرر کرتے وقت کیا، اور یہ ابنِ سعد کی الطبقات میں مذکور ہے جنہوں نے واقدی کے حوالے سے اس کو نقل کیا ہے کہ «اسْتَوْصِ بِعَبْدِ قَيْسٍ خَيْراً، وَأَكْرِمْ سَرَاتَهِمْ» ”عبد قیس کو خیر اور بھلائی کی وصیت کیا کرو اور ان کے بڑوں کا احترام کرو“۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ والیوں کا احتساب بھی کیا کرتے تھے، ان کی حالات معلوم کیا کرتے تھے اور ان کے حوالے سے ملنے والی اطلاعات کو سنتے تھے۔ جیسا کہ ابی حمید ساعدی نے کہا ہے «اسْتَعْمَلَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلاً مِنْ بَنِي أَسْدٍ يُقَالُ لَهُ ابْنُ اللُّتَبِيَّةِ عَلَى صَدَقَةٍ فَلَمَّا قَدِمَ قَالَ هَذَا لَكُمْ وَهَذَا أُهْدِيَ لِي فَقَامَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى الْمِنْبَرِ قَالَ سُفْيَانُ أَيْضًا فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ الْعَامِلِ نَبْعَثُهُ فَيَأْتِي يَقُولُ هَذَا لَكَ وَهَذَا لِي فَهَلاَّ جَلَسَ فِي بَيْتِ أَبِيهِ وَأُمِّهِ فَيَنْظُرُ أَيُهْدَى لَهُ أَمْ لاَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لاَ يَأْتِي بِشَيْءٍ إِلاَّ جَاءَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَحْمِلُهُ عَلَى رَقَبَتِهِ إِنْ كَانَ بَعِيرًا لَهُ رُغَاءٌ أَوْ بَقَرَةً لَهَا خُوَارٌ أَوْ شَاةً تَيْعَرُ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتَّى رَأَيْنَا عُفْرَتَيْ إِبْطَيْهِ أَلاَ هَلْ بَلَّغْتُ ثَلاَثاً» ”نبی ﷺ نے بنی اسد کے ایک فرد کو صدقہ (زکوٰۃ) جمع کرنے کا کام سونپ دیا جب وہ واپس آیا تو کہا یہ آپ ﷺ کا ہے اور یہ میرا تحفہ ہے۔ اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ اس عامل کو کیا ہو گیا ہے وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہیں بیٹھتا ہے تا کہ دیکھے کہ اس کے پاس ہدیہ آتا ہے کہ نہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ ایسی کوئی بھی چیز لے کر آیا ہے، تو قیامت کے دن اس چیز کو اپنے کندھے پر اٹھا کر لائے گا اگر وہ اونٹ یا گائے یا بھیڑ بکری ہے تو وہ آواز نکال رہی ہو گی۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ ہم نے آپ ﷺ کے بغل مبارک بھی دیکھ لی اور تین بار فرمایا کیا میں نے (پیغامِ حق) پہنچا نہیں دیا“ (متفق علیہ)۔

عمرؓ بھی والیوں پر کڑی نظر رکھتے تھے، آپؓ نے محمد بن مسلمہؓ کو والیوں کے بارے میں معلومات اکھٹا کرنے اور ان کی حالات جاننے کی ذمہ داری سونپ دی تھی اور ہر حج کے موسم والیوں کو بلا لیتے تھے اور جائزہ لیتے تھے کہ انہوں نے کیا کچھ کیا۔ ان کے بارے میں رعایا کی شکایات بھی سنتے تھے ولایت کے معاملات میں ان

سے بحث اور گفتگو بھی کرتے تھے اور ان کی حالت سے باخبر رہتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ عمرؓ نے ایک دن اپنے پاس موجود لوگوں سے کہا: کیا خیال ہے جب میں تم سے سب سے زیادہ علم رکھنے والے اور بہتر آدمی کو تمہارے اوپر عامل مقرر کروں اور اس کو عدل و انصاف کا حکم بھی دوں تو کیا میری ذمہ داری پوری ہوگئی ؟ لوگوں نے کہا جی ہاں۔ فرمایا نہیں اس وقت تک نہیں کہ میں یہ دیکھ نہ لوں کہ آیا اس نے میرے اس حکم پر عمل بھی کیا ہے یا نہیں؛اس کو بیھقی نے سنن اور شعب میں طاؤوس کے حوالے نقل کیا ہے۔ عمرؓ اپنے والیوں اور عاملوں کے احتساب کے معاملے میں بڑے سخت تھے، یہ سختی اس قدر تھی کی کبھی کبھی تو انتہائی معمولی شک وشبہ کی بنیاد پر والی کو معزول کرتے تھے۔ ایک دن جب اس حوالے سے آپؓ سے پوچھا گیا تو فرمایا "وہ سب سے معمولی اور آسان چیز جس سے میں کسی قوم کی اصلاح کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں ان کے امیر کو تبدیل کر کے ان کو دوسرا امیر دوں"۔ اس کو ابن شبہ نے تاریخ مدینہ میں ذکر کیا ہے۔ ابنِ سعد نے بھی الطبقات میں الحسن کے حوالے اس کو نقل کیا ہے۔ اس تمام تر سختی کے باوجود وہ ان کے ہاتھوں کو کھلا چھوڑتے تھے اور حکمرانی کے حوالے سے ان کی ہیبت (رعب دبدبہ) کی حفاظت کرتے تھے، ان کی بات سنتے تھے، ان کے دلائل پر غور کرتے تھے۔ جب کسی کی حجت اور دلیل آپؓ کو پسند آتی تو اس کے اظہار اور تعریف میں بالکل تردد نہ کرتے تھے بلکہ کھلم کھلا اس کی تعریف کرتے۔ ایک دن آپ کو خبر ملی کہ حمص پر آپؓ کے عامل عمیر بن سعد نے بر سر منبر کہا کہ "جب تک سلطان (اقتدار) مضبوط ہو اسلام عروج پر رہے گا، سلطان کی مضبوطی اور طاقت تلوار سے قتل یا کوڑے مارنے سے نہیں بلکہ حق کے مطابق فیصلے کرنے اور عدل و انصاف کرنے میں ہے"۔ اس کو ابنِ سعد نے الطبقات میں سعد بن سوید سے روایت کی ہے۔ اس پر عمرؓ نے کہا میرا دل کرتا ہے کہ میرے پاس بھی عمیر بن سعید جیسا آدمی ہوتا تو مسلمانوں کے امور کے حوالے سے میں اس سے مدد لیتا۔

امیر جہاد: شعبہ حرب-افواج

دفعہ نمبر 61: محکمہ حرب، ملٹری فورسز یعنی فوج اور پولیس سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار ہے جس میں معاہدات، مہمات اور فوجی سازوسامان وغیرہ شامل ہیں۔ وہ ملٹری کالجز، فوجی معرکوں اور فوج کے لئے ضروری اسلامی ثقافت، عسکری تربیت اور جنگی تیاری سے متعلق ہر چیز کا ذمہ دار بھی ہے، یہی محکمہ حرب ہے اور اس محکمے کے سربراہ کو امیر جہاد کہا جاتا ہے۔

محکمہ حرب ریاستی اداروں میں سے ایک ادارہ ہے اور اس کے سربراہ کو امیر جہاد کہا جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ فوجی سربراہوں کو امیر کہتے تھے۔ ابن سعد نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «أَمِيرُ النَّاسِ زَيْدُ بن حَارِثَةَ، فَإِنْ قُتِلَ فَجَعْفَرُ بْنُ أَبِي طَالِبٍ، فَإِنْ قُتِلَ فَعَبْدُ اللَّهِ بْنُ رَوَاحَةَ، فَإِنْ قُتِلَ فَلْيَرْتَضِ المُسْلِمُونَ بَيْنَهُمْ رَجُلاً فَيَجْعَلُوهُ عَلَيْهِمْ» ”اور لوگوں کے امیر زید بن حارثہؓ ہیں، اگر وہ قتل ہو گئے تو جعفر بن ابی طالبؓ ہوں گے، وہ قتل ہو گئے تو عبد اللہ بن رواحہؓ ہوں گے اور اگر وہ قتل ہو جائیں تو مسلمان آپس میں رضامندی سے ایک آدمی کو اپنا امیر مقرر کریں“۔ بخاری نے عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ **«أَمَّرَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فِي غَزْوَةِ مُؤْتَةَ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ ...»** ”رسول اللہ ﷺ نے غزوہ موتہ میں زید بن حارثہؓ کو امیر مقرر کیا“۔ بخاری نے ہی سلمہ بن الاکوع کی حدیث روایت کی ہے کہ **«وَغَزَوْتُ مَعَ زَيْدٍ، وَكَانَ يُؤَمِّرُهُ عَلَيْنَا»** ”اور میں نے زیدؓ کے ساتھ مل کر جہاد کیا؛ انہیں ہمارا امیر بنایا گیا“۔ بخاری اور مسلم نے عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ **«بَعَثَ النَّبِيُّ ﷺ بَعْثًا وَأَمَّرَ عَلَيْهِمْ أُسَامَةَ بْنَ زَيْدٍ، فَطَعَنَ بَعْضُ النَّاسِ فِي إِمَارَتِهِ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : أَنْ تَطْعُنُوا فِي إِمَارَتِهِ فَقَدْ كُنْتُمْ تَطْعُنُونَ فِي إِمَارَةِ أَبِيهِ مِنْ قَبْلُ، وَايْمُ اللَّهِ إِنْ كَانَ لَخَلِيقًا لِلإِمَارَةِ ...»** ” اور رسول اللہ ﷺ نے ایک فوجی یونٹ اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں مہم کے لئے روانہ کی، تو بعض لوگوں نے ان کی امارت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: تم لوگ اس کی امارت کو پسند نہیں کرتے جیسے اس سے پہلے اس کے باپ کی امارت کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اللہ کی قسم وہ تو پیدائشی امیر تھے..." ۔ صحابہؓ موتہ کی فوج کو جیش الأمراء کہتے تھے۔ مسلم نے بریدہ سے روایت کی ہے کہ **«كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَمَّرَ أَمِيرًا عَلَى جَيْشٍ أَوْ سَرِيَّةٍ أَوْصَاهُ ...»** "رسول اللہ ﷺ جب بھی کسی کو کسی جیش یا سریہ کا امیر مقرر کرتے تو اس کو وصیت کرتے ..." ۔ محکمہ حرب اس دفعہ میں مذکور طریقہ کار کے مطابق ملٹری فورسز سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار ہے۔

حربی کفار کے خلاف جاسوسی نیٹ ورک اور اس مقصد کے حصول کے لئے ایک ادارے کا قیام بھی محکمہ جنگ کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔ اس کے دلائل میں جنگی محکمے سے متعلق وہ مشہور کام ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں مذکور ہیں اور ان دلائل میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔ جنگی تیاری کے بارے میں دلائل میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ** ترجمہ: اور تم ان کے مقابلے کے لئے اپنی مقدور بھر قوت اور گھوڑوں کو تیار رکھو کہ اس سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ اوروں کو بھی، جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں خوب جانتا ہے، خوف زدہ رکھ سکو اور جو کچھ بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا (الانفال:60)۔ ابنِ سعد نے الطبقات میں مکحول سے روایت کیا ہے کہ **(أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَصَبَ المِنْجَنِيقَ عَلَى أَهْلِ الطَّائِفِ أَرْبَعِينَ يَوْماً)** "رسول اللہ ﷺ نے چالیس دن تک اہل طائف پر منجنیقیں نصب کیے رکھیں"۔ ابنِ هشام نے سیرۃ میں کہاہے کہ **(حَدَّثَنِي مَنْ أَثِقُ بِهِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ أَوَّلُ مَنْ رَمَى فِي الإِسْلاَمِ بِالمِنْجَنِيقِ)** "اور مجھے اس شخص نے بتایا جس پر مجھے اعتماد ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے منجنیق استعمال کی"۔

جنگی مشقوں کے دلائل:

مسلم نے عقبہ بن عامرؓ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس وقت یہ فرماتے ہوئے سنا جب آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ أَلاَ إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلاَ إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلاَ إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ** "اور ان کے مقابلے میں مقدور بھر قوت کے ساتھ تیاری کرو۔ اور سنو! قوت سے مراد نشانہ بازی ہے، سنو! قوت سے مراد نشانہ بازی ہے، سنو! قوت سے مراد نشانہ بازی ہے"۔ بخاری نے سلمہؓ بن الاکوع سے روایت کی ہے کہ «**مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى نَفَرٍ مِنْ أَسْلَمَ يَنْتَضِلُونَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : ارْمُوا بَنِي إِسْمَاعِيلَ فَإِنَّ أَبَاكُمْ كَانَ رَامِيًا، ارْمُوا وَأَنَا مَعَ بَنِي فُلاَنٍ، قَالَ: فَأَمْسَكَ أَحَدُ الْفَرِيقَيْنِ بِأَيْدِيهِمْ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : مَا لَكُمْ لاَ تَرْمُونَ ؟ فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، نَرْمِي وَأَنْتَ مَعَهُمْ ؟ قَالَ: ارْمُوا وَأَنَا مَعَكُمْ كُلِّكُمْ**» "رسول اللہ ﷺ بنو اسلم کے کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے تو فرمایا: اے بنو اسماعیل نشانہ بازی کیا کرو تمہارے باپ دادا تو نشانہ باز تھے، نشانہ بازی کرو میں فلاں قبیلے کے ساتھ ہوں۔ راوی کہتا ہے کہ ایک فریق (ٹیم) نے نشانہ بازی سے ہاتھ کھینچ لئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم کیوں نشانہ بازی نہیں کرتے ؟ تو انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ ان (مدِ مقابل ٹیم) کے ساتھ ہوں تو ہم کیسے نشانہ بازی کریں گے ؟ فرمایا: شروع کرو میں تم سب کے ساتھ ہوں"۔

مسلم نے روایت کیا ہے کہ "فقیم اللخمی نے عقبہ بن عامر سے کہا کہ تم اس بڑھاپے میں بھی اس قدر مشقت کرتے ہو (نشانہ بازی اور جنگی مشق کرتے ہو) تو عقبہ نے کہا کہ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کا وہ فرمان نہیں سنا ہوتا تو کبھی ایسا نہ کرتا۔ تو حارث نے کہا کہ بتاؤ اے ابن شمامہ: وہ کیا فرمان ہے؟ انہوں نے کہا کہ «**مَنْ عَلِمَ الرَّمْيَ ثُمَّ تَرَكَهُ فَلَيْسَ مِنَّا، أَوْ قَدْ عَصَى**» " جس نے نشانہ بازی سیکھ لی اور چھوڑ دی تو وہ ہم میں سے نہیں یا وہ نافرمان ہے"، ابو داؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح بھی قرار دیا ہے اور ذھبی نے ان کی موافقت بھی کی ہے، الفاظ ابو داؤد کے ہیں۔ خالد بن زید نے کہا کہ: میں عقبہ بن عامر کے نشانہ بازوں میں تھا ایک دفعہ وہ میرے پاس سے گزرے اور کہا: اے خالد چلو جا کر نشانہ بازی کرتے ہیں، میں نے تھوڑی دیر کر دی تو کہا: اے خالد آؤ میں تمہیں وہ حدیث سناتا ہو جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے اور تمہیں ایسا ہی بتاتا ہو

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بتایا تھا: (إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ يُدْخِلُ بِالسَّهْمِ الْوَاحِدِ ثَلاَثَةَ نَفَرٍ الْجَنَّةَ: صَانِعَهُ يَحْتَسِبُ فِي صَنْعَتِهِ الْخَيْرَ، وَالرَّامِيَ بِهِ، وَمُنْبِلَهُ، وَارْمُوا وَارْكَبُوا، وَأَنْ تَرْمُوا أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ تَرْكَبُوا، لَيْسَ مِنْ اللَّهْوِ إِلاَّ ثَلاَثٌ: تَأْدِيبُ الرَّجُلِ فَرَسَهُ، وَمُلاعَبَتُهُ أَهْلَهُ، وَرَمْيُهُ بِقَوْسِهِ وَنَبْلِهِ، وَمَنْ تَرَكَ الرَّمْيَ بَعْدَ مَا عَلِمَهُ رَغْبَةً عَنْهُ فَإِنَّهَا نِعْمَةٌ تَرَكَهَا أَوْ قَالَ كَفَرَهَا) ''اللہ تعالیٰ ایک تیر کی وجہ سے تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرے گا: اس تیر کو بنانے والے کو جس نے اس کو بناتے وقت اچھا بنایا۔ اس تیر کو پھینکے والے کو، اور تیر انداز کی مدد کرنے والے کو۔ نشانہ بازی اور گھڑ سواری کیا کرو، اور نشانہ بازی مجھے گھڑ سواری سے زیادہ پسند ہے۔ تین چیزیں کھونی نہیں ہیں: آدمی کا اپنے گھوڑے کو تربیت دینا، اپنے گھر والوں سے کھیلنا اور تیر کمان سے نشانہ بازی کرنا۔ جس کسی نے سیکھنے کے بعد اس کو غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیا تو اس نے ایک نعمت کو ٹھکرادیا، یا (شائد) نبی ﷺ نے فرمایا کہ ناشکری کی''۔

فوج کے لئے لازمی ثقافت تعلیم وتربیت کی دلائل:

سورۃ توبہ میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰہِ ۚ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِهٖ ؕ وَذٰلِکَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ہ اَلتَّآئِبُوۡنَ الۡعٰبِدُوۡنَ الۡحٰمِدُوۡنَ السَّآئِحُوۡنَ الرّٰکِعُوۡنَ السّٰجِدُوۡنَ الۡاٰمِرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَالنَّاهُوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَالۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰہِ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ''بلا شبہ اللہ تعالی نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ لوگ اللہ کہ راہ میں لڑتے ہیں جس میں وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔ اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں، انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدوں کو کون پورا کرنے والا ہے، تو تم لوگ اپنی بیع (تجارت) پر جس کا تم سے معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، (جہاد کے لیے) سفر کرنے والے، رکوع اور سجدہ کرنے

امر بالمعروف کرنے والے، نہی عن المنکر کرنے والے اللہ کی حدود کا خیال کرنے والے ہیں اور ایسے مومنین کو آپ ﷺ خوشخبری سنا دیجئے"(التوبہ:111-112)۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کی خوشخبری پانے کے لیے ہماری طرف سے جان ومال کی قربانی کو کافی قرار نہیں دیا بلکہ اس سے بڑھ کر توبہ کرنے، عبادت کرنے، روزہ رکھنے، نماز پڑھنے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے اور اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کرنے بلکہ ان حدود سے ایک حد تک فاصلہ رکھنے میں ہماری سلامتی کی ضمانت بتائی۔ اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ** "اے ایمان والو! تم ثابت قدم رہو، ایک دوسرے کو تھامے رکھو اور جہاد کے لیے تیار رہو اور اللہ تعالی سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ" (آل عمران:200)۔ بخاری اور مسلم نے سہل بن سعد ساعدیؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(رِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللهِ خَيْرٌ مِنْ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا، وَمَوْضِعُ سَوْطِ أَحَدِكُمْ مِنْ الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِنْ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا، وَالرَّوْحَةُ يَرُوحُهَا الْعَبْدُ فِي سَبِيلِ اللهِ، أَوْ الْغَدْوَةُ، خَيْرٌ مِنْ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا)** "اللہ کی راہ میں ایک رات (اسلامی ریاست کی) سرحد (بارڈر) پر گزارنا، دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس سے بہتر ہے۔ جنت میں ایک کوٹھری دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس سے بہتر ہے۔ ایک صبح یا ایک شام جو کوئی بندہ جہاد میں گزارتا ہے وہ دنیا اور اس کے اوپر جو کچھ واقع ہے اس سے بہتر ہے"۔ بخاری نے عبد اللہ بن ابی اوفیؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **وَاعْلَمُوا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ** "جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے"۔ بخاری نے عبد الرحمٰن بن جبیر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ** "اللہ کی راہ میں بندے کے قدم کے جتنے حصے کو گرد وغبار لگ جائے اس حصے کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی"۔ اس کے راوی حاکم ہیں جس کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے۔ عمران بن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(مَقَامُ الرَّجُلِ فِي الصَّفِّ فِي سَبِيلِ اللهِ أَفْضَلُ عِنْدَ اللهِ مِنْ عِبَادَةِ الرَّجُلِ سِتِّينَ سَنَةً)** "اللہ کی راہ میں کسی آدمی کا صف میں کھڑا ہونا اللہ کے نزدیک ساٹھ سال کی عبادت سے زیادہ بہتر ہے"۔ بخاری میں ابوہریرہؓ

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(إِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ أَعَدَّهَا اللَّهُ لِلْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، مَا بَيْنَ الدَّرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ)** "جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالی نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کر رکھے ہیں۔ دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین اور آسمان کے درمیان ہے"۔ مسلم نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ **"فَدَنَا الْمُشْرِكُونَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: قُومُوا إِلَى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالأَرْضُ، قَالَ: يَقُولُ عُمَيْرُ بْنُ الْحُمَامِ الأَنْصَارِيُّ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، جَنَّةٌ عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالأَرْضُ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: بَخٍ بَخٍ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: مَا يَحْمِلُكَ عَلَى قَوْلِكَ بَخٍ بَخٍ؟ قَالَ لاَ وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِلاَّ رَجَاءَةَ أَنْ أَكُونَ مِنْ أَهْلِهَا، قَالَ: فَإِنَّكَ مِنْ أَهْلِهَا، فَأَخْرَجَ تَمَرَاتٍ مِنْ قَرَنِهِ فَجَعَلَ يَأْكُلُ مِنْهُنَّ، ثُمَّ قَالَ: لَئِنْ أَنَا حَيِيتُ حَتَّى آكُلَ تَمَرَاتِي هَذِهِ إِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيلَةٌ، قَالَ: فَرَمَى بِمَا كَانَ مَعَهُ مِنَ التَّمْرِ ثُمَّ قَاتَلَهُمْ حَتَّى قُتِلَ"** "مشرکین کے ساتھ ہماری مڈبھیڑ ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس جنت کے حصول کے لیے کھڑے ہو جاؤ جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، راوی کہتا ہے کہ یہ سن کر عمیر بن حمام انصاری نے پوچھا: اے اللہ کے رسول جنت! جس کی چوڑائی زمین اور آسمانوں کے برابر ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے کہا ہاں۔ تو فرمایا! واہ واہ، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے واہ واہ کیوں کہا؟ انہوں نے کہا نہیں، اللہ کی قسم! کچھ نہیں، اے اللہ کے رسول، صرف اس امید پر کہ میں بھی اہل جنت میں سے ہو جاؤں، فرمایا: تم تو اہلِ جنت میں سے ہو۔ یہ سن کر انہوں نے اپنی تھیلی سے کھجور نکال کر کھانے لگے پھر کہا اگر ان کھجوروں کو کھانے تک میں زندہ رہا تو یہ ایک لمبی زندگی ہے۔ راوی کہتا ہے کہ انہوں نے بقیہ کھجور پھینک دیں اور لڑائی شروع کر دی حتی کہ شہید کئے گئے"۔

جہاد کے لیے حوصلہ بڑھانے کے دلائل:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: **فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ**

تَنْكِيْلًا ”آپ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہیں، آپ کو آپ کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جائے گی۔ اور ایمان والوں کو ترغیب دیتے رہیں، عنقریب اللہ تعالیٰ کفار کی قوت کو روک دے گا اور اللہ تعالیٰ سخت قوت والا ہے اور سزا دینے میں بھی سخت ہے“(النساء:84)۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے کہ: **يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۚ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ** ”اے نبی ایمان والوں کو جہاد کا شوق دلاؤ، اگر تم میں صبر کرنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں ایک سو ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب رہیں گے، اس واسطے کہ وہ بے سمجھ لوگ ہیں“(الانفال:65)۔ ابنِ اسحاق کی ایک روایت ہے کہ **(ثُمَّ خَرَجَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِلَى النَّاسِ فَحَرَّضَهُمْ وَقَالَ: وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لاَ يُقَاتِلُهُمُ اليَوْمَ رَجُلٌ فَيُقْتَلُ صَابِراً مُحْتَسِباً مُقْبِلاً غَيْرَ مُدْبِرٍ إِلاَّ أَدْخَلَهُ اللّهُ الْجَنَّةَ ...)** ”پھر رسول اللہ ﷺ لوگوں کے پاس تشریف لائے اور انھیں شوق دلایا اور فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آج جو شخص بھی ان سے ایسا لڑا کہ صبر کرتا ہو، ثواب کی نیت سے آگے بڑھتا جائے اور پیچھے نہ ہٹے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کر دے گا“۔ احمد نے صحیح اسناد کے ساتھ ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ **(... فَنَظَرَ فَرَآنِي فَقَالَ: يَا أَبَا هُرَيْرَةَ، فَقُلْتُ: لَبَّيْكَ رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ فَقَالَ: اهْتِفْ لِي بِالأَنْصَارِ وَلاَ يَأْتِينِي إِلاَّ أَنْصَارِيٌّ، فَهَتَفْتُ بِهِمْ فَجَاءُوا، فَأَطَافُوا بِرَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ: تَرَوْنَ إِلَى أَوْبَاشِ قُرَيْشٍ وَأَتْبَاعِهِمْ ؟ ثُمَّ قَالَ بِيَدَيْهِ إِحْدَاهُمَا عَلَى الأُخْرَى: حَصْدًا حَتَّى تُوَافُونِي بِالصَّفَا ...)** ”... نظر دوڑا کر مجھے دیکھا اور فرمایا: اے ابو ہریرہ، میں نے کہا، اے اللہ کے رسول ﷺ میں حاضر ہوں تو فرمایا: انصار کو میرے پاس بلاؤ، انصار کے علاوہ کوئی میرے پاس نہ آئے۔ میں نے انصار کو آواز دی تو وہ آگئے اور رسول اللہ ﷺ کے ارد گرد جمع ہو گئے، تو فرمایا: تم قریش کے اوباشوں اور ان کے پیچھے چلنے والوں کو دیکھ رہے ہو؟ پھر ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر فرمایا: ان کو قتل کرو یہاں تک کہ تم مجھے صفا پر ملو“۔ مسلم نے عباسؓ بن عبد المطلب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: **(شَهِدْتُ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ يَوْمَ حُنَيْنٍ ... فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : أَيْ عَبَّاسُ، نَادِ أَصْحَابَ السَّمُرَةِ، فَقَالَ عَبَّاسٌ**

- وَكَانَ رَجُلاً صَيِّتاً - فَقُلْتُ بِأَعْلَى صَوْتِي: أَيْنَ أَصْحَابُ السَّمُرَةِ، قَالَ: فَوَاللَّهِ لَكَأَنَّ عَطْفَتَهُمْ حِينَ سَمِعُوا صَوْتِي عَطْفَةُ الْبَقَرِ عَلَى أَوْلَادِهَا، فَقَالُوا: يَا لَبَّيْكَ يَا لَبَّيْكَ ...) ”جنگ حنین میں مَیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شریک تھا... رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عباسؓ سمرہ کے ساتھیوں کو آواز دو، عباسؓ جو کہ انتہائی اونچی آواز والے تھے، نے کہا سمرہ کے ساتھی کہاں ہیں۔ عباسؓ کہتے ہیں کہ اللہ کی قسم! جب انہوں نے میرے آواز سنی تو ایسے لپکے جیسے بچھڑا گائے کی آواز سن کر اس کی طرف لپکتا ہے اور کہنے لگے لبیک لبیک...“۔

دشمن سے آمنا سامنا ہونے کی صورت میں صبر کرنے اور صبر کی تلقین کرنے کے دلائل :

ارشادِ باری تعالیٰ ہے **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ** ”اے ایمان والو! جب تم کسی مخالف فوج سے بھڑ جاؤ تو ثابت قدم رہو اور بکثرت اللہ کو یاد کرو تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو“(الانفال:45)۔ اور فرمایا: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ** ”اے ایمان والو! تم ثابت قدم رہو اور ایک دوسرے کو تھامے رکھو اور جہاد کے لیے تیار رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ“ (آل عمران:200)۔ پھر فرمایا **ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** ”جن لوگوں نے فتنوں میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی پھر جہاد کیا اور صبر کا ثبوت دیا بیشک تیرا پروردگار ان باتوں کے بعد انہیں بخشنے والا مہربان ہے“(النحل:110)۔ مسلم نے جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ **«لَمْ نُبَايِعْ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَلَى الْمَوْتِ، إِنَّمَا بَايَعْنَاهُ عَلَى أَنْ لا نَفِرَّ»** ”ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر موت کی بیعت نہیں کی بلکہ اس بات پر بیعت کی کہ فرار اختیار نہیں کریں گے“۔ بخاری نے عبد اللہ بن ابی اوفی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **"إِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا"** ”جب تم (میدانِ جنگ میں) ان کا سامنا کرو تو صابر رہو“۔ بخاری نے ابو ہریرۃؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (**... طُوبَى**

لِعَبْدٍ آخِذٍ بِعِنَانِ فَرَسِهِ فِي سَبِيلِ اللهِ، أَشْعَثَ رَأْسُهُ، مُغْبَرَّةٍ قَدَمَاهُ، إِنْ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ كَانَ فِي الْحِرَاسَةِ، وَإِنْ كَانَ فِي السَّاقَةِ كَانَ فِي السَّاقَةِ، إِنِ اسْتَأْذَنَ لَمْ يُؤْذَنْ لَهُ، وَإِنْ شَفَعَ لَمْ يُشَفَّعْ)"خوشخبری ہے اس بندے کے لیے جو اپنے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اللہ کے راستے میں نکلتا ہے اور اس کے سر اور پاؤں غبار آلود ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے اگلے حصے میں مقرر کیا جاتا ہے تو وہ اسے بخوشی قبول کرتا ہے اور اگر فوج کے پچھلے حصے میں ذمہ داری دی جاتی ہے تو اسے بھی بخوشی قبول کرتا ہے۔ (جبکہ وہ ایسے لوگوں میں سے ہے کہ) اگر وہ اجازت چاہتا ہے تو اجازت نہیں ملتی اور کسی کی سفارش کرتا ہے تو سفارش قبول نہیں کی جاتی"۔ ترمذی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے اور اس کو حسن قرار دیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ (عَيْنَانِ لا تَمَسُّهُمَا النَّارُ: عَيْنٌ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ، وَعَيْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ)"ان دو آنکھوں کو کبھی بھی جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے رو پڑے اور دوسری وہ آنکھ جو اللہ کی راہ میں چوکیداری کرتے ہوئے جاگتی رہی ہو"۔ حاکم نے یہ روایت کیا اور اس کو صحیح کہا اور ذھبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے کہ ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (أَلاَ أُنْبِئُكُمْ بِلَيْلَةٍ أَفْضَلَ مِنْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ، حَارِسٌ حَرَسَ فِي أَرْضِ خَوْفٍ لَعَلَّهُ أَنْ لاَ يَرْجِعَ إِلَى أَهْلِهِ)"کیا میں تمہیں لیلۃ القدر سے بھی زیادہ افضل رات بتاؤں۔ وہ رات جس میں پہریدار نے انتہائی خوف کی حالت میں ایسی جگہ چوکیداری کرتے ہوئے رات گزاری جہاں سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس آنے کی امید کم ہو"۔

دفعہ نمبر62: جہاد مسلمانوں پر فرض ہے اور فوجی تربیت لازمی ہے، ہر مسلمان مرد جس وقت اس کی عمر پندرہ سال ہو جائے جہاد کی تیاری کے لیے فوجی تربیت حاصل کرنا اس پر فرض ہو جائے گا، جبکہ فوج میں باقاعدہ بھرتی ہونا فرضِ کفایہ ہے۔

اس کی دلیل کتاب و سُنت میں موجود ہے ارشاد باری ہے **وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ** "ان سے قتال کرو جب تک کہ فتنہ مٹ نہ جائے اور اللہ کا دین غالب

آجائے" (البقرۃ :193) اور فرمایا: **فَقَاتِلُوٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ** "کفر کے سر غنوں سے قتال کرو"(التوبۃ:12)۔ انسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «**جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ**» "اپنے اموال اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے مشرکین سے جہاد کرو"، اس کو احمد اور نسائی نے نقل کیا ہے الفاظ نسائی کے ہیں، نسائی اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے جبکہ ذھبی نے ان کی تائید کی ہے ۔ معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «**ذُرْوَةُ سَنَامِ الإِسْلاَمِ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ**» "اسلام کی چوٹی اللہ کی راہ میں جہاد ہے"، اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔

چونکہ جہاد لازمی اور ضروری ہے چنانچہ اس کے لیے عسکری تربیت حاصل کرنا بھی لازمی ہے تاکہ اس فرض کو اس طرح ادا کیا جاسکے جیسا کہ شریعت کو مطلوب ہے اور جس کے ذریعے دشمن کو مغلوب اور علاقوں کو فتح کیا جاسکے، اس لیے جہاد کی تربیت فرض ہے۔ قتال کے حکم کا مطلب اس کی تربیت حاصل کرنے کا حکم بھی ہے کیونکہ یہ حکم عام ہے یعنی اس کا مطلب قتال کرنا بھی ہے اور قتال کی تیاری کرنا بھی۔ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ** "تم اپنی طاقت بھر قوت کے ساتھ ان سے لڑنے کی تیاری کرو"(انفال:60)۔ تربیت حاصل کرنا اور اعلیٰ قسم کا عسکری تجربہ رکھنا ہی قوت کی تیاری ہے، کیونکہ قتال کرنے کے لیے یہ ضروری ہے اور یہ مشقوں اور مہم جوئی کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے، یہ فرض ہے کہ باقاعدہ فوج تیار کی جائے یعنی مسلح فورسز بنانا جو مستقل نوعیت کی ہوں اور جہاد سے متعلقہ امور میں مشغول رہیں، کیونکہ جہاد ایک دائمی اور مسلسل فرض ہے خواہ دشمن ہم پر حملہ آور ہو یا نہ ہو اس لیے باقاعدہ فوج فرض کفایہ ہے۔

جہاد صرف مسلمانوں پر فرض ہے اور وہ ریاست میں رہنے والے ذمیوں پر فرض نہیں، کیونکہ جو قتال مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے یعنی آیات جہاد کے ذریعے، اس میں کافر کے ساتھ لڑائی کا حکم ہے، اس لیے کافر یہ کام نہیں کر سکتا، یہی وجہ ہے کہ اس معنی میں جہاد کافروں پر فرض نہیں، تاہم ریاست کے شہری ہونے کی بنا پر غیر مسلم بھی مسلمانوں کے ساتھ ملکر دشمنوں سے لڑسکتے ہیں، کیونکہ قزمان جو کہ ایک مشرک تھا جنگ

احد میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے ساتھ مشرکین سے قتال کے لیے نکلا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو منع نہیں فرمایا۔

جہاد کے صرف مردوں پر فرض ہونے اور عورتوں پر فرض نہ ہونے کی دلیل احمد اور ابن ماجہ کی وہ حدیث ہے جو انہوں نے عائشہؓ سے نقل کی ہے کہ ''میں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ کیا عورتوں پر بھی جہاد فرض ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: **«نَعَمْ عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لاَ قِتَالَ فِيهِ: الْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ»** ''جی ہاں ان پر ایسا جہاد فرض ہے جس میں قتال نہیں، یعنی حج اور عمرہ''۔

فوجی تربیت کے لیے پندرہ سال کی عمر کی حد کی دلیل وہ حدیث ہے جو بخاری نے نافع کے حوالے سے روایت کی ہے کہ ابن عمرؓ نے مجھے بتایا کہ جنگِ اُحد میں جب میں شریک ہونے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس وقت میری عمر چودہ سال تھی تو آپ ﷺ مجھے اجازت نہیں دی، نافع کہتے ہیں کہ جس وقت عمر بن عبدلعزیزؒ خلیفہ تھے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو یہ حدیث سنائی تو فرمایا: ''چھوٹے اور بڑے کے درمیان یہی حدِ فاصل ہے'' اور اپنے عاملوں کو لکھا کہ جو لڑکا پندرہ سال کا ہو جائے فوجی راشن سے اس کو نفقہ دینا شروع کرو''۔

دفعہ نمبر 63: فوج دو قسم کی ہوتی ہے: احتیاطی فوج (ریزرو)، اس میں مسلمانوں میں اسلحہ استعمال کرنے کے قابل تمام لوگ شامل ہیں، دائمی اور مستقل فوج، ان کو ریاستی بجٹ سے دوسرے ملازمین کی طرح تنخواہیں دی جائیں گی۔

اس کی دلیل وہی ہے جو جہاد کی فرضیت کی دلیل ہے۔ ہر مسلمان پر جہاد فرض ہے اور اس کی تربیت حاصل کرنا بھی اس پر فرض ہے، جہاد کی اس فرضیت کی وجہ سے تمام مسلمان احتیاطی (ریزرو) فوج ہیں۔ مسلمانوں میں سے ایک مستقل اور دائمی فوج بنانے کی دلیل یہی شرعی قاعدہ ہے "جس کام کے بغیر فرض ادا نہ

ہوتا ہو وہ کام بھی فرض ہے"۔ آج کل کے زمانے میں اور جنگی حالات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایسی فوج کے بغیر فرض ادا نہیں ہو سکتا اور آج اسلام کی شیرازہ بندی اور مسلمانوں کو کفار سے تحفظ دینے کیلئے ایک زبردست دائمی اور مستقل فوج کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ خلیفہ پر فرض ہے کہ وہ دائمی فوج تشکیل دے۔

جہاں تک ان فوجیوں کو دوسرے ملازمین کی طرح تنخواہیں دینے کا تعلق ہے تو ان میں سے جو غیر مسلم ہیں ان کے لیے واضح ہے کہ اسلامی ریاست میں کفار سے مسلمانوں کے ساتھ مل کر قتال کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، اگر وہ خود مسلمانوں میں شامل ہو کر لڑنا چاہتا ہے تو اس کو معاوضہ دیا جائے گا۔ زُھری نے روایت کی ہے کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَسْهَمَ لِقَوْمٍ مِنْ الْيَهُودِ قَاتَلُوا مَعَهُ»** "نبی ﷺ نے ان یہودیوں کے لیے (مالِ غنیمت میں) حصّے مقرر کیے جو آپ ﷺ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے"، اس کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے، یہ زھری کی ایک مرسل روایت ہے، ابن قدامہ نے بھی المغنی میں اس سے استدلال کیا ہے۔ یہ روایت بھی ہے کہ **«أَنَّ صَفْوَانَ بْنَ أُمَيَّةَ خَرَجَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ حُنَيْنٍ وَهُوَ عَلَى شِرْكِهِ، فَأَسْهَمَ لَهُ، وَأَعْطَاهُ مِنَ الغَنَائِمِ مَعَ المُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ»** "صفوان بن اُمیہ جنگِ حنین میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے یہ اس وقت مشرک تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کیلئے حصہ مقرر کیا اور مالِ غنیمت میں سے مولفۃ القلوب کا حصہ بھی ان کو دیا"، اس کو بھی ابن قدامہ نے المغنی میں ذکر کیا ہے جبکہ ابنِ ہشام نے اپنی سیرت میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بخاری نے ابو ہریرہؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«يَا بِلَالُ قُمْ فَأَذِّنْ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَإِنَّ اللَّهَ لَيُؤَيِّدُ هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ»** "اے بلال کھڑے ہو کر اعلان کرو کہ سوائے مومن کے کوئی جنت میں داخل نہیں ہو گا اور اللہ دین کی مدد ایک فاجر آدمی سے بھی کروالیتا ہے"۔ ابنِ اسحاق نے اپنی سیرت میں ذکر کیا ہے کہ قزمان احد کی لڑائی میں صحابہ کے ساتھ شریک ہوا حالانکہ وہ مشرک تھا اور اس نے سات یا آٹھ مشرکین کو قتل کیا یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّ اللَّهَ لَيُؤَيِّدُ هَذَا الدِّينَ**

بِالرَّجُلِ الفَاجِرِ» ''اللہ تعالیٰ اس دین کی مدد فاجر آدمی سے بھی کروالیتا ہے''،اس کو شوکانی نے اپنی کتاب الدراری المضیہ اور نیل الاوطار میں بھی ذکر کیا۔

پس یہ دلائل اس بات کے جواز کے لیے کافی ہیں کہ کوئی کافر مسلمانوں کے ساتھ ملکر لڑائی میں حصہ لے سکتا ہے اور اسے فوج میں موجودگی کے بدلے مال بھی دیا جاسکتا ہے۔اِجارہ (ملازمت) کی تعریف یہ ہے کہ کسی عوض کے بدلے منفعت کا عقد اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کسی بھی منفعت (فائدہ) کے لیے کسی شخص کو اجرت پر رکھا جاسکتا ہے اور فوج میں بھرتی ہونا اور جنگ میں حصہ لینا بھی ایک طرح کی منفعت ہے۔یہی وجہ ہے کہ اجارہ (ملازمت) کے عام دلائل ہی کافر کو معاوضہ دے کر فوج اور لڑائی کے لیے ملازم رکھنے کے بھی دلائل ہیں۔ لیکن وہ مسلمانوں کے جھنڈے تلے لڑے گا نہ کہ کافروں کے ساتھ یا کافروں کے جھنڈے تلے، جیسا کہ مذکورہ واقعات میں واضح ہو چکا ہے۔ جن کفار نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ملکر لڑائی کی وہ سب اسلامی جھنڈے تلے اور مسلمانوں کی سربراہی میں یعنی اسلامی فوج کے ایک سپاہی کی حیثیت سے لڑے۔ اس لئے اہل ذمّہ بھی مسلمانوں کے ساتھ ملکر لڑائی میں شامل ہو سکتے ہیں اور ان کو اجرت بھی دی جائے گی۔ لیکن یہ صرف اسی صورت میں ہو گا کہ جب خلیفہ سمجھے کہ ان کا اسلامی فوج میں شامل ہونا مسلمانوں کے لئے منافع بخش ہے اور اس میں کسی ضرر کا خطرہ نہیں۔ اس صورت میں انہیں فوج میں قبول کیا جائے گا اور ان کو اجرت دی جائے گی۔ اگر ان کے اسلامی فوج میں داخل ہونے سے کسی نقصان کا اندیشہ ہو تو یہ باقی مباح معاملات کی طرح ضرر کے مذکورہ قاعدے کے مطابق ممنوع ہو جائے گا۔

یہ تو غیر مسلم کے حوالے سے تھا، جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے تو اگر چہ جہاد عبادت ہے لیکن مسلمان کو معاضہ دے کر فوج اور جنگ کے لیے ملازمت دینا جائز ہے کیونکہ اجارہ (ملازمت) کی دلیل عام ہے اور اجرت دے کر کسی ایسی عبادت کو انجام دینا جائز ہے جس کا نفع صرف انجام دینے والے تک محدود نہ ہو اور اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ **«إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللَّهِ»** ''جس چیز پر اجرت لینے کا تمہیں زیادہ حق ہے وہ کتاب اللہ ہے'' اس کو بخاری نے ابن عباسؓ کے

حوالے سے نقل کیا ہے۔ کتاب اللہ کی تعلیم دینا عبادت ہے، پس جس طرح ایک مسلمان کو قرآن پڑھانے کے لئے ملازمت دینا، صلوٰۃ کی امامت کے لئے ملازمت دینا یا موذن کی ملازمت دینا جائز ہے، جبکہ یہ سب اعمال عبادات میں سے ہیں، بالکل اسی طرح فوج میں بھرتی کروانے یا جہاد کے لئے ملازمت دینا بھی جائز ہے۔ مسلمانوں کو جہاد کے لئے اجرت دینے کے جائز ہونے کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جو احمد اور ابو داؤد نے عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: **«لِلْغَازِي أَجْرُهُ وَلِلْجَاعِلِ أَجْرُهُ وَأَجْرُ الْغَازِي»** "غازی (جہاد کرنے والے) کے لیے ایک اجر ہے جبکہ اس کو تیار کرنے والے کے لیے اپنا اور غازی (دونوں) کا اجر ہے"۔ غازی وہ ہے جو خود جہاد کرتا ہے اور جاعل (تیار کرنے والا) وہ ہے جو اجرت دے کر کسی کو جہاد کے لیے روانہ کرتا ہے۔ القاموس المحیط (ڈکشنری) میں ہے کہ "(**جِعَالَة تجاعل**) کسی چیز کو آپس میں بانٹنا اور غازی کو اپنی جگہ اجرت دے کر جہاد پر بھیجنا"۔ حدیث سے اس کا جواز ثابت ہو گیا کہ کسی شخص کو اجرت دے کر اپنی طرف سے جہاد کے لیے بھیجنا درست ہے، یعنی اجرت پر کسی آدمی کو جہاد کے لیے لینا جائز ہے۔ بیہقی نے جبیر بن نفیر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَثَلُ الَّذِينَ يَغْزُونَ مِنْ أُمَّتِي، وَيَأْخُذُونَ الجُعَلَ، وَيَتَقَوَّوْنَ عَلَى عَدُوِّهِمْ، مَثَلُ أُمِّ مُوسَى، تُرْضِعُ وَلَدَهَا، وَتَأْخُذُ أَجْرَهَا»** "میری امت میں سے جو لوگ جُعَل (اجرت) لیکر جہاد کرتے ہیں اور دشمن پر بھاری پڑتے ہیں ان کی مثال موسٰی کی ماں کی طرح ہے جو اپنے ہی بچے کو دودھ پلاتی تھی اور اس کی اجرت بھی لیتی تھی"، اس کو سعید بن منصور نے بھی نقل کیا ہے یہاں الأجر سے مراد اجرت ہے یہی وجہ ہے کہ فوجیوں کو بھی دوسرے ملازمین کی طرح تنخواہیں دی جائیں گی۔

دفعہ نمبر64: فوج کے لیے الویہ (جھنڈے) اور رایات (عَلم) مقرر کئے جائیں گے۔ خلیفہ ہی فوج کا کمانڈر مقرر کر کے اس کو جھنڈا عطا کرے گا اور جہاں تک علم کا تعلق ہے تو وہ فوجی کمانڈرز تقسیم کریں گے۔

1۔ اللِواء اور الرایہ لغت کے اعتبار سے دونوں کا اطلاق عَلَم پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ قاموس المحیط میں لفظ (رَوِیَ) کے ضمن میں لکھا ہے کہ الرّایہ کا مطلب عَلَم ہے اور اس کی جمع رایات ہے۔ اسی طرح لفظ (لَوِیَ) کے ضمن لکھا ہے کہ اللواء (مد کے ساتھ) جمع الویہ کا مطلب علم ہے...''۔

پھر شرع نے ان دونوں کو استعمال کی حیثیت سے ایک شرعی معنی دے دیا جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

لِواء ابیض (سفید علَم) : اس پر لا اِ له اِلاَّاللّٰه محمدرسُولُ اللّٰه، کالے خط کے ساتھ لکھا ہوتا ہے۔ یہ فوج کے امیر یا فوج کے قائد کو دیا جاتا ہے۔ یہ اس کے علاقے کی علامت ہوتا ہے اور قائد جہاں جائے یہ علَم بھی اس کے ساتھ ساتھ گھومتا ہے، فوج کے قائد کو یہ علَم دینے کی دلیل یہ ہے کہ **«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ مَكَّةَ يَوْمَ الْفَتْحِ وَلِوَاؤُهُ أَبْيَضُ»** ''رسول اللہ ﷺ فتحِ مکہ کے دن داخل ہوئے اور ان کے ساتھ سفید لِواء (سفید علَم) تھا''، اس کو ابن ماجہ نے جابرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے اور رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن خود فوج کے قائد تھے۔ رسول اللہ ﷺ فوجی کمانڈروں کو جہاں بھی روانہ کرتے تھے ان کو یہی لواء (سفید علَم) دیتے تھے ''عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل و السیر'' میں لکھا ہے کہ ''امام حافظ ابو الفتح جو کہ ابن سید الناس کے نام سے معروف ہیں جن کی وفات 734 ہجری میں ہوئی، کہتے ہیں، کہ پیر کے دن صفر کے مہینے کے ختم ہونے میں چار راتیں باقی تھیں، 11 ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو روم پر حملہ کرنے کی تیاری کا حکم دے دیا، دوسرے دن اسامہ بن زیدؓ کو بلایا اور ان سے فرمایا اپنے باپ کے مقتل (قتل کی جگہ) کی طرف روانہ ہو جاؤ، اپنے گھوڑے تیار کرو، میں نے تمہیں فوج کا کمانڈر مقرر کر دیا ہے۔ جب بدھ کا دن آ گیا تو رسول اللہ ﷺ کی بیماری زیادہ ہو گئی۔ اگلے دن جمعرات کو اسامہؓ کو اپنے ہاتھ سے لواء (علَم) حوالے فرمایا اور ارشاد فرمایا، اللہ کا نام لیکر اللہ کی راہ میں لڑو اور اللہ سے کفر کرنے والوں کو قتل کرو، اسامہؓ اپنا علَم لے کر روانہ ہو گئے...''۔

الرایہ سوداء (کالا جھنڈا): اس پر لا اِ لہ اِلاّاللہ محمدرسُولُ اﷲ سفید خط میں لکھا ہوتا ہے۔ یہ فوجی کمانڈروں اور فوجی دستوں (بٹالین اور یونٹس) کے ساتھ ہوتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگِ خیبر میں بنفسِ نفیس فوج کے کمانڈر تھے اور آپ ﷺ نے فرمایا: **«لأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ، أَوْ لَيَأْخُذَنَّ الرَّايَةَ، غَدًا رَجُلاً يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ، أَوْ قَالَ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ، يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَإِذَا نَحْنُ بِعَلِيٍّ وَمَا نَرْجُوهُ، فَقَالُوا: هَذَا عَلِيٌّ، فَأَعْطَاهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الرَّايَةَ، فَفَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ»** ''کل میں جھنڈا اس شخص کو دوں گا یا کل جھنڈا وہ شخص لے گا جو اللہ اور رسول ﷺ کا محبوب ہے اور جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے۔ اللہ اس کو فتح دے گا، ہمیں امید تھی یہ علیؓ کو ملے گا، پھر ہم نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے علیؓ کو (الرایہ) جھنڈا دے دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح دے دی'' یہ متفق علیہ حدیث ہے، اس کو سلمہ بن لاکوعؓ نے روایت کیا ہے۔ اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ فوجی دستے کے کمانڈر تھے یا بٹالین کمانڈر تھے، اسی طرح حارث بن حسان البکری کی حدیث میں ہے کہ ''ہم مدینہ میں پہنچے تو رسول اللہ ﷺ منبر پر تھے اور بلالؓ آپ ﷺ کے سامنے کھڑے تھے جن کے ہاتھ میں تلوار تھی اور کالا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ تو میں نے پوچھا: یہ جھنڈا کس لیے ہے؟ لوگوں نے کہا: عمرو بن العاصؓ ابھی جہاد سے واپس آئے ہیں'' اس کو احمد نے اپنی مسند میں اور اوروں نے بھی نقل کیا ہے جبکہ ترمذی کی روایت میں حارث بن حسان الکبری نے کہا ہے کہ ''میں جس وقت مدینہ پہنچا اور مسجد نبوی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مسجد لوگوں سے بھری پڑی ہے اور کالے جھنڈے ہیں اور بلالؓ تلوار لیے رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑے ہیں، میں نے کہا یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے کہا عمرو بن العاصؓ جہاد کے لیے جا رہے ہیں''۔ یہاں کالے جھنڈوں کا مطلب یہ ہے کہ فوج کے ساتھ کئی ایک جھنڈے تھے۔ جبکہ ان کا امیر ایک ہی یعنی عمرو بن العاصؓ تھے جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ جھنڈے بٹالین کمانڈروں اور یونٹ انچارج وغیرہ کے پاس تھے۔

لہٰذا الوائ (علَم) فوج کے سربراہ (امیر الجیش) کے لیے ہوا اور رایات (جھنڈے) فوج کی دوسری یونٹس اور بٹالین اور دستوں کے لیے ہیں، تو ایک فوج میں ایک لواء (علم) ہوتا ہے اور رایات (جھنڈے) بہت

سے ہوتے ہیں۔اس وجہ سے لواء امیر جیش کی نشانی ہو گا جو کسی اور کے پاس نہیں ہو گا اور رایات دوسرے فوجیوں کے پاس ہوں گے۔

2۔لواء چونکہ امیر جیش کے لیے ہے اس لیے اس کی رہائشگاہ پر لگایا جائے گا یعنی جہاں امیر جیش ہو گا لواء وہاں ہو گا۔ حالتِ جنگ میں خواہ امیر جیش خود قیادت کر رہا ہو یا کسی اور کو کمانڈر بنا کر بھیجا ہو اس کو رایہ (جھنڈا) دیا جائے گا جو میدان جنگ میں بلند رہے گا اس لیے اس کو ام الحرب (جنگ کی ماں) کہا جاتا ہے کیونکہ وہ میدان جنگ کے قائد کے پاس ہوتا ہے۔حالت جنگ میں ہر کمانڈر کے پاس بھی ایک رایہ ہو گا۔یہ اس زمانے میں ایک معروف طریقہ تھا اور دوسرے رایات کا بلند رہنا میدان جنگ کے قائد کی قوت وطاقت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔یہ ایک انتظامی کام ہے اور فوجوں کے معروف طریقے کے مطابق اس کا اہتمام کیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فوج کی خبر آنے سے قبل ہی زیدؓ، جعفرؓ اور عبد اللہ بن رواحہؓ کے بارے میں لوگوں سے تعزیت کی اور فرمایا:**«أَخَذَ الرَّايَةَ زَيْدٌ فَأُصِيبَ، ثُمَّ أَخَذَهَا جَعْفَرٌ فَأُصِيبَ، ثُمَّ أَخَذَهَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ رَوَاحَةَ فَأُصِيبَ»** ''زیدؓ نے جھنڈے کو اٹھایا اور وہ شہید ہو گئے، پھر جعفرؓ نے اس جھنڈے کو سنبھالا اور وہ بھی شہید ہو گئے اور اس کے بعد عبد اللہ بن رواحہؓ نے اس کو بلند کیا اور وہ بھی شہید ہو گئے'' اس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔

جنگ کے میدان میں اگر فوج کا سر ابرہ خود خلیفہ ہو اور میدان جنگ میں موجود ہو تو میدان جنگ میں صرف رایات ہی نہیں بلکہ لواء بھی بلند کیا جائے گا۔ سیرت ابنِ ہشام میں جنگِ بدر کے واقع میں مذکور ہے کہ میدان جنگ میں لواء اور رایات موجود تھے۔ سیرت میں ہے کہ ابنِ اسحاق نے کہا ہے کہ:لواء کو مصعب بن عمیر بن ھاشم بن عبد مناف بن عبد الدار کو دیا گیا۔ ابنِ ہشام کہتے ہیں کہ یہ لواء سفید تھا۔ اور ابنِ اسحاق نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو کالے رنگ کے رایات (جھنڈے) بھی تھے ایک علی بن ابی طالبؓ کے پاس اور اس کو عقاب کہا جاتا تھا۔ دوسرا کسی انصاری کے پاس تھا۔ زمانہ امن میں یا جنگ کے ختم ہونے کے بعد

رایات فوج میں پھیلا دئے جائیں گے، فوج کے مختلف بریگیڈز، بٹالین اور یونٹس کے پاس ہوں گے جیسا حارث بن حسان البکری کی حدیث میں عمرو بن العاصؓ کی فوج کے بارے میں ذکر ہے۔

اسلام میں پہلا لواء (عَلَم) عبد اللہ بن جحشؓ کا عَلَم تھا اور سعد بن مالک الأزدی کو کالے رنگ کا رایہ (جھنڈا) دیا گیا۔ اس میں سفید رنگ کا چاند بنا ہوا تھا، یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ فوج میں الویہ اور رایات ہوں گے۔ خلیفہ ہی فوج کا سربراہ مقرر کرکے اس کو لواء دے گا۔ جبکہ رایات خود خلیفہ دے گا یا فوج کا سربراہ کمانڈروں کو دے گا۔ خلیفہ کی جانب سے رایہ دینے کے جائز ہونے کی دلیل سلمہؓ کی مذکورہ حدیث ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا: **«لأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غداً رَجُلاً يُحِبُّ اللّهَ وَرَسُولَهُ، وَيُحِبُّهُ اللّهُ وَرَسُولُهُ...، فَأَعْطَاهَا عَلِيّاً»** "کل میں ضرور اس شخص کو رایہ دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں... پھر وہ رایہ علیؓ کو دیا"۔ فوج کے سربراہ کی جانب سے رایہ دینے کی دلیل وہی الحارث بن حسان البکری کی روایت ہے جس میں یہ "رایات الاسود" (کالے جھنڈوں) کا ذکر ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک کمانڈر، یعنی عمرو بن العاصؓ، کے ماتحت فوج میں کئی ایک رایات تھے، چاہے وہ فوج جنگ سے واپس آرہی ہو یا جنگ کے لے جا رہی ہو۔ بہر حال یہ رایات بٹالین کمانڈروں کے پاس ہوا کرتے تھے اور اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ یہ رایات خود رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک کو دیے ہوں۔ خلیفہ فوج کے سربراہ کو یہ اختیار دے سکتا ہے کہ وہ اپنے کمانڈروں کو رایات دے اور یہ انتظامی ڈسپلن کے لحاظ سے بھی زیادہ موزوں ہے تاہم دونوں صورتیں مباح (جائز) ہیں۔

دفعہ نمبر 65: خلیفہ ہی فوج کا سپہ سالارِ اعلیٰ ہے وہی فوج کے لیے کمانڈر انچیف کا تقرر کرے گا اور وہی ہر بریگیڈ کے لیے کمانڈر مقرر کرے گا اور ہر بٹالین کے لیے بھی کمانڈر مقرر کرے گا، فوج کی باقی ترتیب و تنظیم خود فوجی کمانڈر کریں گے، کسی شخص کو اسٹاف کمانڈر مقرر کرنے کے لیے اس کی جنگی مہارت اور قابلیت کو دیکھا جائے گا اور اس کا تقرر کمانڈر انچیف کرے گا۔

خلافت چونکہ دنیا کے تمام مسلمانوں کی عام قیادت کا نام ہے اور وہی احکام شرعیہ کو قائم کرنے اور اسلام کی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ دار ہے اور اسلام کی دعوت کو دنیا کے سامنے رکھنے کا طریقہ جہاد ہے، چنانچہ اس جہاد کی ذمہ داری اٹھانا خلیفہ کا کام ہے کیونکہ خلافت کا عقد اس کی ذات کے ساتھ ہوا ہے، اس لیے ذمہ داری کو اٹھانا کسی اور کے لیے جائز نہیں اگرچہ جہاد تمام مسلمانوں پر فرض ہے لیکن جہاد کی ذمہ داری اور اس کی سرپرستی خاص خلیفہ کا کام ہے کیونکہ جہاد عملاً کرنا الگ بات ہے اور جہاد کی سرپرستی کرنا الگ بات ہے جہاد کرنا تو ہر مسلمان پر فرض ہے لیکن جہاد کی سرپرستی کرنا اور علَم کا بلند کرنا خلیفہ کا کام ہے، ہاں خلیفہ کے لیے یہ جائز ہے کہ اس کام کے لیے وہ کسی کو اپنا نائب مقرر کرے لیکن اس میں بھی خلیفہ کی سرپرستی اور نگرانی شرط ہے، یہ جائز نہیں کہ خلیفہ سرپرستی اور نگرانی کئے بغیر بالکل آزادی دے۔ خلیفہ کو باخبر رکھنا معاون کی طرح نہیں کہ اس کو صرف خبر دی جائے بلکہ جس کو خلیفہ اس کام کے لیے اپنا نائب بنائے وہ براہِ راست خلیفہ کے ماتحت اور خلیفہ کی نگرانی میں یہ فرض انجام دے گا۔ خلیفہ جسے چاہے فوج کی قیادت بھی دے سکتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ خلیفہ کی آنکھوں کے سامنے اس کی سرپرستی اور نگرانی میں اپنا فرض ادا کرتا رہے گا، اس طرح یہ جائز نہیں کہ خلیفہ کو صرف رسمی طور پر بتا دے اور اپنی مرضی سے جہاد کرتا رہے، کیونکہ خلافت کا عقد اس شخص کی ذات کے ساتھ ہوا ہے اس لیے براہِ راست جہاد کے امور کی نگرانی اس پر فرض ہے۔ لہٰذا دوسرے نظاموں میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ ریاست کا سربراہ ہی فوج کا بھی کمانڈر انچیف ہے لیکن یہ صرف رسمی طور پر ہے اور فوج کا کمانڈر مکمل آزاد اور خود مختار ہوتا ہے، یہ اسلام کی نظر میں باطل ہے اور شرع کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے، اسلام میں تو یہ فرض ہے کہ خلیفہ ہی بالفعل اور عملی طور پر فوج کا سربراہ ہو۔

جہاں تک اُن قائدین کا تعلق ہے جو براہِ راست فوج کی قیادت میں سے نہ ہوں بلکہ صرف فنی، تنظیمی اور اداراتی امور کے ذمہ دار ہوں تو خلیفہ کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اس کام میں کسی کو اپنا نائب مقرر کرے اور اس کے لیے یہ لازمی نہیں کہ وہ فوجی کمانڈروں کی طرح اس کی نظروں کے سامنے ہوں۔

رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس فوج کے عملی کمانڈر انچیف تھے اور خود ہی معرکوں کی قیادت کرتے تھے، فوجی دستوں کے لیے خود ہی کمانڈر مقرر کرتے تھے جو جہاد کرنے نکلتے تھے اور ایسا بھی ہوتا کہ آپ ﷺ ان کے ساتھ نہ جاتے اور جن جنگوں میں آپ ﷺ خود نہیں جاتے تھے ان کو سرایا کہا جاتا ہے۔ آپ ﷺ ہر سریہ کے لیے ایک قائد مقرر کرتے تھے، بعض دفعہ قائدین مقرر کرتے وقت احتیاطی تدابیر بھی کرتے تھے یعنی کوئی شہید ہو جائے تو اس کی جگہ قیادت کون کرے گا جیسا کہ غزوہ موتہ میں فرمایا: بخاری نے عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ " غزوہ موتہ میں رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہؓ کو امیر مقرر کیا اور فرمایا اگر زیدؓ قتل ہو جائیں تو جعفرؓ قیادت سنبھالیں اور اگر جعفرؓ بھی قتل ہو جائیں تو عبد اللہ بن رواحہؓ فوج کے کمانڈر ہوں گے"۔

خلیفہ ہی فوجی قیادت کا تقرر کرے گا اور وہی بریگیڈ کمانڈروں کا انتخاب کرے گا اور ان کو لواء (جھنڈا) عطا کرے گا اور ڈویژن کے کمانڈر بھی وہی خود مقرر کرے گا۔ جس فوج کو آپ ﷺ نے شام روانہ فرمایا جیسا کہ جیش موتہ اور جیش اسامہؓ، وہ ایک بریگیڈ تھی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسامہ کو لواء (جھنڈا) دیا اور وہ سریا جو آپ جزیرۃُ العرب میں ہی بھیجتے تھے جیسا کہ سعد بن ابی وقاصؓ کا سریہ ایک فوجی یونٹ (دستہ) تھا اس کو مکہ کی طرف بھیجا تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بریگیڈ کمانڈر، ڈویژن کمانڈر سب کا تقرر خلیفہ کرے گا۔ اس کے علاوہ جو ذمہ داریاں یا عہدے چھوٹے ہیں رسول اللہ ﷺ اس کو فوجی قیادت اور کمانڈروں پر چھوڑتے تھے۔

چیف آف اسٹاف فنی امور کا ذمہ دار ہوتا ہے وہ فوج کے سربراہ کی طرح ہے اس کا تقرر خلیفہ کرتا ہے، یہ اگرچہ خلیفہ کے ماتحت ہوتا ہے لیکن خلیفہ کی جانب سے براہِ راست حکم کا انتظار کئے بغیر یہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

دفعہ نمبر 66: فوج کو ایک ہی فوج بنایا جائے گا اور اسے خاص چھاؤنیوں میں رکھا جائے گا، تاہم یہ چھاؤنیاں مختلف صوبوں میں ہوں گی اور ان میں سے بعض کو اسٹریٹیجک (جنگی اہمیت کے حامل) علاقوں میں رکھا جائے گا۔ اسی طرح کچھ فوجی چھاؤنیاں ہمیشہ متحرک رہیں گے اور یہ بے پناہ جنگی قوت کے حامل ہوں گے۔ ان فوجی چھاؤنیوں یا اڈوں کو کئی ایک مجموعوں کی شکل میں منظم کیا جائے گا اور ہر مجموعے کو جیش (فوج) کہا جائے گا پھر ہر ایک کا اپنا نمبر ہو گا مثال کے طور پر 1 نمبر یا 2 نمبر یا پھر صوبوں اور عمالہ (ضلع) کے نام پر اس کا نام رکھا جائے گا۔

اسلامی فوج ایک واحد فوج ہوتی ہے جو کئی فوجوں سے مل کر بنتی ہے۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک فوج کا اپنا شناختی نمبر ہو گا اور یوں کہا جائے گا کہ پہلی فوج، تیسری فوج، یا کسی صوبے کے نام پر ان کا نام رکھا جائے گا مثلاً شامی فوج، مصری فوج، صنعاء کی فوج۔ اسلامی فوج کو مخصوص کیمپوں میں رکھا جائے گا اور ہر کیمپ یا چھاؤنی میں فوج کا ایک مجموعہ ہو گا جو چاہے ایک ہی فوج میں سے ہو یا مختلف فوجوں میں سے ہو، تاہم ان چھاؤنیاں کا مختلف صوبوں میں موجود ہونا لازمی ہے جن میں سے بعض فوجی کیمپ ہونگے کچھ مستقل طور پر متحرک ہوں گے اور بہت طاقتور ہوں گے۔ پھر ہر چھاؤنی کا ایک مخصوص نام ہو گا مثال کے طور پر الحبانیہ چھاؤنی پھر ہر چھاؤنی کا اپنا خاص رایہ (جھنڈا) ہو گا۔ یہ مذکورہ ترتیب یا تو مباحات میں سے ہیں، جیسے صوبے کے نام پر فوج کا نام رکھنا یا اس کو کوئی خاص نمبر جاری کرنا سو یہ خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر منحصر ہو گا، جبکہ بعض چیزیں اس قاعدے کے ماتحت ہیں کہ "جس کام کے بغیر کوئی فرض ادا نہیں ہو سکتا وہ کام بھی فرض ہے"۔ جیسے ملک کی حفاظت کا لازم ہونا، سرحدوں پر فوج تعینات کرنا، جنگی حکمت عملی کے مقامات پر فوجی چھاؤنیاں بنانا وغیرہ۔ عمر بن خطابؓ نے مختلف صوبوں میں فوجی چھاؤنیاں قائم کیں چنانچہ فلسطین میں 'فیلقا' کے مقام پر فوجی اڈہ قائم کیا۔ موصل (عراق) میں فوجی اڈہ قائم کیا۔ ریاستی دارالحکومت میں بھی فوجی چھاؤنی ہوا کرتی تھی، اور وہ اپنے ساتھ ایسی فوج تیار رکھتے تھے جو ایک اشارے پر ہی جنگ کے لیے تیار ہو۔

دفعہ نمبر 67: فوج کے لیے انتہائی اعلیٰ سطح کی عسکری تعلیم کا بندوبست کرنا فرض ہے اور جہاں تک ممکن ہو فوج کو فکری لحاظ سے بھی بلند رکھا جائے گا۔ فوج کے ہر ہر فرد کو اسلامی ثقافت سے مزین کیا جائے گا تاکہ وہ اسلام کے بارے میں مکمل بیدار اور باشعور ہو اگرچہ اس کی سطح عام ہی کیوں نہ ہو۔

یہ دفعہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کے تحت ہے کہ **«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ»** "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے"، اس کو ابن ماجہ نے انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے اور زرکشی نے التذکرہ میں کہا ہے کہ حافظ جمال الدین مزی نے کہا کہ اس حدیث کی اسناد حسن ہیں، اور سخاوی نے کہا ہے کہ ابنِ شاہین نے اس کو ایسی اسناد سے روایت کیا ہے جو قابل اعتماد ہیں۔ علم کا لفظ اسم جنس ہے، تمام علوم بشمول عسکری علوم اس میں شامل ہیں، خاص کر عسکری علوم فوج کے لیے انتہائی ضروری ہونگے، اس علم کے بغیر فوج کے لیے جنگ میں کودنا ممکن نہیں، اس لئے اس دفعہ کی دلیل یہ شرعی قاعدہ ہے کہ جس کام کے بغیر فرض ادا نہیں ہو سکتا وہ کام بھی فرض ہے۔ جہاں تک اسلامی ثقافت کا تعلق ہے تو فرائض کی ادائیگی کے لیے ضروری علم حاصل کرنا ہر فرد پر فرض ہے اور جو اس کے علاوہ ہے فرض کفایہ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ»** "اللہ تعالیٰ جس بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا کرتے ہیں" یہ حدیث متفق علیہ ہے اور راوی معاویہ ہیں، ترمذی نے اس کو ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث جس طرح ہر مسلمان پر لاگو ہے، تو بدرجہ اولیٰ اُس فوج پر بھی لاگو ہے جو اسلام کی دعوت کو پھیلانے کے لیے دنیا کو فتح کرے گی۔ اسی طرح فوج کو فکری لحاظ سے بلند کرنا بھی اس کے اندر شعور اور جذبے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے دین اور زندگی کے معاملات کو سمجھنا بھی ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: **«فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ»** "یہ ممکن ہے کہ علم کو حاصل کرنے والا اس کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھے بنسبت اس شخص کے کہ جس نے اس کو براہِ راست سنا تھا" ابو بکرۃ کی یہ حدیث متفق علیہ ہے یہ الفاظ بخاری کے ہیں، اس میں بھی باشعور ہونے کی ترغیب دی گئی ہے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا: لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ "غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں

ہیں"(یونس:24)اور فرمایا لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ "جن کے قلوب ہیں جن سے وہ سمجھتے ہیں" (الحج :46)۔ان سب میں غور و فکر کرنے کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔

دفعہ نمبر68: ہر چھاؤنی میں ایسے افسران کی موجودگی انتہائی ضروری ہے جو جنگی منصوبہ بندی اور حکمت عملی ترتیب دینے میں اعلیٰ قسم کی مہارت اور تجربہ رکھتے ہوں اور پوری فوج میں بھی ایسے افسران کی تعداد ممکن حد تک زیادہ ہونی چاہیئے۔

اس دفعہ کی دلیل بھی دفعہ نمبر 67 کی دلیل ہی ہے یعنی وہی قاعدہ کہ جس کام کے بغیر فرض ادا نہ ہو وہ کام بھی فرض ہے۔ عسکری تعلیم صرف نظریاتی طریقہ تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ تعلیم عملی طور پر مشقیں کرنے، اس تعلیم و تربیت کو عملی جامہ پہنانے، جنگی حکمت عملی ترتیب دینے اور میدان جنگ میں کودنے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے اعلیٰ قسم کی عسکری تعلیم ضروری ہے اور دائمی طور پر جنگی حالات سے باخبر رہنا اور مشقیں کرنا بھی فرض ہے تاکہ فوج جہاد اور میدان جنگ میں جانے کے لیے ہر لمحہ تیار رہے۔ چونکہ ہر چھاؤنی میں موجود فوج کو ہر وقت میدانِ کارزار میں داخل ہونے کے لیے تیار رہنا پڑتا ہے اس لیے ان میں افسران کی کافی تعداد کی موجودگی بھی اس قاعدے کی رو سے فرض ہے یعنی" جس کام کے بغیر فرض ادا نہ ہو وہ کام بھی فرض ہے"۔

دفعہ نمبر69: یہ بھی فرض ہے کہ فوج کے پاس وافر مقدار میں اسلحہ، آلاتِ جنگ، سازوسامان اور جنگی مہمات کے لیے لازمی اور ضروری چیزیں ہوں تاکہ ایک اسلامی فوج ہونے کی حیثیت سے وہ باآسانی اپنی ذمہ داری کو ادا کر سکے۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمُ**

اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ ”اور تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی مقدور بھر قوت اور گھوڑوں کو تیار رکھو کہ اس سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو، اور ان کے علاوہ اُن کو بھی جنہیں تم نہیں جانتے لیکن اللہ انہیں خوب جانتا ہے“(الانفال:60)۔ جہاد وقتال کی تیاری کرنا فرض ہے اور یہ تیاری اتنی واضح اور زبردست ہونی چاہئے کہ اس سے کفار اور دشمنوں پر رعب اور خوف طاری ہو جائے اور ریاست کے اندر موجود منافقین کو بھی دہشت میں مبتلا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ” تُرْهِبُوْنَ دہشت زدہ کرتے رہو“ فرمایا ہے، یہ تیاری کی وجہ اور علت ہے اور تیاری اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جائے گی جب تک وہ علت پوری نہ ہو جو شرع نے بتائی ہے اور یہ علت، دشمنوں اور منافقین کو خوف زدہ اور دہشت زدہ کرنا ہے اس لیے فوج کو ہر قسم کا اسلحہ، آلات اور فوجی سازوسامان مہیا کرنا فرض ہے تا کہ عملاً یہ دشمن خوف زدہ ہو سکیں اور فوج جہاد کے حوالے سے اپنی ذمہ داری کو انجام دینے کے قابل ہو اور اسلام کی دعوت کو دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بھرپور قوت کی تیاری کا حکم دیا تو اس کی وجہ ظاہری اور چھپے ہوئے دونوں دشمنوں کو دہشت زدہ کرنا بتادی۔ مذکورہ آیت پر غور کرنے اور اس کو باریک بینی سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قتال کے لیے تیاری کا حکم نہیں دیا بلکہ دشمنوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے تیاری کا حکم دیا اور یہ زیادہ بلیغ انداز ہے کیونکہ دشمنوں کو جب مسلمانوں کی بے پناہ قوت کا علم ہو جائے تو وہ خود ہی کسی قسم کے حملے سے باز رہیں گے اور یہ جنگ جیتنے کا بہترین اسلوب ہے۔

داخلی امن

دفعہ نمبر 70: داخلی امن کا محکمہ ہی امن وامان کے انتظامات کا ذمہ دار ہوتا ہے اور ہر قسم کے داخلی خطرات سے نمٹتا ہے اور پولیس کے ذریعے ریاست کے امن وامان کو برقرار رکھتا ہے۔ یہ محکمہ فوج سے

مداخلت کی درخواست صرف خلیفہ کے حکم کے بعد ہی کر سکتا ہے۔ اس محکمے کا سربراہ ڈائریکٹر برائے داخلی امن وسلامتی کہلاتا ہے۔ ہر صوبے میں اس محکمے کی شاخیں ہوتی ہیں جو کہ داخلی امن کے ادارے ہوتے ہیں اور ہر صوبے کے ادارے کے سربراہ کو صاحبِ شُرطہ کہا جاتا ہے۔

داخلی امن کا ذمہ دار داخلی امن کا ادارہ ہوتا ہے اس کا سربراہ (مدیر الامن الداخلی) 'ڈائریکٹر برائے داخلی امن' ہوتا ہے۔ اس ادارے کی ہر صوبے میں شاخیں ہوتی ہیں جس کو داخلی امن کا ادارہ کہا جاتا ہے اور اس کا سربراہ "صاحب الشرطہ" ہوتا ہے۔ تنفیذ کے لحاظ سے ہر صوبے کا ادارہ والی کے ماتحت ہوتا ہے لیکن ایک ادارہ ہونے کے لحاظ سے داخلی امن کے مرکزی ادارے کے ماتحت ہوتا ہے اور اس کو ایک خاص قانون کے ذریعے منظم کیا جاتا ہے۔

داخلی امن کا محکمہ ہی امن وامان سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار ہے اور اس امن کو برقرار رکھنے کے لیے وہ پولیس کو استعمال کرے گا اور پولیس ہی امن برقرار رکھنے کا ایک بنیادی وسیلہ ہے۔ اس محکمے کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جہاں چاہے جس طرح چاہے بوقت ضرورت پولیس کو استعمال کرے اور اس کا حکم فوراً نافذ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم جب اس کو فوج کی ضرورت پڑے تو وہ یہ معاملہ خلیفہ کے سامنے رکھے گا اور خلیفہ ہی فوج کو حکم دے سکتا ہے کہ محکمہ داخلہ کی مدد کرے یا امن وامان کو برقرار رکھنے کے لیے مسلح افواج بھیجے یا کوئی اور حکم دے یا پھر فوج کے استعمال سے انکار کرے اور پولیس پر اکتفا کرنے کا حکم دے۔

دفعہ نمبر 71: پولیس دو قسم کی ہوتی ہے: ملٹری پولیس جو امیر جہاد یعنی شعبۂ حرب کے ماتحت ہوتی ہے دوسری قسم وہ پولیس ہے جو امن وامان برقرار رکھنے کے لیے حکمران کے پاس ہوتی ہے اور محکمہ داخلی امن کے تابع ہوتی ہے۔ پولیس کے دونوں قسموں کو خاص قسم کی تربیت و ثقافت (تعلیم وتربیت) دی جاتی ہے تاکہ وہ احسن طریقے سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکے۔

پولیس دو قسم کی ہوتی ہے ملٹری پولیس اور وہ پولیس جو حکمران کے ساتھ ہوتی ہے ان دونوں قسم کی پولیس کا خاص لباس ہوتا ہے اور امن وامان کو برقرار رکھنے کے لیے ان کے پاس خاص نشانیاں ہوتی ہیں۔

الازہری نے کہا ہے کہ "شرطہ کسی بھی چیز کے بہترین حصے کو کہتے ہیں اور شرطہ (پولیس) کو شرطہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ منتخب سپاہی ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شرطہ وہ گروہ ہے جس کا کام فوج سے بھی پہلے ہے"۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اس کو شرطہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ لباس اور ہیئت کے لحاظ سے وہ مخصوص ہوتے ہیں جو کہ ان کی پہچان ہے"، اصمعی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ القاموس میں ہے کہ "شرطہ، ضم (یعنی پیش) کے ساتھ جمع ہے اور اس کا واحد شُرطہ ہے، یہ وہ پہلا دستہ ہے جو جنگ میں کودتا ہے اور موت کے لیے تیار رہتا ہے، یہی والیوں کے مددگار ہوتے ہیں، لفظ شرطی، تُرکی اور جُھنی کی طرح ہے اور یہ نام ان کی نشانیوں کی وجہ سے ہے جو ان کی پہچان ہے"۔

ملٹری پولیس فوج کا ہی ایک دستہ ہوتی ہے۔ اس کی خاص نشانی ہوتی ہے۔ یہ فوج کے آگے ہوتی ہے تاکہ معاملات کو کنٹرول کرے۔ یہ فوج کا ہی جزو ہے جو کہ امیر جہاد کے ماتحت ہوتا ہے یعنی شعبہ حرب کے ماتحت ہوتا ہے۔ جو پولیس حکمرانوں کے پاس ہوتی ہے وہ داخلی امن کے ادارے کے ماتحت ہوتی ہے، بخاری نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ **«إِنَّ قَيْسَ بْنَ سَعْدٍ كَانَ يَكُونُ بَيْنَ يَدَيِ النَّبِيِّ ﷺ بِمَنْزِلَةِ صَاحِبِ الشُّرَطِ مِنَ الأَمِيرِ»** "قیس بن سعد، نبی ﷺ کے لیے گویا کہ ایسے تھے جیسا کہ ایک امیر کا پولیس افسر ہوتا ہے"۔ قیس سے مراد قیس بن سعدؓ بن عبادہ انصاری الخزرمی ہیں۔ ترمذی نے بھی اس کو روایت کیا ہے "کہ قیس بن سعدؓ نبی ﷺ کے گویا پولیس انچارج تھے۔ الانصاری نے کہا ہے کہ یعنی سعدؓ وہ کام کرتے تھے جو پولیس کا سربراہ کرتا ہے"۔ خلیفہ کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ داخلی امن کی ذمہ دار پوری پولیس فورس کو فوج کے ماتحت رکھے یعنی شعبہ حرب کے ماتحت رکھے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کو ایک مستقل ادارہ یعنی ادارہ برائے امن داخلی بنائے۔ اس دفعہ میں اس بات کی تبنی کی گئی ہے کہ امن وامان برقرار رکھنے کے لیے حکمرانوں کے پاس موجود پولیس فورس کا ایک مستقل ادارہ ہو گا جو کہ محکمہ امن داخلی کے ماتحت ہو گا یہ ادارہ

آزاد اور خود مختار ہو گا اور خلیفہ ہی براہ راست دوسرے اداروں کی طرح اس کی نگرانی کرے گا کیونکہ انسؓ کی سابقہ حدیث سے جو کہ قیس بن سعد کے بارے میں ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پولیس کا ایک مستقل ادارہ ہوا کرتا تھا۔ پھر جہاد سے متعلق چاروں اداروں کی خود مختاری کے بارے میں بھی تبنی یہ ہے کہ یہ چاروں ادارے الگ الگ اداروں کی شکل میں خلیفہ کے ماتحت ہوں گے، سب ملکر ایک ادارہ نہیں، یوں پولیس اندرون ملک محکمہ امنِ داخلی کے ادارے کے ماتحت ہے۔

دفعہ نمبر72: داخلی امن و سلامتی کے لیے بنیادی خطرات، جن کی شعبہ ٔداخلی امن و سلامتی روک تھام کرے گا، وہ یہ ہیں: ارتداد، بغاوت اور حرابہ، لوگوں کی مال ودولت پر حملہ، لوگوں کی جان اور عزت پر دست درازی اوران مشتبہ لوگوں سے نبٹنا، جو حربی کفار کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔

داخلی امن کے محکمے کا کام ریاست کے اندرامن وامان کو برقرار رکھنا ہے۔ جو چیزیں اندرونِ ملک امن کے لیے خطرات کا باعث بنتی ہیں وہ یہ ہیں: اسلام سے مرتد ہونا، بغاوت کرنا یعنی ریاست کے خلاف خروج کرنا، توڑ پھوڑ اور تخریب کاری کا ارتکاب کرنا جیسے ہڑتالیں، ریاست کے اہم مراکز پر قبضہ کرنا اور وہاں دھرنا دینا، افراد کی املاک کو نقصان پہنچانا یا عام ملکیت کی اشیاء کو تباہ کرنا یا ریاست کی املاک کو نقصان پہنچانا یا پھر ریاست کے خلاف مسلح جنگ شروع کرنا۔

ڈاکہ ڈالنا اور لوگوں کے اموال کو چھینا اور ان کو جانی نقصان پہچانا بھی داخلی امن کی لیے خطرات میں سے ہے۔

داخلی امن کے لیے ایک چیلنج یہ بھی ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو روکا جائے جو لوگوں کے اموال کو چوری کریں، لوٹیں، سلب اور ہڑپ کریں، لوگوں کو زخمی یا قتل کریں یا ان کے عزت وآبرو پر پروپیگنڈے کے ذریعے کیچڑ اچھالیں یعنی قذف (تہمت) یا زنا کا الزام لگائیں۔

اسی طرح محکمہ داخلی امن کے کاموں میں سے دشمن کے جاسوسوں کا کھوج لگانا اور ان کی سرکوبی کرنا اور امت اور ریاست کو ان کے شر سے محفوظ کرنا بھی ہے۔ یہی وہ بڑے خطرات ہیں جن کا محکمہ داخلی امن کو سامنا ہوتا ہے اور یہی ادارہ ریاست اور لوگوں کو اِن داخلی خطرات سے بچانے کا ذمہ دار ہے۔ چنانچہ جو شخص مرتد ہو جائے اور توبہ سے بھی انکار کرے اور اس کو قتل کرنے کا حکم دیا جائے تو یہی ادارہ اس حکم پر عمل درآمد کرواتا ہے۔ اگر مرتد ہونے والے ایک جماعت کی شکل میں ہوں تو پہلے ان سے بات چیت کی جائے گی اور ان سے اسلام میں واپس آنے کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر وہ توبہ کر کے اپنے موقف سے رجوع کرتے ہوئے دوبارہ احکام شرعیہ کی پابندی شروع کر دیں تو ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی جائے گی اور اگر وہ ارتداد پر ہی اصرار کریں تو ان سے قتال کیا جائے گا۔ اگر چھوٹی موٹی جماعت ہوں اور پولیس کے لیے ان کو زیر کرنا ممکن ہو تو پولیس ہی ان سے لڑے گی۔ اگر ایسا نہ ہو، بلکہ ان کی تعداد زیادہ ہو اور پولیس ان سے لڑنے کے لیے کافی نہ ہو تو پولیس خلیفہ سے سیکورٹی فورسز کے ذریعے مدد کی درخواست کرے گی اگر وہ بھی کافی نہ ہوں تو پولیس خلیفہ سے فوج بھیجنے کی درخواست کرے گی۔

یہ تو مرتدین کے حوالے سے تھا جہاں تک باغیوں کی بات ہے اگر وہ غیر مسلح کاروائیاں کرتے ہوں جیسے توڑ پھوڑ تخریب کاری، ہڑتالیں، مظاہرے اور اہم جگہوں پر قبضہ یا افراد کی املاک کو نقصان پہنچانا یا پھر عوامی ملکیت یا ریاستی ملکیت کی اشیاء کو تباہ کرنا تو محکمہ داخلی امن صرف پولیس کے استعمال پر اکتفاء کرے گا تاکہ ان لوگوں کو روک سکے۔ اگر پولیس ان پر قابو نہ پا سکے تو خلیفہ سے سیکورٹی فورسز کے ذریعے مدد کی درخواست کرے گی تاکہ جلاؤ گھراؤ کی اور تخریب کاری کے ان کاموں کو روکا جا سکے جن کا ارتکاب باغی یا خارجی کرتے ہوں۔ اگر باغی اور خارجی، ریاست کے خلاف مسلح دہشت گردی پر اتر آئیں اور کسی جگہ ڈیرا ڈالیں اور ان کے پاس استعداد یا قوت بھی ہو کہ داخلی امن کا محکمہ صرف پولیس کے ذریعے ان کو قابو کرنے کے قابل نہ ہو اور ان کی سرکشی اور غنڈہ گردی کو ختم نہ کر سکتی ہو، تب داخلی امن کا محکمہ خلیفہ سے سیکورٹی فورسز کی مدد طلب کرے گا یا باقاعدہ مسلح افواج کی مدد طلب کرے گا تاکہ بغاوت کا خاتمہ کیا جا سکے۔ لیکن ان پر حملہ کرنے سے

قبل ان سے رابطہ کیا جائے گا اور یہ معلوم کیا جائے گا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور ان سے واپس راہ راست پر آنے کا مطالبہ کیا جائے گا اور اسلحہ پھینکنے کا کہا جائے گا۔ اگر وہ مان جائیں اور راہ پر آجائیں اور احکام شرعیہ کی پابندی شروع کر دیں تو ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اگر وہ انکار کر دیں اور لڑائی پر اصرار کریں تو ان سے قتال کیا جائے گا اور اس وقت تک ان سے لڑا جائے گا جب تک وہ باز نہ آجائیں۔ یہ قتال ان کو فنا اور تباہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ انھیں بغاوت ترک کرنے، اسلحہ پھینک دینے اور دوبارہ اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے ہوگا جیسا کہ علیؓ نے خوارج سے قتال کیا۔ آپؓ پہلے ان کو راہ راست پر آنے کی دعوت دیتے تھے جو باز آتا اس کو کچھ نہیں کہتے اور جو سرکشی پر اصرار کرتا اس کو سزا دینے کے لیے اس کے خلاف قتال کرتے تاکہ وہ رجوع کرے، بغاوت ترک کرے اور اسلحہ پھینک دے۔

جہاں تک ڈاکوؤں یعنی لوگوں کو تنگ کرنے اور ان کے اموال چھیننے والوں کا تعلق ہے اور لوٹ مار کرنے والوں اور اغوا برائے تاوان یا کرائے کے قاتلوں کا سوال ہے تو محکمہ داخلی امن ان کو سزا دینے ان کو قتل یا پھانسی پر لٹکانے یا ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کے لیے یا پھر ان کو ملک بدر کرنے کے لیے اقدامات کرے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے کہ **اِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْۤا اَوْ يُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ** ”جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑیں اور زمین میں فساد کرتے پھریں ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا سولی پر لٹکا دیے جائیں یا مخالف جانب سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے“ (المائدہ:33)۔ ان سے لڑائی باغیوں سے لڑائی کی طرح نہیں یعنی جو ریاست کے خلاف خروج کرتے ہیں کیونکہ باغیوں کے خلاف لڑائی ان کو راہ راست پر لانے کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن ڈاکوؤں سے لڑائی ان کو قتل کرنے یا سولی پر چڑھانے کے لیے ہوتی ہے، ان پر حملہ کیا جائے گا اور کسی قیمت پر پیچھے نہیں ہٹا جائے گا۔ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو اس آیت میں ہے، جس نے کسی کو قتل کیا اور مال بھی لیا اس کو قتل کیا جائے گا اور سولی پر لٹکایا جائے گا، جس نے قتل کیا لیکن مال نہیں لیا اس کو

قتل کیا جائے گا اور سولی پر نہیں لٹکایا جائے گا، جس نے مال لیا قتل نہیں کیا تو اس کا مخالف ہاتھ اور پاؤں کاٹا جائے گا لیکن قتل نہیں کیا جائے گا، جس نے اسلحہ کی نمائش کے ذریعے لوگوں کو صرف ڈرایا کسی کو قتل نہیں کیا نہ ہی کسی کا مال ہڑپ کیا تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا، نہ ہی پھانسی دی جائے گی اور نہ ہی ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے بلکہ صرف ریاست کے اندر ہی اسکے اپنے علاقے سے دور بے دخل کیا جائے گا۔ داخلی امن کا محکمہ اپنے صوبے میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے صرف پولیس کی خدمات لینے پر اکتفاء کرے گا، پولیس کے علاوہ کسی دوسرے ادارے کو استعمال نہیں کرے گا، سوائے اس وقت کہ پولیس امن امان کو برقرار نہ رکھ سکے تب محکمہ خلیفہ سے دوسرے سکیورٹی فورسز کی مدد کی طلب کرے گا یا حالات کو دیکھ کر فوج طلب کرے گا۔

جہاں تک چوری، اغوا، ڈکیتی، لوٹ مار اور چھینا جھپٹی وغیرہ کے ذریعے لوگوں کی مال و دولت پر شب خون مارنے کا سوال ہے یا لوگوں کو مار پیٹ کر زخمی یا قتل کرنے کے واقعات کا تعلق ہے یا لوگوں کی عزت وآبرو کو پروپیگنڈے، تہمت اور زنا کا الزام لگا کر پارہ پارہ کرنے کے جرم کا تعلق ہے، ان سب کا تدارک اور علاج داخلی امن کا محکمہ اپنے اہل کاروں، سکیورٹی کے ذمہ داروں اور گشتی پولیس وغیرہ کے ذریعے کرے گا۔ پھر ان مجرموں پر قاضیوں کے فیصلوں کو نافذ کرے گا جنہوں نے لوگوں کی جان ومال یا عزت وآبرو پر دست درازی کی ہے، ان تمام کاموں کے لیے صرف پولیس کی خدمات لے گا۔

پولیس کی ذمہ داری نظام کی حفاظت اور داخلی امن کو برقرار رکھنا ہے اور تمام حکومتی فیصلوں کو نافذ کرنا بھی پولیس کا کام ہے، جیسا کہ انسؓ کی گزشتہ حدیث میں ہے کہ قیس بن سعدؓ رسول اللہ ﷺ کی پولیس کے انچارج تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پولیس حکمران کے ہاتھ میں ہو گی اور اوامر کی تنفیذ کے لیے پولیس کی قوت کو استعمال کیا جائے گا۔ تاکہ اسلام کو مکمل طور پر نافذ کیا جا سکے اور نظام کی حفاظت کی جا سکے۔ پولیس راتوں کو بھی پہرا دے گی، گشت کرے گی، چوروں کا پیچھا کرے گی، فسادیوں کو ڈھونڈے گی اور شریروں کا کھوج لگائے گی۔ ابو بکرؓ کے زمانے میں عبد اللہ بن مسعودؓ رات کو گشت کرنے والے پولیس کے سربراہ تھے۔ عمر بن خطابؓ تو خود راتوں کو گھوم کر لوگوں کی حفاظت کرتے تھے، اپنے ساتھ اپنے آزاد کردہ غلام کو بھی رکھتے تھے

اور کبھی عبد الرحمن بن عوفؓ کو ساتھ لیکر نکلتے تھے۔ لہٰذا بعض اسلامی علاقوں میں جو رواج ہے کہ دکاندار اسٹالوں کی چوکیداری کرتے ہیں یا اس کے لیے چوکیدار رکھتے ہیں، یہ غلط ہے یہ کام ریاست کا ہے اور یہ پولیس کی ذمہ داری ہے، لوگ اس کے ذمہ دار نہیں اور نہ ہی اس کے لیے مال خرچ کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔

جہاں تک مشکوک لوگوں کا تعلق ہے یعنی جن سے نقصان کا خطرہ ہو یا ریاست کے خلاف سازشوں کا امکان ہو یا معاشرے میں انتشار پھیلانے یا افراد کو نقصان پہنچانے کا شبہ ہو، ان کا پیچھا کرنا ریاست کا کام ہے۔ کسی شخص کے بارے میں ایسی کوئی بات ظاہر ہو جائے تو جس کو بھی معلوم ہو جائے ریاستی ادارے کو خبر دینا اس پر لازم ہے اس کی دلیل بخاری اور مسلم میں زید بن ارقمؓ کی حدیث ہے کہ **«كُنْتُ فِي غَزَاةٍ، فَسَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ أُبَيٍّ يَقُولُ: لاَ تُنْفِقُوا عَلَى مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّى يَنْفَضُّوا مِنْ حَوْلِهِ، وَلَئِنْ رَجَعْنَا مِنْ عِنْدِهِ لَيُخْرِجَنَّ الأَعَزُّ مِنْهَا الأَذَلَّ، فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِعَمِّي أَوْ لِعُمَرَ، فَذَكَرَهُ لِلنَّبِيِّ ﷺ، فَدَعَانِي، فَحَدَّثْتُهُ ...»** ”میں کسی غزوہ میں تھا تو میں نے عبد اللہ بن ابی منافق کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جو لوگ ہیں ان پر خرچ نہ کرو تاکہ وہ اس کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور جب ہم واپس جائیں گے تو ہم میں سے عزت مند ذلیل کو نکال دے گا۔ تو میں نے یہ اپنے چچا سے یا عمرؓ سے ذکر کیا، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا تو آپ ﷺ نے مجھے بلایا اور میں نے آپ ﷺ کے سامنے بیان کیا“۔

عبد اللہ ابن ابی کے کفار اور محاربین (ریاست کے خلاف برسرِ پیکار) سے تعلقات معروف و مشہور تھے۔ اسی طرح مدینہ کے آس پاس رہنے والے یہودیوں کے ساتھ اس کے تعلقات بھی ڈھکے چھپے نہیں تھے، تمام اسلام دشمنوں سے اس کی دوستی تھی۔ لیکن اس موضوع کے حوالے سے انتہائی باریک بینی کی ضرورت ہے تاکہ رعایا کے خلاف تجسس (جاسوسی)، جو کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق حرام ہے **وَلَا تَجَسَّسُوْا** ”لوگوں کی ٹوہ (جاسوسی) میں نہ لگو“ (الحجرات:12)، کو اس موضوع کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جائے، کیونکہ یہ صرف مشکوک اور ملک دشمن لوگوں کے خلاف جائز ہے۔ مشکوک لوگ وہ ہیں جو کفار اور مسلمانوں سے

برسرِ پیکار دشمنوں، خواہ فعلاً ہوں یا حکماً، سے رابطے میں رہتے ہیں اور ان کو معلومات دیتے ہیں۔ یہ جاسوسی اس لیے جائز ہے کہ یہ کفار کے ساتھ جنگی حکمت عملی کا حصہ اور تقاضا ہے تاکہ مسلمانوں کو بڑے نقصان سے بچایا جا سکے، اس حوالے سے شرعی دلائل موجود ہیں جو کہ تمام اہل حرب کے حوالے سے ہیں۔ اگر اہلِ حرب عملاً ہیں تو یہ بالکل واضح ہے کہ ان کی جاسوسی کرنا فرض ہے۔ اگر وہ حربی حکماً بھی ہیں تب بھی ان کی جاسوسی کرنا جائز ہے کیونکہ ان کے ساتھ کسی بھی وقت جنگ چھڑنے کی توقع ہے۔

یوں رعایا کے ہر اس فرد کو جو کفار اور محاربین کے ساتھ رابطے میں رہتا ہے مشکوک سمجھا جائے گا اور اس کی جاسوسی جائز ہوگی کیونکہ کفار اور اسلامی ریاست سے برسرِ پیکار دشمنوں کی جاسوسی جائز ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے:

1) جو کفار اور محاربین فعلاً ریاست کے ساتھ عملاً حالت جنگ میں ہیں ان کی جاسوسی کرنا جائز ہے گزشتہ دلیل کے علاوہ اس قاعدے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے (ما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب) کہ جس کام کے بغیر فرض ادا نہ ہوتا ہو وہ کام بھی فرض ہے۔ دشمن کی طاقت کا اندازہ لگانا، اس کے منصوبوں اور اہداف کو معلوم کرنا اور اسٹریٹیجک علاقوں کی نشاندہی کرنا دشمن کو شکست دینے کے لیے ضروری ہے اور یہ شعبہ حرب کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے ریاست کی رعایا میں سے ان لوگوں پر نظر رکھنا بھی اس ادارے کی ذمہ داری ہے جو کفار اور محاربین سے رابطے میں رہتے ہوں کیونکہ ریاست کے ساتھ برسر پیکار دشمنوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کی کسی شہری کو اجازت نہیں ہوتی، کیونکہ ان کے ساتھ تو تعلق صرف جنگ کا ہے۔

2) جو حکمی طور پر حربی کفار ہیں (یعنی جو فی الحال حالت جنگ میں نہیں لیکن ان سے جنگ کا امکان ہے) ان کی جاسوسی بھی جائز ہے اور نقصان پہنچانے کا خطرہ ہو تو یہ ریاست پر واجب ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی کھوج لگائے جو دشمنوں کہ مدد کرتے ہیں۔ پھر محاربین حکماً دو قسم کے ہیں :

پہلی قسم: وہ کفار اور محاربین جو اپنے ملک اور علاقے میں ہیں ان کی جاسوسی تو شعبہ حرب کا کام ہے۔

دوسری قسم: وہ کفار اور محاربین جو ہمارے علاقوں میں رہتے ہیں جیسے سفراء، معاہدین وغیرہ، ان پر نظر رکھنا اور نگرانی کرنا محکمہ داخلی امن کا کام ہے۔

داخلی امن کا ادارہ ان لوگوں کی نگرانی اور جاسوسی کا انتظام کرے گا، جو ریاست میں موجود حربی کفار حکماً کے عہدیداروں یا ان کے نمائندوں سے ملتے رہتے ہے یا ان سے رابطے رکھتے ہیں۔ اسی طرح شعبہ حرب کا ادارہ ان شہریوں پر نظر رکھے گا جو کفار محاربین (حکماً) سے یا ان کے نمائندوں سے ان کے علاقوں میں جا کر ملتے ہیں لیکن اس کی دو شرطیں ہیں:

پہلی شرط: حربی کفار حکماً یا انکے ذمہ دار اشخاص یا ان کے نمائندوں کی شعبہٗ حرب یا شعبہ داخلی امن کی جانب سے نگرانی کے ذریعے اس بات کے واضح ثبوت موجود ہوں کہ ان شہریوں کے ان کفار سے تعلقات اور رابطے غیر معمولی نوعیت کے ہیں خواہ یہ رابطے ریاست کے اندر ہوں یا باہر۔

دوسری شرط: یہ کہ ان دونوں محکموں کو جو بھی معلومات ملیں وہ انہیں قاضی حسبہ کے سامنے رکھیں اور قاضی حسبہ ہی دیکھے گا کہ کسی شہری کی طرف سے اس قسم کی حرکتیں اسلام اور مسلمان کے لیے نقصان کا باعث تو نہیں بن رہی ہیں۔ اگر معاملہ ایسا ہو یعنی خطرات موجود ہوں تب محکمہ امن داخلی کے لیے ان شہریوں کی جاسوسی کرنا جائز ہے جو حربی کفار حکماً یا ان کے نمائندوں سے ملتے رہتے ہیں۔ اسی طرح شعبہ حرب کے ادارے کے لیے بھی ان شہریوں کی جاسوسی جائز ہے جو حربی کفار حکماً کے علاقوں میں جا کر ان سے یا ان کے نمائندوں سے تعلقات استوار کرتے ہیں، اس تمام بحث کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

1) مسلمانوں کی جاسوسی آیت کے نص کے مطابق حرام ہے ارشاد ہے: **وَلَا تَجَسَّسُوْا** "اور ایک دوسرے کی جاسوسی نہ کرو۔" (الحجرات:12)۔ یہ جاسوسی کے حرام ہونے کی ایک عام نص ہے اور یہ حکم اس

وقت تک عام ہی رہے گا جب تک کہ جاسوسی کرنے کی اجازت کے حوالے سے کوئی مخصوص نص نہ مل جائے۔ اس کا ثبوت احمد اور ابو داوٴد کی روایت سے ملتا ہے جس میں مقداد اور ابو امامہ کہتے ہیں: **«إِنَّ الأَمِيرَ إِذَا ابْتَغَى الرِّيبَةَ فِي النَّاسِ أَفْسَدَهُمْ»** "اور امیر اپنے لوگوں پر شک کرنے لگے تو وہ ان کو خراب کر دے گا"۔

اس لیے مسلمانوں کی جاسوسی حرام ہے۔ ریاست میں رہنے والے اہل ذمہ کے بارے میں بھی یہی حکم ہے چنانچہ ریاست میں رہنے والے مسلم اور غیر مسلم شہریوں کی جاسوسی حرام ہے۔

2) کفار محاربین فعلاً جو ہمارے ساتھ حالت جنگ میں ہیں اور کفار محاربین حکماً (جو فی الحال حالت جنگ میں نہیں لیکن ان سے جنگ کا امکان ہے) جو ہمارے علاقوں میں آتے ہیں یا معاہدین (معاہدہ کر کے ان کو پناہ دی گئی ہے) یا مستامنین (جو ہمارے امان میں داخل ہیں) جیسے سفراء وغیرہ یا کفار محاربین جو اپنے ہی علاقوں میں ہیں ان سب کی جاسوسی جائز ہے بلکہ واجب ہے۔

اس کے دلائل رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے واضح ہیں:

سیرت ابن ہشام میں عبد اللہ بن جحشؓ کے سریہ (جنگ) کے حوالے سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خط لکھ کر ان کو دیا اور فرمایا دو دن تک اس خط کو نہیں کھولنا۔ عبد اللہ بن جحشؓ نے دو دن چلنے کے بعد جب وہ خط کھولا اور دیکھا تو اس میں لکھا ہوا تھا **«إِذَا نَظَرْتَ فِي كِتَابِي هَذَا، فَامْضِ حَتَّى تَنْزِلَ نَخْلَةَ بَيْنَ مَكَّةَ وَالطَّائِفِ، فَتَرَصَّدْ بِهَا قُرَيْشاً، وَتَعَلَّمْ لَنَا مِنْ أَخْبَارِهِمْ»** "جب تم میرے اس خط پر نظر ڈالو تب اس وقت تک چلو جب تک کہ تم نخلستان (کھجوروں کے باغ) نہیں پہنچ جاتے جو مکہ اور طائف کے درمیان ہے اور وہاں قریش کے ٹوہ میں لگ جانا اور ان کے خبریں ہم تک پہنچانا"۔

سیرت ابنِ ھشام میں ہی غزوہ بدر کے حوالے سے ہے کہ : ابن اسحاق نے کہا ہے کہ :" رسول اللہ ﷺ اور ابو بکرؓ سوار ہو کر نکلے۔ چلتے چلتے وہ راستے میں عرب کے ایک شیخ کے پاس سے گزرے اور اس سے قریش کے بارے میں پوچھا اور پوچھا کہ محمد اور انکے صحابہ کے بارے میں تمھارے پاس کوئی خبر ہے یا کوئی اور خبر ،تو شیخ نے کہا کہ میں تم دونوں کو اس وقت تک کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک تم مجھے یہ نہیں بتاؤ گے کہ تم کون ہو ؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پہلے تم ہمیں بتاؤں پھر ہم بھی بتادیں گے ، اس شیخ نے کہا: تم مجھے بدلے میں بتاؤ گے ؟ فرمایا: جی ہاں۔ پھر شیخ نے کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ قریش فلاں دن نکل چکے ہیں اور اگر مجھے بتانے والے نے صحیح بتایا ہو تو آج قریش فلاں جگہ پہنچ چکے ہوں گے۔ قریش اسی جگہ پہنچے تھے۔ جب اس نے قریش کی خبر دے کر پوچھا کہ تم دونوں کون ہو ؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم پانی سے آئے ہیں۔ یہ فرماتے ہوئے آپ ﷺ واپس روانہ ہو گئے تو بوڑھے نے کہا: پانی سے یا عراق کے پانی سے ؟ پھر رسول اللہ ﷺ (مزید کچھ بتائے بغیر) اپنے صحابہ کے پاس آئے اور جب شام ہو گئی تو علی بن ابی طالبؓ، زبیر بن العوامؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ کو کچھ اور لوگوں کے ساتھ بدر کے پانی کی طرف روانہ کیا تا کہ قریش کی خبر لے آئیں یعنی بطور جاسوس کے روانہ کئے"۔

اسی طرح ابن اسحاق نے روایت کیا ہے جس کو ابن ہشام نے اس عنوان کے تحت نقل کیا ہے کہ 'بسبس بن عمرو اور عدی بن ابی زغباء جاسوسی کرتے تھے'، اسی میں کہا ہے کہ:" عدی اور بسبس نے وہ سن لیا (یعنی جو پانی پر بیٹھی ہوئی دو باندیوں نے قریش کے متعلق کہا تھا) تو وہ دونوں اپنے اونٹ پر سوار ہوئے اور چل پڑے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آکر خبر دی اور جو کچھ سنا تھا وہ بتادیا"۔

یہ سارے دلائل اگرچہ قریش کے حوالے سے ہیں جو فعلاً محارب تھے۔ لیکن یہی حکم حکماً محاربین کے لیے بھی ہے کیونکہ ان سے جنگ بھڑ جانے کا ہر وقت امکان موجود ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فعلاً محاربین کی جاسوسی فرض ہے کیونکہ دشمن کو شکست دینے کے لیے جنگی پالیسی کا یہی تقاضا ہے۔ حکماً محاربین کی

جاسوسی جائز ہے کیونکہ ان سے جنگ ہونے کی توقع ہے اور اگر ان سے نقصان کا اندیشہ ہو یعنی اندیشہ ہو کہ وہ فعلاً محاربین کو مدد فراہم کریں گے یا ان سے مل جائیں گے تب ان کی جاسوسی کرنا بھی فرض ہو جاتا ہے۔

یوں کفار محاربین کی جاسوسی مسلمانوں کے لیے جائز اور ریاست پر فرض ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے جیسا کہ پہلے گزر گیا اور اس کے دلائل میں سے یہ قاعدہ بھی ہے کہ جس کام کے بغیر فرض ادا نہ ہوتا ہو وہ کام فرض ہے۔

لہٰذا رعایا کے جو افراد خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، کفار محاربین فعلاً یا حکماً کے ساتھ تعلقات استوار کریں اور ان سے رابطے کرنے لگیں، خواہ ہمارے علاقے میں ہو یا دشمن کے علاقوں میں، ان شہریوں کی جاسوسی جائز ہے اور ممکن ہے کہ وہ کفار کے لیے جاسوسی کر کے ریاست کو نقصان پہنچائیں۔

لیکن رعایا کے ان افراد کی جاسوسی کرنے کے لیے وہی دو شرطیں ہیں جو ہم نے پہلے بیان کیں، اگر یہ دونوں شرطیں نہیں پائی جاتیں تو رعایا میں سے کسی کی جاسوسی کرنا جائز نہیں خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر کیونکہ اس حوالے سے صریح نصوص ہیں جو ہم بیان کر چکے ہیں۔

شعبہ حرب کا ادارہ ان شہریوں کی جاسوسی کا ذمہ دار ہے جو فعلاً محاربین سے تعلقات بناتے ہیں یا کفار محاربین کے علاقوں میں جا کر ان کے ذمہ داروں یا ان کے نمائندوں سے ملتے ہیں اور داخلی امن کا ادارہ ان شہریوں کی جاسوسی کا ذمہ دار ہے جو ہمارے ہی علاقوں میں کفار محاربین حکماً کے ذمہ داروں یا ان کے نمائندوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔

شعبہ خارجہ

دفعہ نمبر 73: دفتر خارجہ ہی اسلامی ریاست (خلافت) اور دوسرے ممالک کے درمیان تعلقات سے متعلقہ تمام امور کا ذمہ دار ہے خواہ یہ تعلقات سیاسی پہلو سے ہوں یا اقتصادی اور صنعتی یا زرعی اور تجارتی یا پھر یہ مواصلاتی رابطے ہوں جیسے ڈاک سسٹم یا ٹیلی کمیونیکیشن اور وائرلیس روابط وغیرہ۔

دفتر خارجہ ہی ریاست خلافت کے دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات کے تمام معاملات کا ذمہ دار ہے خواہ یہ تعلقات اور معاملات کیسے بھی ہوں چاہے یہ تعلقات سیاسی حوالے سے ہوں یعنی سیاسی معاہدات، صلح ہو، جنگ بندی (سیز فائر) ہو، مذاکرات ہوں، سفیروں کا تبادلہ ہو، ایلچی بھیجنے یا نمائندے روانہ کرنے کی بات ہو، سفارت خانے اور قونصل خانے قائم کرنا ہو یا یہ تعلقات اقتصادی پہلو سے ہوں یا زراعت اور تجارت کے یا مواصلات کے جیسے ڈاک سسٹم، ٹیلی کمیونیکیشن اور وائرلیس پیغامات رسانی کا سسٹم ہو، ان تمام امور کی نگرانی دفتر خارجہ کا کام ہے کیونکہ دوسری ریاستوں کے کسی بھی قسم کے تعلقات کا ذمہ دار دفتر خارجہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دوسری ریاستوں اور طاقتوں سے تعلقات قائم کیے، جیسا کہ وزیر تنفیذ کی بحث میں ہم نے بیان کیا ہے آپ ﷺ نے عثمان بن عفانؓ کو قریش کے ساتھ مذاکرات کے لیے روانہ فرمایا۔ آپ ﷺ نے خود بھی قریشی ایلچیوں سے مذاکرات کئے، بادشاہوں کی طرف بھی پیغام دے کر نمائندے روانہ کئے، بادشاہوں کے نمائندوں اور سفیروں کا استقبال کیا اور ان کے ساتھ معاہدے اور صلح کی۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفاء بھی دوسری ریاستوں اور طاقتوں کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کرتے تھے، اس کام کے لیے اپنے نمائندے بھی مقرر کرتے تھے کیونکہ جو کام انسان خود کر سکتا ہے اس کو اپنے نائب کے ذریعے بھی کروا سکتا ہے۔

بین الاقوامی سیاسی پیچیدگیوں کی وجہ سے اور عالمی سیاسی تعلقات کے تناؤ کی بنیاد پر ہم یہ تبنی کرتے ہیں کہ خلیفہ ایک ایسا ادارہ قائم کرے گا جو صرف بین الاقوامی تعلقات کا ذمہ دار ہو گا اور خلیفہ دوسرے ریاستی اداروں کی طرح اس ادارے کی بھی براہ راست نگرانی کرے گا یا اس کے لیے اپنا نائب (وزیر تنفیذ) مقرر کرے گا جو ان امور سے متعلق احکام شرعیہ کی پابندی کریگا۔

شعبہ صنعت

دفعہ نمبر 74: محکمہ صنعت وہ محکمہ ہے جو صنعت سے متعلق تمام معاملات کا ذمہ دار ہے خواہ یہ صنعت بھاری صنعت ہو جیسے انجن اور آلات سازی، گاڑیوں کی باڈی اور کیمیکل اور الیکڑونک مصنوعات یا پھر ہلکی (چھوٹی) صنعت ہو۔ وہ کارخانے جن کا تعلق حربی شعبے سے ہے اس شعبے کے تحت آئیں گے۔ خواہ ان کارخانوں میں تیار مال عوامی ملکیت میں آتا ہو یا انفرادی ملکیت میں، تمام کارخانے جنگی پالیسی کی بنیاد پر استوار ہونے چاہئیں۔

صنعت کا محکمہ ہی صنعت سے متعلق تمام معاملات کا ذمہ دار ہے چاہے بھاری صنعت ہو جیسے انجن سازی، بڑی مشینری، گاڑیوں کی باڈیز، کیمیکل اور الیکڑانک آلات یا چھوٹی صنعت ہو خواہ ان فیکڑیوں کا تعلق عوامی ملکیت سے ہو یا انفرادی ملکیت سے یا ان کا حربی صنعت سے تعلق ہو۔ ہر قسم کی انڈسٹری کا قیام جنگی حکمت عملی کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا جائے گا۔ کیونکہ جہاد اور قتال کے لیے فوج کی ضرورت ہے اور فوج کو اسلحہ چاہیے اور اسلحہ ہر وقت اور ہر حال میں فوج کو فراہم کرنے کے لئے اس کی صنعت کا ملک کے اندر ہونا ضروری ہے خصوصاً حربی صنعت کا تو جہاد سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ریاست کے لیے زمام اقتدار اپنے ہی ہاتھ میں ہونے اور دوسری ریاست کے اثر ورسوخ سے دور رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اپنی اسلحے کی صنعت ہو اور وہ اس صنعت کو ترقی دینے کے قابل ہو تاکہ کسی کی محتاج نہ رہے اور جدید ترین اسلحہ سے لیس رہے اور اسلحہ کی صنعت ترقی کرے اور اس میں جدت آئے تاکہ ریاست ہر قسم کے ظاہری اور متوقع دشمن کو خوفزدہ رکھے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ** ”اور تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی مقدور بھر قوت کی اور گھوڑوں کو تیار رکھو تاکہ اس سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور ان کے علاوہ اوروں کو بھی جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں خوب جانتا ہے“ (الانفال:60)۔

اس طرح ریاست خود ہی مکمل طور پر اپنے ارادے کی مالک ہو گی، اپنی ضرورت کا اسلحہ خود بنائے گی اور اس کو ترقی دے گی اور ممکن حد تک جدید سے جدید اور اعلیٰ درجے کی طاقت والا اسلحہ بنائے گی تاکہ حقیقی معنوں میں ظاہری اور متوقع دشمنوں کو خوف زدہ کر سکے۔ لہٰذا ریاست پر فرض ہے کہ اپنا اسلحہ خود بنائے اور اس کو ترقی دے۔ اس کے لیے دوسری ریاستوں سے اسلحہ خریدنے پر بھروسہ کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے دوسری ریاستوں کو بالادستی کا موقع ملے گا اور پھر ریاست کو ان ریاستوں کے ارادے کا غلام بننا پڑیگا۔

موجودہ دور میں اس بات کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ جو ریاستیں دوسری ریاستوں کو اسلحہ فروخت کرتی ہیں وہ ہر قسم کا اسلحہ فروخت نہیں کرتیں خاص طور پر جدید اسلحہ، اور جو بھی اسلحہ فروخت کرتی ہیں وہ متعین شرائط کے ساتھ ہوتا ہے، حتیٰ کہ اس کے استعمال کی کیفیت بھی وہی بتاتی ہیں پھر اس مقدار میں فروخت کرتی ہیں جو وہ بہتر سمجھتی ہیں، خریدنے والے ملک کی طلب کے مطابق نہیں، جو اسلحہ بیچنے والے ملک کی خریدنے والے ملک پر بالادستی کا سبب بنتا ہے اور وہ اپنی مرضی کی شرائط اور پابندیاں عائد کرتا ہے، خاص کر جب اسلحہ خریدنے والا ملک کسی جنگ میں شریک ہوتا ہے اور اس وقت اس ملک کو مزید اسلحہ کی ضرورت ہوتی ہے اور مختلف سپیئر پارٹس کی ضرورت پڑتی ہے اور اسلحہ کے ذخیرے کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اس کو

پھر اسلحہ فروخت کرنے والے ملک پر انحصار کرنا پڑتا ہے یوں اس کو مزید جھکنا پڑتا ہے اور اس کے بڑے بڑے مطالبات کو ماننا پڑتا ہے یہی چیز اسلحہ سپلائی کرنے والے ملک کو خریدنے والے ملک پر اپنا اثرورسوخ بڑھانے کا موقع دیتی ہے، خاص کر جب وہ جنگی حالات میں ہو اور اسلحہ کی شدید ضرورت پر اس کا ہر مطالبہ تسلیم کرنا پڑتا ہے یوں وہ ملک اپنے ارادے بلکہ اپنے وجود کو اسلحہ فروخت کرنے والے ملک کے پاس گروی رکھ دیتا ہے۔یہی وجہ ہیں کہ ریاست پر فرض ہے کہ وہ اپنا اسلحہ اور تمام ضروری جنگی آلات ان کے پارٹس وغیرہ خود تیار کرے اور ریاست یہ اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک وہ بھاری صنعت خود ریاست میں قائم نہ کرے اور اس کو ترقی نہ دے اور وہ فیکٹریاں اور کارخانے قائم نہ کرے جو بھاری صنعت کے لیے ضروری ہیں، چنانچہ ریاست کے پاس اپنا ایٹمی پلانٹ اور ایٹمی ری ایکٹرز ہونے چاہئے، اپنی خلائی شٹل ہونی چاہئے، ریاست کا اپنا میزائل پروگرام ہونا ضروری ہے اور اس کے اپنے مصنوعی سیارے ہونے چاہئیں۔

جنگی جہاز، ٹینک، بیڑے، ہر قسم کی بکتر بند گاڑیاں الغرض ہر قسم کا بھاری اور ہلکا اسلحہ وافر مقدار میں تیار ہونا چاہیے۔ اسی طرح یہ بھی ریاست پر فرض ہے کہ اس کے پاس ہر قسم کے آلات، انجن، کیمیکل اور الیکٹرانک آلات بنانے کی فیکٹریاں اور کارخانے ہوں۔ وہ فیکٹریاں جو عوامی ملکیت کے زمرے میں آتی ہے یا وہ فیکٹریاں اور کارخانے جو چھوٹی جنگی مصنوعات بناتی ہیں، سب کا کام اس فرض کی ادائیگی کو مدنظر رکھ کر ہونا چاہئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ** "تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی مقدور بھر قوت سے تیاری کرو" (الانفال:60)۔

چونکہ اسلامی ریاست اسلامی دعوت کی علمبردار ریاست ہوتی ہے اور دعوت وجہاد کے ذریعے اسلام کے پیغام کو دنیا کے سامنے رکھتی ہے اس لیے ریاست ہمیشہ جہاد کی تیاری میں رہتی ہے لہٰذا اس صورتحال کا تقاضا ہے کہ ہلکی یا بھاری ہر قسم کی صنعت اس کی اپنی ہو جو جنگی بنیادوں پر استوار کی گئی ہو تاکہ بوقت ضرورت کسی بھی کارخانے کو جنگی صنعت کاری میں تبدیل کرنے کا کام آسان ہو، یہی وجہ کے ریاستِ خلافت میں تمام صنعتیں جنگی حکمت عملی کی بنیاد پر قائم ہوں گی۔ تمام کارخانے اور فیکٹریاں خواہ بڑی مصنوعات تیار کرتے ہوں

یا چھوٹی سب کی بنیاد جنگی پالیسی کو مد نظر رکھ کر ڈالی جائے گی تا کہ ریاست بوقتِ ضرورت ان کی پیداوار کو جنگی آلات اور میٹریل کی تیاری میں تبدیل کر سکے۔

قضاء (عدلیہ)

دفعہ نمبر 75: عدلیہ کسی معاملے پر فیصلہ صادر کرتی ہے تا کہ اسے نافذ کیا جائے۔یہی ادارہ لوگوں کے درمیان جھگڑوں کا فیصلہ کرتا ہے یا جماعت (معاشرے) کو پہنچنے والے نقصان سے منع کرتا ہے یا لوگوں اور حکمرانوں کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کو ختم کرتا ہے خواہ یہ حکمران کوئی بھی ہو، خلیفہ ہو، اداروں کے ملازمین ہوں یا خلیفہ کے ماتحت کوئی حکمران ہو۔

قضاء کی اصل، کتاب وسُنت میں اس کا حکم ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ** "اور ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (قرآن وسُنت) کے مطابق فیصلہ کیجیے" (المائدہ:49)، اور فرمایا **وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ** "جب یہ اس بات کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کر دیں" (النور:48)

جہاں تک سنت کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ خود قاضی تھے اور لوگوں کے درمیان فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ بخاری میں عائشہؓ سے روایت ہے کہ: "عتبہ بن ابی وقاص نے اپنے بھائی سعد بن ابی وقاصؓ کی ذمہ داری لگائی تھی کہ زمعہ کے ہاں جو لڑکا ہوا ہے وہ میرا ہے تم اس کو اپنی پرورش میں لے لینا۔ عائشہ فرماتی ہیں کہ: جب فتح (مکہ) کا سال آیا سعد بن ابی وقاصؓ نے وہ بچہ لے لیا اور کہا کہ یہ میرے بھائی کا بیٹا ہے، انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے عہد لیا تھا۔ عبد بن زمعہ نے کہا: یہ تو میرا بھائی ہے کیونکہ میرے باپ سے ہی اسی کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔ دونوں فیصلے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس آگئے۔ سعد نے کہا، اے اللہ کے

رسول یہ میرا بھتیجا ہے میرے بھائی نے اس کے بارے میں مجھے وصیت کی تھی، تو عبد بن زمعہ نے کہا یہ تو میرا بھائی ہے اور میرے والد کی لونڈی کا بیٹا ہے، میرے باپ کا بیٹا ہے کیونکہ اسی کے بستر پر پیدا ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«هُوَ لَكَ يَا عَبْدُ بْنَ زَمْعَةَ»** "یہ بچہ تمھارے لیے ہے اے عبد بن زمعہ"، پھر فرمایا **«الْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ»** "اولاد بستر والے کی ہوتی ہے (جس کی بیوی ہے اس کی سمجھی جاتی ہے) اور زانی کیلئے پتھر (سنگسار کرنا) ہے"۔

رسول اللہ ﷺ نے قاضی مقرر فرمائے چنانچہ علیؓ کو یمن کا قاضی مقرر کیا اور فیصلہ کرنے کے طریقے کے حوالے سے ان کو وصیت اور تنبیہ بھی فرمائی **«إِذَا تَقَاضَى إِلَيْكَ رَجُلاَنِ، فَلاَ تَقْضِ لِلأَوَّلِ حَتَّى تَسْمَعَ كَلامَ الآخَرِ، فَسَوْفَ تَدْرِي كَيْفَ تَقْضِي»** "جب دو لوگ فیصلے کے لیے تمہارے پاس آئیں تو صرف ایک کی بات سن کر فیصلہ نہ کرنا بلکہ دوسرے کی بات بھی سن لینا پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ کیا فیصلہ کرنا ہے" اس کو ترمذی اور احمد نے روایت کیا ہے جبکہ احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ **«إِذَا جَلَسَ إِلَيْكَ الْخَصْمَانِ، فَلا تَكَلَّمْ حَتَّى تَسْمَعَ مِنْ الآخَرِ كَمَا سَمِعْتَ مِنَ الأَوَّلِ»** "جب دونوں فریق تمہارے سامنے آئیں تو اس وقت تک کچھ نہیں بولنا جب تک تم دوسرے کی بات کو بھی اسی طرح نہ سنو جیسے کہ پہلے کی بات سنی تھی"۔

رسول اللہ ﷺ کا فیصلے کرنے کا طریقہ کار عائشہؓ کی حدیث سے اخذ کیا جا سکتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ سنایا، جب سعد اور عبد بن زمعہ نے اس بچے کے بارے میں اختلاف کیا جو زمعہ کی بیوی سے پیدا ہوا تھا، پہلے (سعد) نے کہا کہ یہ بچہ میرے بھائی کا بیٹا ہے جبکہ دوسرے (ابن زمعہ) نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں حکم شرعی ان کو بتا دیا کہ زمعہ کی بیوی سے پیدا ہونے والا یہ بچہ عبد بن زمعہ کا بھائی ہے کیونکہ بچہ بستر کا تابع ہوتا ہے (عورت جس مرد کی بیوی ہے بچہ اسی کا ہے)۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ ایک حکم شرعی کی خبر دینا ہے، پھر اس فیصلے کی پابندی کو بھی ان پر لازم قرار دیا اور عبد بن زمعہ نے بچہ لے لیا۔ یہی دفعہ نمبر 75 کی دلیل ہے، اسی میں قضاء کی تعریف کی گئی ہے، یہ تعریف

حقیقت کا وصف (صفت) ہے۔ چونکہ یہ ایک شرعی حقیقت ہے اور چونکہ شرعی تعریف درحقیقت ایک حکم شرعی ہوتا ہے تو اس کے لیے ایک دلیل (نص) کی ضرورت ہوتی ہے جس سے اس کو مستنبط کیا گیا ہو، پس یہ حدیث قضاء کی تعریف کی دلیل ہے جو کہ اس دفعہ میں موجود ہے۔

بعض نے قضاء کی تعریف میں یہ کہا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان جھگڑوں کو طے کرتی ہے یہ تعریف نامکمل ہے کیونکہ یہ قضاء کا حقیقی وصف نہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل اور احادیث سے واضح ہے بلکہ یہ تعریف محض اس بات کی تفصیل ہے کہ قضاء کیا کر سکتی ہے یا کیا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ قاضی کسی مسئلے میں فیصلہ تو دیتا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ لوگوں (فریقوں) کے درمیان معاملہ طے نہ ہو۔ لہٰذا قضاء کی صحیح تعریف وہی ہے جو ہم نے اس دفعہ میں بیان کی اور یہی احادیث سے مستنبط تعریف ہے۔

پھر یہ تعریف لوگوں کے درمیان فیصلوں کو بھی شامل کرتی ہے جیسا کہ عائشہؓ کی حدیث میں ہے۔ اور اس میں حسبہ (عوامی نظم) بھی شامل ہے جو کہ یہ ہے کہ: "اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچانے کے بارے حکم شرعی کی پابندی کی خبر دینا"۔ یہ کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں مسلم میں موجود ابوہریرہؓ کی اس حدیث سے ہے جس میں ہے کہ **«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَرَّ عَلَى صُبْرَةِ طَعَامٍ فَأَدْخَلَ يَدَهُ فِيهَا فَنَالَتْ أَصَابِعُهُ بَلَلاً، فَقَالَ: مَا هَذَا يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ ؟ قَالَ: أَصَابَتْهُ السَّمَاءُ يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: أَفَلاَ جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ كَيْ يَرَاهُ النَّاسُ، مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي»** "رسول اللہ ﷺ ایک جگہ کھانے کی چیزوں کے اسٹاک (ڈھیر) کے پاس سے گزرے اور اس میں ہاتھ ڈالا، تو آپ ﷺ کی انگلیاں گیلی ہو گئیں، تو فرمایا: اے کھانے کے مالک یہ کیا ہے؟ اس شخص نے کہا "اے اللہ کے رسول ﷺ یہ بارش کی وجہ سے ہے، فرمایا: تم نے اسے کھانے کی چیزوں کے اوپر کیوں نہیں رکھا، تاکہ لوگ دیکھ لیں، جس نے دھوکہ دیا وہ مجھ میں سے نہیں"۔ احمد اور ابن ماجہ اور دارمی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: **«مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا»** "جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں"۔

اسی طرح یہ تعریف مظالم کے فیصلوں کے بارے میں بھی ہے کیونکہ وہ بھی قضاء ہے حکمرانی نہیں کیونکہ یہ حکمران کے خلاف شکایت ہے۔ مظالم کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ: ''حکم شرعی کی خبر دینا جس کا مقصد اس کا نفاذ ہو اور اس کا تعلق لوگوں اور خلیفہ یا اس کے معاونین یا والیوں یا اس کے ملازمین کے درمیان کسی اختلاف سے ہو اور اس کا تعلق شرعی نص کے معنی کے بارے میں ان کے اختلاف سے متعلق ہو جس کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کرنا ہو اور اس کے حکم کو بیان کرنا ہو''۔ مظالم کا ذکر رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں قیمتوں کے تعین کے حوالے سے ہے، آپ ﷺ نے فرمایا **«وَإِنِّي لأَرْجُو أَنْ أَلْقَى اللَّهَ وَلا يَطْلُبُنِي أَحَدٌ بِمَظْلِمَةٍ ظَلَمْتُهَا إِيَّاهُ فِي دَمٍ وَلا مَالٍ»** ''مجھے امید ہے کہ میں اس حال میں اللہ تعالیٰ سے ملوں کہ کوئی ایک بھی مجھ سے ایسے کسی ظلم کا بدلہ نہ مانگتا ہو، جو میں نے اس کے خون یا مال کے حوالے سے اس پر کیا ہو''۔ اس کو احمد نے انس بن مالکؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ایک اور فرمان بھی ہے کہ **«مَنْ أَخَذْتُ لَهُ مَالاً فَهَذَا مَالِي فَلْيَأْخُذْ مِنْهُ، وَمَنْ جَلَدْتُ لَهُ ظَهْراً فَهَذَا ظَهْرِي فَلْيَقْتَصَّ مِنْهُ»** ''میں نے جس کا مال لیا ہو تو اس کو چاہیے کہ آکر میرے اِس مال میں سے لے لے اور اگر میں نے کسی کے پشت پر کوڑے مارے ہوں تو یہ میری پشت ہے آکر اپنا بدلہ لے لے'' اس کو ابو یعلیٰ نے فضل بن عباس سے نقل کیا ہے۔ ہیثمی نے کہا ہے کہ اس کے اسناد میں ابو یعلی عطاء بن مسلم ہے، ابنِ حبان نے اس پر اعتماد کیا ہے دوسروں نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے، اس کے باقی راوی سب قابل اعتماد ہیں۔ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حکمران، والی یا سرکاری ملازم کی شکایت کو قاضی المظالم کے سامنے اٹھایا جائے گا اور قاضی المظالم اس کے بارے میں حکم شرعی بتائے گا جس کی پابندی لازمی ہو گی۔

اس لیے قضاء کی تعریف ایسی جامع ہونی چاہیے جس میں ان تینوں قسم کی قضاؤں کو شامل کیا گیا ہو جو کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور آپ ﷺ کے فعل میں وارد ہیں، یعنی لوگوں کے درمیان جھگڑوں کے فیصلے کرنا، اجتماعی نقصان سے بچانا اور حکمرانوں اور رعایا کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو قاضی المظالم کے سامنے رکھنا۔

دفعہ نمبر76: خلیفہ ایسے شخص کو قاضی القضاۃ مقرر کرے گا جو مرد، بالغ، آزاد، مسلمان، عاقل، عادل اور فقیہ ہو۔ پھر اگر اس کو قاضی المظالم مقرر کرنے اور اس کو برطرف کرنے اور مظالم میں فیصلے کرنے کا اختیار بھی دیا جائے تب اس کے لیے مجتہد ہونا ضروری ہے۔ اور انتظامی قوانین کے اندر رہتے ہوئے اس کے پاس قاضیوں کے تقرر، ان کو سمجھانے اور ان کو بوقت ضرورت برطرف کرنے کا اختیار بھی حاصل ہو گا۔ تاہم عدلیہ کے باقی ملازمین اس محکمے کے انچارج کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں جو عدلیہ کے تمام امور کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

اس میں اصل یہ ہے کہ خلیفہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی کو ریاست کے کسی بھی حصے میں کسی خاص کام کے لیے والی مقرر کرے یا کسی کو ایک خاص علاقے میں کسی کام کا والی مقرر کرے، خلیفہ ایک شخص کو ایک خاص جگہ میں عام ولایت بھی دے سکتا ہے۔ خلیفہ کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ کسی شخص کو امیر الجہاد مقرر کرے، کسی کو امیر حج مقرر کرے، کسی کو امیر خراج مقرر کرے اسی طرح وہ کسی کو امیر قضاء (عدلیہ) بھی مقرر کر سکتا ہے اور اس امیر کو قاضیوں کے تقرر، ان کی سرزنش کرنے اور ان کو برطرف کرنے کا اختیار دے سکتا ہے۔ اسی طرح امیر الجہاد کو یہ اختیار دے سکتا ہے کہ وہ فوج میں کمانڈروں اور ذمہ داروں کا تقرر کرے، ان کو منظم کرے اور ان کو معزول کر سکے۔ لہٰذا خلیفہ کیلئے جائز ہے کہ وہ قاضی القضاۃ یعنی امیر القضاء مقرر کرے۔ یہ قاضی القضاۃ یا امیر الا قضاء حکمران ہو گا ملازم نہیں کیونکہ یہ ایک والی ہے جس کو کسی بھی دوسرے امیر کی طرح ایک خاص کام کا امیر اور والی مقرر کیا گیا ہے۔ تاہم وہ قضاء کے معاملے میں خلیفہ کا معاون نہیں ہوتا کیونکہ اسے مخصوص ذمہ داری دی گئی ہے لہٰذا اس کی تعیناتی صرف قضاء کے معاملے تک محدود ہے اس سے آگے نہیں۔ جہاں تک خلیفہ کے معاون کا تعلق ہے تو اس کو تمام معاملات میں ذمہ داری دی جاتی ہے تا کہ خلیفہ تمام معاملات میں اس کی مدد حاصل کر سکے اور یہ معاملہ قاضی القضاء سے مختلف ہے جو صرف قضاء کے معاملات میں ہی خلیفہ کی معاونت کرتا ہے۔

یہ بات کہیں بھی ثابت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کو قاضی القضاء مقرر کیا ہو، اسی طرح خلفائے راشدینؓ میں سے کسی کے بارے میں بھی یہ ثابت نہیں کہ کسی نے کوئی قاضی القضاء مقرر کیا ہو، اس کی بھی کوئی دلیل نہیں ملتی کی دور دراز علاقوں میں قاضی اپنے نائب مقرر کرتے تھے تاکہ وہ ان کی نیابت میں فیصلے کریں، ایسا نہ تو خلفائے راشدینؓ کے عہد میں ہوا بلکہ امویوں کے عہد میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ سب سے پہلے خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں قاضی القضاء مقرر کیا گیا۔ سب سے پہلے جس قاضی کو یہ صفت (لقب) دیا گیا وہ ابو حنیفہ کے ساتھی مشہور زمانہ قاضی ابو یوسف الکندی تھے جو کہ مجتہد تھے۔ یوں قاضی القضاء مقرر کرنا ایک مباح عمل ہے، چنانچہ خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ ایسا قاضی مقرر کرے جس کے پاس قاضیوں کو مقرر اور بر طرف کرنے کا اختیار ہو، ایسے قاضی کو قاضی القضاء کہا جاتا ہے۔ قاضی القضاء کے لیے بھی وہی شرائط ہیں جو کہ ایک قاضی اور حکمران کے لیے ہیں کیونکہ وہ ایک قاضی بھی ہے اور حکمران بھی اور اسے اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ قاضی مقرر کرے اور عدالت میں مقدمات کا فیصلہ بھی کرے۔ دوسرے لفظوں میں قاضی القضاء مرد، بالغ آزاد، مسلمان، عاقل اور عادل ہو اور ساتھ ہی اس کا اہلِ فقہ میں سے ہونا ضروری ہے، کیونکہ باصلاحیت ہونے کی شرط کا مطلب یہاں یہ ہے کہ وہ فقیہ ہو، یہ اس لیے کہ اس کا کام قاضیوں کے تقرر کے ساتھ ساتھ فیصلے کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جہالت سے فیصلے کرنے کی مذمت کی ہے اور ایسا کرنے والے کو جہنمی قرار دیا ہے، ارشاد ہے **«وَرَجُلٌ قَضَى لِلنَّاسِ عَلَى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ»** ''اور وہ شخص جو لوگوں کے فیصلے جہالت (علم کے بغیر) سے کرے وہ آگ میں ہے'' اس کو اصحاب سنن اور حاکم نے نقل کیا اور بریدہ کی روایت کے حوالے سے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے قاضی القضاء کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اہلِ فقہ میں سے ہو۔ قاضی القضاء کے لیے مجتہد ہونے کی شرط اس وقت ہے جب اس کو قاضی المظالم کی تقرری اور بر طرفی کا اختیار دیا گیا ہو اور نتیجتاً وہ مظالم کے فیصلے کرتا ہو کیونکہ مظالم کے فیصلوں کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ دفعہ نمبر 78 میں واضح ہے۔

اس دفعہ میں عدلیہ کے ملازمین کے تقرر کا جو ذکر ہے وہ اُجرت والے ملازمین ہیں، ان کے تعین کے جائز ہونے کی دلیل ملازم کو اجرت دے کر ملازمت دینے کی دلیل ہے۔

دفعہ نمبر 77: قاضی تین ہیں: ایک قاضی عام، یہ لوگوں کے درمیان معاملات اور عقوبات میں فیصلے کا ذمہ دار ہوتا ہے، دوسرا محتسب، یہ ان خلاف ورزیوں کے فیصلوں کو نمٹانے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو جماعت کے حق میں ضرر رساں ہوتے ہیں، تیسرا قاضی المظالم، یہ ریاست اور عوام کے مابین پیدا ہونے والے تنازعات کو ختم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

یہ دفعہ عدلیہ کی اقسام کا بیان ہے، جہاں تک اس بات کی دلیل کا تعلق ہے کہ قضاء (عدلیہ) لوگوں کے باہمی جھگڑوں کے فیصلے کا نام ہے تو یہ رسول ﷺ کی جانب سے معاذ بن جبلؓ کو یمن کے ایک علاقے کا قاضی مقرر کرنے کا عمل ہے۔

رہی بات ان خلاف ورزیوں میں فیصلے کرنے کے لیے عدلیہ کی دلیل کی جو جماعت (عوام) کے حق کو نقصان پہنچانے کے بارے میں ہے، جس کے قاضی کو محتسب کہا جاتا ہے، یہ بھی رسول اللہ ﷺ کے عمل اور قول سے ثابت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّ»** "جس نے دھوکہ دیا (ملاوٹ کیا) وہ ہم میں سے نہیں" اس کو احمد، ابوداؤد اور ابنِ ماجہ نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ملاوٹ کرنے والے کی گرفت کرتے اور اس کی سرزنش فرماتے۔ قیس بن ابی غرزہ الکنانی روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ہم مدینے میں اوساق (ایک پیمانہ، وسق کی جمع) خرید و فروخت کیا کرتے تھے اور اپنے آپ کو دلال (ایجنٹ) کہا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ہمارے پاس آکر ہمیں ایسے نام سے پکارا، جو ہمارے نام سے بہتر تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«يَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ، إِنَّ الْبَيْعَ يَحْضُرُهُ اللَّغْوُ وَالْحَلْفُ، فَشُوبُوهُ بِالصَّدَقَةِ»** "اے تاجر لوگو، خرید و فروخت میں بیہودہ گوئی اور قسم ہوتی رہتی ہے، اس لیے اس کا ازالہ صدقہ دے کر کرو" اس کو اہلِ سنن اور حاکم نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے

کہ یہ حسن صحیح ہے۔ یہ حدیث بھی روایت کی گئی ہے کہ براء بن عازب اور زید بن ارقم شراکت دار تھے، دونوں نے کچھ نقد اور کچھ ادھار پر چاندی خریدی، یہ رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہو گیا تو آپ ﷺ نے ان دونوں کو حکم دیا کہ **«أَنَّ مَا كَانَ بِنَقْدٍ فَأَجِيزُوهُ، وَمَا كَانَ بِنَسِيئَةٍ فَرُدُّوهُ»** ''جو نقدی کے بدلے تھا اس کو رکھ لو اور جو ادھار پر تھا اس کو واپس کرو'' اس کو احمد نے ابو منھال سے روایت کیا ہے۔ یہ حسبہ عدالت ہے۔ اجتماعی طور پر نقصان پہنچانے والے کیسوں میں فیصلے کرنے والی عدالت کو حسبہ کا نام دینا ریاست میں ایک مخصوص عمل کے لیے اصطلاح ہے، جو تاجروں اور صنعت کاروں کو اپنی تجارت، ہنر اور صنعت میں جعل سازی سے روکتی ہے اور ایسے پیمانے اور ترازو وغیرہ استعمال کرنے پر ان کا مواخذہ کرتی ہے جس سے جماعت کو نقصان پہنچتا ہو۔ یہ بعینہٖ وہ کام ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا اور اس کا حکم دیا اور ان کے بارے میں فیصلے کرنے کی خود نگرانی کی، جیسا کہ براء بن عازب کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کو ادھار سے منع فرما دیا۔ لہٰذا حسبہ کی دلیل سنت ہے، اس کی ایک اور دلیل رسول اللہ ﷺ کا سعید بن العاص کو فتح کے بعد مکہ کے بازار کا عامل مقرر کرنا ہے جیسے کہ طبقات ابنِ سعد اور ابن عبد البر کے الاستیعاب میں ہے۔ عمرؓ بن خطاب نے اپنی قوم کی الشفاء نامی خاتون کو جو ام سلیمان بن ابی حثمہ تھی کو بازار کے لیے قاضی مقرر کیا، یعنی قاضی حسبہ مقرر کیا۔ اسی طرح عبد اللہ بن عتبہ کو مدینہ کے بازار کے لیے قاضی مقرر کیا، اس کو مالک نے اپنے موطا میں اور شافعی نے اپنے مسند میں نقل کیا ہے۔ عمرؓ خود بھی حسبہ کے فیصلوں کا اہتمام کرتے تھے، بازاروں کے دورے کیا کرتے تھے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔ خلیفہ ہی حسبہ کے فیصلے کیا کرتا تھا یہاں تک کہ مہدی کا دور آیا تو اس نے حسبہ کے لیے ایک مخصوص ادارہ بنایا، یوں یہ عدلیہ کے ڈھانچے کا حصہ بن گیا۔ ہارون رشید کے عہد میں محتسب بازاروں میں گشت کیا کرتا تھا، دھوکہ دہی کی روک تھام کے لیے ترازو اور پیمانوں کو چیک کیا کرتا تھا اور تاجروں کے معاملات پر نظر رکھتا تھا۔

جہاں تک اس عدلیہ کی بات ہے جس کو قاضی مظالم کہا جاتا ہے، یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا فعل ہے جب آپ ﷺ نے ایک شخص کو اپنے سے بدلہ لینے کا حکم دیا: بیھقی نے سُنن الکبریٰ میں ابو سعید

خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کوئی چیز تقسیم کر رہے تھے کہ ایک شخص آگے آگیا اور رسول اللہ ﷺ اس پر گر پڑے اور آپ ﷺ کے ہاتھ میں موجود کھجور کی ٹہنی سے وہ شخص زخمی ہو گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا"آ اپنا بدلہ لے لے"، اس شخص نے کہا نہیں اللہ کے رسول ﷺ! میں نے معاف کر دیا، یہ ریاست کے سربراہ رسول اللہ ﷺ اور ایک شہری کے درمیان فیصلہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ **«فَمَنْ كُنتُ أصبتُ مِن عِرضه، أو مِن شَعره، أو من بَشَرِه، أو مِن ماله شيئاً، هذا عِرض محمد وشعرُه، وبشرُه، وماله فليَقُمْ فليَقتصَّ»** "اگر میں نے کسی کی عزت کو پامال کیا ہو، کسی کے بال نوچے ہوں، کسی کی جلد پر کوڑے برسائے ہوں یا کسی کا مال لیا ہو تو اس کو چاہیے کہ اٹھ کر اپنا قصاص لے لے" اس کو ابو یعلیٰ نے فضل بن عباس سے روایت کیا ہے، ھیثمی نے کہا ہے کہ ابو یعلی کی اسناد میں عطاء بن مسلم ہے جس کو ابنِ حبان وغیرہ نے ثقہ قرار دیا ہے جبکہ دوسروں نے اس کو ضعیف کہا ہے باقی راوی ثقہ ہیں۔ معجم الاوسط میں طبرانی کی روایت میں فضل بن عباس نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«مَنْ أَخَذْتُ لَهُ مَالاً فَهَذَا مَالِي فَلْيَأْخُذْ مِنْهُ، وَمَنْ جَلَدْتُ لَهُ ظَهْراً فَهَذَا ظَهْرِي فَلْيَقْتَصَّ مِنْهُ»** "اگر میں نے کسی کے پیٹھ پہ کوڑے مارے ہوں تو یہ میری پیٹھ ہے اپنا بدلہ لے لے، اگر میں نے کسی کو گالی دے کر بے عزتی کی ہو تو آئے اپنا بدلہ لے، اگر میں نے کسی کا مال لیا ہو تو یہ میرا مال ہے اس سے اپنا بدلہ لے"۔ یہ سب قضائے مظالم (مظالم کی عدالت) کے علاوہ کچھ نہیں، کیونکہ قضائے مظالم کی تعریف بھی یہی ہے کہ خلیفہ اور رعایا کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات پر نظر رکھنا، چنانچہ قضائے مظالم کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فعل اور قول ہے۔ تاہم رسول اللہ ﷺ نے ریاست کے کسی گوشے میں مظالم کے لیے کوئی مخصوص قاضی متعین نہیں کیا۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفاء بھی آپ ﷺ ہی کے نہج پر چلے اور خود ہی مظالم کے فیصلے کرتے رہے، جیسا کہ علی بن ابی طالبؓ کیا کرتے تھے، لیکن علی کرم اللہ وجہہ اس کے لیے کوئی مخصوص وقت اور متعین اسلوب مقرر نہیں کرتے تھے، بلکہ کہیں بھی ظلم کا ارتکاب ہوتا تو اس کا تدارک کرتے، یوں یہ بھی دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ

ہوتا۔ عبد المالک بن مروان کے زمانے تک یہی حال تھا، یہ پہلے خلیفہ تھے جس نے مظالم کے فیصلوں کے لیے مخصوص وقت اور متعین اسلوب مقرر کردیا۔ چنانچہ اس کے لیے ایک دن مقرر کیا کرتے تھے اور مظالم کی تفتیش کیا کرتے تھے، اگر کوئی چیز مشکل معلوم ہوتی تو اس کو اپنے قاضی کے حوالے کرتے تاکہ وہ اس کا فیصلہ کرے، پھر خلیفہ لوگوں پر ہونے والے مظالم پر نظر رکھنے کے لیے اپنے نمائندے مقرر کرتے تھے۔ اس طرح مظالم کا ادارہ وجود میں آگیا، جس کو "دار العدل" کا نام دیا گیا۔ اس کے لیے ایک مخصوص قاضی مقرر کرنا جائز ہے، کیونکہ خلیفہ کے جتنے اختیارات ہیں ان میں وہ اپنا نائب بھی مقرر کرسکتا ہے۔ اس کے لیے مخصوص وقت اور متعین اسلوب مقرر کرنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ مباحات میں سے ہے۔

دفعہ نمبر 78: قاضی کا منصب سنبھالنے والے شخص کے لیے شرط کہ وہ مسلمان، آزاد، بالغ، عاقل، عادل، فقیہ اور احکامات کو حقائق پر لاگو کرنے پر قادر ہو، جبکہ کہ قاضی مظالم کا منصب لینے والے شخص کے لیے ان شرائط کے علاوہ یہ شرط بھی ہے کہ وہ مرد اور مجتہد بھی ہو۔

اس کی دلیل وہی ہے جو قاضی القضاء کی دلیل کے بارے میں گزر گیا ہے، تاہم جھگڑوں کے فیصلے کرنے والے قاضی اور قاضی حسبہ کے لیے مرد ہونے کی کوئی شرط نہیں، بلکہ عورت بھی ہوسکتی ہے، کیونکہ یہ حکمران نہیں بلکہ صرف قاضی ہے، یعنی وہ حکمِ شرعی کے بارے خبر دینے والا ہے اس کو نافذ کرنے والا نہیں، اس لیے یہ حدیث اس پر لاگو نہیں ہوتی **«لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً»** "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جو اپنے معاملے کو کسی عورت کے سپرد کردے" اس کو بخاری نے روایت کیا ہے اور یہ ولایت کے بارے میں ہے جو کہ حکمرانی ہے۔ اس حدیث کا سبب فارس کی جانب سے عورت کو اپنی ملکہ مقرر کرنا ہے۔ ابو بکرہ کہتے ہیں کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر ملی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنی ملکہ بنادیا تو فرمایا **«لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً»** "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جو اپنے معاملے کو کسی عورت کے سپرد کردے" اس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ اس حدیث کے فرمان کا سبب ایک مخصوص موضوع

ہے جو کہ حدیث کے نص میں بھی صریحاً موجود ہے۔یہ حکمرانی اور اقتدار ہے جبکہ قضاء اقتدار نہیں۔یوں یہ حدیث حکمرانی کے ساتھ خاص ہے قضاءاس میں داخل نہیں،اس کے دو سبب ہیں:

ایک:جو نص کسی معین موضوع کے بارے میں ہو وہ اس نص کی طرح ہوتی ہے جو سوال کے جواب میں ہو،اس نص کو اسی سوال یاواقعے کے موضوع کے ساتھ مخصوص کرنالازمی ہوتاہے،اس کا ہر چیز کے لیے عام ہونا درست نہیں،کیونکہ وہ ایک سوال کا جواب ہے اور ایک معین موضوع کے بارے میں گفتگو ہے،اس لیے اس کو اسی موضوع تک محدود ہونالازمی ہے۔رسول اللہ ﷺ کے الفاظ سوال یاواقعے سے متعلق ہیں تو حکم بھی اسی سے متعلق ہو گا،یہ اس کے بر خلاف ہے کہ جس میں رسول اللہ ﷺ نے ابتداء سے ہی ارشاد فرمایاہو(نہ کہ کسی سوال کے ردِ عمل میں)تب وہ عام اور عموم سے متعلق ہو گا۔مگر جس وقت آپ ﷺ نے کسی واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے یاکسی مخصوص سوال کے جواب میں ارشاد فرمایاہو تو صورت حال مختلف ہوتی ہے،تب نص یعنی اللہ یااس کے رسول کا کلام قطعی طور پر سوال یاواقعے سے متعلق ہو گا،اسی لیے بلاشبہ حکم بھی اسی سے متعلق ہو گا۔یہ تو اس موضوع کے متعلق تھاجو واقعہ یاسوال ہے،اور یہ سوال کرنے والے یا جس کے ساتھ واقعہ پیش آیااس سے متعلق نہیں ہے۔چونکہ ان دونوں میں اعتبار لفظ کے عموم کا ہے سبب کے مخصوص ہونے کا نہیں،اسی لیے سبب اور موضوع میں فرق ہے۔یوں اعتبار الفاظ کی عمومیت کا ہے سبب کے خاص ہونے کا نہیں،چونکہ الفاظ سبب کے ساتھ مخصوص نہیں اس لیے واقعہ اور سوال کے بر خلاف یہ اپنی عمومیت پر ہی رہیں گے،یعنی اس موضوع کے بر خلاف جس کے ضمن میں واقعہ یاسوال ہے۔اس حدیث میں بلاشبہ الفاظ موضوع سے متعلق ہیں،عام نہیں ہیں،یہی وجہ ہے کہ یہ حدیث **«لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً»** "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جو اپنے معاملے کو کسی عورت کے سپرد کر دے" حکمرانی کے ساتھ خاص ہے عدلیہ کے لیے نہیں۔

یہ تو تھاپہلا سبب،جہاں تک دوسرے سبب کی بات ہے تو لفظ " **وَلَّوْا أَمْرَهُمُ** " ولایت سے ہے جو کہ ولایت امر ہے،جبکہ قاضی والی یاولی الامر نہیں ہوتا،اسی وجہ سے وہ اس حدیث کے ماتحت نہیں آتا۔یوں یہ

حدیث قضاء (عدلیہ) کے بارے میں نہیں۔ یہ وضاحت تھی حدیث کی دلالت کے لحاظ سے۔ جہاں تک عورت کے لیے قاضی بننے کے مباح ہونے کی بات ہے تو قاضی کو بھی دوسرے ملازمین کی طرح اجرت پر رکھا جاتا ہے، جس کو اجرت پر رکھا جاتا ہے اس کا مرد یا عورت ہونا دونوں جائز ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ** "اگر وہ (مطلقہ مائیں) تمہارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو ان کی اجرت دے دو" (الطلاق:6)۔ قاضی شرع کے مطابق عمل کرتا ہے یعنی فریقین کو اس حکم شرعی کے بارے میں خبر دینے کے لیے اس کا تقرر ہوتا ہے جس کی پابندی لازمی ہے۔ اس کا تقرر شرع کو نافذ کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس پر اجارہ کی تعریف صادق آتی ہے کہ یہ معاوضے کے بدلے فائدہ اٹھانے کا عقد ہے۔ حکمرانی اس کے برعکس ہے جس پر یہ تعریف صادق نہیں آتی کیونکہ اس کے ساتھ کسی خاص فائدے کے لیے کوئی عقد نہیں ہوتا، بلکہ اس کا کام شرع کا نفاذ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عورت کے لیے حکمران بننا جائز نہیں، کیونکہ حکمران ہی ولی الامر ہوتا ہے۔ لیکن عورت کے لیے قاضی بننا جائز ہے کیونکہ قاضی کو اجرت پر رکھا جاتا ہے وہ حکمران نہیں ہوتا۔

جہاں تک قاضی کے لیے باقی شرائط کی بات ہے تو اس کے دلائل خلیفہ کی شرائط کے دلائل میں ذکر کیے جا چکے ہیں۔ اس طرح اس شرط کی دلیل کہ وہ فقیہ ہو یہ حدیث ہے کہ "قاضی تین ہیں" یہاں تک کہ فرمایا کہ **«وَرَجُلٌ قَضَى لِلنَّاسِ عَلَى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ»** "جس شخص نے ناسمجھ ہونے کے باوجود لوگوں کے درمیان فیصلے کیے وہ آگ میں ہوگا" اس کو اہلِ سنن اور حاکم نے بریدہ سے روایت کیا اور صحیح قرار دیا ہے۔

یہ قضائے حسبہ اور اس قضاء کے حوالے سے تھا جس میں جھگڑوں کے فیصلے ہوتے ہیں، جن میں عورت کا قاضی ہونا جائز ہے۔ تاہم قاضی المظالم کے لیے قاضی القضاء کی طرح مرد ہونا شرط ہے، کیونکہ اس کا کام فیصلہ اور حکمرانی ہے، وہ حکمران کے بارے میں فیصلے دیتا ہے اور اس پر شرع کو نافذ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے قاضی کی ان شرائط کے علاوہ جن میں فقیہ ہونا بھی ہے، ایک اور شرط اس کا مرد ہونا ہے، بلکہ اس

سے بھی بڑھ کر اس کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ وہ مجتہد ہو، کیونکہ وہ جن مظالم پر نظر رکھتا ہے ان میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ حکمران نے" ما أنزل الله " کو چھوڑ کر حکومت کی ہے، یعنی کوئی ایسا حکم دیا ہے جس کی شرعی دلیل نہیں، یا اس نے جس دلیل سے استدلال کیا ہے وہ اس واقعے پر منطبق ہی نہیں ہوتی۔ اس قسم کے مظالم کا فیصلہ صرف وہ قاضی کر سکتا ہے جو مجتہد ہو۔ اگر وہ مجتہد نہ ہو تو وہ جہالت کی حالت میں فیصلہ کرنے والا ہو گا جو کہ حرام اور ناجائز ہے، اس لیے اس کے لیے حکمران اور قاضی کی شرائط کے علاوہ یہ بھی شرط ہے کہ وہ مجتہد ہو۔

دفعہ نمبر 79: قاضی، محتسب اور قاضی مظالم کو تمام علاقوں میں تمام مسائل کے فیصلے کرنے کی عمومی ذمہ داری سونپ دینا بھی جائز ہے اور کسی مخصوص علاقے میں کچھ مخصوص قسم کے مسائل کے فیصلے کرنے کی خصوصی ذمہ داری سونپنا بھی جائز ہے۔

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فعل ہے۔ آپ ﷺ نے علی ابن ابی طالبؓ کو یمن میں عدلیہ کی ذمہ داری سونپی۔ احمد نے اپنے مسند میں صحیح اسناد کے ساتھ علیؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ: "رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن کی طرف روانہ کیا، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ آپ مجھے مجھ سے بڑی عمر کے لوگوں کے پاس بھیج رہے ہیں جبکہ میں کم عمر ہوں اور فیصلے کرنے میں بصیرت نہیں، کہتے ہیں: آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک میرے سینے پر رکھ کر فرمایا: "اے اللہ اس کی زبان کو درست کر دے اور اس کے دل کو ہدایت دے، اے علی! جس وقت فریقین تمہارے سامنے آجائیں تو جس طرح پہلے کی بات سنتے ہو اسی طرح دوسرے کی بات بھی سن کر ان کے درمیان فیصلہ کرو، کیونکہ ایسا کرنے سے فیصلہ تمہارے لیے واضح ہو گا' آپؓ کہتے ہیں کہ: اس کے بعد کوئی فیصلہ مجھے پیچیدہ یا مشکل نہیں لگا"۔ جبکہ آپ ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کے ایک علاقے کی عدلیہ کی ذمہ داری دی۔ ابو عمر بن عبد البر نے الاستیعاب میں ذکر کیا ہے کہ: "اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبلؓ اور جعفر بن ابی طالبؓ کے مابین اخوت قائم کی، جنہوں (معاذؓ) نے عقبہ، بدر اور تمام معرکوں میں شمولیت اختیار کی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں یمن کے علاقے الجند کا

قاضی مقرر کر کے بھیجا، جہاں وہ لوگوں کو قرآن اور اسلامی تعلیمات سکھاتے اور ان کے درمیان فیصلے کرتے، عاملوں سے زکوٰۃ وصول کرنے کی ذمہ داری بھی ان کو دی تھی...“۔

آپ ﷺ نے عمرو بن العاصؓ کو ایک مخصوص مسئلے کا فیصلہ کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ ابن قدامہ نے المغنی میں ذکر کیا ہے کہ: ”اور عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ: دو فریق لڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرو، میں نے عرض کیا آپ ﷺ ہی اس کے لائق ہیں، فرمایا: ’اگرچہ بات ایسے ہی ہے، (مگر پھر بھی)۔ میں نے کہا: کس طرح فیصلہ کروں؟ فرمایا: ’فیصلہ کرو، اگر تم نے درست فیصلہ کیا تو تمہارے لیے دس نیکیاں ہوں گی، اگر تم نے غلطی کی تو تمہیں ایک ہی اجر ملے گا“۔ ابن قدامہ نے کہا ہے کہ: اس کو سعید نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے، ھیثمی نے مجمع الزوائد میں کہا ہے کہ: ”امام احمد نے اسے اسناد سے روایت کیا ہے جس کے راوی قابلِ بھروسہ ہیں۔ عقبہ بن عامر نے نبی ﷺ سے اسی قسم کی روایت کی ہے تاہم اس میں یہ فرمان بھی ہے کہ ”اگر تم نے فیصلہ کرتے وقت اجتہاد کیا اور اجتہاد درست ہوا تو تمہیں دس نیکیاں ملیں گی، اگر تمہارا اجتہاد غلط ہو تو تمہیں ایک ہی اجر ملے گا“۔

دفعہ نمبر 80: کسی بھی عدالت کا ایک سے زیادہ ایسے قاضیوں پر مشتمل ہونا جائز نہیں جس کے پاس مسئلوں کے فیصلے کرنے کا اختیار ہو، ہاں قاضی کے ساتھ ایک یا زیادہ ایسے قاضی ہو سکتے ہیں جن کے پاس فیصلے کرنے کا اختیار نہ ہو، ان کے پاس مشورہ اور رائے دینے کا اختیار ہوتا ہے اور ان کی رائے کا وہ پابند بھی نہیں ہوتا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی ایک مسئلے میں کبھی دو قاضی مقرر نہیں کیے، ایک مسئلے کے فیصلے کے لیے ایک ہی قاضی مقرر کیا، جو ایک ہی مسئلے میں قاضیوں کے متعدد ہونے کے جائز نہ ہونے کی دلیل ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ قضاء حکمِ شرعی کے بارے میں ایسی خبر دینا ہے کہ جس کی پابندی لازمی ہو اور مسلمان کے لیے حکم شرعی متعدد نہیں ہوتے کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے اور اللہ کا حکم ایک ہی ہے۔ یہ درست ہے

کہ اس کے بارے میں فہم متعدد ہو سکتے ہیں، لیکن مسلمان کے لیے اس پر عمل کرنے کے لحاظ سے وہ ایک ہی ہوتا ہے متعدد نہیں۔ اس نے جو سمجھا ہے اس کے حق میں وہی اللہ کا حکم ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اس کے حق میں اللہ کا حکم نہیں۔ اگرچہ اس کی نظر میں اس کو حکم شرعی سمجھا جاتا ہے، جس کو اس نے اختیار (تقلید) کیا ہے اور اپنی تقلید پر عمل کر رہا ہے تو یہ اس کے حق میں اللہ کا حکم ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اس حق میں اللہ کا حکم نہیں۔ قاضی بھی جس وقت کسی عدالتی فیصلے میں ایسی خبر دے رہا ہے جس کی پابندی لازمی ہے تو اس خبر کا ایک ہونا بھی واجب ہے، کیونکہ یہ اللہ کے حکم کی ایسی خبر دینا ہے جس کی پابندی لازمی ہے۔ تو یہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے اللہ کے حکم پر عمل کرنا ہے اور اللہ کا حکم اس پر عمل کرنے کی حالت میں متعدد نہیں ہوتے، خواہ اس کے فہم متعدد بھی ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی کا بھی متعدد ہونا درست نہیں، کیونکہ اللہ کے حکم کا متعدد ہونا محال ہے۔ یہ تو ایک ہی مسئلے کی نسبت ہے، یعنی ایک ہی عدالت میں، جبکہ ایک علاقے میں فیصلوں کے لیے الگ الگ عدالتیں ہونا جائز ہے، کیونکہ قضاء خلیفہ کی نیابت ہے اور یہ وکالت کی طرح ہے جس میں تعداد جائز ہے۔ اسی طرح کئی قاضیوں کا ایک جگہ ہونا جائز ہے۔ اگر فریقین دو قاضیوں میں دلچسپی کا اظہار کریں تو مدعی کو ترجیح دی جائے گی اور وہی قاضی فیصلہ دے گا جس کا اس نے مطالبہ کیا، کیونکہ اس نے اپنے حق کا مطالبہ کیا ہے اس لیے اس کو اس شخص پر ترجیح حاصل ہے جس سے وہ اپنا حق مانگ رہا ہے۔

دفعہ نمبر 81: قاضی کے لیے مجلسِ قضاء کے علاوہ کہیں فیصلہ کرنا جائز نہیں، گواہی اور قسم بھی صرف عدالت کی مجلس میں ہی معتبر ہیں۔

اس کی دلیل وہ ہے جو عبد اللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ **«قَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنَّ الْخَصْمَيْنِ يَقْعُدَانِ بَيْنَ يَدَيِ الْحَكَمِ»** "رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ دیا ہے کہ فریقین قاضی کے سامنے بیٹھیں گے" اس کو احمد اور ابو داؤد نے روایت کی ہے اور یہ الفاظ ابو داؤد کے ہیں۔ یہ حدیث فیصلہ کرنے کی کیفیت کو بیان کرتی ہے۔ یہی شرعی کیفیت ہے، یعنی ایک مخصوص ماحول میں فیصلہ ہونا چاہیے، جو یوں ہے کہ

فریقین قاضی کے سامنے آکر بیٹھیں گے۔اسی کو عدالت کی نشست کہا جاتا ہے۔عدالت کی صحت کے لیے یہ شرط ہے،یعنی ایک مخصوص مجلس لازمی ہے جہاں فیصلہ سنایا جائے گا،یہی فیصلہ درست ہو گا اوراسی مجلس میں فریقین فیصلہ کرنے والے کے سامنے بیٹھیں گے۔علیؓ کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ **«يَا عَلِيُّ، إِذَا جَلَسَ إِلَيْكَ الْخَصْمَانِ فَلاَ تَقْضِ بَيْنَهُمَا حَتَّى تَسْمَعَ مِنَ الآخَرِ كَمَا سَمِعْتَ مِنَ الأَوَّلِ»** ''اے علی جب فریقین تمہارے سامنے بیٹھ جائیں تو جس طرح پہلے کی بات سنی ہے اسی طرح دوسرے کی بات سننے تک فیصلہ نہ دینا''اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔یہ بھی ایک مخصوص صورتحال کی تصویر کشی کررہی ہے کہ جب فریقین تمہارے سامنے بیٹھ جائیں،یوں فیصلے کے صحیح ہونے کے لیے مجلس قضاء(نشست)شرط ہے۔قسم کے معتبر ہونے کے لیے بھی یہ شرط ہے،کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«وَلَكِنَّ الْيَمِينَ عَلَى الْمُدَّعَى عَلَيْهِ»** ''لیکن قسم مدعی علیہ کی ہے''،متفق علیہ ہے ابنِ عباسؓ نے روایت کیا ہے۔اس کی یہ صفت یعنی مدعی علیہ ہونا بھی عدالت کی نشست ہی میں ہو گا۔گواہی کا بھی عدالت کی نشست کے علاوہ کوئی اعتبار نہیں،کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے **«الْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي»** ''گواہی مدعی پر ہے''اس کو بیہقی نے صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے جیسا کہ ابن حجر نے کہا ہے،یہ صفت بھی قضاء کی مجلس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

دفعہ نمبر82:کیسوں کی اقسام کے اعتبار سے عدالتوں کے متعدد درجات ہونا جائز ہے،اس لیے بعض قاضیوں کو متعین کیسوں میں ایک حد تک مخصوص کرنا جائز ہے،ان کیسوں کے علاوہ دوسرے کیسوں کو دوسری عدالتوں کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ عدلیہ خلیفہ کی نیابت ہے،یہ بالکل وکالت کی طرح ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔یہ وکالت ہی ہے اور وکالت عام بھی ہو سکتی ہے اور خاص بھی۔اس لیے ایک قاضی کو کچھ مخصوص مقدمات پر مقرر کیا جا سکتا ہے اور ان کے علاوہ دوسرے مقدمات کا فیصلے کرنے سے اس کو روکا جاسکتا

ہے۔ دوسرے کیسوں کے لیے کوئی اور قاضی مقرر کیا جائے گا۔ اس کا تقرر ایک ہی جگہ کے لیے بھی ہو سکتا ہے یا جیسا بھی اس کا تقرر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عدالتوں کے درجات مختلف ہو سکتے ہیں۔ قرون اولیٰ میں مسلمانوں کے ہاں اس طرح تھا۔ ماوردی نے اپنی کتاب احکامِ سلطانیہ میں کہا ہے کہ: ''ابو عبداللہ زبیری نے کہا: بصرہ کے ہمارے حکمران وقت شناس تھے جنہوں نے جامع مسجد میں ایک قاضی مامور کیا ہوا تھا، جس کو مسجد کا قاضی کہا جاتا تھا جو دو سو درھم یا بیس دینار اور اس سے کم کے مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا، نفقات مقرر کرتا تھا، اپنی جگہ اور اپنے اختیارات سے تجاوز نہیں کرتا تھا''۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ایک مخصوص مقدمے میں عمرو بن العاصؓ کو اپنا نائب مقرر کیا اور تمام مقدمات کے لیے علی ابن ابی طالبؓ کو ولایہ یمن میں اپنا نائب مقرر فرمایا، جو قضاء کے عمومیت اور خصوصیت دونوں کے جواز کی دلیل ہے۔

دفعہ نمبر 83: اپیل کورٹس اور خصوصی عدالت کا کوئی وجود نہیں ، کیس کے فیصلے کا ایک ہی قطعی درجہ ہے، قاضی جس وقت فیصلہ سنادے تو اس کا فیصلہ اسی وقت نافذ ہوتا ہے، کسی اور قاضی کا فیصلہ کسی بھی حالت میں اس کے فیصلے کو کالعدم نہیں کر سکتا سوائے اس صورت کے کہ اس نے غیر اسلامی فیصلہ دیا ہو، یا اس نے کتاب، سنت یا اجماع صحابہ کی کسی قطعی نص کی خلاف ورزی کی ہو، یا یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے حقائق کے بر خلاف فیصلہ دیا ہے۔

یہ دفعہ اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ قاضی کا فیصلہ کالعدم نہیں ہوتا۔ وہ خود بھی ایسا نہیں کر سکتا کوئی اور قاضی بھی اس کو کالعدم نہیں کر سکتا۔ اس بات کی دلیل کہ قاضی کا فیصلہ کالعدم نہیں ہو سکتا یہ ہے کہ صحابہؓ نے اس پر اجماع کیا۔ چنانچہ ابو بکرؓ نے بعض مسائل میں اجتہاد کیا اور عمرؓ نے ان کی مخالفت کی لیکن ان کے فیصلے کو منسوخ نہیں کیا۔ اسی طرح علیؓ نے اپنے اجتہاد میں عمرؓ سے اختلاف کیا لیکن ان کے فیصلے کو منسوخ نہیں کیا۔ علیؓ نے ابو بکرؓ اور عمرؓ دونوں سے بھی اختلاف کیا لیکن ان کے فیصلوں کو منسوخ نہیں کیا۔ ابن ابی شیبہ نے المصنف میں روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ''اہل نجران علیؓ کے پاس آگئے اور کہا کہ اے امیر المومنین! اپنے

ہاتھ سے ہمارے لیے لکھئے اور اپنی زبان سے ہماری سفارش کیجئے، عمرؓ نے ہمیں ہماری زمینوں سے نکالا ہے، ہمیں واپس ہماری زمینوں پر واپس لائیے، علیؓ نے ان سے فرمایا، ہائے تمہاری بربادی عمرؓ تو ہدایت یافتہ تھے میں ان کے فیصلے کو نہیں بدلوں گا"۔ یہ روایت بھی کی گئی ہے کہ عمرؓ نے دوماں شریک بھائیوں جن کے باپ الگ الگ تھے کی شراکت کو ساقط کرنے کا فیصلہ دیا پھر ایک اور معاملے میں ان دونوں کو شریک کرنے کا فیصلہ دیا اور فرمایا: وہ ہمارے اُس فیصلے کے مطابق تھا اور یہ ہمارے اِس فیصلے کی رو سے ہے۔ اس تضاد کے باوجود ان دونوں فیصلوں کو نافذ کیا، اس کو ابن قدامہ نے المغنی میں ذکر کیا ہے اور بیہقی نے اس کو حکم بن مسعود ثقفی سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح دادا کے حوالے سے مختلف فیصلے دیئے اور پہلے کو منسوخ نہیں کیا جیسا کہ بیہقی نے سُنن الکبریٰ میں ذکر کیا ہے۔

رہی بات اس روایت کی کہ شریح نے دو چچازاد بھائیوں کے بارے میں جن میں سے ایک دوسرے کی ماں کا بھائی بھی تھا یہ فیصلہ دیا کہ مال بھائی کا ہے۔ پھر یہ مسئلہ علیؓ سامنے اٹھایا گیا تو فرمایا: بندے کو لایا جائے، لایا گیا تو فرمایا: یہ تمہیں اللہ کی کتاب میں کہاں مل گیا؟ اس نے کہا: اللہ تعالی کے اس ارشاد میں **وَاُولُو الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ** "اور اللہ کی کتاب میں رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں" (الانفال:75)، علیؓ نے ان سے فرمایا: اللہ تعالی نے فرمایا ہے **وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ** "اور اگر کوئی میت جس کی میراث دوسروں کو ملے گی خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت ایسا ہو کہ اس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا" (النساء: 12)، اور ان کے فیصلے کو منسوخ کر دیا، جیسا کہ بعض روایات میں اس کا ذکر ہے۔ ابن قدامہ نے المغنی کے باب القضاء میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ: "ہمارے پاس تو اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ علیؓ نے ان کے فیصلے کو منسوخ کیا ہو، اگر ثابت ہو بھی جائے تو یہ سمجھا جائے کہ علیؓ نے ان کے اس فیصلے کو مذکورہ آیت کے نص کے خلاف سمجھا"۔ یہ بات ثابت ہے کہ صحابہؓ مسائل میں اپنے اجتہاد سے فیصلے کیا کرتے تھے اور ابو بکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کے عہد میں خلیفہ اس میں ان سے

اختلاف بھی کیا کرتے تھے لیکن کسی نے کسی کے فیصلے کو منسوخ نہیں کیا۔ یہ بھی ثابت ہے کہ عمرؓ نے ایک ہی مسئلے میں مختلف فیصلے دیئے اور ان سب کو نافذ کیا۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آپؓ نے اس حوالے سے فرمایا: ''وہ بھی ہمارا فیصلہ تھا یہ بھی ہمارا فیصلہ ہے'' اس کو ابن قدامہ نے المغنی میں جبکہ بیہقی نے حکم بن مسعود الثقفی سے روایت کیا ہے۔ یہ قاضیوں کے فیصلوں کو منسوخ نہ کرنے کے دلائل تھیں۔ ابنِ قُدامہ نے المغنی میں کہا ہے کہ: اگر اس کا اجتہاد بدل جائے اور وہ نص یا اجماع کے خلاف بھی نہ ہو یا اس کا اجتہاد پہلے کے اجتہاد کے خلاف ہو تو اس مخالفت سے وہ منسوخ نہیں ہو گا، کیونکہ اس پر صحابہؓ نے اجماع کیا ہے''۔

رہی بات اس روایت کی کہ عمرؓ نے ابو موسیٰؓ کو خط لکھا جس میں فرمایا: ''تمہارا کل کا کیا ہوا فیصلہ تمہیں نہ روکے جس سے تم نے اپنے دل میں ہی رجوع کیا ہو اور تمہیں ہدایت نصیب ہوئی ہو کہ تم حق کی طرف لوٹ جاؤ، کیونکہ حق ہی مقدم ہے اور حق کی طرف رجوع کرنا باطل پر اصرار کرنے سے بہتر ہے'' اس کو بیہقی نے السنن میں سعید بن ابی بردہ سے روایت کی ہے۔ خطیب بغدادی نے التاریخ میں سعید بن ابیہ سے اور دار قُطنی نے ابی ملیح ھذلی سے روایت کیا ہے، اس خط کا مقصد یہ تھا کہ آپ نے جو فیصلہ کل دیا تھا پھر تمہیں معلوم ہو گیا کہ تمہارا فیصلہ غلط تھا تو آئندہ کسی ایسے واقعے میں اس قسم کا فیصلہ مت دو، اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ اپنے کل کے کیے ہوئے فیصلے کو منسوخ کرو۔ یہی وجہ ہے کہ فرمایا: ''حق کی طرف لوٹنا'' یہ نہیں کہا کہ ''اپنے فیصلے سے رجوع کرنا''۔ حق کی طرف رجوع کرنا اپنی غلط رائے کو ترک کرنا اور درست رائے اپنانا ہے۔ اس میں کہیں بھی اس فیصلے کو منسوخ کرنے کے جواز کی دلیل نہیں ہے جو فیصلہ شرع کے مطابق ہو۔ لہٰذا اسلام میں پرانے فیصلے (منسوخ شدہ فیصلے) کے نام سے کوئی چیز نہیں، یعنی کسی ایک مسئلے میں پہلے یہ حکم دیا گیا تھا بلکہ اگر ایک مسئلے میں ایک مخصوص حکم دیا گیا ہو تو اس فیصلے پر پابندی سے کاربند رہنا لازم نہیں ہوتا اگر قاضی کو یہ غالب گمان ہو جائے کہ نیا حکم زیادہ صحیح ہے تو اگلی بار اسی قسم کے مسئلے میں نئے فیصلے کو نافذ کرے گا۔ لیکن جس مسئلے کا پہلے فیصلہ دے چکا ہے اسی مسئلے سے رجوع کرنا اور پہلے فیصلے کو بدل دینا قاضی کے لیے جائز نہیں۔ یوں اسلام میں اپیل کورٹ اور خصوصی عدالت کا کوئی تصور نہیں، بلکہ عدلیہ کا ایک ہی درجہ ہوتا ہے۔ یہ شرعی قاعدہ ہے کہ

"اجتہاد دوسرے اجتہاد کو منسوخ نہیں کرتا" اس لیے ایک مجتہد دوسرے مجتہد کے لیے کوئی حجت نہیں۔ اس لیے ایسی عدالتوں کی کوئی گنجائش نہیں جو دوسری عدالتوں کے فیصلوں کو منسوخ (کالعدم) قرار دے۔

ہاں اگر قاضی نے شرعی احکامات کو نظر انداز کر کے کفریہ احکامات کی رو سے فیصلہ دیا ہو یا کتاب ، سنت اور اجماع صحابہؓ کے قطعی نص کے خلاف فیصلہ دیا ہو، یا حقائق کے بالکل برخلاف فیصلہ دیا ہو جیسا کہ ایک شخص کے قصاص کا یہ فیصلہ دیا ہو کہ اس نے قتلِ عمد کا ارتکاب کیا ہے اور پھر اصلی قاتل معلوم ہو جائے تو ان حالات اور ان جیسے حالات میں قاضی کے فیصلے کو منسوخ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ فِيهِ فَهُوَ رَدٌّ» "جس نے ہمارے اس امر (دین) میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہیں تو وہ چیز مسترد ہے" اس کو بخاری اور مسلم نے عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے بھی جابرؓ سے یہ روایت کیا ہے کہ «أَنَّ رَجُلاً زَنَى بِامْرَأَةٍ، فَأَمَرَ بِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَجُلِدَ الْحَدَّ، ثُمَّ أُخْبِرَ أَنَّهُ مُحْصَنٌ فَأَمَرَ بِهِ فَرُجِمَ» "ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا تو نبی ﷺ کے حکم سے اس کو کوڑے مارے گئے پھر بتایا گیا کہ یہ شخص شادی شدہ ہے تو اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا"۔ اور مالک بن انس نے الموطا میں روایت کیا ہے کہ "عثمان بن عفانؓ کے پاس ایک عورت لائی گئی جس کے حمل کے چھٹے مہینے میں بچہ پیدا ہوا تھا آپ ﷺ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تو علیؓ نے فرمایا: اس کو سزا نہیں دی جاسکتی، اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے وَحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا "اس کا حمل اور دودھ چھڑانا (ملا کر) تیس مہینے ہیں" (الاحقاف:15) اور یہ بھی فرمایا ہے کہ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ "اور مائیں پورے دو سال اپنے بچوں کو دودھ پلائیں گی اگر کوئی مدت رضاعت کو مکمل کرنے کا ارادہ کرے" (البقرۃ:233) یعنی حمل چھ مہینے کا بھی ہو سکتا ہے اس میں کوئی سنگسار نہیں، عثمان بن عفانؓ نے اس کے پیچھے آدمی بھیجے لیکن اس کو سنگسار کیا جاچکا تھا۔ عبد الرزاق نے امام نووی کے حوالے سے خبر دی ہے کہ: "قاضی نے

اگر کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجماع صحابہ کے خلاف فیصلہ دیا تو وہ اس فیصلے کو واپس لے سکتا ہے"۔ جس کو ان فیصلوں کو منسوخ کرنے کا اختیار ہے وہ قاضی المظالم ہے۔

دفعہ نمبر 84: محتسب وہ قاضی ہے جو اُن تمام مقدمات پر نظر رکھتا ہے جن کا تعلق عام حقوق سے ہو اور اس میں کوئی مدعی نہیں ہوتا، بشرطیکہ یہ حدود اور جنایات (جرائم) میں داخل نہ ہوں۔

یہ دفعہ قاضی حسبہ کی تعریف ہے اور یہ تعریف اناج کے ڈھیر والی حدیث سے ماخوذ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ اناج کے ڈھیر میں گیلا پن ہے تو اس کو اُلٹ کر اوپر رکھنے کا حکم دیا تاکہ لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ یہ لوگوں کا ایک عمومی حق ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس حق کی نگہبانی کی اور دھوکہ دہی کے ازالے کے لیے گیلے اناج کو اُلٹا کر اوپر رکھوانے کا فیصلہ کیا۔ اس میں اسی نوعیت کے تمام حقوق شامل ہیں۔ اس میں حدود اور جنایات (جرائم) شامل نہیں کیونکہ وہ اس نوع میں داخل نہیں، بلکہ یہ دراصل لوگوں کے باہمی جھگڑے ہیں۔

دفعہ نمبر 85: محتسب کسی بھی خلاف ورزی کے بارے میں معلوم ہونے پر فوراً کسی بھی جگہ فیصلہ دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس کے لیے عدالتی نشست کی ضرورت نہیں۔ اپنے احکامات کو نافذ کرنے کے لیے وہ پولیس بھی ساتھ رکھے گا۔ اس کا فیصلہ فوراً نافذ العمل ہوتا ہے۔

اس دفعہ میں اس بات کا بیان ہے کہ محتسب کے لیے کسی کیس کو نمٹانے کی خاطر مجلسِ قضاء (عدالتی نشست) کی ضرورت نہیں، بلکہ خلاف ورزی کے ارتکاب کی تحقیق کرتے ہی کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ بازار میں، گھر پر، سواری پر بیٹھے ہوئے، گاڑی میں، دن کے وقت یا رات کو، کیونکہ جس دلیل میں فیصلہ دینے کے لیے مجلسِ قضاء کی شرط ہے وہ محتسب پر لاگو نہیں ہوتی، اس لیے کہ وہ حدیث جس کو ابو داؤد اور احمد نے عبد اللہ بن زبیرؓ سے روایت کیا ہے اور جس میں مجلسِ قضاء کی شرط ہے، اس میں یہ کہا گیا ہے

کہ :"فریقین قاضی کے سامنے بیٹھیں گے "اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«إِذَا جَلَسَ إِلَيْكَ الْخَصْمَانِ»** "جب فریقین تمہارے سامنے بیٹھ جائیں"اس کو احمد نے علیؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔یہ قاضی حسبہ کے لیے نہیں،کیونکہ اس میں دو فریق نہیں ہوتے بلکہ یہ عوام کی حق تلفی یا شرع کے خلاف ورزی کا معاملہ ہے۔یہ بات بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس وقت اناج کے ڈھیر کے معاملے کا فیصلہ دیا اس وقت رسول اللہ ﷺ بازار میں گشت پر تھے اور یہ ڈھیر فروخت کے لیے رکھا گیا تھا۔آپ ﷺ نے اناج والے کو اپنی کسی خاص مجلس میں نہیں بلایا بلکہ خلاف ورزی کو دیکھتے ہی اسی جگہ فیصلہ سنا دیا،جو اس بات کی دلیل ہے کہ حسبہ کے مقدمات میں مجلسِ قضاء کی شرط نہیں ہوتی۔

دفعہ نمبر 86: محتسب کو اپنے ایسے نائبین مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہے جن کے اندر محتسب کی شرائط پائی جاتی ہوں،جن کو مختلف علاقوں میں تعینات کیا جائے گا۔ان نائبین کو اس علاقے یا محلے میں ان مسائل میں حسبہ کی ذمہ داری ادا کرنے کا اختیار ہو گا جو ان کو سپرد کیے گئے ہوں۔

یہ دفعہ ان قیود کو بیان کرتی ہے کہ اگر محتسب کے تقرری کے وقت اس کو اپنے نائبین منتخب کرنے کا بھی اختیار دیا گیا ہو یعنی استخلاف (اپنا قائم مقام مقرر کرنے) کا حق دیا گیا ہو۔یہ اس وقت ہے کہ اس کا تقرر خلیفہ کی جانب سے ہو اور اگر اس کا تقرر قاضی القضاء کی جانب سے ہو تو اس میں مذکورہ شرط کے علاوہ یہ شرط بھی ہے کہ اس قاضی القضاء کا اپنا تقرر بھی اس طرح ہو کہ اس کو نائبین مقرر کرنے یعنی استخلاف کا حق دیا گیا ہو۔اگر قاضی القضاء کی تعیناتی ایسی نہ ہو تو وہ نائب مقرر نہیں کر سکتا،یعنی اس کے پاس استخلاف کا حق نہیں ہو تا۔یوں اس محتسب کو بھی اپنا نائب مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہو تا،یعنی اس کو استخلاف کا حق حاصل نہیں ہو تا۔قاضی کے لیے نائب کا حق خواہ یہ محتسب ہو،قاضی ہو یا قاضی المظالم ہو،اگر خلیفہ یا عدلیہ کے والی یعنی قاضی القضاء نے قاضی کو یہ حق نہ دیا ہو تو اس کو یہ حق حاصل نہیں،یعنی کسی کو اپنا نائب بنانے کا حق نہیں ہو تا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قاضی کو عدلیہ میں ایک مخصوص قسم کی عدلیہ یعنی حسبہ میں تعینات کیا گیا ہے چنانچہ اگر اس کے

ساتھ اس کو استخلاف یعنی اپنے نائب مقرر کرنے کا حق نہیں دیا گیا ہو تو اس کو اس قسم کی تقرر کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ یہی حال قاضی اور قاضی المظالم کا ہے، سب برابر ہیں کیونکہ سب کی تقرری مخصوص قسم کے فیصلے کرنے کے اختیارات کے ساتھ ہوئی ہے اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اختیار نہیں، یعنی دوسرے قاضی متعین کرنے کا اختیار ان کے پاس نہیں۔ ہاں اگر ان کو ذمہ داری سونپتے وقت ان کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہو تب ہو سکتا ہے، یوں انھیں کسی شخص کو قاضی تعینات کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی کو حسبہ کے فرائض کی ادائیگی کے لیے اپنے نائب تعینات کرنے کا اختیار نہیں ہوتا جب تک کہ یہ اختیار اس کو دیا نہ گیا ہو۔ یہی اصول قاضی القضاء کے لیے لاگو ہوتا ہے۔

جہاں تک قاضی کی طرف سے اپنے نائب مقرر کرنے کے جواز کا سوال ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک مقدمہ لایا گیا تو آپ ﷺ نے اس کا فیصلہ سنانے کے لیے اپنا نائب مقرر کیا۔ چنانچہ ایک بدو کے واقعے میں جس نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر خبر دی کہ اس کا بیٹا ایک آدمی کا خادم تھا جس نے خود اس کو خادم رکھا تھا پھر اس نے مالک کی بیوی سے زنا کا ارتکاب کیا، اس کا حکم بتا دیجیے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«وَاغْدُ يَا أُنَيْسُ** - رجل من أسلم - **إِلَى امْرَأَةِ هَذَا، فَإِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْهَا»** ''اے انیس (جو کہ قبیلہ اسلم کا ایک آدمی تھا) اِس عورت کی طرف دوڑو اور اگر وہ اعتراف کرتی ہے تو اس کو رجم (سنگسار) کرو'' (متفق علیہ)، اس کو ابو ہریرہؓ اور زید بن خالد نے روایت کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قاضی کسی متعین مسئلے کے فیصلے میں اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے۔ محتسب بھی ایسا کر سکتا ہے کیونکہ وہ بھی قاضی ہی ہے۔ تاہم اس میں یہ شرط ہے کہ قاضی اپنے نائب کو فیصلے کا مکمل اختیار دے گا یعنی معاملے کی چھان بین اور اس کے بارے میں فیصلے کا مکمل اختیار، تب ہی اس کا تقرر درست ہوگا کیونکہ قضاء کے معنی ہے حکم کے بارے میں ایسی خبر دینا جس پر عمل لازمی ہو اور اس معنی کے لحاظ سے قضاء کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس کو ایسا نائب نہیں بنایا جا سکتا کہ وہ مسئلے کی چھان بین تو کر سکتا ہے مگر فیصلہ نہیں دے سکتا، بلکہ اس کی تعیناتی مکمل ہونی چاہیے، تاکہ وہ صحیح معنوں میں قاضی ہو اور اس کے فیصلے درست ہوں، حتیٰ کہ

اگر وہ بالفعل فیصلے نہ بھی کرتا ہوتب بھی اس کا تقرر درست ہے، کیونکہ اس کی ذمہ داری میں بالفعل فیصلے کرنے کی کوئی شرط نہیں۔ یہ جائز ہے کہ قاضی ایک مسئلے کو دیکھے لیکن اس کو مکمل نہ کر سکے اور فیصلہ سنانے سے پہلے اس کو معزول کیا جائے اس کے علاوہ کوئی اور قاضی اس معاملے کو دیکھے اور فیصلہ دے۔ اسی طرح نائب قاضی کے لیے بھی یہ شرط نہیں کہ وہ فیصلے کرے لیکن یہ شرط ضرور ہے کہ اس کی تقرری کے وقت اس کو مسئلے کو دیکھنے اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہو، یعنی اس کی تعیناتی کے وقت اس کے پاس قاضی کے تمام اختیارات ہونے چاہیے۔ اسی طرح محتسب بھی جب اپنا نائب مقرر کرے گا اور جس واقعے کے لیے ان کو ذمہ داری سونپے گا ان کو مکمل اختیارات دے گا بشرطیکہ اس کو اپنا نائب مقرر کرنے کا اختیار ہو۔ جن کو وہ اپنا نائب مقرر کر رہا ہے اس کے لیے مسلمان، آزاد، عادل، بالغ، فقیہ ہونا ضروری ہے یعنی محتسب جن کو اپنا نائب مقرر کر رہا ہے ان کے لیے بھی وہی شرائط ہیں جو خود محتسب کے لیے ہیں کیونکہ وہ بھی اسی کی طرح قاضی ہیں۔

دفعہ نمبر 87: قاضی مظالم وہ قاضی ہے جس کو ریاست کی جانب سے ہر اس شخص کے ساتھ ہونے والے ظلم یا زیادتی کا ازلہ کرنے کے لیے مقرر کیا جاتا ہے، جو ریاست کے زیر سایہ رہتا ہو چاہے وہ شخص ریاست کا شہری ہو یا نہ ہو اور خواہ یہ ظلم خلیفہ کی جانب سے ہو یا اس کے کسی ماتحت حکمران یا ملازم کی طرف سے ہو۔

اس دفعہ میں قاضی مظالم کی تعریف کی گئی ہے اور اس کی بنیاد وہ حدیث ہے جس میں نبی ﷺ نے یہ کہا ہے کہ حکمران کوئی بھی ناحق کام کرے تو وہ رعایا کے ساتھ ظلم ہے۔ انسؓ کہتے ہیں کہ: نبی ﷺ کے زمانے میں قیمتیں بڑھ گئی تو لوگوں نے کہا یا رسول الله، لو سعرت "اے اللہ کے رسول ﷺ اگر آپ ﷺ قیمتیں مقرر (فکس) فرمادیں"، تو فرمایا **«إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْخَالِقُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ الْمُسَعِّرُ، وَإِنِّي لأَرْجُو أَنْ أَلْقَى اللَّهَ وَلا يَطْلُبُنِي أَحَدٌ بِمَظْلِمَةٍ ظَلَمْتُهَا إِيَّاهُ فِي دَمٍ وَلا مَالٍ»** "بے شک اللہ ہی خالق، پکڑنے والا، پھیلانے والا، رزق دینے والا، قیمتیں مقرر کرنے والا

ہے۔اور میں یہ امید کرتا ہوں کہ اس حال میں اللہ سے ملوں کہ کوئی مجھ سے میرے کیے ہوئے ظلم کے بدلے کا طلب گار نہ ہو جو میں نے اس کے مال یا جان کے اوپر کیا ہو" اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے قیمتیں مقرر کرنے کو ظلم قرار دیا، کیونکہ یہ ایسا کام کرنا ہے جس کا کسی کو حق حاصل نہیں۔اسی طرح عام حقوق کے حوالے سے پیدا ہونے والے ان مسائل کو جنہیں ریاست منظم کرتی ہے بھی مظالم قرار دیا، جیسے عام پانی سے کھیتوں کو پانی دینا جس میں سب کا حصہ ہو۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ ، زبیر بن عوامؓ اور ایک انصاری شخص کے درمیان پانی دینے کے تنازعے کو حل کرنے کے لیے خود تشریف لائے اور زبیرؓ سے فرمایا **«اسْقِ يَا زُبَيْرُ ثُمَّ أَرْسِلِ الْمَاءَ إِلَى جَارِكَ»** "اے زبیر پانی دو اور اس کے بعد پانی کو اپنے پڑوسی کی جانب بہنے دو" یہ حدیث متفق علیہ ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ جیسا کہ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہو رہا ہے کہ کسی بھی قسم کی زیادتی کسی بھی شخص کے ساتھ خواہ حکمران کی جانب سے ہو یا ریاستی اداروں کی طرف سے یا اس کے احکامات کی وجہ سے سب کے سب مظالم ہیں اس کو خلیفہ یا قاضی المظالم میں سے اس کے نائب کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 88: قاضی مظالم کی تقرری خلیفہ یا قاضی القضاء کی طرف سے ہوتی ہے، تاہم اس کا محاسبہ، اس کو تنبیہ یا اس کی برطرفی خلیفہ کی طرف سے ہوتی ہے یا پھر قاضی القضاء کی جانب سے بشرطیکہ خلیفہ کی طرف سے اس کو اس کا اختیار دیا گیا ہو۔ مگر اس کی برطرفی اس حالت میں درست نہیں ہوتی جس وقت وہ خلیفہ یا معاون تفویض یا پھر مذکورہ قاضی القضاء کی طرف سے کیے گیے کسی زیادتی کے بارے میں چھان بین کر رہا ہو، اس حالت میں اس کو برطرف کرنے کا اختیار محکمہ المظالم کے پاس ہو گا۔

قاضی مظالم کا تقرر خلیفہ یا قاضی القضاء کرتا ہے، کیونکہ مظالم بھی قضاء ہی ہے اور قضاء کے معنی حکم شرعی کے بارے میں ایسی خبر دینا ہے کہ جس پر عمل لازمی ہو۔ قاضی چاہے کسی بھی قسم کا ہو اس کا تقرر خلیفہ ہی کر سکتا ہے کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود ہی ہر قسم کے قاضی کا تقرر کرتے تھے جیسا کہ

ہم پہلے بیان کر چکے۔ یوں خلیفہ ہی قاضی مظالم کا تقرر کرتا ہے، جبکہ قاضی القضاء صرف اس وقت ایسا کر سکتا ہے جب اس کو ذمہ داری سونپتے وقت خلیفہ اس کو یہ اختیار دے۔ یہ جائز ہے کہ محکمہ مظالم کا مرکزی دفتر خلیفہ، اس کے وزراء اوراس کے قاضی القضاء کی زیادتیوں پر نظر رکھنے کے لیے ریاستی دارالحکومت میں ہو اور محکمہ مظالم کی شاخیں والیوں، عاملوں اور دوسرے سرکاری ملازمین کے مظالم کے تدارک کے لیے ولایات (صوبوں) میں ہوں۔ خلیفہ کو چاہیے کہ وہ مرکزی محکمہ مظالم کو ولایات میں موجود اس کی شاخوں کے لیے قاضی مظالم مقرر کرنے اور ان کو برطرف کرنے کا اختیار دے۔

خلیفہ ہی دارالحکومت میں موجود مرکزی محکمہ مظالم کے ارکان کا تقرر اور ان کو برطرف کر سکتا ہے، تاہم مرکزی محکمہ مظالم کے سربراہ یعنی اس قاضی مظالم کو برطرف کرنا جو خلیفہ کو برطرف کرنے کے معاملے کی چھان بین کر رہا ہو، اگرچہ اصولاً خلیفہ کو اس کو بھی برطرف کرنے کا حق ہونا چاہیے جیسا کہ اس کو تعینات کرنے کا حق ہے، لیکن یہ ایک حالت ایسی ہے کہ اگر اس وقت اس کو برطرف کرنے کا اختیار خلیفہ کے ہاتھ میں رہے تو غالب گمان ہے کہ یہ حرام کا وسیلہ بن سکتا ہے، چنانچہ یہاں یہ قاعدہ لاگو ہو گا کہ "حرام کا وسیلہ بھی حرام ہے"، کیونکہ اس قاعدے کو لاگو کرنے کے لیے غالب گمان کافی ہے۔ یہ حالت ایسی ہے کہ قاضی مظالم کے سامنے خلیفہ اس کے وزراء یا اس کے اس قاضی القضاء کے خلاف (جس کو خلیفہ نے قاضی مظالم کے تقرری اور برطرفی کا اختیار دیا ہو) کوئی کیس زیر سماعت ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حالت میں اس قاضی کو برطرف کرنے کے اختیار کا خلیفہ کے ہاتھ میں ہونا قاضی کے فیصلے کو متاثر کر سکتا ہے اور نتیجے کے طور پر قاضی کی جانب سے خلیفہ یا اس کے معاونین کو برطرف کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ یوں برطرفی کا یہ اختیار حرام کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ اس لیے اس حال میں اس اختیار کا خلیفہ کے ہاتھ میں ہونا حرام ہے۔

تاہم باقی حالات میں حکم اپنی اصلی حالت میں باقی رہے گا یعنی قاضی مظالم کو برطرف کرنے کا اختیار اس کے تقرری کے اختیار کی طرح خلیفہ کے پاس ہی رہے گا۔

دفعہ نمبر89: قاضی مظالم کے لیے ایک شخص یا چند افراد کی تعداد مقرر نہیں، بلکہ خلیفہ حسبِ ضرورت مظالم پر قابو پانے کے لیے قاضی مظالم مقرر کر سکتا ہے، خواہ ان کی تعداد کتنی بھی ہو۔ لیکن براہِ راست فیصلہ دیتے وقت فیصلے کا اختیار ایک ہی قاضی کے پاس ہو گا اگرچہ فیصلہ سناتے وقت مجلس قضاء میں اس کے ساتھ کئی ایک قاضیوں کا ہونا جائز ہے لیکن ان کے پاس صرف مشورہ دینے کا اختیار ہو گا اس کو بھی قبول کرنا قاضی مظالم کے لیے ضروری نہیں۔

اس بات کی دلیل کہ قاضی مظالم ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں یہ ہے کہ خلیفہ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے جتنے نائب مقرر کرنا چاہے کر سکتا ہے مگر اس تعداد کے باوجود مظالم کو دیکھنے کا ان کا اختیار تقسیم نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس مظالم کو دیکھنے کا اختیار ہو تا ہے۔ہاں خلیفہ کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی قاضی مظالم کو کسی خاص صوبے کے لیے مخصوص کرے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کو کچھ خاص مسائل کے لیے مخصوص کرے کیونکہ وہ مظالم کے لیے عام ولایت بھی دے سکتا ہے اور خاص بھی۔ اسی طرح وہ تمام علاقوں کے لیے یا ایک علاقے کے لیے یا ایک صوبے کے لیے جیسے مناسب سمجھے ولایت دے سکتا ہے۔ جہاں تک یہ بات ہے کہ قاضی مظالم فیصلہ دیتے وقت کئی ایک نہیں ہو سکتے تو یہ پہلے گزر چکا ہے کہ ایک مسئلے میں ایک سے زیادہ قاضی کا ہونا جائز نہیں ہاں مجلس قضاء میں کئی ایک قاضی بیٹھ سکتے ہیں۔ اس لیے یہ جائز ہے کہ مشورے کے لیے کئی ایک قاضی مظالم اس کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں لیکن ان کی رائے فیصلے میں شامل نہیں ہو گی۔ یہ بھی اس کی رضا مندی اور اس کے اختیار پر منحصر ہے اگر وہ مناسب نہ سمجھے اور مخالفت کرے تو وہ نہیں بیٹھ سکتے کیونکہ قاضی کے پاس کوئی بیٹھ کر اس کی توجہ اس معاملے سے نہیں ہٹا سکتا جس کے لیے اس کو مخصوص کیا گیا ہے، لیکن مجلس قضاء سے اٹھنے کے بعد وہ ان سے مشورہ کر سکتا ہے۔

دفعہ نمبر90: محکمۂ مظالم کو ریاست کے کسی بھی حکمران یا ملازم کو برطرف کرنے کا حق حاصل ہے جیسا کہ اس کو خلیفہ کو معزول کرنے کا حق حاصل ہے اور یہ اس وقت ہو گا جب کسی ظلم کے ازالے کا تقاضا ہو۔

اس دفعہ میں حکمرانوں کو برطرف کرنے کے پہلو سے محکمہ مظالم کے اختیارات کی وضاحت کی گئی ہے۔ حکمران کا تقرر عقد (تقرری کے کنٹریکٹ) سے ہوتا ہے اس کو عقدِ تقلید (ذمہ داری سونپنے کا کنٹریکٹ) کہا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ خلیفہ کو ولایت کا حق ہے جو کہ حکمرانی ہے اور اس کو تقلید (ذمہ داری دینا) کا حق ہے جو کہ تقرری ہے۔ چونکہ تقلید (ذمہ داری دینا) ایک عقد (کنٹریکٹ) ہے اس لیے یہ صریح الفاظ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پس اس حکمران کو معزول کرنا جس کو خلیفہ نے ذمہ داری دی ہے اس عقد (کنٹریکٹ) کو ختم کرنا ہے۔ خلیفہ ایسا کر سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے والیوں کو ذمہ داریاں دیں پھر ان کو معزول بھی کیا۔ خلفاء راشدینؓ نے بھی والیوں کا تقرر کیا اور ان کو برطرف بھی کیا۔ اسی طرح خلیفہ کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اس تقرری اور معزول کرنے میں اپنا نائب مقرر کرے، یہ الگ بات ہے کہ محکمہ مظالم کو خلیفہ کے نائب کے طور پر حکمرانوں کو معزول کرنے کا حق نہیں کیونکہ یہ تقرری اور برطرف کرنے میں خلیفہ کا نائب نہیں بلکہ مظالم پر نظر رکھنے کے لیے اس کا نائب ہے۔ چنانچہ اس حکمران کا اپنی ولایہ میں ہونا اگر مظلمہ (ظلم کا سبب) ہو تو محکمہ کو اس ظلم کے ازالے کا حق ہے یعنی اس حکمران کو برطرف کرنے کا حق ہے۔ پس حکمرانوں کو معزول کرنے میں اس کا اختیار خلیفہ کے نائب ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف ظلم کے ازالے کے لیے ہے چنانچہ جس کو معزول کرنے کا یہ ادارہ حکم صادر کرے، وہ معزول ہو گا خواہ خلیفہ اس پر راضی نہ ہو، کیونکہ اس حالت میں اس کو معزول کرنا ظلم کو ختم کرنے کا فیصلہ ہے جو کہ سب پر لاگو ہو گا، یعنی خلیفہ اور دوسرے تمام حکمرانوں پر، کیونکہ قاضی کا حکم سب کے لیے حکم ہوتا ہے۔ اسی طرح خلیفہ کو برطرف کرنے کے حوالے سے اس کا حکم بھی ظلم کے ازالے کا حکم ہے۔ اگر خلیفہ کی بھی ایسی حالت ہو جائے تو اس کو معزول کرنا بھی واجب ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت میں اس کا اپنے منصب پر برقرار رہنا ظلم ہو گا اور محکمہ مظالم کا کام ہی ظلم کا تدارک

کرنا ہے اس لیے وہی اس کے معزولی کا حکم صادر کرے گا۔ یوں محکمہ مظالم کی طرف سے خلیفہ کو معزول کرنے کا حکم گویا ظلم کو ختم کرنے کا حکم ہے چنانچہ ظلم کو ختم کرنے کا یہ تقاضا ہو کہ خلیفہ کو معزول کیا جائے تو اس کو معزول کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

دفعہ نمبر 91: محکمہ مظالم کو کسی بھی قسم کے مظالم کو دیکھنے کا اختیار حاصل ہے خواہ اس کا تعلق ریاستی اداروں کے افراد سے ہو یا ریاست کے سربراہ کی جانب سے احکام شرعیہ کی خلاف ورزی سے ہو یا پھر ریاست کے سربراہ کی جانب سے تبنی کے ضمن میں دستور، قانون اور سارے احکام شرعیہ کی تشریع کے اندر نصوص میں سے کسی نص کے معنی سے متعلق ہو یا کسی قسم کے ٹیکس وغیرہ لگانے کے حوالے سے ہو۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دکھا دیا کہ حکمران کی جانب سے قیمتیں مقرر کرنا ظلم ہے اور یہ بھی کہ عام پانی سے سیراب کرنے کے حوالے سے لوگوں کی باری کو بغیر عدل کے ریاست کی جانب سے ترتیب دینا ظلم ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حکمران کا کوئی عمل حق کے برخلاف ہو یا احکام شرعیہ کے مخالف ہو اور اس کا تعلق خلیفہ (ریاست کے سربراہ) کے ساتھ ہو تو یہ ظلم ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ ریاست کے سربراہ تھے۔ اسی طرح اگر اس کا تعلق ریاستی اداروں کے افراد کے ساتھ بھی ہو تب بھی یہ ظلم ہے کیونکہ یہ خلیفہ (ریاست کے سربراہ) کے نائب ہیں اس لیے اس کا تعلق بھی خلیفہ کے ساتھ ہے کیونکہ اس کا تعلق اس عمل سے ہے جس میں خلیفہ نے ان کو اپنا نائب بنایا ہے نہ کہ ان کی ذات کے ساتھ۔ چنانچہ قیمتیں مقرر کرنے والی حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ کی طرف سے کسی قسم کی خلاف ورزی ظلم ہے اور محکمہ مظالم ہی اس ظلم کو دیکھنے کا اختیار رکھتا ہے۔ یہ اس دفعہ کے پہلے حصے کی دلیل تھی۔ جہاں تک دوسرے حصے یعنی دستور کے نصوص میں سے کسی نص کو یا قانون کو دیکھنے کی بات ہے تو یہ دستور ایک اساسی قانون ہے اور قانون سلطان کا امر ہوتا ہے تو اس پر نظر رکھنا سلطان کے امر پر نظر رکھنا ہے، چنانچہ یہ بھی قیمتوں والی حدیث میں داخل ہے

کیونکہ یہ بھی خلیفہ کے اعمال پر نظر رکھنا ہے، اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ** ”اگر تم کسی بات پر جھگڑو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو“ (النساء:59) یعنی جب تم اور تمہارے حکمران کسی بات پر جھگڑو اور یہ جھگڑا دستور کے دفعات میں سے کسی دفعہ کے بارے میں ہو یا قانون کی دفعات میں سے کسی دفعہ میں ہوں تو یہ تنازعہ رعایا اور حکمرانوں کے درمیان احکام شرعیہ میں سے ایک حکم کے بارے میں ہے اس لئے اس کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا اور اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹانے کا مطلب اس کو محکمہ مظالم کی طرف لوٹانا ہے کیونکہ یہ ہی اللہ اور رسول ﷺ کا فیصلہ ہے۔ رہی بات دفعہ کی تیسری قسم کی تو اس حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **«مَنْ أَخَذْتُ لَهُ مَالاً فَهَذَا مَالِي فَلْيَأْخُذْ مِنْهُ»** ”اگر میں نے کسی کا مال لیا ہو تو یہ میرا مال ہے اس میں سے لے لے“ اس کو ابو یعلیٰ نے فضل بن عباس سے نقل کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: **«وَإِنِّي لأَرْجُو أَنْ أَلْقَى اللَّهَ وَلا يَطْلُبُنِي أَحَدٌ بِمَظْلِمَةٍ ظَلَمْتُهَا إِيَّاهُ فِي دَمٍ وَلا مَالٍ»** ”اور میں یقیناً اللہ سے یہ امید رکھتا ہو کہ اس حال میں اللہ سے ملوں کہ کوئی مجھ سے کسی جانی یا مالی ظلم کے بدلے کا طلبگار نہ ہو“ اس کو احمد نے انسؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ خلیفہ کی جانب سے رعایا کا مال ناحق لینا ظلم ہے۔ اس طرح اس مال کو لینا بھی ظلم ہے جس کو شرع نے واجب قرار نہیں دیا ہو یہی وجہ ہے کہ محکمہ مظالم کو چاہئے کہ وہ ٹیکسز پر نظر رکھے کیوں یہ وہ مال ہے جو رعایا سے لیا جاتا ہے، اور نظر رکھنے کا یہ مطلب ہے کہ یہ دیکھے کہ آیا جو مال مسلمانوں سے لیا جا رہا ہے یہ وہ مال ہے جو شرع نے مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے جیسا کہ فقراء کو کھانا کھلانے کے لیے لیا گیا مال کیونکہ یہ ظلم نہیں۔ یا پھر پورے پانی کو محفوظ کرنے کے لیے ایسا ڈیم بنانے کے لیے لیا جانے ولا مال جس کی اشد ضرورت نہیں تو یہ ظلم ہے اس کا ازالہ کیا جائے گا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ محکمہ مظالم ٹیکسز پر نظر رکھے گا۔

دفعہ نمبر92: مظالم کی قضاء(فیصلے) کے لیے مجلس قضاء کی شرط نہیں، نہ ہی مدعی علیہ کو بلانا اور نہ ہی مدعی کی موجودگی شرط ہے بلکہ محکمہ مظالم کو کسی بھی ظلم کو دیکھنے کا حق ہے چاہے کوئی دعویٰ کرے یا نہ کرے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ دلیل جس میں فیصلے کے لیے مجلس قضاء کی شرط ہے وہ محکمہ مظالم پر لاگو نہیں ہوتی کیونکہ اِس میں مدعی ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی مدعی کی ضرورت ہے، محکمہ ہر ظلم کو دیکھے گا چاہے کوئی دعویٰ کرے یا نہ کرے اور اس میں مدعی علیہ کے حاضر ہونے کی بھی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ مدعی علیہ کو حاضر کیے جانے کی ضرورت پڑے بغیر مسئلے کی چھان بین کرتا ہے کیونکہ وہ مسئلے کو انتہائی باریک بینی سے دیکھتا ہے، یوں مجلس قضاء کی شرط کی دلیل اس پر لاگو نہیں ہوتی اور وہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے **«أَنَّ الْخَصْمَيْنِ يَقْعُدَانِ بَيْنَ يَدَيِ الْحَكَمِ»** ''دونوں فریق قاضی کے سامنے بیٹھیں گے''، اس کو احمد اور ابو داؤد نے عبد اللہ بن زبیرؓ سے نقل کیا ہے، آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے کہ **«إِذَا جَلَسَ إِلَيْكَ الْخَصْمَانِ»** ''جب فریقین تمہارے سامنے بیٹھ جائیں'' اس کو احمد نے علیؓ سے نقل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محکمہ مظالم ظلم کے سرزد ہوتے ہی بغیر کسی شرط کے اس کے بارے میں فیصلہ دے سکتا ہے اس میں مکان، زمان یا مجلس قضاء وغیرہ کی کوئی شرط نہیں۔ تاہم اختیارات کے لحاظ سے اس محکمے کے مرتبے کو پیش نظر رکھ کر اس کو پر ہیبت اور پر عظمت بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ مصر اور شام میں سلاطین کے زمانے میں سلطان کی وہ مجلس جس میں مظالم کو دیکھا جاتا تھا کو دار العدل کہا جاتا تھا اور وہاں سلطان کے نائبین موجود ہوتے تھے اور قاضی اور فقہا وہاں حاضر ہوتے تھے۔ المقریزی نے اپنی کتاب (السلوك إلى معرفة دول الملوك) میں ذکر کیا ہے کہ سلطان الملک الصالح ایوب نے دار العدل کے لیے اپنے نائبین مقرر کیے تھے جو مظالم کے ازالے کے لیے بیٹھتے تھے اور ان کے ساتھ قاضی اور فقہا ہوا کرتے تھے۔ اس میں حرج نہیں کہ محکمہ مظالم کے لیے ایک شاندار عمارت بنائی جائے کیونکہ یہ مباح ہے خصوصاً جب اس سے عدل کی عظمت نظر آتی ہو۔

دفعہ نمبر 93: ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خصومت (جھگڑے یا لڑائی) میں یا اپنے دفاع میں جس کو چاہے اپنا وکیل مقرر کرے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، مرد ہو یا عورت، اس میں وکیل اور موکل کے درمیان کوئی فرق نہیں اور وکیل کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اجرت لے کر وکالت کرے وہ اس اجرت کا حقدار ہے جو اس نے اپنے موکل کے ساتھ باہمی رضامندی سے طے کیا ہو۔

اس دفعہ میں لڑائی اور جھگڑے میں وکالت کے جواز کا بیان ہے۔ اس کی دلیل وکالت کی دلیل ہے۔ کیونکہ وہ عام ہے اور ہر وکالت اس میں داخل ہے۔ وکالت سنت سے ثابت ہے چنانچہ ابو داؤد نے روایت کی ہے اور اپنے اسناد سے جابر بن عبد اللہؓ سے اس کو صحیح قرار دیا ہے، انہوں نے کہا: **«أَرَدْتُ الْخُرُوجَ إِلَى خَيْبَرَ، فَأَتَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ لَهُ: إِنِّي أَرَدْتُ الْخُرُوجَ إِلَى خَيْبَرَ، فَقَالَ: إِذَا أَتَيْتَ وَكِيلِي فَخُذْ مِنْهُ خَمْسَةَ عَشَرَ وَسْقًا، فَإِنِ ابْتَغَى مِنْكَ آيَةً فَضَعْ يَدَكَ عَلَى تَرْقُوَتِهِ»** "میں نے خیبر کے لیے روانہ ہونے کا ارادہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر آپ ﷺ کو سلام کیا اور کہا: میں نے خیبر کے لیے نکلنے کا ارادہ کیا ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم میرے وکیل کے پاس جاؤ تو اس سے پندرہ وسق (ایک مقدار) لے لو، اگر وہ تم سے نشانی مانگے تو اپنا ہاتھ اس کے تھیلے پر رکھو" الحافظ نے التلخیص میں اس کو حسن قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ سے یہ بھی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے میمونہؓ کے نکاح قبول کرنے میں ابو رافع کو اپنا وکیل مقرر فرمایا: چنانچہ احمد نے المسند میں رسول اللہ ﷺ کے وکیل ابو رافع (آزاد کردہ غلام) سے روایت کیا ہے کہ **«أن رسول الله ﷺ تزوج ميمونة حلالا وبنى بها حلالا وكنت الرسول بينهما»** "رسول اللہ ﷺ نے میمونہ سے حلال طریقے سے نکاح کیا اور حلال طریقے سے رشتہ قائم کیا اور میں ان دونوں کے درمیان پیغام رساں تھا"۔ چنانچہ ہر وہ شخص جس کا اپنا کوئی بھی تصرف (کام) صحیح ہو اور وہ کام ایسا ہو کہ اس میں نیابت درست ہو تو اس میں وہ کسی کو بھی اپنا وکیل بنا سکتا ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا کافر۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ وکالت خاص طور پر اجماع صحابہ سے ثابت ہے۔ علیؓ نے عقیل کو ابو بکرؓ کے پاس اپنا وکیل مقرر

کیا اور کہا: ''اس کے حق میں جو فیصلہ ہو جائے وہ میرے حق میں ہے اور اس کے خلاف بھی جو فیصلہ ہو جائے وہ میرے بھی خلاف ہے''۔ اسی طرح عبد اللہ بن جعفر کو عثمانؓ کے پاس اپنا وکیل مقرر کیا اور کہا: ''تنازعات میں ہلاکت خیزیاں ہیں اور شیطان وہاں حاضر ہو جاتا ہے اس لیے میں وہاں حاضر ہونا پسند نہیں کرتا''۔ اس کو ابن قدامہ نے المغنی میں ذکر کر کے کہا ہے کہ یہ قصے بہت پھیلے اور مشہور ہوئے ہیں لیکن کسی سے ان کا انکار ثابت نہیں۔ اس میں (القحم) کا لفظ ہے جس کے معنی ہلاکت خیز کے ہیں۔ اس بنا پر حقوق کے مطالبے، ان کو ثابت کرنے اور اس کے لیے عدالت جانے کے لیے وکیل بنانا جائز ہے، موکل خود حاضر ہو یا غائب ہو تندرست ہو یا بیمار۔ اسی طرح اس میں مدِ مقابل کی رضامندی کی بھی ضرورت نہیں۔ وکیل کے لیے اجرت لے کر وکالت کرنا جائز ہے کیونکہ اس میں اجارہ جائز ہے۔ اجارہ عام ہے اس میں ہر چیز شامل ہے اس لیے وکالہ بھی اس میں شامل ہے۔ پھر یہ کہ اجارہ کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عوض کے بدلے منفعت کا عقد (کنٹریکٹ) ہے۔ یہی منفعت (فائدہ) ہے کہ جس کے لیے اجارہ کا کنٹریکٹ ہوا ہے اس لیے یہ تعریف اس پر صادق آتی ہے۔ جس وقت اجرت کے بدلے وکالت طے پا گئی تو وکیل اپنے موکل سے اس اجرت کو لینے کا مستحق ہے جس پر دونوں رضامند ہو گئے تھے۔ تاہم اجرت کا مستحق بننے کے لیے عقد اجارہ اور اس پر متفق ہونا ضروری ہے کیونکہ وکالت خود ایک عقد ہے جس سے خود بخود اجرت واجب نہیں ہوتی بلکہ اس میں اجارہ کا عقد کرنے سے اجرت واجب ہو جاتی ہے۔ اس وکالت کے عقد کے ساتھ ساتھ اجارہ کا عقد بھی ضروری ہے تاکہ وکیل اپنے موکل سے اجرت لینے کا مستحق بن جائے۔ وکالت اور اس پر اجرت لینا بالکل جائز ہے چاہے وکیل نے بطور پیشہ اس کو اختیار کیا ہو جس سے وہ اپنی معاشی ضروریات پوری کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ چنانچہ آج کل جو وکالت ہے اور جن کو وکیل کہا جاتا ہے ان کا کام اجرت لے کر کام کرنے کے حوالے سے تو ٹھیک ہے لیکن باطل کے مقابلے میں حق کو ثابت کرنے کے لیے کفریہ قوانین کو اختیار کرنا جائز نہیں۔ بلکہ حق وہ ہے جس کو اسلام حق کہے اور باطل وہ ہے جس کو اسلام باطل کہے اسلام کے مخالف کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں خواہ کفریہ قوانین اس کی اجازت بھی دے دیں۔

دفعہ نمبر94: اس شخص کے لیے جو خاص اعمال میں سے کسی عمل جیسے وصیت یا ولایت پر ذمہ دار ہو یا عام اعمال جیسے خلیفہ، حکمران ، ملازم، قاضی مظالم یا محتسب کے حوالے سے صاحبِ اختیار ہو، اپنے اختیارات میں قائم مقام بنا کر جھگڑے اور دفاع کے اعتبار سے اپنا وکیل بنا سکتا ہے۔اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ مدعی ہے یا مدعی علیہ۔

اس کی دلیل بعینہ وہی دلیل ہے جو وکالت کی ہے کیونکہ جس طرح کسی شخص کے لیے اپنے ان تصرفات میں اپنا وکیل بنانا درست ہے جن کا وہ خود مالک ہے جیسے خرید وفروخت، لڑائی جھگڑا وغیرہ اسی طرح ان تصرفات میں بھی اپنا وکیل مقرر کرنا صحیح ہے جن کا وہ کسی اور کے نائب کے طور پر مالک ہے۔وکیل کو بھی اگر وکیل بناتے وقت اس بات کا حق دیا گیا ہو کہ وہ ان کاموں میں اپنا وکیل مقرر کر سکتا ہے جن میں اس کا تصرف جائز ہے تو یہ وکالت کی طے شدہ شرائط کے مطابق جائز ہے۔اسی طرح وصی (جس کو کسی نے اپنے مال کے بارے میں وصیت کی ہو) کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ موصی علیہ (جس کے لیے وصیت کی گئی ہو) کے مال میں جتنا تصرف اس کے لیے جائز ہے اس میں اپنا نائب بنا سکتا ہے۔اسی طرح وقف کا متولی (ذمہ دار) کے لیے بھی یہ جائز ہے کہ وہ جس کو چاہے ان کاموں میں اپنا وکیل بنائے جن میں تصرف کرنے کا اختیار اس کو حاصل ہے جیسے وقف (املاک) کرائے پر دینا وغیرہ۔حکمران کی مثال بھی انہی کی طرح ہے اس کے لیے بھی یہ جائز ہے کہ وہ ان کاموں میں جس کو چاہے اپنا وکیل مقرر کرے جن میں تصرف وہ خود کر سکتا ہے۔تاہم اگر حکمران خلیفہ ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ جس کو چاہے اپنا وکیل مقرر کرے کیونکہ اس کو ہر چیز میں تصرف کا حق حاصل ہے۔وہ گویا ایسا ہے کہ اپنے آپ کا وکیل بنا رہا ہے۔خلیفہ کے علاوہ وہ لوگ جن کو اس نے اپنا نائب مقرر کیا ہے جیسے معاونین، قضاء اور اداروں کے سربراہ، اس وقت تک ان کاموں میں کسی کو اپنا وکیل مقرر نہیں کر سکتے جو ان کے ذمہ ہیں جب تک خلیفہ ان کو اس کا اختیار نہ دے، کیونکہ وہ خلیفہ کے نائب ہونے کی وجہ سے وکلاء کی طرح ہیں اور وکیل اس وقت تک کسی کو اپنا وکیل مقرر نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا موکل اس کو اس بات کا اختیار نہ دے۔اگر اس کا موکل اس کو یہ حق دے دے تب وہ اپنا وکیل مقرر کر سکتا ہے چاہے وہ مدعی ہو

یا مدعی علیہ کیونکہ حقِ وکیل (وکیل بنانے کا حق) عام ہے اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس میں تصرف کیا جاسکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کل جو حکومتی وکیل کے لیے معروف اصطلاح ہے جیسے اٹارنی جنرل، پبلک پراسیکیوٹر یا اس سے ملتے جلتے الفاظ یہ سب وکالت کے احکامات کے لحاظ سے تو صحیح شرعی عمل ہیں کیونکہ شرع نے اس وکالت کی اجازت دی ہے۔

دفعہ نمبر95: وہ معاہدے، معاملات اور فیصلے جو پایہ تکمیل کو پہنچ چکے ہوں اور خلافت کے قیام سے قبل ان کا نفاذ ہوچکا ہو تو خلافت کی قضاء (عدالت) ان کو کالعدم نہیں کرے گی اور نہ ہی نئے سرے سے ان کو دوبارہ کھولے گی سوائے اس کے کہ ان میں مندرجہ ذیل تین باتیں ہو:

ا) ان کا اسلام کے خلاف کوئی دائمی اور مسلسل اثر ہو تب ان کو نئے سرے سے کھولنا واجب ہے۔

ب) یا ان کا تعلق اسلام یا مسلمانوں کی ایذا رسانی سے ہو جن کو سابقہ حکمرانوں یا ان کے ماتحتوں نے انجام دیا ہو، تب خلیفہ کے لیے جائز ہے کہ وہ ان مسائل کو دوبارہ کھولے۔

ج) یا ان کا تعلق ایسے غصب شدہ مال سے ہو جو ابھی تک غاصب کے ہاتھ میں ہو۔

وہ تمام عقود (کنٹریکٹس)، معاملات اور فیصلے جو پایہ تکمیل کو پہنچ چکے ہوں اور خلافت کے قیام سے قبل ہی ان کا نفاذ ہو چکا ہو ان کو طرفین کے درمیان درست سمجھا جائے گا اگر ان کی تنفیذ کی مدت خلافت سے پہلے ختم ہو چکی ہو۔ خلافت کی عدلیہ ان کو نہیں توڑے گی نہ ہی نئے سرے سے ان کو کھولے گی اور نہ ہی خلافت کے قیام کے بعد ان کے حوالے سے نئے دعوے قبول کیے جائیں گے۔

اس سے تین حالات میں استثناء حاصل ہے:

1) اگر اس مسئلے کا جو حل کیا جا چکا ہے اور وہ حل نافذ کیا گیا ہے، اس کا ایسا دائمی اثر ہو جو اسلام کے مخالف ہو۔

2) اگر اس مسئلے کا تعلق ایسی چیز سے ہو جس سے اسلام اور مسلمانوں کو اذیت پہنچتی ہو۔

3) اگر اس مسئلے کا تعلق ایسے غصب شدہ مال سے ہو جو ابھی تک غاصب کے پاس موجود ہو۔

جہاں تک ان معاہدات، معاملات اور مسائل کو نہ توڑنے اور نئے سرے سے ان کو نہ کھولنے کا معاملہ ہے جو انجام پا چکے ہیں اور ان کو نافذ کرنے کا کام خلافت کے قیام سے قبل مکمل ہو چکا ہے اور جن کا تعلق مذکورہ تین حالات سے نہیں تو یہ اس لیے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت جاہلیت کے معاہدوں، معاملات اور فیصلوں کو نہیں توڑا جب ان (لوگوں) کا دار، دارالاسلام بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے بعد اپنے اس گھر میں واپس نہیں آئے جس سے ہجرت فرمائی کیونکہ عقیل بن ابی طالب قریش کے قانون کے مطابق اس گروہ کے گھروں کے وارث بن گئے تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا اور ہجرت کی پھر عقیل نے انہیں بیچ دیا جن میں رسول اللہ ﷺ کا گھر بھی شامل تھا۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا: اپنے کون سے گھر میں تشریف لائیں گے؟، آپ ﷺ نے فرمایا **«وَهَلْ تَرَكَ لَنَا عَقِيلٌ مِنْ رِبَاعٍ»** "کیا عقیل نے ہمارے لیے بالشت بھر جگہ بھی چھوڑی ہے؟"۔ دوسری روایت میں ہے کہ **«وَهَلْ تَرَكَ لَنَا عَقِيلٌ مِنْ مَنْزِلٍ»** "عقیل نے ہمارے لیے گھر کہاں چھوڑا؟" کیونکہ عقیل رسول اللہ ﷺ کے گھر کو فروخت کر چکے تھے، رسول ﷺ نے اس کو منسوخ (کالعدم) قرار نہیں دیا۔ حدیث جس کو بخاری نے اسامہ بن زیدؓ سے روایت کیا ہے یوں ہے (أَنَّهُ قَالَ زَمَنَ الْفَتْحِ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَيْنَ تَنْزِلُ غَدًا ؟ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ : **«وَهَلْ تَرَكَ لَنَا عَقِيلٌ مِنْ مَنْزِلٍ ؟ !»**) "فتح مکہ کے وقت کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کل کہاں تشریف فرمائیں گے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: عقیل نے ہمارے لیے گھر کہاں چھوڑا؟"۔ اسی طرح یہ روایت بھی ہے کہ ابو العاص بن الربیع نے جس وقت اسلام لا کر مدینہ کی طرف ہجرت کی جن کی زوجہ محترمہ زینبؓ بنت رسول اللہ بدر کے بعد مسلمان ہو کر ہجرت کر کے مدینہ آچکی تھی جب یہ مشرک ہی تھا اور مکہ میں تھا ان کے مسلمان ہونے پر رسول اللہ ﷺ نے ان کی زوجہ زینبؓ بنت رسول اللہ ﷺ کو بغیر تجدید عقد اور نکاح کے، اسی نکاح پر واپس لوٹا دیا جو جاہلیت میں کیے گئے عقد کو برقرار رکھنے کا اقرار ہے۔ ابن ماجہ نے ابن عباسؓ

کے حوالے سے نقل کیا ہے **«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَدَّ ابْنَتَهُ عَلَى أَبِي الْعَاصِ بْنِ الرَّبِيعِ بَعْدَ سَنَتَيْنِ بِنِكَاحِهَا الأَوَّلِ»** ''رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کو دو سال بعد پہلے نکاح پر ہی ابو العاص بن الربیع کے ساتھ واپس کر دیا'' اور احمد کی روایت میں یوں ہے **«حَدَّثَنَا يَزِيدُ قَالَ أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ إِسْحَاقَ عَنْ دَاوُدَ بْنِ حُصَيْنٍ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ رَدَّ ابْنَتَهُ زَيْنَبَ عَلَى أَبِي الْعَاصِ زَوْجِهَا بِنِكَاحِهَا الأَوَّلِ بَعْدَ سَنَتَيْنِ وَلَمْ يُحْدِثْ صَدَاقًا»** ''یزید نے بیان کیا ہے کہ محمد بن اسحاق نے داؤد بن حصین سے، انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے ابن عباسؓ سے ہمیں خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی زینبؓ کو دو سال بعد پہلے ہی نکاح پر اور بغیر کسی نئے مہر کے ابو العاص کی طرف لوٹا دیا''۔ اور یہ ابو العاص کے اسلام لانے کے بعد ہوا۔

رہی بات ان دائمی اثر رکھنے والے اسلام مخالف مسائل کو نئے سرے سے کھولنے کی تو رسول اللہ ﷺ نے باقی رہنے والے سود کو ان لوگوں کے سر سے اتار دیا اور صرف راس المال (اصل زر) کو ان کا حق قرار دیا جس وقت یہ لوگ اسلامی ریاست کے شہری بن گئے، یعنی دارالاسلام قائم ہونے کے بعد لوگوں کے اوپر باقی سود کو کالعدم قرار دیا۔ ابو داؤد نے سلیمان بن عمرو سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع کے موقعے پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ **«أَلا إِنَّ كُلَّ رِبًا مِنْ رِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ، لَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لا تَظْلِمُونَ وَلا تُظْلَمُونَ»** ''سنو زمانہ جاہلیت کا ہر قسم کا سود معطل ہے اور تمہارے لیے تمہارا راس المال (اصل مال) ہے نہ ظلم کرو گے اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا''۔

اسی طرح جو لوگ جاہلیت کے قوانین کے مطابق چار سے زیادہ شادیاں کیے ہوئے تھے، دارالاسلام قائم ہونے کے بعد ان کو صرف چار پر اکتفا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ترمذی نے عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ غیلان بن سلمہ الثقفی جس وقت اسلام لایا اس کی جاہلیت کی دس بیویاں بھی اس کے ساتھ مسلمان ہو گئیں۔ نبی ﷺ نے اس کو حکم دیا کہ ان میں سے چار کو اپنے پاس رکھو''۔

یہی وجہ ہے کہ وہ عقود (کنٹریکٹس) جو دائمی طور پر اسلام مخالف ہیں خلافت کے قیام کے ساتھ ہی ان کو غیر موثر (منسوخ) کر دیا جائے گا اور ایسا کرنا واجب ہے۔

مثال کے طور پر اسلامی ریاست سے پہلے کسی مسلمان خاتون کی شادی کسی نصرانی شخص سے ہوئی ہو تو خلافت کے قیام کے بعد شرعی احکامات کے مطابق اس کو فسخ کیا جائے گا۔

جہاں تک ان مسائل کو کھولنے کی بات ہے جن کا تعلق ایسے لوگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو اذیت دی، تو رسول اللہ ﷺ نے جس وقت مکہ فتح کیا تو چند ایسے افراد کے خون کو مباح کر دیا جو جاہلیت کے زمانے میں اسلام اور مسلمانوں کو اذیت پہنچاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے خون کو بے قیمت قرار دیا حتی کہ وہ کعبہ کے پردوں سے بھی لٹک جائیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ **«إِنَّ الإِسْلامَ يَجُبُّ مَا كَانَ قَبْلَهُ»** "بے شک اسلام اپنے سے پہلے کی ہر چیز (گناہ) کو ختم کرتا ہے" اس کو احمد اور طبرانی نے عمرو بن العاصؓ سے روایت کیا ہے، یعنی جو اسلام اور مسلمانوں کو اذیت پہنچائے وہ اس حدیث سے مستثنیٰ ہے۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ نے بعد میں ان میں سے بعض کو معاف بھی کر دیا جیسا کہ عکرمہ بن ابو جہل کو معاف کیا، لہٰذا خلیفہ کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اس قسم کے لوگوں کے خلاف مقدمات کو دوبارہ کھولے یا بعض کو معاف کرے۔ یہ ان تمام لوگوں پر لاگو ہوتا ہے جو حق بات کہنے کی وجہ سے مسلمانوں کو عذاب دیتے ہیں یا اسلام کے بارے میں بکواس کرتے رہتے ہیں۔ یہ حدیث ان پر لاگو نہیں ہوتی کہ "اسلام اپنے سے پہلے کے ہر گناہ کو ختم کر دیتا ہے" بلکہ وہ اس حدیث سے مستثنیٰ ہیں، خلیفہ جس طرح مناسب سمجھے گا عدالت کو حرکت میں لائے گا۔

غصب شدہ مال کے معاملے کو دوبارہ کھولنے کا جہاں تک تعلق ہے جو ابھی تک غاصب کے پاس موجود ہے اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو مسلم نے وائل بن حجر سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ **«كُنْتُ**

عِنْدَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَأَتَاهُ رَجُلاَنِ يَخْتَصِمَانِ فِي أَرْضٍ فَقَالَ أَحَدُهُمَا إِنَّ هَذَا انْتَزَى عَلَى أَرْضِي يَا رَسُولَ اللَّهِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَهُوَ امْرُؤُ الْقَيْسِ بْنُ عَابِسٍ الْكِنْدِيُّ وَخَصْمُهُ رَبِيعَةُ بْنُ عِبْدَانَ قَالَ: بَيِّنَتُكَ، قَالَ: لَيْسَ لِي بَيِّنَةٌ، قَالَ: يَمِينُهُ، قَالَ إِذَنْ يَذْهَبُ بِهَا، قَالَ: لَيْسَ لَكَ إِلاَّ ذَاكَ، قَالَ: فَلَمَّا قَامَ لِيَحْلِفَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنِ اقْتَطَعَ أَرْضًا ظَالِمًا لَقِيَ اللَّهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ» ''میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا کہ دو آدمی زمین کے لیے لڑتے ہوئے آپ ﷺ کے پاس آ گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ اس نے زمانہ جاہلیت میں میری زمین پر قبضہ (غصب) کیا ہے اور یہ شخص امرءالقیس بن عابس الکندی اور اس کا مد مقابل ربیعہ بن عبدان تھا۔ (رسول اللہ ﷺ نے) اس سے پوچھا: تمہارے گواہ کہاں ہیں؟ اس (مدعی) نے کہا میرے پاس کوئی گواہ نہیں، اس پر (رسول اللہ ﷺ) نے کہا: اس کو قسم کھانا پڑے گی۔ مدعی نے کہا؛ پھر تو وہ (زمین) لے جائے گا، (رسول اللہ ﷺ) نے کہا: تمہارے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔ اس (راوی) نے کہا: جب وہ قسم کے لیے کھڑے ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کسی نے ظلم سے زمین لی (قبضہ کیا) وہ ایسی حالت میں اللہ سے ملاقات کرے گا کہ اللہ اس پر غضبناک ہو گا''۔ اس میں لفظ '' انتزى على أرضي '' کا مطلب اس پر قبضہ کرنا اور غصب کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ جاہلیت کے زمانے کا واقعہ ہے، غصب شدہ زمین کے بارے میں اس آدمی کے دعویٰ کو قبول کیا۔

یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے بھی کسی کی زمین پر قبضہ کیا ہو یا جانور غصب کیا ہو یا ایسا مال ہڑپ کیا ہو جو افراد کی ملکیت ہو یا پھر عوامی ملکیت یا ریاستی ملکیت کا مال غصب کیا ہو، اس کے خلاف دعویٰ قبول کیا جائے گا۔

ان تین حالات کے علاوہ خلافت کے قیام سے قبل انجام پانے والے معاہدے، معاملات اور فیصلے جو نافذ کیے گیے ہیں نئے سرے سے نہیں کھولے جائیں گے۔

مثال کے طور پر اگر ایک آدمی کو سکول کا دروازہ توڑنے پر دو سال قید کا فیصلہ سنایا گیا اور وہ دو سال قید بھگت کر خلافت کے قائم ہونے سے پہلے جیل سے نکلا پھر خلافت کے قیام کے بعد اس نے ارادہ کیا کہ وہ اس شخص کے خلاف دعوی دائر کرنا چاہتا ہے جس نے اس پر یہ تہمت لگا کر اس کو جیل بھیج دیا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جیل جانے کا حقدار نہیں تھا، یہ دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ واقعہ خلافت کے قیام سے پہلے رونما ہوا۔ اس کے بارے میں فیصلہ دیا گیا اور وہ فیصلہ خلافت کے قیام سے پہلے نافذ بھی ہو چکا ہے اب وہ اللہ سے ہی اس پر اجر طلب کر سکتا ہے۔

اگر یہی آدمی دس سال کے لیے جیل میں ہو اور اس میں سے دو سال گزر جائیں پھر خلافت قائم ہو گئی اس صورت میں خلیفہ اس مسئلے کی چھان بین کر سکتا ہے یا تو سرے سے اس کی سزا کو معطل کرے گا تو وہ شخص اس الزام سے مکمل بری ہو کر جیل سے نکلے گا یا جو سزا اس نے کاٹی ہے اس کو کافی سمجھا جائے گا یعنی اس کی سزا کو دو سال ہی سمجھا جائے گا اور وہ جیل سے نکلے گا یا خلیفہ اس فیصلے کے بارے میں تحقیق کرے گا اور متعلقہ شرعی احکامات کا لحاظ کرتے ہوئے رعایا کے مفاد کو پیش نظر رکھے گا، خاص طور پر جب اس کا تعلق افراد کے حقوق سے ہو اور اس میں اس شخص کی بھلائی ہو۔

انتظامی مشینری (انتظامی عملہ)

دفعہ نمبر96: ریاستی امور (معاملات) کو چلانے اور لوگوں کے مفادات (مصالح) کی نگرانی کے لیے ڈپارٹمنٹس (محکمے) اور ادارے ہوتے ہیں جو ریاست کی ترقی اور لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

رسول اللہ ﷺ ریاستی مفادات (مصالح) کی نگرانی اور انتظام خود فرماتے تھے اور اس انتظام کے لیے کاتب مقرر کرتے تھے اور ان کے ذریعے مدینے میں لوگوں کے مفادات کی نگرانی فرماتے تھے، ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے، ان کی مشکلات کو حل کرتے، ان کے تعلقات کو منظم کرتے، ان کی ضروریات کو پورا کرتے، ان کو اس بات کی طرف متوجہ فرماتے کہ ان کے لیے بہتر کیا ہے۔ یہ سارے انتظامی معاملات تھے جو ان کی زندگی سے مشکلات اور پیچیدگیوں کا خاتمہ اور آسانی پیدا کرتے تھے۔

چنانچہ تعلیمی امور میں رسول اللہ ﷺ نے جنگی قیدیوں کا خون بہا (فدیہ) کفار کی طرف سے مسلمانوں کے دس بچوں کو پڑھنا، لکھنا، سکھانا مقرر کیا جو مالِ غنیمت میں سے تھا جو کہ مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ یوں تعلیم کا انتظام کرنا مسلمانوں کے مفادات میں سے ایک مفاد ہے۔

جہاں تک صحت کے معاملات کی بات ہے تو رسول اللہ ﷺ کو ایک ڈاکٹر بطور ہدیہ دیا گیا، جس کو رسول اللہ ﷺ نے عام مسلمانوں کے لیے ڈاکٹر مقرر کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ہدیہ کا آنا پھر آپ ﷺ کا اس میں کوئی تصرف نہ کرنا، اس کو اپنے پاس نہ رکھنا بلکہ اس کو مسلمانوں کے علاج کی ذمہ داری دینا اس بات کی دلیل ہے کہ علاج معالجہ بھی مسلمانوں کے مفادات میں سے ایک مفاد ہے۔

جہاں تک روزگار کا سوال ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو لوگوں سے مانگنے کے بجائے رسی اور کلہاڑی خرید کر لکڑیاں لا کر لوگوں کو بیچنے کی ہدایت کی تاکہ اپنی ضرورت پوری کرے تو گویا روزگار کے مسئلے کو حل کرنا بھی مسلمانوں کے مفادات میں سے ایک مفاد ہے، چنانچہ ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ **«أَنَّ رَجُلاً مِنَ الأَنْصَارِ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ يَسْأَلُهُ، فَقَالَ: أَمَا فِي بَيْتِكَ شَيْءٌ؟ قَالَ: بَلَى ... قَالَ: ائْتِنِي بِهِمَا، قَالَ: فَأَتَاهُ بِهِمَا، فَأَخَذَهُمَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بِيَدِهِ وَقَالَ: مَنْ يَشْتَرِي هَذَيْنِ ؟ ... قَالَ رَجُلٌ: أَنَا آخُذُهُمَا بِدِرْهَمَيْنِ، فَأَعْطَاهُمَا إِيَّاهُ وَأَخَذَ الدِّرْهَمَيْنِ، وَأَعْطَاهُمَا الأَنْصَارِيَّ وَقَالَ: اشْتَرِ بِأَحَدِهِمَا طَعَامًا فَانْبِذْهُ إِلَى أَهْلِكَ، وَاشْتَرِ بِالآخَرِ قَدُومًا فَأْتِنِي بِهِ، فَأَتَاهُ بِهِ، فَشَدَّ فِيهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ عُودًا بِيَدِهِ ثُمَّ**

قَالَ لَهُ: اذْهَبْ فَاحْتَطِبْ وَبِعْ، وَلا أَرَيَنَّكَ خَمْسَةَ عَشَرَ يَوْماً، فَذَهَبَ الرَّجُلُ يَحْتَطِبُ وَيَبِيعُ، فَجَاءَ وَقَدْ أَصَابَ عَشَرَةَ دَرَاهِمَ ...» ”انصار میں سے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر سوال کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہارے گھر میں کچھ بھی نہیں ہے؟ اس شخص نے کہا: کیوں نہیں۔ فرمایا: وہ لیکر میرے پاس آؤ۔ راوی کہتا ہے کہ وہ لیکر آگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا: یہ دو چیزیں کون خریدے گا؟ ایک آدمی نے کہا: میں یہ دونوں دو درہم میں لیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے وہ دونوں چیزیں اس شخص کو دے کر دو درہم لے لئے۔ ان دو درہموں کو انصاری کو دے کر فرمایا: ان میں سے ایک درھم میں کھانا خرید کر اہل وعیال کو دو اور دوسرے سے کلہاڑی خرید کر میرے پاس لاؤ۔ پھر وہ شخص لیکر آیا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس میں دستہ لگایا اور فرمایا: جاؤ لکڑیاں کاٹ کر لا کر بیچا کرو اور پندرہ دن تک میں تمہیں نہ دیکھوں۔ وہ شخص جا کر لکڑیاں چن کر بیچنے لگا اور جس وقت آیا وہ دس درھم کما چکا تھا“۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا جیسا کہ بخاری نے ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ: **«لَأَنْ يَحْتَطِبَ أَحَدُكُمْ حُزْمَةً عَلَى ظَهْرِهِ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ أَحَدًا فَيُعْطِيَهُ أَوْ يَمْنَعَهُ»** "تم میں سے کسی شخص کا اپنے پشت پر لکڑیوں کی گٹھڑی لا کر بیچنا کسی سے سوال کرنے سے بہتر ہے جو اس کو دے گا یا نہیں“۔

راستوں کے معاملے کو آپ ﷺ نے اس طرح منظم کیا کہ اپنے زمانے کے لحاظ سے اختلاف کی صورت میں راستے کو سات ہاتھ قرار دیا۔ بخاری نے ابوہریرہؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ **«قَضَى النَّبِيُّ ﷺ إِذَا تَشَاجَرُوا فِي الطَّرِيقِ بِسَبْعَةِ أَذْرُعٍ»** ”جب راستے کے بارے میں اختلاف ہوا، تو رسول اللہ ﷺ نے سات بازو (کی لمبائی کے برابر) راستہ مقرر کیا“، جب کہ مسلم کی روایت یوں ہے ” جب راستے کے بارے میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو سات بازو راستہ مقرر ہے“۔ احمد نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«وَالطَّرِيقُ الْمِيتَاءُ سَبْعَةُ أَذْرُعٍ»** ”چلنے کا راستہ سات بازو

ہے"احمد ہی کی دوسری روایت میں ہے جو انہوں نے عبادہ بن صامتؓ سے کی ہے کہ **« وَقَضَى فِي الرَّحَبَةِ تَكُونُ بَيْنَ الطَّرِيقِ ثُمَّ يُرِيدُ أَهْلُهَا الْبُنْيَانَ فِيهَا فَقَضَى أَنْ يُتْرَكَ لِلطَّرِيقِ فِيهَا سَبْعُ أَذْرُعٍ »** "راستے کے اطراف میں اگر اہل علاقہ تعمیرات کریں تو سات بازو سڑک کے لیے جگہ چھوڑیں"۔

یہ اس وقت کے لحاظ سے ایک انتظامی معاملہ تھا، اگر اس سے بھی وسیع راستہ چاہیے ہو، بنایا جاسکتا ہے جیسا کہ شافعی مذہب میں ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے راستہ روکنے سے منع فرمایا. طبرانی نے الصغیر میں روایت کیا ہے کہ **«مَنْ أَخَذَ مِنْ طَرِيقِ الْمُسْلِمِينَ شِبْراً طَوَّقَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ »** "جس شخص نے مسلمانوں کے راستے سے بالشت بھر جگہ بھی ہڑپ کی، قیامت کے دن اللہ سات زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈال دے گا"۔

زراعت کا جہاں تک تعلق ہے، زبیرؓ اور انصار کے ایک آدمی کے مابین کھیتوں کو سیراب کرنے کے بارے میں اختلاف ہوا، یہ اختلاف اس پانی پر تھا جو ان دونوں کی زمین سے گزرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«اسْقِ يَا زُبَيْرُ ثُمَّ أَرْسِلِ الْمَاءَ إِلَى جَارِكَ»** "زبیر تم پانی دو، پھر پانی اپنے ہمسائے کے لیے جانے دو" (یہ حدیث متفق علیہ ہے الفاظ مسلم کے ہیں)۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے مفادات کو منظم کرتے تھے اور انتہائی سہولت و آسانی سے ان کی انتظامی مشکلات کو حل کرتے تھے اور اس کام کے لیے بعض صحابہؓ سے مدد لیتے تھے۔ یوں لوگوں کے مفادات کا ادارہ ہوتا تھا جس کا سربراہ خلیفہ ہوتا تھا یا اس کے لیے مناسب ایڈمنسٹریٹر مقرر کرتا تھا جو اس کا نگران ہوتا تھا اس کے بارے میں یہ ہی تبنی ہے تاکہ خلیفہ کے اوپر بوجھ کم ہو، خاص کر موجودہ دور میں جب مصالح (مفادات) متنوع اور بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ لوگوں کے مفادات کے لیے ادارہ ہو گا جس کا

مناسب نگران ہو گا جو مختلف اسالیب اور وسائل سے لوگوں کے لیے زندگی کو آسان بنائے گا اور بغیر کسی پیچیدگی کے بلکہ سہولت اور آسانی سے ان کو ضروری خدمات (سروسز) فراہم کرے گا۔

اس نظام میں بہت سے ادارے اور محکمے ہوں گے، جیسے شہریت، ٹرانسپورٹ، کرنسی کی چھپائی کا محکمہ، تعلیم، صحت، زراعت، محکمہ تجارت، ہائی ویز کا محکمہ وغیرہ۔ ہر ادارے کی اپنی ذاتی انتظامیہ ہوتی ہے پھر اس کے ذیلی افسر اور ادارے ہوتے ہیں۔ ہر محکمہ اپنے ادارے کا نگران ہوتا ہے اور اپنے ذیلی اداروں کا بھی۔

یہ (محکمے) ادارے اور افسر ریاست کی ترقی اور لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قائم کئے جاتے ہیں۔

انتظامی مشینری کو ایک واضح نہج پر استوار کرنا فعل کو انجام دینے کے اسالیب میں سے ایک اسلوب اور اس کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہے، اس لیے اس کے لیے کسی خاص (مخصوص) دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ وہ عام دلیل کافی ہے جو اس کی اصل پر دلالت کرتی ہے۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ اسالیب بندے کے افعال ہیں اس لیے یہ صرف احکام شرعیہ کے مطابق ادا کئے جاسکتے ہیں۔ ہاں یہ نہیں کہا جائے گا کیونکہ ان افعال کے اصل کے بارے میں عام شرعی دلیل موجود ہے جو اس سے نکلنے والے افعال کے لیے بھی ہے۔ ہاں مگر تاوقت کہ اصل سے نکلنے والے کسی فروعی فعل کے بارے میں کوئی شرعی دلیل آئے، تب اس دلیل کے مطابق اس فعل کو انجام دیا جائے گا۔ مثال کے طور پر اللہ کا ارشاد ہے کہ وَآتُوا الزَّكَاةَ "اور زکوٰۃ ادا کرو"، یہ ایک عام دلیل ہے پھر اس سے نکلنے والے افعال کے بارے میں دلائل آگئے، جیسے زکوٰۃ کے نصاب کی مقدار، اس کو اکھٹا کرنے والے اور وہ اصناف جن پر سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یہ سارے اس وَآتُوا الزَّكَاةَ سے متفرع (نکلے ہوئے) افعال ہیں۔ ہاں اس زکوٰۃ کو اکھٹا کرنے والے لوگوں کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ کیسے جائیں گے یعنی پیدل یا سوار ہو کر؟ کیا اپنی مدد کے لیے اجرت پر ملازم اپنے ساتھ رکھیں گے یا نہیں؟ کیا اس کو رجسٹر میں درج کریں گے یا نہیں؟ کیا اپنے لیے کوئی خاص جگہ مقرر کریں گے جہاں جمع ہوں گے؟ کیا جمع کیے

ہوئے مال کے لیے اسٹور بنائیں گے ؟ یہ اسٹورز زیرِ زمین ہوں گے یا گھروں میں موجود اناج کے اسٹوروں کی طرح ہونگے ؟ کیا نقدی زکوٰۃ بوریوں میں جمع کی جائے گی یا صندوقوں میں ؟ یہ یا اس جیسے امور **وَاٰتُوا الزَّکَاۃَ** سے متفرع افعال ہیں جو عام دلیل میں داخل ہیں کیونکہ ان کے بارے میں کوئی خاص دلیل نہیں ہے۔ یہی حال تمام اسالیب کا ہے۔ اسلوب وہ فعل ہوتا ہے جو اس اصل کی فرع (ذیلی شاخ) ہوتا ہے جس اصل کے بارے میں عام دلیل موجود ہو، اس کے بعد اس فرع کے لیے کوئی خاص دلیل نہ ہو اور اس کی اصل کی عام دلیل ہی اس کے لیے دلیل ہو۔

یہی وجہ ہے کہ انتظامی اسالیب کو کسی بھی نظام سے لیا جا سکتا ہے اگر یہ انتظامی مشینری کو چلانے میں آسانی کے لیے مناسب اور لوگوں کی ضرورتوں کو پوری کرتا ہو، کیونکہ انتظامی اسلوب ایسا حکم نہیں کہ جس کے لیے دلیل کی ضرورت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عمرؓ نے دیوان (کمپارٹمنٹ یا سکرٹیریٹ) کا اسلوب اخذ کیا اور سپاہیوں اور رعایا کے نام لکھے تاکہ عام ملکیت یا ریاستی ملکیت کے اموال کی ان کے درمیان تقسیم کو منظم کیا جائے، جیسے عطیہ اور تنخواہیں۔

عابد بن یحیی نے حارث بن نفیل سے روایت کی ہے کہ عمرؓ نے دیوان مرتب کرنے کے بارے میں مسلمانوں سے مشورہ لیا۔ علیؓ بن ابی طالب نے کہا: ہر سال جتنا مال آپ کے پاس جمع ہو جائے اس کو تقسیم کر دیں اور اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھیں۔ عثمان بن عفانؓ نے کہا مجھے نظر آرہا ہے کہ مال اتنا زیادہ ہے جو لوگوں کے لیے کافی ہے، اگر اس کا حساب کتاب نہ رکھا جائے تو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ کس نے لیا اور کس نے نہیں لیا اور معاملہ انتشار کا شکار ہو گا۔ جب کہ ولید بن ہشام نے کہا کہ "میں ملک شام میں تھا جہاں میں نے دیکھا بادشاہوں نے دیوان مرتب کر رکھے ہیں اور اس کام کے لیے عملہ بھرتی کرر کھا ہے۔ آپ بھی دیوان مرتب کیجئے اور عملہ بھرتی کیجئے۔ عمرؓ نے ان کی بات مان لی اور عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم کو بلوایا یہ تینوں قریش کے انساب (شجرہ نسب) کے ماہر تھے، ان سے فرمایا: "لوگوں کے نام ان کے گھروں کے حساب سے لکھو (مردم شماری کرو)"۔

پھر عراق میں اسلام کے ظہور کے بعد دواوین (جمع دیوان) کو پہلے سے موجود شکل میں ہی جاری رکھا گیا۔ چنانچہ شام کا دیوان رومی زبان میں تھا کیونکہ یہ رومی علاقے تھے جب کہ عراق کا دیوان فارسی تھا کیونکہ یہ فارسی علاقے تھے۔ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں اکیاسی (81) ہجری میں شام کے دیوان کو عربی میں منتقل کیا گیا پھر حسب ضرورت اور لوگوں کے مفادات کو پیش نظر رکھ کر دواوین مرتب کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک دیوان تھا جو فوج کے ساتھ خاص تھا جو فوجی بھرتی اور فوجیوں کے لیے بخشش کیلیے تھا۔ اسی طرح اعمال (کاروبار)، فیس اور حقوق کے لیے بھی مخصوص دواوین تھے۔ ایک دیوان عاملوں والیوں کی تقرری اور برطرفی کے لیے مخصوص تھا۔ بیت المال کے آمدن اور خرچ کے لیے بھی مخصوص دیوان تھے وغیرہ۔ یوں دیوان مرتب کرنے کا تعلق ضرورت کے ساتھ ہے۔ پھر اس کا اسلوب بھی زمانے کے لحاظ سے مختلف ہوتا تھا کیونکہ اسالیب اور وسائل بدلتے رہتے ہیں۔

دیوان کا ایک سربراہ بھی مقرر کیا جاتا تھا اور اس کے لیے ملازمین بھی بھرتی کیے جاتے تھے۔ بعض مرتبہ اس سربراہ کو دیوان کے لیے ملازمین مقرر کرنے کا اختیار بھی دیا جاتا تھا جب کہ بعض مرتبہ ملازمین بھرتی کر کے اس کے حوالے کیے جاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اس ادارے (دیوان) کو قائم کرتے وقت ضرورت کو مد نظر رکھا جائے گا اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مناسب اسالیب اور وسائل اختیار کیے جائیں گے۔ یہ جائز ہے کہ یہ ہر زمانے میں مختلف ہوں یا ہر ولایہ میں مختلف ہوں یا ہر علاقے میں مختلف ہوں۔

دفعہ نمبر 97: مفادات (Public Interests) کی نگرانی اور محکموں کے انتظام کی پالیسی نظام میں سادگی، اعمال کو انجام دینے میں جلدی اور محکموں کے لیے قابل ذمہ داران کے تقرر کی بنیاد پر ہو گی۔

یہ مفادات یا مصالح کو پورا کرنے کی حقیقت سے ماخوذ ہے، کہ جس شخص کو کسی عوامی سہولت کی ضرورت ہو، اس تک یہ سہولت جلد از جلد اور بھرپور انداز سے پہنچنی چاہیے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **«إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ الإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ، فَإِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ ...»** "اللہ نے ہر چیز میں احسان لکھ دیا ہے پس جب تم قتل کرو تو احسان (اچھے طریقے) سے کرو اور جب ذبح کرو تب بھی احسان (احسن انداز) سے کرو"، اسے مسلم نے شداد بن اوس سے روایت کیا ہے۔ شریعت میں اعمال کی ادائیگی میں احسان کا حکم دیا گیا ہے، مفادات کو پورا کرنے میں اس احسان تک پہنچنے کے لیے انتظامیہ میں تین صفات کا ہونا ضروری ہے:

پہلی صفت: نظام میں سادگی کیونکہ اس سے سہولت اور آسانی ہوگی، پیچیدگی سے مشکل پیش آئے گی۔

دوسری صفت: معاملات کی کامیاب اور جلد انجام دہی، اس سے لوگ غیر ضروری تاخیر سے بچیں گے۔

تیسری صفت: ذمہ داران کے اندر قابلیت کا پایا جانا، یہ عمل کی احسن طریقے سے انجام دہی کا باعث بنے گا، جو کہ عمل کو ٹھیک ٹھیک سرانجام دینے اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے درکار ہے۔

ان تین صفات کی دلائل درجہ ذیل ہیں:

آسانی:

ابوموسیٰ کی حدیث، جو متفق علیہ ہے، بخاری نے اسے ان الفاظ میں روایت کیا ہے: سعید بن ابی بردہ نے اپنے باپ پھر اپنے داد اسے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو اور معاذ بن جبلؓ کو روانہ فرمایا تو ان سے کہا **«يَسِّرَا وَلا تُعَسِّرَا، وَبَشِّرَا وَلا تُنَفِّرَا، وَتَطَاوَعَا ...»** "آسانی پیدا کرنا مشکل میں مت ڈالنا، خوشخبری سنانا متنفر مت کرنا، معاونت سے کام کرنا"۔

انسؓ کی متفق علیہ حدیث جو دونوں کے ہاں انہی الفاظ کے ساتھ مروی ہے: نبی ﷺ نے فرمایا «**يَسِّرُوا وَلا تُعَسِّرُوا، وَسَكِّنُوا وَلا تُنَفِّرُوا**» ”آسانی پیدا کرو، مشکل میں مت ڈالو، تسکین دو اور تنفر مت کرو“۔

حاکم کی عمرو بن مرہ کی حدیث جسے انہوں نے صحیح قرار دیا ہے اور ذھبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ «**مَنْ أَغْلَقَ بَابَهُ دُونَ ذَوِي الْحَاجَةِ وَالخِلَّةِ وَالْمَسْكَنَةِ، أَغْلَقَ اللَّهُ بَابَ السَّمَاءِ دُونَ خِلَّتِهِ وَحَاجَتِهِ وَفَقْرِهِ وَمَسْكَنَتِهِ**» ”جس نے ضرورت مند، ملنے والے اور مسکین کے سامنے دروازہ بند کر لیا اللہ اس کی دوستی، اس کی حاجت، اس کے فقر اور اس کی مسکینی کے سامنے آسمان کا دروازہ بند کر دے گا“۔

حاکم کی ابی مریم الازدی کی حدیث جسے انہوں نے صحیح کہا ہے اور ذھبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے، میں ذکر ہے: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ «**مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ الْمُسْلِمِينَ شَيْئاً فَاحْتَجَبَ دُونَ خِلَّتِهِمْ وَحَاجَتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ وَفَاقَتِهِمْ، احْتَجَبَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ القِيَامَةِ دَونَ خِلَّتِهِ وَفَاقَتِهِ وَحَاجَتِهِ وَفَقْرِهِ**» ”جس کسی کو مسلمانوں کے معاملے میں کوئی ذمہ داری دی گئی اور وہ ان سے دوری اختیار کیے رہا، ان کی ضرورتیں پوری نہیں کی، ان کے فقر اور فاقہ سے لاتعلق رہا، اللہ عزوجل قیامت کے دن اس سے، اس کے فاقے، اس کی ضرورت اور اس کی فقیری سے لاتعلق رہے گا“۔ حاکم مستدرک میں کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، اگرچہ (شیخین نے) اس کی تخریج نہیں کی ہے، اس کی اسناد شامی اور صحیح ہیں۔

احمد کے نزدیک معاذؓ کی حدیث جس کو الزین نے صحیح قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ النَّاسِ شَيْئًا فَاحْتَجَبَ عَنْ أُولِي الضَّعَفَةِ وَالْحَاجَةِ، احْتَجَبَ اللَّهُ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ**» ”جس کسی کو مسلمانوں کے معاملے (حکمرانی) میں کوئی ذمہ داری دی گئی اور وہ کمزور اور ضرورت مند سے لاتعلق رہا، اللہ قیامت کے روز اس سے لاتعلق رہے گا“۔

جلد تکمیل:

طبرانی نے ایسی اسناد سے جس کے رجال (راوی) قابل اعتماد ہیں روایت کیا ہے اور یہ ابوہریرہؓ کی روایت سے مختلف ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«إِيَّاكُمْ وَالإِقْرَادُ. قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا الإِقْرَادُ ؟ قَالَ: يَكُونُ أَحَدُكُمْ أَمِيراً أَوْ عَامِلاً فَتَأْتِيهِ الأَرْمَلَةُ وَالمِسْكِينُ فَيُقَالُ لَهُ: انْتَظِرْ حَتَّى يُنْظَرَ فِي حَاجَتِكَ، فَيُتْرَكُونَ مُقْرَدِينَ لاَ تُقْضَى لَهُمْ حَاجَةٌ وَلاَ يُؤْمَرُونَ فَيَنْصَرِفُونَ، وَيَأْتِي الرَّجُلُ الغَنِيُّ الشَّرِيفُ فَيُقْعِدُهُ إِلَى جَانِبِهِ ثُمَّ يَقُولُ: مَا حَاجَتُكَ ؟ فَيَقُولُ: كَذَا وَكَذَا. فَيَقُولُ: اقْضُوا حَاجَتَهُ وَعَجِّلُوا بِهَا»** "خبر دار اقراد سے بچو! لوگوں نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ اقراد کیا ہے ؟ فرمایا: تم میں سے کوئی امیر (والی) یا عامل بن جائے اور اس کے پاس کوئی بیوہ یا مسکین آئے تو اس (بیوہ یا مسکین) کو کہا جائے کہ انتظار کرو یہاں تک کہ تمہاری ضرورت کو دیکھا جائے، یوں ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے اور ان کی ضرورت کو پورا نہ کیا جائے اور نہ اس کے لیے حکم دیا جائے، اور وہ (بغیر ضرورت پورا کیے) چلے جائیں۔ جبکہ ایک مالدار عزت دار آدمی آئے تو اس کو اس (امیر یا عامل) کے پہلو میں بٹھایا جائے، پھر اس سے کہا جائے: کیا چاہیے ؟ وہ کہتا ہے یوں یوں، تو کہا جائے کہ اس کی ضرورت کو پوری کرو اور جلدی کرو"۔

ابنِ شبہ نے اپنی تاریخ میں ابن شوذب سے روایت کیا ہے کہ عمرؓ نے فرمایا: "اے لوگو! آج کا کام کل کے لیے موئخر مت کرو، اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر کاموں کا بوجھ ہو گا اور تم یہ نہیں سمجھ پاؤ گے کہ ضائع کیے ہوئے کاموں میں سے کس کام سے ابتدا کرنی ہے"۔

امام شافعی اپنی کتاب الأم میں فرماتے ہیں: اہلِ علم میں سے ایک سے زیادہ نے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ جس وقت عراق سے جو کچھ مال عمر بن خطابؓ کے پاس آیا تو بیت المال کے ذمہ دار نے آپؓ سے کہا: میں یہ مال بیت المال میں جمع کرنا چاہتا ہوں، فرمایا: نہیں رب کعبہ کی قسم! بیت المال کے چھت کے نیچے جو کچھ بھی ہے میں وہ سب تقسیم کروں گا"۔

احمد نے الزھد میں، ابنِ عبد البر نے الاستیعاب میں اور ابنِ ابی عاصم نے بھی الزھد میں ایک جماعت سے روایت کیا ہے کہ " علیؓ بیت المال میں جھاڑو دینے کا حکم دیتے تھے اور اس امید پر اس کی صفائی کر کے اس میں نماز پڑھتے تھے کہ قیامت کے دن یہ اس بات کی گواہی دے گا کہ آپ نے اس میں مسلمانوں کا مال بند کر کے نہیں رکھے رکھا"۔

قابلیت (صلاحیت):

احمد نے حسن اسناد کے ساتھ حذیفہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ قَوْماً كَانُوا أَهْلَ ضَعْفٍ وَمَسْكَنَةٍ قَاتَلَهُمْ أَهْلُ تَجَبُّرٍ وَعَدَدٍ، فَأَظْهَرَ اللَّهُ أَهْلَ الضَّعْفِ عَلَيْهِمْ، فَعَمَدُوا إِلَى عَدُوِّهِمْ فَاسْتَعْمَلُوهُمْ وَسَلَّطُوهُمْ، فَأَسْخَطُوا اللَّهَ عَلَيْهِمْ إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ» "ایک قوم تھی جو کہ کمزور اور مسکین تھی ان سے ایک جابر اور بڑی تعداد والی قوم نے لڑائی کی، اللہ نے کمزور قوم کو ان پر غالب کر دیا لیکن انہوں نے اس قوم سے انتقام کا ارادہ کیا، ان کو ستایا اور ان کو مجبور کیا یوں قیامت تک کے لیے اللہ کو ناراض کر بیٹھے"۔

مسلم نے ابو موسیٰؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّا وَاللَّهِ، لاَ نُوَلِّي عَلَى هَذَا الْعَمَلِ أَحَدًا سَأَلَهُ، وَلاَ أَحَدًا حَرَصَ عَلَيْهِ» "اللہ کی قسم! ہم ایسے شخص کو اس کام (حکمرانی) کی ذمہ داری نہیں دیں گے جو اس کے لیے سوال کرے اور نہ ہی ایسے شخص کو دیں گے جو اس کے لیے لالچی ہو"۔

بیہقی نے الشعب میں عمرؓ کے بارے میں کہا ہے کہ انہوں نے فرمایا: لا يقضى بين الناس الا حصيف العقل اريب العقدة لا يطلع منه على عورة ولايحنق على جرة ولاتاخذه فى الله لومة لائم "لوگوں کے درمیان صرف وہ شخص فیصلے کرے جو کامل العقل (عقلمند) ہو، پیچیدگیوں کو سلجھانے والا ہو، کسی کی پردہ دری نہ کرتا ہو، اپنی رعایا سے بغض نہ رکھتا ہو اور اللہ کے معاملے میں

کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرتا ہو"۔ ابن الاثیر نے النھایہ میں کہا ہے کہ لا یحنق کا یہی مطلب ہے کہ اپنی رعایا سے بغض نہ رکھتا ہو۔

حاکم نے مستدرک میں زید بن اسلم سے، انہوں نے اپنے والد سے، انہوں نے عمرؓ سے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اور ذھبی نے بھی ان کی موافقت کی ہے کہ " عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: کوئی تمنا کرو، بعض نے کہا: میری یہ تمنا ہے کہ یہ گھر سونے سے بھرا ہو جس کو میں اللہ کے راستے میں خرچ اور صدقہ کروں، ایک آدمی نے کہا: میری یہ تمنا ہے کہ یہ زبرجد اور جواہرات سے بھرا ہو اور میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ اور صدقہ کروں۔ عمرؓ نے پھر فرمایا: تمنا کرو۔ سب نے کہا: اے امیر المومنین ہمیں نہیں معلوم (کہ کیا تمنا کریں)۔ عمرؓ نے فرمایا: میری تمنا یہ ہے کہ یہ (مکان) ابو عبیدہ بن الجراحؓ، معاذ بن جبلؓ، سالم مولی ابی حذیفہ اور حذیفہ بن الیمانؓ جیسے آدمیوں سے بھرا ہو"۔

دفعہ نمبر 98: ہر وہ شخص جو ریاست کا شہری ہو اور باصلاحیت ہو، کو کسی بھی مفاد، محکمہ یا ڈپارٹمنٹ کا ملازم یا اس کا مدیر (ڈائریکٹر) مقرر کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

یہ اجارہ (ملازمت) کے احکام سے ماخوذ ہے، کیونکہ ریاست میں ڈائریکٹرز اور ملازمین اجارہ کے احکامات کے مطابق ملازم ہوتے ہیں۔ ملازم کو اجرت پر رکھنا مطلقاً جائز ہے خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم کیونکہ اجارہ کے دلائل عام ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ** (الطلاق 6:) "اگر وہ تمہارے لیے دودھ پلائیں تو ان کو ان کا اجر دے دو"۔ یہ حکم مطلق (absolute i.e not restricted) ہے، مسلمان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اور بخاری نے ابو ہریرہؓ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ((**ثَلاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ... وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِ أَجْرَهُ**)) "تین لوگوں کا قیامت کے دن میں فریق (دشمن) بنوں گا... وہ

آدمی جس نے اجرت پر ملازم رکھا،اس سے کام تو پورا لیا اور اس کو اجرت نہیں دی"۔ یہ حکم مطلق ہے اور مسلمان اجیر کے ساتھ خاص نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بنی الدیل کے آدمی کو اجرت پر رکھا حالانکہ وہ اپنی قوم کے دین پر تھا، جیسا کہ بخاری نے عائشہؓ سے روایت کی ہے جو غیر مسلم کو اجرت پر رکھنے کی دلیل ہے۔ جس طرح کہ مسلمان کو اجرت پر رکھنا جائز ہے، اسی طرح دلائل کے عام ہونے کی وجہ سے عورت کو اجرت پر رکھنا بھی اسی طرح جائز ہے جیسا کہ مرد کو رکھنا، پس عورت کے لیے ریاست کے محکموں میں سے کسی محکمے کا ڈائریکٹر یا اس میں ملازم ہونا جائز ہے اور غیر مسلم کے لیے بھی کسی ادارے کا سربراہ ہونا یا اس میں ملازم ہونا جائز ہے کیونکہ یہ سب ملازمین (اجرا) ہی ہیں اور اجرا کے دلائل عام اور مطلق ہیں۔

دفعہ نمبر99: ہر مفاد عامہ(public interest) کے لیے عام ڈائریکٹر متعین کیا جائے گا۔ جبکہ ہر آفس اور ادارے کے لیے ایک ڈائریکٹر ہو گا جو اس کے انتظام کا نگران ہو گا اور اس کا براہ راست ذمہ دار ہو گا پھر یہ ڈائریکٹرز اپنے کام کے لحاظ سے ان مفادات کے اعلیٰ اداروں کے آفیسرز یا اداروں کے ڈائریکٹرز کے سامنے جواب دہ ہوں گے اسی طرح یہ احکام کی پابندی اور عام نظام کے حوالے سے والی اور عامل کے سامنے بھی جواب دہ ہوں گے۔

اسی میں مفادات، دفاتر اور اداروں کو چلانے کی ضمانت ہے، اس لیے لازمی طور پر ان ذمہ داروں کا تقرر ہو گا۔ ہر مفاد کے لیے ایک عام مدیر (ڈائرکٹر) مقرر کیا جائے گا جو براہ راست مفاد کے معاملات کے انتظام وانصرام کا ذمہ دار ہو گا، وہ اس کے تمام ذیلی دفاتر اور اداروں کا نگران ہو گا۔ ہر محکمے اور ہر ادارے کا ایک مدیر متعین کیا جائے گا جو براہ راست اس کا اور اس کی شاخوں اور اقسام کا ذمہ دار ہو گا۔

یہ تو مفادات کے اداروں یا دیوان کے قیام کے حوالے سے ہے۔ جہاں تک ان ملازمین کی جوابدہی کا سوال ہے تو یہ ملازمین ہیں اور ساتھ ہی رعایا بھی، چنانچہ وہ ملازمین ہونے کے لحاظ سے یعنی اپنے کام کے لحاظ سے

اپنے ادارے کے سربراہ کے سامنے جوابدہ ہیں، یعنی اپنے ادارے کے ڈائریکٹر کے سامنے، جب کہ رعایا ہونے کے لحاظ سے حکمران یعنی والیوں اور معاونین کے سامنے اور اسی طرح خلیفہ کے سامنے جواب دہ ہیں، اور یہ نظام اور انتظام میں احکام شرع کا پابند ہیں۔

دفعہ نمبر100: تمام مفاد عامہ کے دفاتر اور محکموں کے مدیران کو کسی سبب سے انتظامی نظام کے ضمن میں ہی معزول کیا جاسکتا ہے، تاہم ان کو ایک کام سے دوسرے کام کی طرف منتقل کرنا جائز ہے۔ ان کو کام سے روکنا بھی جائز ہے، ان کی تعیناتی، منتقلی، کام سے روکنا، تادیب اور ان کو معزول کرنا ان محکموں اور اداروں کے اعلیٰ انتظامی ذمہ داران کی طرف سے ہی ہو گا۔

یہ ملازمت کے احکامات سے ماخوذ ہے۔ ملازم کو جس وقت ایک مدت کے لیے اجرت پر رکھا جائے تو اجرت کی اس مدت کے دوران اس کو برطرف کرنا صحیح نہیں، لیکن اس کو کام سے روکا جا سکتا ہے، اسی کو (توقیف) کہا جاتا ہے۔ اس حال میں وہ اجرت کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ اجرت صرف جائز عقود (contracts) میں سے ہی نہیں بلکہ یہ لازمی عقود میں سے ہے۔ جوں ہی عقدِ اجارہ (ملازمت کا کنٹرکٹ) طے ہو جائے تو وہ کنٹرکٹ کرنے والے دونوں فریقوں پر لازم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک انتظامی ڈسپلن کی پابندی کا سوال ہے تو یہ گویا کی شرائط کی طرح ہیں جن کی پاسداری کرنا لازمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **«الْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ»** "مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں"۔ اس کو ابوداؤد نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے ایک اور روایت میں حاکم اور دارقطنی نے عائشہؓ سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں **«الْمُسْلِمُونَ عِنْدَ شُرُوطِهِمْ»** "مسلمان اپنی شرائط کے پابند ہیں"۔

رہی بات اسے ایک کام سے دوسرے کام کی طرف منتقل کرنے کی، تو یہ ملازمت کے عقد کے تحت ہے، مثلاً اگر کسی کو یہ کہہ کر اجرت پر رکھا کہ وہ خندق کھودے گا تو اسے گھر بنانے کے کام پر منتقل نہیں کیا جا

سکتا۔ بالکل یہی حال حکومتی افسر کا ہے، اگر کسی کام کے لیے اس کی تعیناتی عام ہو تو اسے اسی کام میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا جائز ہے۔ اور اگر اس کی تعیناتی بالکل ہی عام ہو اس کو منتقل کرنا بھی مطلقاً ہی جائز ہو گا یعنی اس کو منتقل کرنے میں تعیناتی کے عقد کی ہی پابندی کی جائے گی۔

دفعہ نمبر 101: مدیران کے علاوہ جتنے ملازمین ہیں ان کی تعیناتی، ان کی منتقلی، ان کو کام سے روکنا، ان کو سزا دینا اور ان کو برطرف کرنا انہی کے مفادات (اداروں) ان کے دفاتر اور محکموں کے اعلیٰ ذمہ داران کی جانب سے ہو گا۔

ریاست میں آفیسرز ملازمت کے قواعد کے مطابق ہی ملازم ہوتے ہیں۔ ان کی تعیناتی، برطرفی، ان کی منتقلی اور ان کو سزا دینے کا کام انہی اداروں، دفاتر یا محکموں کے اعلیٰ ذمہ داران کا ہے اور یہ کام انتظامی ڈسپلن کے مطابق ہو گا۔

یہ ملازمت کے احکامات سے ماخوذ ہے اور ملازم کے ساتھ طے کیے جانے والے کنٹریکٹ کے تقاضوں کی پابندی لازم ہے، بالکل اسی طرح جیسے کہ ملازم پر کنٹریکٹ کی پابندی لازم ہے۔ کیونکہ کنٹریکٹ میں جو اتفاق ہوا ہے اس کی پابندی دونوں اطراف پر لازم ہے۔ اس لیے جس مدت کے لیے ملازم کو اجرت پر رکھا گیا ہے اس مقررہ مدت کے دوران اس کو برطرف کرنا درست نہیں۔

انتظامی امور کی پابندی کرنا ملازمت کی شرائط میں سے ہے کہ جس کی پابندی لازمی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں"، اس کو ابوداؤد نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ جہاں تک ملازمین کو ایک کام سے دوسرے کام میں منتقل کرنے کی بات ہے تو یہ عقدِ ملازمت کے تابع ہے۔ اس لیے اس کی تعیناتی کے وقت جو معاہدہ ہوا ہے اس کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔

ان ملازمین کی تعیناتی، ان کی تادیب اور ان کی برطرفی، ان کے محکموں، اداروں اور ڈپارٹمنٹس کے ذمہ داران کا کام ہے کیونکہ وہی اس مفاد کے بارے میں جواب دہ ہیں، جس کے لیے وہ کام کر رہے ہیں۔ وہ اپنی دی گئی ذمہ داری کے تقاضا کے مطابق بااختیار ہوں گے۔

بیت المال

دفعہ نمبر102: بیت المال وہ محکمہ ہے جو احکام شرعیہ کے مطابق آمدن اور اخراجات کو اکٹھا کرنے، ان کی حفاظت کرنے اور خرچ کرنے کی نگرانی کرتا ہے۔ بیت المال کے محکمے کے سربراہ کو 'بیت المال کا خازن' کہا جاتا ہے۔ پھر ہر صوبے میں اس محکمے کے ذیلی دفاتر (ادارے) ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ادارے کے سربراہ کو 'صاحب بیت المال' کہا جاتا ہے۔

بیت المال ترکیب اضافی (مضاف و مضاف الیہ) کے ساتھ مرکب ہے، اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں ریاست کی آمدن کو جمع کیا جاتا ہے اور وہیں سے اس کو خرچ بھی کیا جاتا ہے۔ بیت المال کہہ کر وہ محکمہ بھی مراد لیا جاتا ہے جو مال اکھٹا کرتا ہے، پھر اس مال کو ان مسلمانوں پر خرچ کرتا ہے جو اس کے مستحق ہیں۔

چونکہ ہم نے تبنی کیا ہے جیسا کہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ والی کی ولایت ولایتِ خاص ہو گی جس میں فوج، عدلیہ اور مالیات داخل نہیں ہوں گے یہی وجہ ہے کہ پوری فوج کا ایک ہی مرکزی ادارہ (امیر الجہاد)، پوری عدلیہ کے لیے ایک ہی مرکزی عدلیہ اور مالیات کے لیے ایک ہی مرکزی ادارہ (بیت المال) ہو گا۔ یوں بیت المال بھی ریاست کے کسی بھی دوسرے ادارے کی طرح ایک مستقل ادارہ ہے اور کسی بھی ریاستی ادارے کی طرح خلیفہ کے ماتحت ہوتا ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اس حوالے سے بہت سے دلائل موجود ہیں کہ بیت المال براہِ راست رسول اللہ ﷺ یا خلیفہ کے ماتحت ہوتا تھا یا آپ ﷺ کے حکم سے کوئی اس کی نگرانی پر مامور ہوتا تھا۔ کبھی تو رسول اللہ ﷺ خود ہی بیت المال کے خزانے کی براہِ راست نگرانی فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کا ایک خزانہ (اسٹور) ہوتا تھا۔ آپ ﷺ براہ راست مال اپنے قبضے میں لیتے تھے اور اس کو تقسیم فرماتے تھے اور ہر قسم کے مال کو اس کی جگہ رکھتے تھے۔ جبکہ آپ ﷺ کبھی یہ ذمہ داری کسی اور کو سونپ دیتے۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفائے راشدینؓ بھی خود ہی بیت المال کے امور کی نگرانی کرتے یا کسی اور کو اپنا نائب مقرر کرتے۔

رسول اللہ ﷺ مال کو یا تو مسجد میں رکھتے جیسا کہ بخاری نے انسؓ سے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ کے پاس بحرین سے مال آیا تو فرمایا: "اس کو مسجد میں جمع کر کے رکھو"۔ یا ازواجِ مطہرات کے حجروں میں سے کسی حجرے میں رکھتے جیسا کہ بخاری نے عقبہ سے روایت کی ہے کہ "میں نے مدینہ میں عصر کی نماز نبی ﷺ کے پیچھے پڑھی، آپ ﷺ نے سلام پھیرتے ہی فوراً کھڑے ہو گئے اور لوگوں کے گردنیں پھلانگتے ہوئے اپنے کسی زوجہ کے حجرے کی طرف گئے، اتنی جلد بازی دیکھ کر لوگ فکر مند ہو گئے۔ پھر آپ ﷺ لوگوں کی طرف آئے اور دیکھا کہ اس جلدی کی وجہ سے لوگوں کو تعجب ہوا، تو فرمایا: مجھے یاد آگیا کہ میرے پاس سونے کا ٹکڑا ہے پس مجھے برا لگا کہ یہ اللہ کی یاد سے میرے توجہ پھیرے، اس لیے میں نے اس کو تقسیم کرنے کا حکم دے دیا"۔

جہاں تک مال کو خزانے میں رکھنے کی بات ہے تو مسلم نے عمرؓ سے روایت کیا ہے جس میں ذکر ہے کہ "...میں نے ان سے کہا: رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا: آپ ﷺ اپنے خزانے میں ہیں۔ میں نے آپ ﷺ کے خزانہ میں نظریں دوڑائیں، تو اپنے سامنے تھوڑے سے، ایک صاع کے برابر، جَو دیکھے۔ اسی طرح دیکھا کہ کچھ پتے (نچوڑنے کے لیے) کمرے کے ایک کونے میں ہیں اور ایک چمڑا (بغیر دباغت کئے) لٹکا ہوا ہے۔ (عمرؓ) کہتے ہے کہ: میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابنِ خطابؓ کس چیز نے

تمہیں رُلا دیا؟ میں نے کہا: اے اللہ کے نبی، کیسے نہ روؤں، اس چٹائی سے آپ ﷺ کے پہلو پر نشان پڑ گئے ہیں اور آپ ﷺ کے خزانے کی یہ حالت ہے۔

خلفائے راشدینؓ کے عہد میں اس جگہ کو بیت المال کا نام دیا گیا، جہاں مال کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ ابنِ سعد نے الطبقات میں سہل بن ابی حثمہ وغیرہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ:"ابو بکرؓ کا سنح (مدینہ کے پاس ایک جگہ) میں بیت المال تھا، جس کا کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ آپؓ سے کہا گیا کہ اس کے لیے چوکیدار کیوں نہیں رکھتے؟ فرمایا: اس میں تالا لگا ہے۔ آپ اس میں جو کچھ ہوتا اس میں سے لوگوں کو دیتے، یہاں تک کہ وہ خالی ہو جاتا۔ جب آپ مدینہ (شہر) منتقل ہو گئے تو بیت المال کو بھی تبدیل کر کے اپنے گھر میں لے آئے"۔ ھناد نے الزھد میں عمدہ اسناد کے ساتھ انسؓ سے روایت کیا ہے کہ:"ایک آدمی نے عمرؓ کے پاس آکر کہا: اے امیر المومنین، مجھے سوار کریں میں جہاد کے لیے جانے کا ارادہ کیا ہے، عمرؓ نے ایک آدمی سے کہا: اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو بیت المال میں داخل کرو تاکہ اس کو جو کچھ چاہیے وہ لے لے..."۔ بیہقی نے سنن الکبریٰ میں عبداللہ بن ودیعہ سے روایت کیا ہے جس کو ابنِ حجر نے صحیح قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:"سالم جو کہ ابو حذیفہ کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) تھے، وہ ہماری ایک عورت جس کا نام سلمی بنت یعار کے مولی تھے، انہیں زمانہ جاہلیت میں آزاد کیا گیا تھا۔ وہ جنگِ یمامہ میں مارے گئے، تو ان کی میراث عمر بن خطابؓ کے پاس لائی گئی۔ آپؓ نے ودیعہ بن خذام کو بلوایا اور فرمایا: یہ تمہارے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) کی میراث ہے، جس کے تم ہی زیادہ حقدار ہو۔ اس نے کہا: اے امیر المومنین اللہ نے ہمیں اس سے مستغنی کر دیا ہے، ہماری ایک خاتون نے اس کو مکمل طور پر آزاد کیا تھا، ہمارا اس کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ تب عمرؓ نے اس مال کو بیت المال میں جمع کرا دیا"۔ بیہقی اور دارمی نے روایت کیا ہے جس کو ابنِ حزم نے صحیح قرار دیا ہے کہ "ابوسفیان بن عبداللہ بن ربیعہ ثقفی کو کھوئی ہوئی چیز ملی، وہ لے کر عمر بن خطابؓ کے پاس آیا تو انہوں نے فرمایا: ایک سال تک اس کے بارے میں لوگوں کو بتاؤ، اگر کسی نے (اپنی چیز) پہچان لی تو ٹھیک ہے، ورنہ یہ تمہاری ہو جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہی حکم دیا ہے۔ اس نے کہا: مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ پھر عمرؓ نے وہ چیز بیت المال میں جمع کر دی"۔

دارمی اور ابن ابی شیبہ نے عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت کیا ہے کہ "عثمانؓ کے عہد میں ایک ایسے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) کا انتقال ہو گیا جس کا کوئی والی نہیں تھا۔ آپؓ نے اس کا مال لا کر بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا"۔ ابن عبد البر نے الاستذکار میں انس بن سیرین سے روایت کی ہے کہ "علیؓ اموال تقسیم کرتے یہاں تک کہ بیت المال خالی ہو جاتا پھر آپ اس کی صفائی کروا کر اس میں بیٹھ جاتے"۔

یہ تو بیت المال اپنے پہلے معنی یعنی جگہ (مکان یا اسٹور) کے متعلق تھا، جہاں تک دوسرے معنی یعنی ڈپارٹمنٹ کا تعلق ہے، تو وہ اس بنا پر ہے کہ بعض دفعہ مال بیت المال میں نہیں سماتا جیسے اراضی، کنویں، تیل، گیس، معدنیات کے پہاڑ، صدقات کے وہ مال جو مالداروں سے لے کر مستحقین پر خرچ کیے جاتے ہیں اور انہیں کسی مکان یا گھر میں جمع نہیں کیا جاتا، یوں بعض دفعہ بیت المال ڈپارٹمنٹ (محکمے) کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا جہاں مکان مراد لینا ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر بیہقی نے السنن میں، احمد نے المسند میں اور عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں لاحق بن حمید سے روایت کیا ہے کہ "ابن مسعود کو قضاء اور بیت المال کے لیے روانہ کیا گیا"۔ یہ ممکن نہیں کہ عمرؓ نے ان کو بیت المال کا چوکیدار بنا کر روانہ کیا ہو، بلکہ ان کو اس ڈپارٹمنٹ کا ذمہ دار بنا کر روانہ کیا تا کہ وہ مال کو اکھٹا کریں اور اسے خرچ کریں۔ ابن مبارک نے بھی الزھد میں حسن سے جو روایت کی ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ جب بصرہ کے سردار ابو موسیٰ الاشعریؓ کے ساتھ آ گئے اور عمرؓ سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لیے کھانا مقرر کریں، تو آپؓ نے اپنی بات چیت کے اختتام پر فرمایا "اے سرداروں کی جماعت میں نے تمہارے لیے بیت المال سے دو بکرے اور دو بوریاں (اناج) مقرر کر دی ہیں" یہاں بھی ڈپارٹمنٹ ہی مراد ہے۔

بیت المال کے آمدن اور اخراجات کے بارے میں اختیارات کا مالک خلیفہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود ہی جیشِ عسرت (غزوہ تبوک کے لشکر) کے لیے عثمانؓ کی جانب سے دیے جانے والے صدقے کو اپنے حجرے میں ہی وصول کیا۔ احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو حسن غریب کہا ہے، جب کہ حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، اور ذھبی نے بھی ان کی موافقت کی ہے کہ عبد الرحمان بن سمرہ نے بیان کیا "جب رسول

اللہ ﷺ نے جیشِ عسرت کو تیار کیا تو عثمانؓ ایک کپڑے میں ایک ہزار دینار رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آئے اور آپ ﷺ کے حجرے میں انڈھیل دیے۔ آپ ﷺ ان کو اپنے ہاتھ سے الٹتے اور فرماتے آج کے بعد ابنِ عفان جو بھی عمل کرے گا اس کو کوئی نقصان نہیں ہو گا" آپ ﷺ اس کو دہراتے رہے۔ آپ ﷺ کبھی کبھی تقسیم کی نگرانی خود بھی فرماتے۔ بخاری نے انسؓ سے روایت کیا ہے: "نبی ﷺ کے پاس بحرین سے مال آگیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "مال کو مسجد میں رکھو... آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے اور مال کے پاس آکر بیٹھ گئے اور جو بھی نظر آتا اس کو دینے لگے... اور اس وقت تک آپ ﷺ نہیں اٹھے جب تک ایک درھم بھی باقی تھا"۔ اسی طرح ابو بکرؓ نے بھی خود ہی بحرین سے آئے ہوئے مال کی تقسیم کی نگرانی کی۔ بخاری نے جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر میرے پاس بحرین سے مال آجائے تو میں تمہیں اتنا اتنا مال دے دوں گا، لیکن یہ مال رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں نہیں آیا۔ جوں ہی بحرین سے مال آگیا تو ابو بکرؓ نے اعلان کروایا کہ جس شخص کا رسول اللہ ﷺ پر کوئی قرض یا کوئی وعدہ ہو وہ ہمارے پاس آئے۔ تب میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے یوں فرمایا تھا، آپؐ نے میرے لیے تین حصے مقرر کر دیے..."۔ سفیان ثقفی کی وہ حدیث جو گذر چکی ہے، جس میں اس نے ایک تھیلا ملنے پر اس کے مالک کا پتہ لگانے کی کوشش کی، بالآخر عمرؓ نے اس کو بیت المال میں جمع کر دیا۔ شافعی اپنی کتاب الأم میں روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ایک سے زیادہ اہلِ علم نے ہمیں خبر دی ہے کہ جب عمرؓ بن خطاب کے پاس عراق سے مالِ غنیمت آگیا تو بیت المال کے انچارچ نے کہا کہ میں اس کو بیت المال میں جمع کروں گا تو آپ نے فرمایا: نہیں ربِ کعبہ کی قسم! میں اس مال کو بیت المال کے چھت کے نیچے پہنچنے سے پہلے ہی تقسیم کروں گا۔ پھر آپؓ نے اس کو مسجد میں ہی رکھنے کا حکم دیا، اس پر پردہ (دری یا چٹائی) ڈال دیا گیا۔ انصار اور مہاجرین کے آدمی اس کے چوکیداری کرنے لگے۔ جب اگلے دن صبح ہو گئی تو آپ کے ساتھ عباسؓ بن عبد المطلب اور عبد الرحمنؓ بن عوف تھے۔ آپؓ نے ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا یا ان میں سے کسی نے آپؓ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ جب لوگوں نے آپؓ کو دیکھا تو مال سے پردہ ہٹا دیا، آپؓ نے ایسا منظر دیکھا جو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ نے اس مال

میں سونا، یاقوت، زبرجد اور موتی دیکھے، جو جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر آپؓ رو پڑے۔ ان میں سے ایک نے کہا: اللہ کی قسم یہ رونے کا دن نہیں بلکہ یہ شکر اور خوشی کا دن ہے۔ فرمایا: اللہ کی قسم! جو آپ سمجھ رہے ہیں میں ایسا نہیں سوچ رہا ہوں، لیکن جب بھی یہ چیزیں کسی قوم کے پاس زیادہ ہو جاتی ہیں ان میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ پھر آپؓ قبلہ رو ہو گئے، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا اور کہنے لگا: اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میں مستدرج(ڈھیل دیا گیا شخص)بن جاؤں، میں آپ کو سنتا ہوں آپ (سبحانہ تعالیٰ)فرماتے ہیں: **سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ** (سورۃ القلم: 44)"ہم ان کو اس طرح ڈھیل دے کر رکھیں گے کہ وہ سمجھ ہی نہیں پائیں گے"۔ پھر فرمایا: سراقہ بن جعشم کہاں ہے؟ آپ کے پاس ایک پتلے بازوؤں، جن پر بال تھے، والے آدمی کو لایا گیا۔ آپؓ نے اس کو کسریٰ کے دونوں کنگن دیتے ہوئے فرمایا: ان دونوں کو پہنو، اس نے پہن لیے۔ آپؓ نے فرمایا: اللہ اکبر کہو۔ اس نے اللہ اکبر کہا۔ آپؓ نے فرمایا کہو اس اللہ کی تعریف کہ جس نے یہ کنگن کسریٰ بن ہرمز سے چھین کر بنی مدلج کے ایک دیہاتی سراقہ بن جعشم کو پہنا دیے۔ یہ کہتے ہوئے آپ لاٹھی سے ان کنگنوں کو الٹاتے رہے اور فرمایا: جس شخص نے یہ حوالہ کیا وہ امین ہے۔ یہ سن کر ایک آدمی نے کہا: میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ اللہ کے امین ہو، یہ لوگ آپ کو وہ امانت دے رہے ہیں جو آپ اللہ کو دے رہے ہو۔ اگر آپ کانپو گے (یعنی خیانت کرو گے) تو وہ بھی کریں گے۔ آپؓ نے فرمایا: تم نے سچ کہا، پھر ان کو الگ کیا"۔ دارمی میں عبد اللہ بن عمرو کی حدیث گذر چکی ہے کہ " عثمانؓ کے عہد میں ایک مولی(آزاد کردہ غلام)کا انتقال ہو گیا جس کا کوئی والی(وارث) نہیں تھا آپ نے اس کے مال کو بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دے دیا"۔ اسی طرح الاستذکار میں انس بن سیرین کی حدیث کہ "علیؓ اس وقت تک اموال کو تقسیم کرتے کہ بیت المال فارغ ہو جاتا اور اس میں پانی چھڑک کر (صفائی کر کے) بیٹھ جاتے"۔

کبھی کبھار رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ میں سے کسی کو مال کی تقسیم پر مامور فرماتے تھے، یا پھر اس کو بعض مالی معاملات کے لیے اپنا عامل مقرر کرتے تھے۔ بخاری میں عقبہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے یاد آگیا کہ ہمارے پاس سونے کا ٹکڑا ہے اور مجھے پسند نہیں تھا کہ اس کی تقسیم سے پہلے موت آئے

اس لئے اس کو تقسیم کرنے کا حکم دے کر آیا ہوں"۔ اور ابن شبہ کے نزدیک ابنِ شہاب کی حدیث جس کے اسناد کو حافظ ابن حجر عسقلانی، منذری اور ہیثمی نے حسن قرار دیا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ بلالؓ کے اس مخزن (اسٹور) میں داخل ہوئے جس میں صدقات کو رکھا جاتا تھا، وہاں کچھ کھجوریں رکھی ہوئیں تھی، دیکھا تو فرمایا: بلال! یہ کیسی کھجوریں ہیں؟ آپؓ نے کہا: یہ میں نے آپ کے کل کے لیے رکھا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس ثبوت ہے کہ کل صبح تک تم زندہ رہو گے؟ یہ چیزیں جہنم کی بھاپ (دھواں) ہیں۔ خرچ کیا کرو اور عرش کے مالک کی جانب سے کم ہونے کا خوف مت رکھو"۔ یہ بھی حدیث ہے کہ "رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عبد الرحمن بن عوفؓ اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ کے انچارج تھے، بلالؓ پھلوں کی زکوٰۃ کے نگران تھے اور محمیہ ابن جزء خمس کے ذمہ دار تھے"۔ خلیفہ نے کہا کہ " اس کے نفقات (اخراجات) کے نگران بلال تھے"۔ ابنِ حبان نے صحیح میں عبد اللہ بن لحی الھوزنی سے روایت کی ہے کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ کے موذن بلالؓ سے ملاقات کی اور کہا: اے بلالؓ! رسول اللہ ﷺ کا نفقہ کیسا تھا؟ انہوں نے کہا: آپ ﷺ کے پاس کچھ نہیں ہوتا تھا، میں ہی آپ کی بعثت سے لے کر آپ کی وفات تک ہر چیز کا بندوبست کرتا تھا۔ جب بھی آپ ﷺ کے پاس کوئی مسلمان آدمی آتا، کہ جو اچھے کپڑوں کے بغیر ہوتا تو آپ ﷺ مجھ سے کہتے اور میں جا کر کسی سے قرض لے کر اس کے لیے کوئی اوڑھنے کی (چادر یا جبہ وغیرہ) خریدتا اور اسے کو کھلاتا.."۔ مسلم نے رسول اللہ ﷺ کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) ابو رافع سے روایت کی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے اونٹ کا ایک بچھڑا لیا، جونہی آپ کے پاس صدقے کے اونٹ آگئے، آپ ﷺ نے ابو رافع کو حکم دیا کہ آدمی کو اس کا بچھڑا واپس کرو۔ ابو رافع واپس آکر کہنے لگے: اس کے تو بہترین رباعی (چار سال کے یا دانت نکلے ہوئے) ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہی دے دو، بہترین انسان تو وہ ہوتا ہے جو اچھے طریقے سے ادائیگی کرے"۔

ابن عباسؓ کی متفق علیہ حدیث میں ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کیا تو فرمایا... اگر وہ اس معاملے میں تمہاری اطاعت کریں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) کو فرض کیا

ہے جو ان کے مالداروں سے وصول کیا جائے گا اور ان کے فقراء کو دیا جائے گا۔ اگر وہ اس معاملے میں تمہاری اطاعت کریں تو خبر دار ان کے بہترین اموال سے دور رہنا، اور مظلوم کی دعا سے بچنا کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں"۔

مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے عمرؓ کو صدقات کے لیے بھیجا"۔

آپ ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے بھی آپ ﷺ ہی کی سیرت کی پیروی کی اور کسی شخص کو مالی معاملات میں اپنا نائب مقرر کرتے رہے۔ ابنِ اسحاق اور خلیفہ روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ابو بکرؓ نے ابوعبیدہ بن جراحؓ کو بیت المال کا نگران مقرر کیا، پھر ان کو شام کی طرف روانہ کیا"۔ معقیب کی زندگی کے حالات کو بیان کرتے ہوئے ذھبی نے کہا ہے "اور ابو بکرؓ اور عمرؓ نے ان کو بیت المال کا والی مقرر کیا"۔ البدایہ والنہایہ میں ابنِ کثیر نے عبد اللہ بن زبیرؓ سے روایت کیا ہے کہ: "رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن الارقم بن عبد یغوث کو اپنا کاتب (معاون تنفیذ) مقرر کیا، جو آپ ﷺ کی طرف سے بادشاہوں کو جواب دیتے تھے۔ ان کی امانت کا یہ حال تھا کہ آپ ﷺ ان کو بادشاہوں کو خطوط لکھنے کا حکم دیتے تھے اور جو کچھ وہ پڑھ کر سناتے اور اس پر رسول اللہ ﷺ مہر لگاتے کیونکہ آپ ﷺ کو ان کی امانت داری پر بھروسہ تھا۔ پھر وہ ابو بکرؓ کے لیے بھی لکھتے رہے، آپؓ نے ان کو بیت المال کی ذمہ داری بھی دی۔ عمرؓ بن خطاب نے بھی ان کو برقرار رکھا"۔ ابنِ سعد نے طبقات میں اور ابنِ حجر نے اصابہ میں روایت کیا ہے کہ "عمرؓ کا خزانچی ان کا آزاد کردہ غلام تھا"، جبکہ احمد نے اپنے مسند میں اور عبد الرزاق نے اپنی المنصف میں لاحق بن حمید سے روایت کیا ہے "اور ابن مسعودؓ کو قضاء اور بیت المال کے لیے روانہ کیا" یعنی کوفہ کی طرف۔ خلیفہ نے مالک بن انس سے زید بن اسلم کی روایت نقل کی ہے کہ "عمرؓ نے عبد اللہ بن ارقم کو بیت المال کا والی مقرر کیا"۔ ابن خزیمہ نے اپنے صحیح میں عروہ بن زبیرؓ سے روایت کی ہے کہ "عمرؓ کے عہد میں عبد الرحمن بن عبد القاری، عبد اللہ بن الارقم کے ساتھ بیت المال کے نگران تھے"۔ ابنِ حجر نے فتح الباری میں عبد اللہ بن مسعودؓ کے مناقب کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے: "آپ کو عمرؓ پھر عثمانؓ نے کوفہ میں بیت المال کا والی مقرر کیا"۔ جہشیاری نے الوزراء والکتاب میں ذکر کیا ہے کہ "عبد اللہ

بن ارقم ابن عبد یغوث رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے کاتبین میں سے ایک تھے، جن کے کندھوں پر بیت المال کی ذمہ داری تھی"، یعنی عثمانؓ کے عہد میں۔ حاکم نے مستدرک میں زبیر بن بکار سے روایت کی ہے کہ "عبد اللہ بن الارقم بن عبد یغوث عمرؓ کے زمانے میں اور عثمانؓ کے شروع کے دور میں بیت المال کے انچارج تھے، یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی بھی کچھ صحبت حاصل کی تھی"۔ ابن عبد البر نے الاستیعاب میں کہا ہے کی "زید بن ثابتؓ عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں بیت المال کے ذمہ دار تھے اور زید کا ایک غلام تھا جس کا نام وھیب تھا، عثمانؓ نے اس کو دیکھا کہ وہ بیت المال کے کاموں میں ان کی مدد کرتا رہتا ہے، تو فرمایا: یہ کون ہے؟ زید نے کہا: میرا غلام ہے۔ عثمانؓ نے فرمایا: میں اس کو دیکھتا رہتا ہوں کہ یہ مسلمانوں کی مدد کرتا ہے، اس کا حق بنتا ہے کہ میں اس کے لیے کچھ مقرر کروں۔ آپؓ نے اس کے لیے دو ہزار مقرر کیا، تو زید نے کہا اللہ کی قسم! غلام کے لیے دو ہزار مقرر نہ کریں۔ چنانچہ اس کے لیے ایک ہزار مقرر کیا"۔ صدفی نے اپنی کتاب 'معرفۃ علماء مصر و من دخلھا من اصحاب رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم' میں ذکر کرتے ہوئے کہا ہے "اس کے بعد ابو رافع علیؓ کی طرف چلے گئے تو انہوں نے ابو رافع کو کوفہ کے بیت المال کا والی مقرر کیا"۔ ابنِ عبد البر نے الاستیعاب میں کہا ہے "عبید اللہ بن ابو رافع علیؓ کے خازن اور کاتب تھے"۔ العینی نے عمدۃ القاری میں کہا ہے "عبد اللہ بن وھب السوائی کو علیؓ بہت پسند کرتے تھے، اس کا اکرام کرتے تھے، اس پر اعتماد کرتے تھے، اس کو کوفہ میں بیت المال کا ذمہ دار مقرر کیا تھا"۔ علیؓ نے زیاد کو بصرہ کا عامل مقرر کیا، جہشیاری نے کہا ہے کہ "جب زیاد بصرہ سے روانہ ہوا، تو اس کو خراج اور دیوان پر عامل مقرر کیا"۔

بیت المال کی تقسیم دو طرح کی ہو سکتی ہے:

1. آمدن (محصولات) کا ڈپارٹمنٹ:

یہ تین دیوانوں پر مشتمل ہوتا ہے:

دیوان فئی اور خراج: اس میں غنائم، خراج، اراضی، جزیہ، فئے اور ٹیکسز شامل ہیں۔

ملکیت عامہ کا دیوان: اس میں پٹرول، گیس، بجلی، معدنیات، سمندر، نہریں، چھوٹے سمندر، چشمے، جنگلات، چارہ گاہیں اور حمیٰ شامل ہیں۔

صدقات کا دیوان: اس میں نقدی، سامانِ تجارت، فصلوں، پھلوں، اونٹ، گائے اور بھیڑ بکریوں کی زکوۃ شامل ہے۔

2. نفقات (اخراجات) کا ڈپارٹمنٹ:

یہ آٹھ دیوانوں پر مشتمل ہوتا ہے:

دیوان دارالخلافہ
ریاستی مفادات (مصالح) کا دیوان
عطاء (بخشش) کا دیوان
جہاد کا دیوان
صدقات کے مصارف کا دیوان
ملکیت عامہ کے مصارف کا دیوان
ایمرجنسی کا دیوان
عام میزانیہ، محاسبہ اور نگرانی کا دیوان

میڈیا

دفعہ نمبر 103: میڈیاوہ محکمہ یاادارہ ہے جو ریاست کے نشرواشاعت کے احوال کا ذمہ دار ہو تا ہے تا کہ اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کرے اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں اپنا کردار ادا کرے۔ داخلی طور پر ایک مضبوط اور مربوط اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کے لیے خباثت کو باہر کرے اور پاک چیزوں کو اپنے اندر سموئے، اور خارجی طور پر حالتِ امن اور حالتِ جنگ میں اسلام کی عظمت، اس کے عدل اور اس کی عسکری قوت کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اسی طرح انسان کے بنائے ہوئے نظام کے فساد، اس کے ظلم اور اس کی عسکری کمزوریوں کو بے نقاب کرے۔

ریاست اور دعوت کے لیے میڈیا بہت اہمیت کا حامل ہے، یہ صرف لوگوں کے مفادات (مصالح) میں سے ایک مفاد نہیں جو مفادات کے محکمے کے تابع ہو بلکہ یہ بحیثیت ایک مستقل ادارہ کے براہِ راست خلیفہ کے ماتحت ہو تا ہے، یہ ریاست کے کسی بھی دوسرے مستقل ادارے کی طرح ایک ادارہ ہے۔

میڈیا پالیسی انتہائی زبردست اور منفرد ہو گی تا کہ اسلام کو دنیا کے سامنے بھرپور اور موثر انداز میں پیش کیا جاسکے۔ میڈیا ہی لوگوں کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے ان کے ضمیر کو جھنجھوڑے گا اور ان کو دعوتِ فکر دے گا، اسلامی علاقوں کو خلافت میں ضم کرنے کے عمل کو آسان بنائے گا، اس سے بڑھ کر یہ کہ میڈیا سے متعلق بہت سے امور کا ریاست سے براہ راست اور مضبوط تعلق ہے۔ کچھ خبریں ایسی ہوتی ہیں جن کی نشرواشاعت خلیفہ کی اجازت کے بغیر جائز نہیں، یعنی عسکری امور سے متعلق خبریں، یا اس سے ملتے جلتے جیسے افواج کی نقل وحرکت، فتح یا شکست کی خبر، عسکری صنعت کی خبریں۔ اس قسم کی خبروں کا تعلق براہ راست خلیفہ کے ساتھ ہو تا ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کونسی خبر شائع کرنی ہے اور کونسی نہیں۔ اس کی دلیل کتاب وسنت میں موجود ہے :

کتاب میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے **وَاِذَا جَآءَھُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ** (النساء: 83)''اور جب ان کے پاس امن یاخوف کی کوئی خبر آتی ہے تو اس کی اشاعت کر دیتے ہیں، اگر وہ اس کو رسول ﷺ یا اپنے میں سے اولوالامر کی طرف لوٹا دیتے، تو وہ لوگ اس کی تہہ تک پہنچتے جو ان میں سے اخذ کرتے ہیں''۔ اس آیت کا موضوع خبریں ہیں۔ جہاں تک سنت سے دلیل کا تعلق ہے تو یہ ابن عباسؓ کی وہ حدیث ہے جو فتح مکہ کے موقع کے حوالے سے ہے، جس کو حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے اور ذھبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے:''اور خبریں قریش سے پوشیدہ رہیں، ان کو رسول اللہ ﷺ کے متعلق کوئی خبر نہ مل سکی ان کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ ﷺ کیا کرنے والے ہیں''۔ اسی طرح ابو سلمہ کی مرسل حدیث جس کو ابنِ ابی شیبہ نے نقل کیا ہے جس میں ہے کہ ''پھر رسول اللہ ﷺ نے عائشہؓ سے فرمایا: مجھے تیار کر و اور کسی کو اس کی خبر نہ ہونے دو... آپ ﷺ نے راستوں کو پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا، یوں اہل مکہ اندھیرے میں رہے ان کو کوئی خبر نہ مل سکی''۔ اور کعبؓ کی حدیث جو غزوۂ عسرت کے بارے میں ہے، اور متفق علیہ حدیث ہے:''رسول اللہ ﷺ جب بھی کسی غزوہ کا ارادہ کرتے تو دوسروں سے اس کو پوشیدہ رکھتے، یہاں تک اس غزوے کو بھی جو آپ ﷺ نے انتہائی شدید گرمی میں لڑا، جس میں آپ ﷺ نے دور کا سفر کیا، بڑے دشمن سے مقابلہ کیا اور کامیابی حاصل کی، مسلمانوں کو اس کا اندازہ ہو چکا تھا اس لیے جس طرح مناسب سمجھا ان کو بتا دیا''۔ اس طرح بخاری میں انسؓ کی حدیث:''رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے زیدؓ، جعفرؓ اور ابن رواحہؓ کی خبر آنے سے پہلے ہی ان کے بارے میں تعزیت کرتے ہوئے فرمایا: زیدؓ نے جھنڈا اٹھایا وہ شہید ہو گئے، پھر جعفرؓ نے جھنڈا لیا اور وہ بھی شہید ہو گئے، پھر ابن رواحہؓ نے جھنڈا لیا اور وہ بھی شہید ہوئے، یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہاں تک کہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (خالد بن ولید) نے جھنڈا اسنبھالا اور اللہ نے فتح نصیب فرمائی''۔

خلفائے راشدینؓ نے بھی اس حکم پر عمل کیا چنانچہ ابن مبارک نے الجھاد میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت مسلم کی شرط پر صحیح ہے، اور ذھبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے، کہ زید بن اسلم نے اپنے باپ سے اور انہوں نے عمر بن خطابؓ سے نقل کیا ہے کہ: "ان کو خبر پہنچی کی ابو عبیدہؓ شام میں محصور ہو گئے، اور لوگ ان پر ٹوٹ پڑے۔ عمرؓ نے ان کو لکھا: السلام علیکم، اما بعد، جب بھی کسی مومن بندے پر کوئی سختی آتی ہے، اس کے بعد اللہ اس کے لیے آسانی پیدا فرماتا ہے، ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب نہیں آتی **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْاۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ** (آل عمران: 200) "اے ایمان والو صبر کرو، مقابلے کے وقت ڈٹ جاؤ اور مستعد رہو اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم کامیاب ہو سکو"۔ انہوں نے کہا کہ اس کے جواب میں ابو عبیدہؓ نے عمرؓ کو لکھا: السلام علیکم اما بعد، اللہ کا ارشاد ہے **اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ** (الحدید 20) "جان لو کہ دنیا کی زندگی صرف کھیل تماشا، زینت اور آپس میں فخر اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا ہے"۔ راوی کہتا ہے کہ عمرؓ اُن کا خط لے کر نکلے اور منبر پر جا کر بیٹھ گئے، پھر مدینہ والوں کے سامنے وہی خط پڑھا اور فرمایا: اے مدینہ والو! ابو عبیدہؓ نے اس خط میں تمہارے طرف ہی اشارہ کیا ہے کہ جہاد کے لیے اپنا شوق دکھاؤ"۔

خلیفہ یا اس کے نائب اور کافر ممالک کے نمائندوں کے درمیان ہونے والے مذاکرات، ملاقاتیں اور مناظرات کی خبروں کا حکم بھی عسکری خبروں کا ہے، ان مذاکرات کی مثالوں میں سے ایک وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ اور قریش کے نمائندوں کے درمیاں حدیبیہ کے مقام پر ہوئے، جو آخر بعض نکات پر صلح کی شکل میں اختتام کو پہنچے۔ مناظروں میں سے وہ جو نجران کے وفد کے ساتھ ہوا اور مباہلہ کی دعوت پر ختم ہوا۔ اسی طرح ثابت بن قیس اور حسان کا رسول اللہ ﷺ کے حکم سے بنو تمیم کے وفد کے ساتھ مناظرہ وغیرہ، یہ سب کچھ اعلانیہ تھا اس میں سے کوئی خفیہ نہیں تھا۔

دوسری قسم کی خبریں جو براہِ راست تو ریاست سے تعلق نہیں رکھتی ہیں نہ اس کے لیے خلیفہ سے رائے لینا ضروری ہوتا ہے جیسے روزانہ کی خبریں، سیاسی، ثقافتی اور علمی پروگرامز، عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات لیکن بعض دفعہ ان کا تعلق زندگی کے بارے میں نقطہ نظر کے ساتھ ہوتا ہے یا بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے ریاست کی نقطہ نظر کے ساتھ، اسلئے اس قسم کی خبروں کی نگرانی ریاست پہلی قسم کی خبروں سے مختلف انداز سے کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میڈیا کے ڈپارٹمنٹ کے دو مرکزی دفاتر (سرکل) ہوتے ہیں:

اول: اِس دفتر کے کام کا تعلق ریاست سے متعلق اہم خبروں، جیسے عسکری امور، حربی، صنعت یا بین الاقوامی تعلقات سے ہے۔

اِس آفس کا کام اس قسم کی خبروں کی براہ راست نگرانی کرنا ہے اس لیے سرکاری یا غیر سرکاری میڈیا میں کوئی خبر اس ادارے کی اجازت کے بعد ہی نشر کی جاسکے گی۔

دوسرا: یہ دفتر دیگر خبروں کے ساتھ خاص ہے، اس لیے اس کی طرف سے نگرانی بِلواسطہ ہوتی ہے، اس لیے ریاستی یا غیر ریاستی میڈیا کے لیے ایسی خبروں کے لیے اس ادارے سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

دفعہ نمبر 104: نشر و اشاعت کے ایسے ادارے (میڈیا) کے لیے لائسنس (این او سی) کی کوئی ضرورت نہیں، جس کا مالک ریاست کا شہری ہو، بلکہ صرف متعلقہ ریاستی ادارے کے آفس کو خبر کرنا اور اس کے علم میں لانا کافی ہے کہ کس قسم میڈیا بنایا جارہا ہے۔ ان ذرائع ابلاغ کے مالکان اور لکھنے والے (صحافی) اپنی ہر رپورٹ اور مواد کے بارے میں ذمہ دار ہوں گے، کسی قسم کے خلافِ شرع مواد پر ان کا محاسبہ ہوگا جیسا کہ ریاست کے کسی بھی شہری کا ہوتا ہے۔

ذرائع ابلاغ کے لیے کسی لائسنس (این او سی) کی ضرورت نہیں، بلکہ اسلامی ریاست کا ہر شہری کوئی بھی ذریعہ ابلاغ قائم کر سکتا ہے: خواہ پرنٹ میڈیا ہو، الیکٹرانک ہو (پڑھا جانے والا، سنا جانے والا یا دیکھا جانے والا) صرف اطلاعات و نشریات کے ادارے کو خبر کرنا اور اس کے علم میں لانا کافی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا کہ صرف ریاست سے متعلق اہم خبروں کو نشر کرنے سے قبل اجازت ضروری ہے، جب کہ دوسری خبریں نشر کرنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔

بہر حال میڈیا کا مالک اپنے میڈیا میں نشر کی جانے والی ہر خبر اور ہر قسم کے مواد کا ذمہ دار ہے اور کسی بھی ریاستی شہری کی طرح اس کا بھی شریعت کی کسی قسم کی خلاف ورزی پر محاسبہ ہو گا۔

مجلسِ امت (شوریٰ اور محاسبہ)

دفعہ نمبر 105: وہ اشخاص (افراد) جو رائے میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور خلیفہ ان کی طرف رجوع کرتا ہے ان کو مجلسِ امت کہا جاتا ہے، وہ اشخاص جو اہل ولایہ (صوبے کے لوگوں) کی نمائندگی کرتے ہیں ان کو مجالسِ ولایات (مجلسِ ولایہ کی جمع) کہا جاتا ہے، غیر مسلموں کے لیے حکمرانوں کے ظلم یا احکامِ شرعیہ کی غلط تنفیذ کی شکایت کی غرض سے مجلسِ امت میں شامل ہونا جائز ہے۔

مجلسِ امت وہ مجلس ہے جو ان افراد سے بنتی ہے جو رائے میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں، خلیفہ بعض امور میں مشاورت کے لیے ان کی طرف رجوع کرتا ہے، یہ لوگ حکمرانوں کا محاسبہ کرنے میں امت کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے ماخوذ ہے۔ آپ ﷺ مہاجرین اور انصار کے بعض افراد سے مشاورت کرتے رہتے تھے، جو اپنی قوم کے نمائندے تھے، آپ ﷺ نے اپنے صحابہ میں سے کچھ

افراد کو شوریٰ کے لیے مخصوص کر رکھا تھا، چنانچہ آپ ﷺ رائے لینے کے لیے اکثر امور میں دوسروں سے زیادہ ان کی طرف ہی رجوع کیا کرتے تھے، ان میں ابو بکرؓ، عمرؓ، حمزہؓ، علیؓ، سلمان فارسیؓ اور حذیفہؓ شامل تھے۔

پھر مہاجرین اور انصار میں سے بھی آپ ﷺ خاص طور پر ابو بکرؓ اور عمرؓ سے، پیش آنے والے اہم معاملات میں رائے لیتے تھے۔ ابو بکرؓ کے عہد میں علما اور فتویٰ دینے والے لوگ اہلِ شوریٰ تھے، ابنِ سعد نے قاسم سے روایت کیا ہے کہ ''ابو بکر صدیقؓ کو کوئی ایسا اہم معاملہ درپیش ہوتا جس میں اہل رائے اور اہل فقہ سے مشورہ کی ضرورت ہوتی تو مہاجرین اور انصار کے کچھ آدمیوں کو بلاتے ان میں عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبد الرحمٰن بن عوفؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ شامل تھے اور یہ سب ابو بکرؓ کی خلافت میں فتویٰ دیا کرتے تھے کیونکہ لوگ فتویٰ کے لیے انہی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ ابو بکرؓ اسی پر قائم رہے پھر جب عمر خلیفہ بنے وہ بھی انہی لوگوں کو بلاتے رہے''۔ اسی طرح یہ دلائل بھی ہیں کہ حکمرانوں کا محاسبہ کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، مسلمانوں نے ہمیشہ یہ ذمہ داری ادا کی جیسا کہ خلفائے راشدینؓ کے عہد میں ہوتا تھا۔ جس طرح شوریٰ کے لیے اپنا نائب بنانا مسلمانوں کا حق ہے اسی طرح محاسبہ کے لیے بھی اپنا نائب بنانا بھی ان کا حق ہے، یہ سب اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایک خاص مجلس بنانا مباح ہے جو حکمرانوں کے احتساب میں امت کی نمائندہ ہو اور شوریٰ میں بھی نمائندہ ہو جو کہ قرآن وسنت کے نص سے ثابت ہے، اس کو مجلسِ امت اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ احتساب اور شوریٰ دونوں میں امت کی نمائندہ ہوتی ہے۔

اس مجلس میں ریاست کے غیر مسلم شہری بھی حکمرانوں کی طرف سے ان پر کسی ظلم وزیادتی، اسلام کے غلط نفاذ یا ان کو خدمات وغیرہ مہیانہ کرنے کے خلاف شکایت کی غرض سے ممبر بن سکتے ہیں۔

دفعہ نمبر 106: مجلس ولایہ کے اراکین کو ایک معین ولایہ (صوبہ) کے لوگوں کی جانب سے براہِ راست انتخاب کے ذریعے سے منتخب کیا جائے گا اور مجلس ولایات (صوبوں) کے اراکین کی تعداد ریاست کی ہر

ولایہ کی آبادی (افراد) کی تعداد کی نسبت سے ہو گی۔ مجلسِ امت کے اراکین کو مجلس ولایات کے براہِ راست انتخابات کے ذریعے منتخب کیا جائے گا۔ مجلس امت کی ابتدا اور انتہا کی مدت وہی ہو گی جو مجلس ولایہ کی ہے۔

مجلسِ امت کے اراکین کو انتخابات کے ذریعے منتخب کیا جائے گا، ان کا تعین نہیں ہو گا۔ یہ اس لیے کہ وہ رائے میں لوگوں کے وکیل ہوتے ہیں اور وکیل کا انتخاب صرف مؤکل ہی کر سکتا ہے، وکیل کو موکل پر مسلط ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی کہ مجلس امت کے اراکین رائے میں افراد اور معاشرے کے نمائندے ہوتے ہیں، ایک بڑے علاقے اور قوم میں نمائندوں کا علم اس وقت ہی ہوتا ہے جب وہاں کے رہنے والے کسی کو اپنا نمائندہ چنیں۔ اور یہ بات بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رائے لینے کے لیے طاقت، صلاحیت اور شخصیت کی بنیاد پر لوگوں کا تعین نہیں کیا، بلکہ ان کے نقباء (نقیب کی جمع) ہونے یعنی گروہوں کے نمائندہ ہونے کی بنیاد پر ان کو منتخب کیا، چنانچہ بیعتِ عقبہ ثانیہ میں نقباء منتخب کرنے کا کام ان لوگوں پر چھوڑا جنہوں نے بیعت کی تھی اور ان سے فرمایا **«أَخْرِجُوا إِلَيَّ مِنْكُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيباً يَكُونونَ على قَوْمِهِمْ»** ''اپنے میں سے اپنی قوم کے بارہ نقیب میرے سامنے لاؤ'' اس کو ابنِ ہشام نے السیرۃ میں کعب بن مالک کے حوالے سے نقل کیا ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ یہ استنباط کیا گیا ہے کہ مجلس امت کے اراکین رائے کے وکیل ہوتے ہیں۔ جس علت (سبب) کے لیے مجلس امت کا وجود ہے وہ بھی رائے اور احتساب میں افراد اور جماعتوں کی نمائندگی کرنا ہے۔ غیر معروف لوگوں کے اندر یہ علت اس وقت ہی محقق ہو پائے گی جب وہ عام انتخابات کے ذریعے منتخب ہوں گے۔ اس پوری بحث سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ مجلس امت کے اراکین کا انتخاب الیکشن کے ذریعے ہو گا، ان کو مقرر یا تعینات نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک انتخاب کی کیفیت کا تعلق ہے تو وہ مندرجہ ذیل طریقے سے ہو گا:

1) دفعہ 56 کے مطابق ولایہ کے لیے مجلس اس لیے منتخب کی جائے گی تا کہ وہ دو مقاصد کے لیے اہلِ ولایہ کی نمائندگی کرے:

اول: صوبے کی زمینی حقائق اور ضروریات سے متعلق اہم معلومات والی کو مہیا کرنا، یہ اس لیے کہ اپنے کام کی انجام دہی میں اس کے لیے آسانی ہو اور اہل ولایہ کو اطمینان اور امن کی زندگی کی مکمل گارنٹی دی جا سکے، ان کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور خدمات مہیا کرنا آسان ہو۔

دوم: تا کہ ولایہ کے لوگ والی کی حکومت کے بارے میں رضامندی یا شکایت کا اظہار کر سکیں کیونکہ مجلس ولایہ کی اکثریت کی طرف سے شکایت کی صورت میں والی کی برطرفی لازمی ہو جاتی ہے۔ یعنی مجلس ولایہ کی حیثیت ایک ایسے ادارے کی ہے جو صوبے کے حقیقی حالات کو سمجھنے، اس کے بارے میں شکایت یا رضامندی کے اظہار میں والی کی مدد کرتی ہے۔ اس سے اس کا کام اور بہتر ہو جاتا ہے، اس مجلس کے اس سے زیادہ کوئی اختیارات نہیں ہوتے ہیں، برخلاف مجلس امت کے جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

2) دفعہ 105 کے مطابق جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک مجلسِ امت ہو گی (شوریٰ اور احتساب کے لیے)۔ یہ منتخب مجلس ہو گی جو امت کی نمائندہ ہو گی، اس کے اختیارات کا ذکر آگے اپنی جگہ پر آئے گا۔

3) ایک انتخابات ولایات کی مجلس کے اراکین کے لیے ہوں گے جبکہ دوسرے انتخابات مجلس امت کے اراکین کے چناؤ کے لیے ہوں گے۔

4) انتخابی عمل کو آسان بنانے اور رعایا کو بار بار انتخابات کی مشغولیت سے بچانے کے لیے پہلے مجلس ولایہ کا انتخاب رعایا کی جانب سے ہو گا پھر مجلس ولایہ میں کامیاب ہونے والے جمع ہو کر اپنے میں سے مجلسِ امت کے اراکین منتخب کریں گے، یعنی مجلس ولایات کا انتخاب براہ راست امت کی جانب سے ہو گا، جبکہ مجلس امت کا

انتخاب مجلس ولایہ کی جانب سے ہو گا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ مجلس امت کی ابتدائی اور انتہائی مدت وہی ہو گی جو مجلس ولایات کی ہوتی ہے۔

5) مجلس ولایہ میں سے جو شخص مجلس امت کا رکن منتخب ہو جائے اس کی جگہ وہ امیدوار مجلس ولایہ کا رکن بن جائے گا جو مجلس ولایہ کے انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ لے کر ہار گیا تھا(جیت کے قریب تھا)، اگر ایسے کئی لوگ ہوئے تو ان کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے گی۔

6) اہلِ ذمہ (ریاستِ خلافت کے غیر مسلم شہری) بھی مجلس ولایات کے لیے اپنے نمائندے منتخب کریں گے، پھر ان کے یہ نمائندے مجلسِ امت کے لیے اپنے نمائندے منتخب کریں گے۔ یہ سب کچھ ریاست کے اندر مجلس ولایات اور مجلس امت کے انتخابات کے ساتھ ہی ہو گا۔

یوں بیان کردہ تمام امور قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے انجام دیئے جائیں گے، مجلس ولایات اور مجلس امت کے انتخابات اس قانون کے مطابق ہی ہوں گے۔

دفعہ نمبر107: ریاست کے ہر اس شہری کو جو بالغ اور عاقل ہو، مرد ہو یا عورت، مسلم ہو یا غیر مسلم، مجلس امت اور مجلس ولایہ کا رُکن بننے کا حق حاصل ہے، مگر غیر مسلموں کی رکنیت حکمرانوں کے ظلم یا اسلام کو برے طریقے سے نافذ کرنے کی شکایت کے اظہار تک محدود ہو گی۔

ہر مسلمان کو جو ریاست کا شہری ہو اور بالغ و عاقل ہو، مجلس امت کا رُکن بننے کا حق حاصل ہے۔ اس کو مجلس امت کے ارکان منتخب کرنے کا بھی حق حاصل ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ یہ اس لیے کہ مجلس امت کا تعلق حکمرانی سے نہیں، یوں یہ اس حدیث کے تحت نہیں جس میں عورت کی حکمرانی سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا تعلق شوریٰ اور محاسبہ سے ہے جو کہ مرد کی طرح عورت کا بھی حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تیرہویں سال (اس سال جس میں آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی) پچھتر (75) مسلمان حاضر ہوئے، جن

میں تہتر (73) مرد اور دو خواتین تھیں اور ان سب نے بیعتِ عقبہ ثانیہ میں آپ ﷺ کی بیعت کی۔ یہ جنگ اور قتال کی بیعت ہونے کی وجہ سے ایک سیاسی بیعت تھی، جب یہ لوگ بیعت سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سب سے فرمایا: ''اپنے میں سے اپنی قوم کے لیے بارہ نقیب میرے سامنے لاؤ''۔ یہ ایک لمبی حدیث ہے جس کو احمد نے کعب بن مالکؓ کے حوالے سے نقل کی ہے، یہ حکم ان سب کے لیے تھا کہ سب میں سے کچھ افراد کو منتخب کریں۔ اس میں مردوں کی تخصیص نہیں کی گئی یا عورتوں کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا، نہ منتخب کرنے والوں میں نہ ہی منتخب کیے جانے والوں میں۔ اس لیے مطلق اس وقت تک مطلق ہی رہے گا جب تک کہ اس کو مقید کرنے کی کوئی دلیل موجود نہ ہو، جیسا کہ عام اس وقت تک عام ہی رہتا ہے جب تک تخصیص کی کوئی دلیل نہ ہو، یہاں کلام مطلق اور عام ہے، تخصیص یا تقید کی کوئی دلیل وارد نہیں ہوئی ہے۔ یوں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دو خواتین کو بھی نقباء منتخب کرنے کا حکم دیا اور ان کو مسلمانوں میں سے نقیب منتخب ہونے کا حق بھی دے دیا۔

جس دن رسول اللہ ﷺ لوگوں سے بیعت لینے کے لیے بیٹھے، تو ابو بکرؓ اور عمرؓ بھی آپ ﷺ کے پاس بیٹھ گئے۔ مردوں اور عورتوں نے آپ ﷺ کی بیعت کی۔ یہ بیعت صرف اور صرف حکمرانی کی بیعت تھی اسلام کی نہیں، کیونکہ وہ خواتین سب کے سب مسلمان تھیں، حدیبیہ میں بھی بیعتِ رضوان کے بعد خواتین نے آپ ﷺ کو بیعت دی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **يَآ اَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّـٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٝ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِىْ مَعْرُوْفٍ ۙ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّـٰهَ ۖ اِنَّ اللّـٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** ''اے نبی! جب مسلمان عورتیں آپ کے پاس آئیں کہ اِن اِن باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ بہتان کی اولاد لائیں گی جس کو وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (نطفہ شوہر سے جنی ہوئی کا دعویٰ کرکے) بنالیں اور معروف (مشروع) باتوں میں وہ آپ ﷺ کے

خلاف نہ کریں گی تو آپ ﷺ ان کی بیعت لے لیا کیجئے اوران کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کیجئے۔ بے شک اللہ غفور ور حیم ہے"(الممتحنہ 12)۔

یہ بھی حکمرانی کی بیعت تھی کیونکہ قرآن خود کہتاہے کہ وہ خواتین مومن تھیں اور بیعت اس بات پر تھی کہ وہ شرعی کاموں میں نافرمانی نہیں کریں گی۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ عورت کورائے میں اپناوکیل مقرر کرنے کا حق ہے وہ بھی رائے میں کسی کی وکیل بن سکتی ہے، کیونکہ اس کو اپنی رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے، اس میں وہ کسی کو اپناوکیل بناسکتی ہے، وکالت میں مذکر ہونے کی کوئی شرط بھی نہیں، اس لیے وہ کسی اور کی وکیل بھی بن سکتی ہے۔

یہ بھی ثابت ہے کہ سیدنا عمرؓ کو جب کوئی ایسامسئلہ درپیش ہوتا جس میں مسلمانوں سے رائے لینے کی ضرورت ہوتی، خواہ اس مسئلے کا تعلق شرعی احکامات سے ہوتا یااس کا تعلق حکمرانی سے ہوتا یاپھر کسی بھی ریاستی معاملے سے متعلق، تو آپؓ مسلمانوں کو مسجد میں بلاتے تو مردوں اور عورتوں دونوں کو بلاتے۔ آپؓ سب سے رائے لیتے، چنانچہ جب ایک عورت نے مہر کی حد مقرر کرنے کے حوالے سے آپؓ کو جواب دیا، تو آپؓ نے اپنی رائے سے رجوع کرلیا۔

جس طرح مسلمانوں کو مجلسِ امت میں نمائندگی کا حق ہے اسی طرح غیر مسلموں کو بھی مجلسِ امت میں نمائندگی کا حق ہے، کہ وہ بھی اپنے منتخب کرنے والوں کے نائب ہوں گے تاکہ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے رائے دیں اور اپنے خلاف حکمران کے ظلم یا اسلام کے برے طریقے سے نفاذ کی شکایت کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: [فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ]"اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھ لو"(النحل: 43)۔ یہاں اہلِ ذکر سے مراد اہلِ کتاب ہیں اور اہلِ کتاب کفار ہیں، پھر بھی اللہ تعالی نے ان سے پوچھنے کا حکم دیاہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اپنے معاملات میں اظہار رائے کا حق حاصل ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ غیر مسلموں کو احکام شرعیہ کے بارے میں رائے دینے کا کوئی حق نہیں کیونکہ اسلامی شریعت اسلامی عقیدہ سے نکلتی ہے۔ یہ شرعی احکامات ادِلّہ تفصیلیہ سے مستنبط ہیں اور یہ ایک متعین نقطۂ نظر کی بنیاد پر انسانی مسائل کو حل کرتے ہیں، جس کو اسلامی عقیدہ متعین کرتا ہے۔ جبکہ غیر مسلم کا عقیدہ اسلام سے متصادم ہے، زندگی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر اسلام کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے، اس لیے احکامِ شرعیہ کے بارے میں ان سے رائے نہیں لی جائے گی۔

غیر مسلم کو خلیفہ کے انتخاب کا حق بھی نہیں نہ خلافت کے امیدواروں کی نامزدگی کا حق ہے کیونکہ حکمرانی میں ان کا کوئی حق نہیں۔ مجلسِ امت کے اختیارات کے حوالے سے باقی اشیاء میں وہ بالکل مسلمانوں کی طرح ہے اور اپنی رائے کا اظہار کرسکتا ہے۔

دفعہ نمبر 108: شوریٰ اور مشورہ مطلقاً رائے لینا ہے۔ یہ تشریع (قانون سازی)، تعریف، فکری امور جیسے حقائق کے انکشاف، فنی اور علمی امور میں لازمی نہیں۔ جب خلیفہ عملی امور میں سے کسی امر میں مشورہ طلب کرے تب اس پر عمل لازم ہو جاتا ہے جب وہ اعمال تحقیق اور باریک بینی کے محتاج نہ ہوں۔

الشوریٰ کا لفظ شَاوَرَ کا مصدر ہے، یہ مستشار (جس سے مشورہ لیا جاتا ہے) سے رائے طلب کرنا ہے۔ استشار کا مطلب ہے مشورہ طلب کرنا۔ الشوریٰ اور المشُورة کے ایک ہی معنی میں ہیں۔ اسی طرح مشُورہ اسی معنی میں ہے۔ عربی کی لغت لسانُ العرب میں ہے کہ: کہا جاتا ہے کہ فلانٌ جيد المشُورة والـمَشْورة ' ہے، دونوں لغتوں کے ساتھ۔ فراء نے کہا ہے کہ: المشُورة کی اصل مشْورہ ہے، پھر خفیف ہونے کی وجہ سے اس کو مَشُورة بنایا گیا۔ اللیث نے کہا ہے کہ: الـمَشْورَة مَفْعَلَة (کے وزن پر) الاشارہ سے مشتق ہے، کہا جاتا ہے کہ: مَشُورہ شوریٰ اور المشُورہ ہے اور اسی طرح مشْورہ ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ شاورته في الأمر واستشرته 'ان دونوں کا ایک ہی معنی ہے کہ میں نے اس سے مشورہ لیا۔ مختار

الصحاح میں ہے کہ:المشُورۃ،الشوریٰ ہے اوراسی طرح المشُورۃ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ' شاورہ في الأمر واستشارہ کے ایک ہی معنی میں ہیں کہ میں نے اس سے رائے طلب کی۔

شوریٰ کی شرعی ہونے کی اصل اللہ تعالی کی طرف سے اپنے نبی ﷺ کو مومنین سے مشورہ لینے کا حکم ہے، ارشاد ہے **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ** ''اوران سے باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے''(ال عمران:159)۔ اس امر میں طلب کا فائدہ ہے۔ پھراس امر کے ساتھ والے قرائن(indications) جو کہ نصوص میں موجود ہیں،سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طلب ندب(مندوب یعنی جس کے کرنے کا ثواب ہو اور اسے چھوڑنے کا گناہ نہ ہو)کے لیے ہے،وہ نصوص یہ ہیں:

1) اللہ تعالی نے مومنین کی ان کے شوریٰ کی وجہ سے تعریف کرکے شوریٰ کے عمل کی بھی مدح کی ہے، ارشاد ہے **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** ''اور ان کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے''(الشوریٰ:38)۔

2) رسول اللہ ﷺ کی جانب سے مختلف امور میں صحابہؓ سے کثرت سے مشورہ لینا اس کے اہتمام،اہمیت اوراس کی فضیلت کی دلیل ہے۔ آپ ﷺ اس کے ذریعے مسلمانوں کواس کی پابندی کی تعلیم بھی دیتے تھے،چنانچہ ترمذی نے ابوہریرہؓ کا یہ قول نقل کیاہے کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کرکسی کواپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتے نہیں دیکھاہے''۔

3) اللہ تعالی کی طرف سے اپنے رسول ﷺ کو مومنین سے مشورہ لینے کے حکم کے ساتھ ساتھ ان کے لیے نرمی،معافی اور استغفار کا حکم دینا،جیسا کہ ارشاد ہے **فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ** ''اللہ ہی کی رحمت کے سبب آپ ﷺ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند

خو اور سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، سو آپ ان کو معاف کر دیجیے اور ان کے لیے استغفار کیجیے اور خاص باتوں میں ان سے مشورہ لیتے رہا کیجیے" (آل عمران:159)۔

یوں شوریٰ کے حکم میں اصل اس کا مندوب ہونا ہے۔

لیکن عملی امور اور ان اعمال میں جن میں باریک بینی اور تحقیق کی ضرورت نہیں، ان معاملات میں خلیفہ کی جانب سے مجلس امت سے مشورہ لینے کی صورت میں اکثریت کی رائے کی پابندی ضروری ہے، جیسے ریاست کے داخلی امور، مثلاً حکمرانی، تعلیم، صحت، تجارت، صنعت، زراعت وغیرہ۔ اسی طرح خلیفہ کی طرف سے ایسے امور کی انجام دہی کے حوالے سے اس کا محاسبہ کرنے میں بھی وہ اکثریت کی رائے کا پابند ہے۔ یہ اس بات سے اخذ کیا گیا ہے کہ اُحد کے معرکے میں رسول اللہ ﷺ اکثریت کی رائے مان کر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے مدینہ سے باہر نکلے حالانکہ خود رسول اللہ ﷺ اور کبار صحابہؓ کی رائے تھی کہ باہر نکلے بغیر مدینہ کے اندر رہتے ہوئے مشرکین کا مقابلہ کیا جائے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے بھی یہ بات اخذ ہوتی ہے جو آپ ﷺ نے ابو بکرؓ اور عمرؓ سے فرمائی کہ **«لَوِ اجْتَمَعْتُمَا فِي مَشُورَةٍ مَا خَالَفْتُكُمَا»** "جہاں تم دونوں کا ایک ہی مشورہ ہو تو میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا" اس کو احمد نے حسن اسناد سے عبد الرحمن بن غنم الاشعری کے حوالے سے روایت کیا ہے۔

اگر خلیفہ ان امور کے علاوہ کسی معاملے میں مجلس امت سے مشورہ لے جیسے فنی امور یا ایسے فکری امور جس میں تحقیق اور باریک بینی کی ضرورت ہو یا جنگی امور اور چال کا معاملہ ہو تو اکثریت کی رائے کو اختیار کرنا خلیفہ کے لیے لازم نہیں بلکہ خلیفہ کی رائے ہی حتمی ہو گی۔ اسے اس بات سے اخذ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معرکہ بدر کی جگہ کی تعین کے حوالے سے حباب بن منذرؓ کی رائے کو اختیار کیا اور صحابہؓ کو نظر انداز کیا بلکہ رائے کے لیے ان کی طرف رجوع ہی نہ کیا۔ اسے اس بات سے بھی اخذ کیا گیا ہے کہ ابو بکرؓ نے زمامِ

خلافت سنبھالتے ہی مرتدین اور منکرین زکوٰۃ کے خلاف جنگ نہ کرنے کے حوالے سے جمہور صحابہ کی رائے کو مسترد کر دیا۔

یہی حال مذکورہ امور میں سے اُن امور پر، مجلسِ امت کی جانب سے، خلیفہ کے احتساب کا ہے کہ جن پر بالفعل عمل ہو چکا ہو اور ان کو نافذ کیا جا چکا ہو، یعنی اس میں بھی اکثریت کی رائے پر عمل کرنا خلیفہ پر لازم نہیں۔

قانون سازی میں بھی لوگوں کی رائے نہیں لی جائے گی، کیونکہ شرع (قانون) اللہ کی طرف سے ہے لوگوں کی طرف سے نہیں، شوریٰ اللہ کی طرف سے صرف مباح کردہ امور میں ہے اور جو چیز مباح نہیں اس میں کسی کو کوئی اختیار نہیں، بلکہ وہ جیسے وارد ہوئی ہے اسے ایسے ہی لیا جائے گا، خواہ وہ واجب ہے، مندوب ہے، مکروہ ہے یا حرام۔ شوریٰ صرف مباح اعمال میں ہے۔

دفعہ نمبر 109: شوریٰ صرف مسلمانوں کا حق ہے غیر مسلموں کا شوری میں کوئی حق نہیں، تاہم رائے کے اظہار کا حق رعایا کے تمام افراد کو حاصل ہے خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔

شوریٰ کے صرف مسلمانوں کے حق ہونے کی دلیل یہ دو آیتیں ہیں **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ** "اور خاص امور میں ان کی رائے لیتے رہیے" (آل عمران:159)۔ اور دوسری آیت **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** "اور ان کا ہر کام مشورے سے ہوتا ہے" (الشوری:38)۔ یہ دونوں مسلمانوں کے لیے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد **فَاسْاَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ** "اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو اہلِ کتاب سے معلوم کرلو" (النحل:43)۔ یہ غیر مسلموں کے بارے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن باتوں کے بارے میں اہلِ کتاب سے پوچھنے حکم دیا ہے جو ہمیں معلوم نہیں۔ یہ اہلِ کتاب سے رائے لینے کے جواز کی دلیل ہے، جب ان سے رائے لینا جائز ہے تو ان کا مجلسِ شوریٰ کے رکن بننا بھی جائز ہے۔

دفعہ نمبر110: وہ مسائل جن میں خلیفہ کی جانب سے مشورہ طلب کیا جائے اور اس مشورے پر عمل بھی لازمی ہو، توان مسائل میں غلط اور صحیح سے قطع نظر اکثریت کی رائے کو اختیار کیا جائے گا، جب کہ وہ مسائل جو شوریٰ کے ماتحت تو ہیں لیکن ان میں مشورے کو اختیار کرنا لازمی نہیں ان میں اکثریت یا اقلیت سے قطع نظر درست کو تلاش کیا جائے گا۔

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فعل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُحد کے معرکے میں اکثریت کی رائے کو اختیار کیا۔ جبکہ بدر کے معرکے میں حباب بن منذرؓ کی رائے پر عمل کیااوراپنی رائے کو چھوڑ دیا اوراکثریت کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اور صلح حدیبیہ کے موقع پر صرف اپنی رائے پر ہی عمل کیا، حتی کہ ابو بکرؓ اور عمرؓ کی رائے کو بھی مسترد کیا بلکہ تمام مسلمانوں کی رائے کو نظر انداز کیا۔ آپ ﷺ نے ناراضگی کے باوجود ان سب کو اپنی رائے کو قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ان تین اعمال کو جب رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان "جب تم دونوں (ابو بکر و عمر) کا ایک ہی مشورہ ہو تو میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا" سے ملایا جائے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے ساتھ کہ " خاص باتوں میں ان سے مشورہ لیتے رہیے" یا یہ ارشاد کہ "اور ان کا ہر کام مشورے سے ہوتا ہے" سے ملایا جائے، تب ان دونوں آیتوں اور حدیث کی تفسیر ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کون سے معاملات ہیں کہ جن میں خلیفہ رائے طلب کرے تو اس میں اکثریت کی رائے کی پابندی اس پر لازم ہے اور وہ کون سے اعمال ہیں کہ جن میں خلیفہ رائے طلب کرے لیکن اس رائے کی پابندی اس پر لازم نہیں۔ اگر حدیبیہ کے واقعہ سے مشابہ کوئی واقعہ ہو یعنی اس میں حکم شرعی واضح ہو، تو اس کے بارے میں خلیفہ کو اختیار حاصل ہو گا اور اس میں شوریٰ کی پابندی لازمی نہ ہو گی۔ جبکہ اگر کوئی واقعہ بدر کے واقعہ سے مشابہ ہو یعنی اس میں فکر و نظر، باریک بینی یا فنی لحاظ سے رائے دینے کی ضرورت ہو گی تو اس میں اکثریت کی رائے کے قطع نظر درست رائے کا انتخاب کیا جائے گا۔ اور اگر احد کے واقعہ سے ملتا جلتا کوئی واقعہ ہو جو کہ عملی اقدام کے بارے میں رائے ہے تو اس میں اکثریت کی رائے کو ترجیح دی جائے گی، یہ ابو بکرؓ اور عمرؓ کے بارے میں

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے ضمن میں آتا ہے کہ "جہاں تم دونوں کا مشورہ ایک ہو گا میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا" اس کو احمد نے روایت کی ہے۔

دفعہ نمبر111: مجلس امت کے پاس پانچ اختیارات ہیں:

1) الف) خلیفہ کی جانب مجلس امت سے مشورہ لینا اور مجلس امت کی طرف سے خلیفہ کو اعمال اور داخلی سیاست کے ایسے علمی امور کے بارے میں مشورہ دینا جن کا تعلق معاملات کی دیکھ بھال سے ہو، جو گہری فکری تحقیق اور باریک بینی کے محتاج نہ ہوں جیسے حکمرانی کے معاملات، تعلیم، صحت، اقتصاد، تجارت، صنعت، زراعت وغیرہ جن میں مجلس امت کی رائے کو اختیار کرنا خلیفہ پر لازم ہے۔

ب) : وہ فکری امور جن میں گہری تحقیق اور باریک بینی کی ضرورت ہے اور وہ امور جو تجربہ اور علم کے محتاج ہیں یا فنی اور علمی امور اسی طرح مالیات، فوج، خارجہ سیاست کے معاملات میں خلیفہ رائے لینے کے لیے مجلس امت کی طرف رجوع کر سکتا ہے تاکہ مجلس کے ممبران کی رائے کو جان سکے، لیکن ان امور میں مجلس امت کی رائے کو اختیار کرنا خلیفہ پر لازم نہیں۔

2) خلیفہ مجلس کے سامنے وہ احکام اور قوانین پیش کر سکتا ہے جن کی وہ تبنی کرنا چاہتا ہے، مجلس کے مسلمان اراکین کو ان کے بارے میں بحث کرنے اور ان کو غلط یا صحیح کہنے کا حق حاصل ہے، اگر وہ ان قوانین کے ماخوذ کے طریقہ کار کے درست ہونے اور قوانین کے دلائل کے بارے میں خلیفہ سے اختلاف کریں کہ یہ قوانین کو اخذ کرنے سے متعلق ریاست کے تبنی کردہ اصولوں کے خلاف ہے، تو فیصلہ محکمہ مظالم کا ہو گا، اس میں محکمہ کی رائے حتمی ہو گی۔

3) مجلس کو ان تمام اعمال میں خلیفہ کے احتساب کا حق حاصل ہے جو ریاست میں بالفعل انجام پاچکے ہوں خواہ ان کا تعلق داخلی امور سے ہو یا خارجہ سے، مالی معاملات سے ہو یا فوج وغیرہ سے۔ ان میں سے جن امور میں اکثریت کی رائے لازم ہوتی ہے ان میں مجلس کی رائے کو اختیار کرنا لازمی ہے، جن میں اکثریت کی رائے لازمی نہیں ان میں مجلس کی رائے کو اختیار کرنا خلیفہ پر لازم نہیں۔

اگر ایسے کسی عمل کے شرعی طور پر جائز ہونے کے متعلق خلیفہ اور مجلس میں اختلاف ہو جائے جو نافذ العمل ہو چکا ہو تو اس کی شرعی ہونے یا نہ ہونے کو طے کرنے کے لیے لازمی طور پر محکمہ مظالم کی طرف رجوع کیا جائے گا، اور اس میں محکمہ کی رائے حتمی اور لازمی ہو گی۔

4) مجلس کو معاونین، والیوں اور عاملوں سے ناراضگی کے اظہار کا حق حاصل ہے اور اس میں اس کی رائے کو اختیار کرنا لازمی ہے، خلیفہ کو فوراً ان کو برطرف کرنا پڑے گا۔ اگر اس حوالے سے مجلسِ امت اور اس علاقے کی منتخب مجلس ولایہ کی رائے مختلف ہو، تو مجلس ولایہ کی رائے کو ترجیح دی جائے گی۔

5) مجلس کے مسلم اراکین کو خلافت کے ان امیدواروں کو شارٹ لِسٹ کرنے کا حق حاصل ہے جن کے اندر محکمہ مظالم کے فیصلے کے مطابق انعقاد کی تمام شرائط موجود ہوں۔ اس میں اکثریت کی رائے حتمی ہو گی۔ انتخاب صرف ان لوگوں میں سے صحیح ہو گا جن کو مجلس نے شارٹ لِسٹ کیا ہو۔

اس دفعہ میں مجلسِ امت کے اختیارات کو بیان کیا گیا ہے، ان اختیارات کی دلائل یوں ہیں:

1) الف) جہاں تک اعمال اور ان عملی امور میں مجلس امت کی رائے کے لازمی ہونے کی دلیل کی بات ہے جو تحقیق اور باریک بینی کے محتاج نہیں تو یہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مشرکین کے لشکر کا سامنا کرنے کے لیے اکثریت کی رائے کو قبول کرنے کے فعل سے ظاہر ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ اور کبار صحابہؓ کی اپنی رائے

مدینہ میں ہی رہ کر لڑنے اوروہاں سے نہ نکلنے کی تھی۔ اسی طرح اسے ابو بکرؓ اور عمرؓ کے بارے میں آپ ﷺ کے اس فرمان سے بھی اخذ کیا گیا ہے کہ "جہاں تم دونوں کا مشورہ ایک ہی ہو تو میں تمہاری مخالفت نہیں کروں گا" اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ وہ علمی امور جو رائے کی بنیاد پر انجام دیے جاتے ہیں، جیسے اطمینان سے زندگی گزرنے کے لیے رعایا کو خدمات مہیا کرنا، ان کو امن کی ضمانت دینا، ان کے شہروں کی حفاظت اور خطرات کو دور کرنا تو ان امور میں مجلس کی اکثریت کی رائے خلیفہ پر لازم ہو گی، خواہ وہ خلیفہ کی خواہش کے خلاف ہو، جیسا کہ اُحد میں رسول اللہ ﷺ نے اکثریت کی رائے پر عمل کرتے ہوئے مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کو اختیار کیا۔

ب) وہ امور جو اوپر اس جزو کے تحت بیان کیے گئے ہیں، ان میں خلیفہ علما، تجربہ کاروں اور اسپیشلسٹ لوگوں کی رائے قبول کرے گا، جیسا کہ معرکۂ بدر کی جگہ کے انتخاب میں رسول اللہ ﷺ نے حباب بن منذرؓ کی رائے کو قبول کیا۔ سیرت ابنِ ہشام میں ہے کہ: "رسول اللہ ﷺ جب بدر میں پانی کے اس طرف اترے تو حباب بن منذرؓ اس جگہ پر راضی نہ ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: اے اللہ کے رسول، جس جگہ آپ اترے ہیں یہ اللہ کا حکم ہے کہ ہم اس سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتے یا یہ رائے، جنگی منصوبہ بندی اور چال ہے؟ فرمایا: نہیں یہ تو رائے، جنگی منصوبہ اور چال ہے۔ حبابؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول یہ جگہ ٹھیک نہیں، لوگوں کو اٹھایئے اور پانی کے اُس طرف اتر جایئے، ہم اس کے پچھلی طرف قلب سے آئیں گے، ایک حوض بنا کر اس کو پانی سے بھر دیں گے، پھر دشمن سے لڑیں گے یوں ہم پانی پیتے رہیں گے اور وہ پانی نہیں پی سکیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے اچھی رائے سے مشورہ دیا۔ یہ کہہ کر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی اٹھے اور چل پڑے یہاں تک کہ پانی کی دوسری طرف آکر اترے، پھر قلب بنانے کا حکم دیا، اس قلب کے پیچھے حوض بنایا گیا اور اس کو پانی سے بھر دیا گیا، اس میں برتن (ڈول) ڈال دیا گیا"۔ یہاں رسول اللہ ﷺ نے حبابؓ کی بات سنی اور ان کی رائے پر عمل کیا۔

یہ واقعہ جو کہ رائے، جنگ اور چال کی قسم میں سے ہے اس کے بارے میں فیصلہ کرنے میں لوگوں کی رائے کی کوئی قیمت نہیں بلکہ تجربہ کار کی رائے کی اہمیت ہے۔ یہی حال اُن فنی اور فکری امور کا ہے جو تحقیق اور باریک بینی کے محتاج ہیں۔ اسی طرح تعریفات میں بھی تجربہ کاروں اور اسپیشلسٹوں کی طرف رجوع کیا جائے گا لوگوں کی آراء کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی کیونکہ اس میں بھی اکثریت کی کوئی قیمت نہیں، بلکہ علم، تجربہ اور ماہرِ فن ہونے کی قیمت ہے۔

اس کی ایک مثال مالی امور بھی ہیں، کیونکہ شرع نے ہی محصولات اور اخراجات کے انواع کا تعین کیا ہے، یہ بھی متعین کیا ہے کہ کب ٹیکسز لگایا جاسکتا ہے اس لیے محصولات اور نفقات میں لوگوں کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں، یہی حال فوج کا ہے، شرع نے اس کے امور کی تدبیر بھی خلیفہ کی ذمہ داری گردانی ہے، جہاد کے احکامات کو مقرر کیا ہے، جہاں شرع کا فیصلہ موجود ہو وہاں لوگوں کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہی حال ریاست کے دوسری ریاستوں کے ساتھ تعلقات کے معاملے کا ہے یہ بھی وہ فکری امر ہے جس میں تحقیق اور باریک بینی کی ضروت ہے، اس کا جہاد کے ساتھ بھی تعلق ہے، پھر یہ رائے، جنگ اور چال میں سے ہے، اس میں لوگوں کی رائے کی کثرت اور قلت کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس کے باوجود خلیفہ کے لیے جائز ہے کہ وہ ان امور کو مجلسِ امت کے سامنے مشورے کے لیے پیش کرے اور ان کی رائے لے، کیونکہ ان امور میں رائے لینا مباحات میں سے ہے، لیکن ان امور میں مجلس کی رائے لازم نہیں جیسا کہ بدر کے واقعے میں ثابت ہے۔ اور فیصلہ صرف صاحبِ اختیار (حکمران) کے ہاتھ میں ہے۔

شق نمبر 1 کے (الف) اور (ب) میں فرق مندرجہ ذیل تین مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے:

کسی دُور گاؤں میں لوگوں کی خدمت اور فائدے کے لیے نقل و حمل کے لیے پُل بناتے وقت مجلس کی اکثریت کی رائے لینا خلیفہ پر لازم ہے تاکہ پل کی تعمیر کے ذریعے لوگوں کی نقل و حرکت کا مسئلہ حل ہو سکے۔ لیکن فنی لحاظ سے پل کے لیے مناسب زمین کا انتخاب اور پل کے لیے انجنئیرنگ کے بہترین نقشے بنانا، پل لٹکا ہونا

چاہیے یا نہر کے اندر ستونوں پر بنناچاہیے وغیرہ، کے معاملات میں تجربہ کار اور اسپشلسٹ لوگوں سے مشورہ لیا جائے گا مجلس کی اکثریت کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا۔

اس طرح ایک ایسے گاؤں میں لڑکوں کے لیے مدرسہ (سکول) بنانا جہاں کے بچوں کو شہر کے سکولوں تک پہنچے میں بڑی دِقت کا سامنا ہو تا ہے، اس مسئلے میں مجلسِ امت کی اکثریت کی رائے کو قبول کرنا خلیفہ پر لازم ہے، لیکن گاؤں میں مدرسہ کے لیے جگہ کا انتخاب کہ کہاں زمین مضبوط ہے جہاں بنیاد ڈالی جائے، اسی طرح اس کو بنانے کی کیفیت یا تیار عمارت خریدی جائے، یا پھر کوئی عمارت کرائے پر ایک یا دو سال کے لیے حاصل کی جائے، ان تمام امور میں تجربہ کار اور اسپشلسٹ لوگوں سے رائے لی جائے گی اکثریت کا کوئی اعتبار نہیں۔ تاہم خلیفہ صرف ان سے رائے پوچھ سکتا ہے لیکن یہ رائے خلیفہ کے لیے لازم نہیں۔

بالکل اسی طرح ایک ایسا سرحدی علاقہ جہاں دشمن کے حملے کا خطرہ رہتا ہے، میں دشمن کے خطرے کو کم کرنے اور نقصان سے بچنے کے لیے قلعے وغیرہ تعمیر کرنے کے حوالے سے مجلس کی اکثریت کی رائے لازم ہے لیکن یہ قلعے کس قسم کے بنائے جائیں اور دشمن کے خطرے کے مقابلے میں کون سے جنگی وسائل اپنائے جائیں اس کے لیے تجربہ کاروں اور ماہرین کی رائے کو اختیار کیا جائے گا مجلس کی اکثریت کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا۔

جہاں تک دوسری شق کا تعلق ہے کہ قانون سازی صرف اللہ کے لیے ہے، تو یہ اس بناء پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا **اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ** ؕ "حکم تو صرف اللہ کا ہی ہے" (الانعام:57)، اور ارشاد ہے **فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا** "قسم ہے آپ ﷺ کے رب کی! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک یہ آپس کے تمام جھگڑوں میں آپ کو ثالث (حاکم) نہ بنالیں اور پھر آپ کے فیصلے پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اوراس کو پورا پورا تسلیم کرلیں" (سورۃ النساء:65)۔ اسی طرح آپ ﷺ کی جانب سے اس آیت کی تفسیر کہ **اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ**

وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ "انہوں (نصاریٰ) نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے علاوہ معبود بنا لیا ہے" (التوبہ: 31)، میں ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس اس حال میں آیا کہ میرے گلے میں سونے کی صلیب تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عدی، اس بت کو گلے سے اتار کر پھینک دو۔ میں نے سنا کہ آپ ﷺ سورۃ براۃ کی اس آیت کی تلاوت کر رہے تھے اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ " انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو معبود بنا لیا ہے" اور آپ ﷺ نے فرمایا: " وہ (نصاریٰ) ان (اپنے علماء) کی عبادت نہیں کرتے تھے لیکن جس چیز کو وہ (علماء) حلال قرار دیتے تھے اس کو حلال سمجھتے تھے اور جس چیز کو وہ حرام قرار دیتے اس کو حرام سمجھتے تھے"۔

یوں تشریع (قانون سازی) مجلس کی رائے سے نہیں ہو گی، خواہ یہ کثرتِ رائے یا متفقہ رائے سے ہی کیوں نہ ہو بلکہ یہ کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ سے، درست طریقۂ اجتہاد کے ذریعے، لی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ میں مسلمانوں کی اکثریت کی رائے کو مسترد کیا اور فرمایا: «إِنِّي عَبْدُ اللهِ وَرَسُولُهُ، وَلَنْ أُخَالِفَ أَمْرَهُ» "میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں اور کبھی اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا"۔ کیونکہ صلح اللہ سبحانہ کی طرف سے وحی کردہ تھی۔ یوں قانون سازی میں لوگوں کی رائے کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا۔ اس بنیاد پر احکام شرعیہ کی تبنی، قانون سازی، احکام اور قوانین کی تبنی سب اکیلے خلیفہ کے اختیارات میں داخل ہے۔ ان سب کو وہ شرعی نصوص سے اخذ کرے گا، خواہ یہ اس کے اپنے اجتہاد سے ہو یا دوسرے معتبر مجتہدین کے اجتہاد سے۔ البتہ اس کے باوجود خلیفہ کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ رائے لینے کے لیے مجلس امت کے سامنے یہ بات رکھے کہ وہ کون سے احکام اور شرعی قوانین کی تبنی کرنا چاہتا ہے، جیسا کہ عمرؓ بن خطاب نے احکامِ شرعیہ کے لیے مسلمانوں کی طرف رجوع کیا اور صحابہؓ نے اس عمل کا انکار نہیں کیا، جیسا کے عراق کی مفتوحہ اراضی کے معاملے میں ہوا۔ مسلمانوں نے عمرؓ سے ان زمینوں کو ان لوگوں کے درمیان تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا جنہوں نے ان زمینوں فتح کیا تھا۔ آپؓ نے لوگوں سے رائے تو مانگی لیکن فیصلہ یہ دیا کہ یہ زمینیں اصل مالکوں کے پاس ہی رہیں گی اس شرط پر کہ وہ اس پر مقررہ خراج ادا کریں گے

اور افراد پر جزیہ اس کے علاوہ ہو گا۔ عمرؓ کی جانب سے لوگوں کی رائے کی طرف رجوع اور اس سے قبل ابو بکرؓ کی جانب سے احکام شرعیہ میں صحابہؓ کی رائے لینا، ان سے پوچھا کرنا اور صحابہؓ کی طرف سے کسی قسم کا انکار نہ کرنا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے جواز کی دلیل اجماع صحابہؓ ہے۔

جہاں تک ان قوانین کے صحیح استنباط کے متعلق خلیفہ اور مجلس شوریٰ میں اختلاف ہونے کی صورت میں محکمہ مظالم کی طرف رجوع کرنے کا تعلق ہے یا ریاست میں تبنی شدہ اصول کے مطابق طریقہ تبنی کی دلیل کے صحیح ہونے کا تعلق ہے تو اس میں قاضی المظالم کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ خلیفہ کی جانب سے تبنی کردہ حکم کی چھان بین کرے، کہ کیا اس کی شرعی دلیل موجود ہے اور کیا یہ دلیل واقعہ (حقیقت) پر لاگو ہوتی ہے۔ یعنی جس وقت خلیفہ کی جانب سے کسی تبنی کردہ حکم کے بارے میں خلیفہ اور مجلس کے درمیان اختلاف ہو جائے کہ یہ صحیح حکم شرعی ہے یا نہیں تو اس اختلاف کا فیصلہ قاضی المظالم کرے گا کیونکہ یہ اس کی خصوصیت ہے اور اس میں محکمہ مظالم کی رائے حتمی ہے۔

مجلس کے غیر مسلم ارکان کو خلیفہ کی جانب سے تبنی کیے گئے احکامات اور قوانین کے جائزے کا کوئی حق نہیں کیونکہ ان کا تو اسلام پر ایمان ہی نہیں۔ ان کو صرف حکمران کی جانب سے ان پر ہونے والے ظلم پر اظہارِ رائے کا حق حاصل ہے۔ شرعی احکام اور قوانین کے بارے میں رائے دینے کا ان کو حق نہیں۔

تیسری شق کی دلیل اُن نصوص کی عمومیت ہے جو حکمرانوں کے محاسبے کے حوالے سے ہیں۔ احمد نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«سَيَكُونُ عَلَيْكُمْ أُمَرَاءُ يَأْمُرُونَكُمْ بِمَا لاَ يَفْعَلُونَ، فَمَنْ صَدَّقَهُمْ بِكِذْبِهِمْ، وَأَعَانَهُمْ عَلَى ظُلْمِهِمْ، فَلَيْسَ مِنِّي وَلَسْتُ مِنْهُ، وَلَنْ يَرِدَ عَلَيَّ الْحَوْضَ»** ''عنقریب تمہارے ایسے حکمران ہوں گے جو تمہیں اس چیز کا حکم دیں گے جو وہ خود نہیں کریں گے۔ جس نے ان کے جھوٹ میں ان کی تصدیق کی یا ان کے ظلم میں ان کی مدد کی، تو وہ مجھ میں سے نہیں اور میں اُس میں سے نہیں، وہ میرے حوض (حوضِ کوثر) پر نہیں آسکے گا''۔ اور

احمد نے ابو سعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «**... أَلاَ إِنَّ أَفْضَلَ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ**» ''بہترین جہاد جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے''۔ اور حاکم نے جابرؓ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ «**سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَرَجُلٌ قَامَ إِلَى إِمَامٍ جَائِرٍ فَأَمَرَهُ وَنَهَاهُ فَقَتَلَهُ**» ''شہدا کے سردار حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ آدمی جو جابر امام (حکمران) کے سامنے کھڑے ہو کر امر (بالمعروف) اور نہی (عن المنکر) کرے اور وہ (حکمران) اس کو قتل کرے''۔ مسلم نے ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**سَتَكُونُ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ، فَمَنْ عَرَفَ بَرِئَ وَمَنْ أَنْكَرَ سَلِمَ، وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ ...**» ''عنقریب ایسے حکمران ہوں گے جن کو تم پہچانو گے اور ناپسند کرو گے۔ جس نے ان کو پہچانا تو وہ بری ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ سلامت رہا، ہاں جو راضی ہوا اور تابعداری کی (وہ بری ہوا نہ سلامت رہا)...''۔

یہ نصوص عام ہیں جو شریعت کے مطابق حکمرانوں کے احتساب پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کا محاسبہ تمام اعمال میں ہو گا، یوں مجلس کی جانب سے خلیفہ، اس کے معاونین، والیوں اور عاملوں کا محاسبہ ہر اس عمل میں ہو گا جو بالفعل انجام پایا ہو، خواہ یہ عمل حکم شرعی کے مخالف ہو یا یہ عمل غلط ہو، مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہو یا اس میں رعایا پر ظلم ہو، یا پھر معاملات کی دیکھ بھال میں کوتاہی ہو۔ خلیفہ پر لازم ہے کہ وہ اس محاسبہ اور اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر اور اپنے اعمال، اقوال اور تصرفات کی دلیل بیان کرے تاکہ مجلس امور کی حُسنِ تدبیر اور خلیفہ کی استقامت سے مطمئن ہو سکے۔ اگر مجلس نے خلیفہ کے نقطۂ نظر کو تسلیم نہیں کیا اور اس کی دلیل کو مسترد کر دیا تو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ عمل ایسا ہو کہ جس میں اکثریت کی رائے کی پابندی لازمی ہے، تب مجلس کی رائے کو اختیار کرنا لازمی ہو گا، جیسا کہ شق (الف) کے امور کا معاملہ ہے، ورنہ مجلس کی رائے پر عمل لازم نہیں جیسا کہ شق (ب) والے امور کا معاملہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر محاسبہ اس بات پر ہو کہ

گذشتہ سال میں سکول کیوں نہیں بنایاتب محاسبہ لازمی ہے۔ اگر محاسبہ اس بات پر ہو کہ سکول کا ڈیزائن ایسا کیوں بنایا اور ویسا کیوں نہیں بنایا، اس میں محاسبہ لازمی نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جس وقت احتساب کرنے والوں اور حکمرانوں کے درمیان کسی معاملے کے شرعی پہلو کے حوالے سے اختلاف ہو جائے تو مجلس کے مطالبے پر قاضی مظالم کی طرف رجوع کیا جائے گا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: **يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ** "اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اپنے میں سے حکمرانوں کی۔ اگر تمہارے درمیان کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو" (النساء:59)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! اگر تمہارا حکمرانوں سے اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو یعنی فیصلہ کے لیے شریعت کی طرف رجوع کرو۔ شریعت کی طرف رجوع کرنے سے مراد ہے کہ عدلیہ کی طرف رجوع کرو۔ اور اس معاملے میں محکمہ مظالم کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اسی کی رائے سب پر لاگو ہو گی کیونکہ اس صورتِ حال میں اسی کو یہ خصوصیت حاصل ہے۔

جہاں تک شق نمبر 4 کا تعلق ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بحرین میں اپنے عامل علاء بن حضرمی کو برطرف کیا کیونکہ عبد قیس کے وفد نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی شکایت کی تھی۔ ابنِ سعد نے محمد بن عمر سے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے علاء بن حضرمی کو لکھا کہ وہ عبد قیس کے بیس آدمیوں کو لائے۔ چنانچہ وہ بیس آدمیوں کو لے کر آیا جن میں ان کا سردار عبد اللہ بن عوف الاشجع بھی تھا۔ اور علاء نے بحرین میں منذر بن ساوی کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ وفد نے علاء بن حضرمی کی شکایت کی اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو معزول کر کے ابان بن سعید بن العاص کو والی مقرر کر کے ان سے فرمایا: "عبد قیس کی خیر خواہی کرو اور اس کے سرداروں کا اکرام کرو"۔ اسی طرح عمر بن خطابؓ نے صرف لوگوں کی شکایت پر سعد

بن ابی وقاصؓ کو ولایت سے برطرف کر دیا اور فرمایا "میں نے انہیں کسی کمزوری یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا"۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل ولایہ (کی نمائندہ مجلسِ ولایہ) کو اپنے والیوں اورامراء سے ناراضگی کے اظہار کا حق حاصل ہے، اس بنیاد پر خلیفہ کو ان کو معزول کرنا چاہیے۔ مجلسِ امت کو بھی یہ حق حاصل ہے، کیونکہ وہ تمام ولایات کے مسلمانوں کی وکیل (نمائندہ) ہے، اس لیے وہ والیوں اور عاملوں کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتی ہے اگر شکایت مجلسِ ولایہ یا مجلسِ امت کی اکثریت کی طرف سے ہو تو خلیفہ کو فوراً ان کو معزول کرنا پڑے گا۔ اگر دونوں مجلسوں میں اختلاف ہو جائے تو مجلس ولایہ کو ترجیح حاصل ہو گی کیونکہ مجلس ولایہ مجلسِ امت کے نسبت والی کے حالات سے زیادہ باخبر آگاہ ہوتی ہے۔

شق نمبر پانچ میں دو مسئلے ہیں:

پہلا: امیدواروں کی شارٹ لسٹنگ (تحدید)

دوسرا: ان کا صرف چھ (6) پھر دو (2) تک محدود ہونا۔

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے تو خلفائے راشدینؓ کے تقرر کا بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ امیدواروں کی تعداد محدود ہوتی تھی اور ان کا چناؤ مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والے لوگوں میں سے براہِ راست ہوتا تھا یا لوگوں کی طرف سے خلیفہ سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے نائب کے طور پر کچھ امیدواروں کی تحدید کریں۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں ابو بکرؓ، عمرؓ، ابو عبیدہؓ، سعد بن عبادہؓ امیدوار تھے، ان ہی پر اکتفا کیا گیا یعنی امیدواروں کو ان تک محدود رکھا گیا۔ یہ سقیفہ والوں کی موافقت اور پھر صحابہؓ کی موافقت سے ہوا جس میں آگے چل کر انہوں نے ابو بکرؓ کی بیعت کی۔

پھر ابو بکرؓ اپنے آخری دنوں میں تقریباً تین مہینے تک مسلمانوں سے مشورہ لیتے رہے اور ان سے اپنے بعد خلافت کے بارے میں بحث کرتے رہے، مسلمانوں نے ان سے بحث مباحثے کے بعد عمرؓ کی نامزدگی پر اتفاق کیا یعنی نامزدگی ایک ہی فرد تک محدود رہی۔

عمرؓ کے زخمی ہونے کے بعد امیدواروں کی تحدید (شارٹ لِسٹنگ) انتہائی واضح اور آشکار تھی۔ صحابہؓ نے آپؓ سے مطالبہ کیا کہ کسی کو نامزد کریں آپؓ نے چھ افراد کو منتخب کیا اور دوسروں کو منع کیا اور جیسا کہ معلوم ہے کہ آپؓ نے اس معاملے میں انتہائی سختی کا مظاہرہ کیا۔

علیؓ کی بیعت کے وقت وہی اکیلے امیدوار تھے، ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا، اس لیے امیدواروں کی تحدید (شارٹ لِسٹنگ) کا سوال ہی نہیں تھا۔

یہ تحدید (شارٹ لِسٹنگ) سب کے سامنے ہوتی تھی۔ اگر یہ ناجائز ہوتا تو اس کا انکار کیا جاتا اور یہ نافذ نہ ہوتا کیونکہ اس میں دوسروں کو امیدوار بننے کے حق سے محروم کرنا موجود ہے۔ یوں خلافت کے لیے امیدواروں کی شارٹ لِسٹنگ اجماع صحابہؓ کی بنا پر جائز ہے۔ امت یعنی اس کے نمائندوں کو امیدواروں کی شارٹ لسٹنگ کا حق حاصل ہے خواہ یہ براہِ راست امت کی طرف سے ہو یا جانے والے خلیفہ کو امیدواروں کی تحدید کا اختیار دینے کے ذریعے ہو کہ وہ اس کام میں امت کی نمائندگی کرے۔

یہ تو تحدید کے حوالے سے تھا، رہی بات ابتدائی طور پر امیدواروں کے چھ تک محدود ہونے کی تو یہ عمرؓ کے فعل کی پیروی ہے، پھر اس کے بعد امیدواروں کی دو تک تحدید، عبدالرحمن بن عوفؓ کے فعل کی پیروی ہے۔ علاوہ ازیں اسی طرح مسلمانوں کی اکثریت کی جانب سے بیعت کا حصول محقق ہو پائے گا۔ کیونکہ اگر امیدوار دو سے زیادہ ہوں گے تو ان میں سے جو کامیاب ہوا، ہو سکتا ہے کہ وہ مثلاً تیس فیصد یا اس سے بھی کم ووٹ لے یوں یہ اکثریت نہیں ہو گی۔ جیتنے والے کو اکثریت اس وقت حاصل ہو گی جب امیدواروں کی تعداد دو سے زیادہ نہ ہو۔

مجلسِ امت کی جانب سے ان امیدواروں کی تحدید چھ پھر دو میں کرنے کا تعلق ہے تو یہ وہ لوگ ہوں گے کہ جن کے اندر محکمہ مظالم کے فیصلے کے مطابق انعقاد کی شرائط موجود ہوں۔ یہ اس لیے کہ مجلس امت ان ہی میں سے خلیفہ منتخب کرے گی یعنی ان امیدواروں میں انعقاد کی شرائط کا ہونا لازمی ہے۔ محکمہ مظالم ان امیدواروں کو مسترد کر دے گا جن میں انعقاد کی شرائط نہیں ہوں گی۔ محکمہ مظالم کی جانب سے انعقاد کی شرائط کے حوالے سے امیدواروں کے بارے میں فیصلہ آنے کے بعد ہی مجلس امت خلیفہ منتخب کرے گی، یہی شق نمبر پانچ کی تفصیلات تھیں۔

معاشرتی نظام

دفعہ نمبر 112: عورت کے بارے میں اصل یہ ہے کہ وہ ماں ہے اور خاندان کی تربیت اس کی ذمہ داری ہے، وہ ایسی عزت و آبرو ہے جس کی حفاظت فرض ہے۔

یہ دفعہ متعدد دلائل سے مستنبط ہے جو کہ یہ ہیں: پہلی دلیل نکاح کی ترغیب اور یہ دلیل کہ عورت بچے کی پرورش کی زیادہ حقدار ہے، دوسرے اس دلیل سے کہ عورت کا اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نکلنا ممنوع ہے، اور یہ دلیل کہ بیوی کی جانب سے شوہر کی خدمت کرنا واجب ہے، تیسری عورت کے مستور (باپردہ) ہونے کی دلیل سے، اس کے لیے خاص زندگی ہونے کی دلیل سے، غیر محرم کے ساتھ خلوت (تنہائی) کے ممنوع ہونے کی دلیل کی وجہ سے، غیر محرم کے ساتھ عورت کے سفر جائز نہ ہونے کی دلیل کی وجہ سے، تبرج (بے پردہ ہو کر نکلنے) کی حرمت کی دلیل سے۔

پہلی دلیل وہ ہے جو انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ازدواجی زندگی کا حکم دیتے تھے اور بغیر شادی کے زندگی گزارنے سے سختی سے منع فرماتے تھے اور فرماتے تھے **«تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ، إِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الأَنْبِيَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»** "محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی سے شادی کرو کیونکہ قیامت کے دن میں تمہاری تعداد کی زیادہ ہونے میں انبیا پر سبقت لے جاؤں گا" اس کو احمد نے حسن اسناد سے روایت کیا ہے۔ معقل بن یسار سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: مجھے ایک ایسی عورت پسند ہے جو اچھے خاندان والی اور خوب صورت ہے لیکن اس کے بچے نہیں ہوتے، کیا میں اس سے شادی کروں؟ فرمایا: نہیں۔ پھر دوسری مرتبہ آیا پھر بھی اس کو منع فرمایا۔ پھر تیسری مرتبہ آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "تم بچے جننے والی اور محبت کرنے والی عورت سے شادی کرو کیونکہ یوں دوسری امتوں کے مقابلے میں میری امت کی تعداد زیادہ ہوگی" اس کو ابو داؤد، ابنِ حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نکاح کی حکمت اور اس سے مقصود نتیجہ ولادت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسی عورت سے نکاح سے منع فرمایا ہے جس کے بارے میں نکاح کرنے والے کو معلوم ہو کہ اس کے بچے نہیں ہوتے۔ البتہ یہ نہی غیر جازم ہے کیونکہ جزم کا فائدہ دینے والا کوئی قرینہ یہاں موجود نہیں اور ساتھ ہی عزل یعنی حمل نہ ٹھہرانے کے جواز کے دلائل بھی وارد ہوئے ہیں۔ ان دلائل میں سے ایک وہ ہے جو مسلم نے اپنی صحیح میں جابرؓ سے روایت کی ہے: "ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عزل کیا کرتے تھے یہ بات نبی ﷺ کو معلوم ہوئی آپ ﷺ نے منع نہیں فرمایا"۔ اس لیے یہ جائز ہے کہ آدمی ایسی عورت سے شادی کرے جس کے بچے نہیں ہوتے لیکن بچے جننے والی عورت سے شادی کرنا افضل ہے اور مذکورہ دونوں حدیثوں کی وجہ سے مندوب ہے۔ یعنی عورت میں اصل اس کا ماں بننا ہے، اس کے بعد وہ بیوی ہے اور شرع نے اس کے ساتھ مباشرت کو جائز اور مندوب قرار دیا ہے۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے یہ روایت بھی ہے کہ ایک عورت نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ میرا بیٹا ہے، میرا بطن اس کا برتن تھا، میرے پستان سے ہی یہ پیتا تھا، میری گود اس کی پناہ گاہ تھی، اب اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اس کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ

نے اس سے فرمایا: ”جب تک تم نکاح نہیں کرو گی تم ہی اس کی زیادہ حقدار ہو“ اس کو ابو داؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے۔ اس حدیث نے ان مختلف حالات کو گنا ہے جو بچے کی نسبت سے عورت کو ہوتے ہیں اور یہ اس کے ماں ہونے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس لیے عورت کے حق میں بچے کی کفالت کا فیصلہ دیا گیا ہے۔ یہ دونوں دلیلیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عورت میں اصل یہ ہے کہ وہ ماں ہے، اس کے علاوہ وہ احکامات بھی ہیں جو حمل، ولادت اور رضاعت سے متعلق ہیں۔

جہاں تک دوسری دلیل کی بات ہے تو انسؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی سفر پر روانہ ہوا اور اپنی بیوی کو گھر سے نکلنے سے منع کیا۔ اس کا باپ بیمار ہو گیا تو اس نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے باپ کی عیادت کی اجازت چاہی تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا «اتَّقِي اللَّهَ وَلاَ تُخَالِفِي زَوْجَكِ» ”اللہ سے ڈر اور اپنے خاوند کی نافرمانی مت کر“ اس کو ابنِ قدامہ نے المغنی میں ذکر کیا ہے۔ اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لاَ يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَصُومَ وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ إِلاَّ بِإِذْنِهِ» ”عورت کے لیے اس کے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ رکھنا جائز نہیں“، یہ متفق علیہ ہے۔ اور ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «وَمِنْ حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى زَوْجَتِهِ أَنْ لاَ تَصُومَ تَطَوُّعاً إِلاَّ بِإِذْنِهِ» ”شوہر کا اپنی بیوی پر یہ حق بھی ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ نہ رکھے“ اس کو طبرانی نے نقل کیا ہے۔ شرع نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے بیمار باپ کی عیادت کرے، اپنے اللہ کے لیے نفلی روزہ رکھے لیکن اس کو شوہر کے حق سے کم تر قرار دیا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ عورت میں اصل یہ ہے کہ وہ گھر پر ذمہ دار ہے“۔

رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی روایت کیا گیا کہ آپ ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہؓ پر گھر کے اندر خدمت کی ذمہ داری ڈالی جبکہ علیؓ پر گھر سے باہر کے کام کاج کا بوجھ ڈالا۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے ضمرہ بن حبیب سے نقل کیا ہے۔ اگرچہ اس حدیث کی سند میں ابو بکر بن مریم الغسانی ہے مگر اس کا معنی اس حدیث سے سمجھا جا سکتا ہے

جو احمد نے اپنی مسند میں حسن اسناد کے ساتھ علیؓ سے روایت کی ہے جس میں ہے کہ علیؓ نے کہا: ” اے اللہ کے رسول! ڈول کھینچتے کھینچتے مجھے سینے میں درد کی شکایت ہو گئی ہے “ اور فاطمہؓ نے کہا: ”آٹا پیستے پیستے میرے ہاتھ کھر درے (سخت) ہو گئے ہیں، اللہ نے اب آپ کو جنگی قیدی اور وسعت دی ہے تو ہمیں خدمت گار دے دیجئے“۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ بتادوں جو تم دونوں نے سوال کیا ہے۔ دونوں نے کہا: کیوں نہیں۔ تو فرمایا: کچھ کلمات جو جبریل علیہ السلام نے مجھے سکھائے ہیں، یہ کہہ کر فرمایا: ہر فرض نماز کے بعد دس مرتبہ سبحان اللہ دس مرتبہ الحمدللہ اور دس مرتبہ اللہ اکبر پڑھو اور جس وقت سونے کے لیے بستر پر جاؤ تو تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمدللہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر پڑھو۔ علیؓ کہتے ہیں کہ: ” اللہ کی قسم! جب سے رسول اللہ ﷺ نے یہ مجھے سکھائے ہیں میں نے کبھی بھی ان کو نہیں چھوڑا۔ یہ سن کر ابن الکوا نے ان سے پوچھا کہ کیا صفین کی رات بھی نہیں؟ آپؓ نے فرمایا: ” ہاں، اے اہل عراق! اللہ تمہیں ہلاک کرے، صفین کی رات بھی نہیں“۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے علیؓ کی جانب سے گھر کے باہر کھیتوں کو پانی دینے کے کام کو ناپسند نہیں کیا اور نہ ہی فاطمہؓ کی طرف سے گھر کے اندر آٹا پیسنے کے کام کو برا سمجھا بلکہ دونوں کو کچھ ایسے کلمات سکھائے جو زندگی کی سختی کو آسان کر دیں گی اور آخرت میں دائمی بھلائی کا باعث بنیں گے۔ اس طرح اس حدیث میں عورت پر گھر کے اندر کی خدمات اور مرد پر گھر کے باہر کے کام کاج کے وجوب پر دلالت ہے، کیونکہ خادم طلب کرنا، ان پر گھر کے اندر اور گھر سے باہر کام کے بوجھ ہونے پر دلالت کرتا ہے، اگر یہ واجب نہ ہوتا تو وہ کام کا بوجھ نہ اٹھاتے کیونکہ واجب نہ ہو تو بوجھ اور مشقت کیوں برداشت کی جائے۔

یہ تو احمد کی اس حدیث سے سمجھ آتا ہے جو ابن ابی شیبہ کی حدیث کی تائید ہے، ابو حنیفہ نے بھی اس حدیث کو لیا ہے اور کئی فقہاء نے اس پر عمل کیا ہے۔ ان میں سے ابو بکر بن ابی شیبہ خود بھی ہیں جنہوں نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ ابو اسحاق جوزجانی نے بھی کئی ذرائع سے اس حدیث کو روایت کیا ہے، جیسا کہ صاحب المغنی نے کہا ہے لیکن انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ابن حبیب المالکی نے الوضحۃ میں اس حدیث کو لیا اور اس پر عمل کیا۔ ابنِ حجر فتح الباری میں کہتے ہیں کہ ابن حبیب نے اصبغ سے اور اس نے ابن

الماجشوب سے اور اس نے مالک سے روایت کیا ہے کہ گھر کی خدمت عورت پر لازم ہے، جب خاوند تنگ دست ہو، خواہ بیوی اعلیٰ خاندان اور شرف والی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ اسی لیے نبی ﷺ نے فاطمہؓ پر گھر کی خدمت کی اور علیؓ پر گھر سے باہر کے کام کاج کی ذمہ داری ڈال دی۔

یہی وجہ ہے کہ ہم ابن ابی شیبہ کی مذکورہ حدیث کو لیتے ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہؓ پر گھر کی خدمت کی اور علیؓ پر گھر کے باہر کے کام کاج کا بوجھ ڈال دیا“۔ نبی ﷺ اپنی ازواج مطہرات کو اپنی خدمت کا حکم دیا کرتے تھے۔ مسلم نے ام المؤمنین عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«يَا عَائِشَةُ هَلُمِّي الْمُدْيَةَ، ثُمَّ قَالَ اشْحَذِيهَا بِحَجَرٍ فَفَعَلَتْ»** ”اے عائشہ مدیہ (ایک برتن یا پیمانہ) لے آؤ، پھر فرمایا اس کو پتھر سے کھرچو (صاف کرو) تو میں نے ایسا ہی کیا“، اس کو احمد نے صحیح اسناد کے ساتھ یعیش بن طخفہ بن قیس الغفاری سے نقل کیا ہے جو کہتے ہیں کہ ان کے والد اصحابِ صفہ میں سے تھے۔ آگے کہتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ عائشہؓ کے گھر گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے عائشہ ہمیں کھانا کھلاؤ“۔ پھر فرمایا: ”عائشہ ہمیں پانی پلاؤ“۔ اس لیے اگر شوہر کی خدمت اور ایسا کوئی عمل بیک وقت در پیش ہو جس کو شرع نے مباح قرار دیا ہو یا جیسے تجارت یا مندوب ہو جیسے نفلی نماز تو شوہر کی خدمت کو ترجیح حاصل ہے، بیوی کو چاہیے کہ مباح یا مندوب کو ترک کرے اور شوہر کی خدمت کرے۔ یہ دونوں دلیلیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عورت کے لیے اصل یہ ہے کہ گھر کی ذمہ داری اس پر ہے۔

تیسری دلیل: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”لڑکی جب بالغ ہو جائے اس کے ہاتھوں (کے جوڑوں تک) اور چہرے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آنا چاہیے“ اس کو ابو داؤد نے قتادہ سے مرسلاً روایت کیا ہے اور قتادہ نے صحابی انسؓ کا زمانہ پایا ہے، اس لیے ان کے مرسل پر عمل کیا جائے گا۔ یہ عورت کے لباس کی تحدید ہے۔ اس کے عورت ہونے کی وجہ سے وہ ایسی آبرو ہے جس کی حفاظت کی جائے۔ یہ بھی کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا** (النور: 27) ”اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ کسی گھر میں گھر والوں سے انس پیدا (تعارف) کئے

بغیر اور سلام کے بغیر داخل مت ہو"۔ اللہ تعالیٰ نے گھر والوں کی اجازت لے کر ہی ان کے گھروں میں داخل ہو نے کا حکم دیا، اجازت نہ لینے کو وحشیت قرار دیا، اجازت لینے کو انس (مانوس ہونا) فرمایا۔ تَسْتَأْنِسُوْا یہ اجازت طلب کرنے سے کنایہ ہے، یہاں اجازت لینے سے مقصود عورت کی تنہائی کی حالت (بے پردگی کی حالت) میں داخل نہ ہونا ہے۔ اس لیے اجازت لیناواجب ہے اگرچہ گھر میں اس شخص کی ماں ہی موجود ہو۔ حدیث میں ہے کہ **«حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ سَأَلَهُ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَسْتَأْذِنُ عَلَى أُمِّي ؟ فَقَالَ: نَعَمْ، قَالَ الرَّجُلُ: إِنِّي مَعَهَا فِي الْبَيْتِ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : اسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا، فَقَالَ الرَّجُلُ: إِنِّي خَادِمُهَا فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ : اسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا أَتُحِبُّ أَنْ تَرَاهَا عُرْيَانَةً ؟ قَالَ: لاَ، قَالَ: فَاسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا»** "مجھے مالک نے بتایا، اس نے صفوان بن سلیم سے اور اس نے عطا بن یسار سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر کہا: اے اللہ کے رسول کیا میں اپنی ماں سے بھی اجازت لیا کروں؟ فرمایا: 'ہاں۔ اس شخص نے کہا: میں تو اس کے ساتھ گھر میں ہی میں رہتا ہوں، تو فرمایا: اس سے اجازت لے کر داخل ہو۔ اس آدمی نے کہا: میں تو اس کا خادم ہوں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: اس سے اجازت لے کر داخل ہو، کیا تم یہ پسند کرتے ہوں کہ تم اس کے گھر میں داخل ہو اور وہ برہنہ حالت میں ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ فرمایا: پھر اجازت لے کر داخل ہو"۔ اس کو مالک نے موطا میں اور ابو داؤد نے عطا بن یسار سے المراسیل میں نقل کیا ہے، ابن عبد البر نے التمہید میں اس کو مرسل صحیح کہا ہے، اور الاستذکار میں کہا ہے کہ یہ صحیح مراسیل میں سے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوَاتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ** (النور: 31) "اور اپنی زینت کی جگہوں کو ظاہر نہ کریں مگر جو اس زینت میں سے کھلا رہتا ہے۔ اور اپنے دوپٹے کو اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں۔ اور اپنی زینت کی جگہوں کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر، اپنے باپ پر، اپنے شوہر کے باپ پر، اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں پر، اپنے بھائیوں پر، اپنے بھتیجوں پر یا اپنے بھانجوں پر یا اپنی

عورتوں پر یا اپنے مملوکوں (باندیوں اور غلاموں) پر یا ان خدام پر جو شہوت نہ رہتے ہوں، یا ایسے کم سن لڑکوں پر جو عورتوں کے پردوں کی باتوں سے ابھی ناواقف ہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حد بندی کر دی کہ خاص زندگی میں عورت کے بدن میں سے کون کون سے اعضاء کا ظاہر ہونا جائز ہے، جو کہ ہاتھوں اور چہرے کے علاوہ ہیں، کیونکہ یہ صرف محارم اور ان لوگوں کے سامنے ہی ظاہر کئے جاسکتے جن میں شہوت نہ ہو۔ یہ حد بندی اس بات پر واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ عورت ایک عزت و آبرو ہے جس کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ اس لیے اس کے بارے میں یہ احکامات ہیں۔ شرع نے جس طرح ستر کی حد بندی کر دی اسی طرح ان افراد کا بھی تعین کر دیا ہے جن کا اس ستر سے زیادہ دیکھنا صحیح ہے۔ یہ ایک باریک بینی پر مبنی حد بندی ہے جو عورت کی حفاظت پر دلالت کرتی ہے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے خطبے میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ «**لاَ يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلاَّ مَعَ ذِي مَحْرَمٍ**» "کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ اس کے محرم کے بغیر تنہائی اختیار نہ کرے" یہ متفق علیہ ہے اور الفاظ بخاری کے ہیں۔ مسلم میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ «**إِلاَّ وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ**» "سوائے یہ کہ اس کے ساتھ محرم موجود ہو"۔ نبی ﷺ سے یہ بھی روایت ہے کہ «**لاَ يَحِلُّ لامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ تُسَافِرُ مَسِيرَةَ يَوْمٍ إِلاَّ مَعَ ذِي مَحْرَمٍ**» "جو عورت اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہے اس کے لیے یہ حلال نہیں کہ وہ ایک دن کی مسافت کا سفر بغیر محرم کے کرے" اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ابنِ عباسؓ کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا «**... وَلاَ تُسَافِرِ الْمَرْأَةُ إِلاَّ مَعَ ذِي مَحْرَمٍ، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ امْرَأَتِي خَرَجَتْ حَاجَّةً وَإِنِّي اكْتُتِبْتُ فِي غَزْوَةِ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: انْطَلِقْ فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ**» ... کوئی بھی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے، ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا اے اللہ کے رسول! میری بیوی حج کرنے جارہی ہے جب کہ میں نے فلاں غزوہ کا ارادہ کیا ہے (نام لکھوایا ہے)، فرمایا: جاؤ اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو"۔ اس کو مسلم نے ابن عباسؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کو اس لشکر سے باہر نکالا جو روانہ ہونے والا تھا اور اس کو اسی کی بیوی کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ اللّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا**

فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِيْنَةٍ (النور:60)''اور بڑی بوڑھی عورتیں جن کو نکاح کی امید نہ ہو ان کو اس بات کا کوئی گناہ نہیں کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے اس طرح اتار رکھیں کہ زینت کا اظہار نہ ہو''۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ وہ زینت ہی نہ کریں کیونکہ زینت عورت کے لیے مباح ہے، ہاں زینت کا اظہار اس طرح نہ ہو جو مردوں کی نظر کو اپنی طرف متوجہ کرے، یعنی ممانعت زینت کے اظہار کا ہے مطلق زینت سے نہیں۔ یہ تمام دلائل قطعی طور پر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عورت ایک ایسی عزت ہے جس کی حفاظت فرض ہے۔ یہ تھے اس دفعہ کے دلائل۔

دفعہ نمبر113: اصل یہ ہے کہ مرد اور عورت الگ الگ ہوں، صرف اس ضرورت کے لیے اکھٹے ہوں جس کے لیے شرع نے اجازت دی ہو یا شرع میں یہ اجتماع ممنوع نہ ہو، جیسا کہ حج اور خرید وفروخت (تجارت)۔

یہ دفعہ کئی ایک دلائل سے مستنبط ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے: شرع نے مسلمان کے لیے ایک خاص زندگی اور ایک عام زندگی مقرر کی ہے پھر خواتین کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ خاص زندگی (پرائیویٹ لائف) میں اپنے محارم کے سامنے اپنے ستر کے علاوہ بدن کو ظاہر کر سکتی ہیں، لیکن عام زندگی (پبلک لائف) میں اپنے بدن میں سے چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ کچھ ظاہر نہیں کر سکتیں۔ دوسری دلیل: شرع نے نماز میں خواتین کی صفوں کو مردوں کے پیچھے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ تیسری دلیل: شرع نے مردوں کو خواتین کے سامنے اور خواتین کو مردوں کے سامنے نظریں نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے۔ چوتھی دلیل: شرع نے عام زندگی میں خواتین کو ایسے بھرپور اور مکمل لباس زیب تن کرنے کا حکم دیا ہے جس سے زینت کے تمام اعضا چھپ جائیں سوائے ان کے کہ جن کا کھلنا جائز ہے۔ پانچویں دلیل: شرع نے خاص زندگی میں محارم کے درمیان خواتین کے لیے اپنے ستر کے علاوہ بدن کو کھولنے کو مباح قرار دیا۔

ان سارے احکامات کے دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ خواتین اور مردوں کے درمیان فاصلہ (جدائی) ہو، کیونکہ دونوں کی زندگی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کے ساتھ شرع نے خواتین کے لیے کچھ امور کو مباح قرار دیا، کچھ امور کو مندوب اور بعض امور کو ان پر فرض کیا ہے۔ ان مباح، مندوب اور فرض امور کو ادا کرنا ہے لیکن بغیر تبرج کے، اس لباس میں جو اللہ تعالی نے بیان کر دیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے: **وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوْبِهِنَّ** (النور:31)"اور ان کو چاہیے کہ اپنی چادروں کو اپنے سینوں پر ڈال لیں"۔ یہ جسم کے اوپری حصے کے لباس کے بارے میں ہے، پھر یہ ارشاد کہ **يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ**(الاحزاب:59)"اپنے جلباب (برقعہ) اپنے اوپر ڈال لیں"۔ یہ نچلے لباس کے بارے میں ہے کیونکہ جلباب وہ لباس ہے جو عام کپڑوں کے اوپر پہنا جاتا ہے۔ جوہری نے الصحاح میں کہا ہے کہ:"جلباب اوڑھا جاتا ہے"۔ جبکہ القاموس المحیط میں ہے کہ:"جلباب سرداب اور سنمار کے وزن پر کھلی قمیص کی طرح ہے جو عورت چادر کی مانند اوڑھتی ہے جس سے عام پہننے کے کپڑے چھپ جاتے ہیں"۔ اور (اِدناء) سے مراد کپڑے کو نیچے تک لٹکانا ہے۔ اللہ تعالی کے اس ارشاد کہ: **غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِيْنَةٍ** (النور:60) سے مراد تبرج نہ کرنا ہے۔

شرع نے جو امور عورت کے لیے مباح قرار دیے ہیں مثلاً خرید وفروخت، اجارہ، وکالہ وغیرہ، جو اس پر واجب کیے ہیں جیسے حج کی ادائیگی، زکوۃ دینا وغیرہ اور جو اس کے لیے مندوب ہیں جیسے نفلی صدقہ، مساکین کی خدمت، مریض کی تیمارداری وغیرہ؛ ان اعمال کی ادائیگی کے لیے نکلنا اور مردوں کے ساتھ اکٹھا ہونا عورت کے لیے جائز ہے لیکن اس کے لیے لباس وہی ہوگا جو شرع نے مقرر کیا ہے۔ یہ وہ ضروریات ہیں جو شرع میں اس کے لیے واجب، مباح یا مندوب ہونے کی حیثیت سے جائز ہیں۔ پھر ان اعمال کی ادائیگی کے لیے مردوں کے ساتھ اجتماع کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ یہ دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اسلام کا طریقۂ زندگی یہ ہے کہ خاص زندگی (پرائیویٹ لائف) میں خواتین (غیر محرم) مردوں سے الگ رہیں اور عام زندگی (پبلک

لائف) میں عورتیں شرعی لباس کے اندر رہتے ہوئے فرض، مندوب اور مباح کی ادائیگی کے لیے مردوں کے ساتھ اکٹھا ہو سکتی ہیں۔ یہ اس دفعہ کے دلائل تھے۔

دفعہ نمبر 114: عورت کو بھی وہی حقوق دیئے جائیں گے جو مردوں کو دیئے جاتے ہیں، اس کے بھی وہی فرائض اور ذمہ داریاں ہیں جو مردوں کی ہیں۔ تاہم اسلام نے کچھ احکامات خصوصی طور پر عورتوں کے ساتھ مخصوص کیے ہیں یا شرعی دلیل کے مطابق مردوں کے ساتھ خاص کیے ہیں وہ الگ ہیں۔ عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تجارت کرے، زراعت یا صنعت سے وابستہ ہو جائے، معاہدات اور معاملات کو نبٹائے، وہ ہر قسم کی املاک کی مالک بن سکتی ہے، خود یا کسی کے ذریعے اپنے اموال کو بڑھا سکتی ہے، خود براہ راست زندگی کے تمام امور کو انجام دے سکتی ہے۔

اس دفعہ کی دلیل یہ ہے کہ شارع (اللہ تعالیٰ) نے جس وقت بندوں سے خطاب کیا، ان کے مرد یا عورت ہونے کو نظر انداز کرتے ہوئے بحیثیت انسان ان کو مخاطب کیا۔ ارشاد ہے **يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا** (الاعراف:158) "اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں"۔ اور فرمایا **يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ** (الحج:1) "اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو"۔ اور فرمایا **يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ** (الانفال:24) "اے ایمان والو ! اللہ اور رسول (کی پکار پر) جواب دو"۔ اسی طرح فرمایا: **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ** (البقرہ:183) "روزے تم پر لکھ دیے گئے ہیں"۔ اور ارشاد ہے: **فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ** (البقرۃ:185) "تم میں سے جو چاند دیکھے اس کو چاہیے کہ روزہ رکھے"۔ فرمایا: **وَاَقِيْمُوا الصَّلَاةَ** (البقرۃ:43) "اور نماز قائم کرو"۔ اور فرمایا: **خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً** (التوبہ:103) "ان کے اموال میں سے (زکوٰۃ) لے لو"۔ اور ارشاد ہے **اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ** (التوبہ:60) "صدقات (زکوٰۃ) تو صرف فقراء اور مساکین کے لیے ہیں"۔ اور ارشاد ہے **وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ** (التوبہ:34) "اور جو

لوگ سوناچاندی جمع کرتے رہتے ہیں"۔ اور فرمایا **وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا** (البقرہ:275)"اور اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے"۔ اس کے علاوہ بھی نصوص ہیں، ان تمام نصوص میں شارع (اللہ تعالیٰ) نے مخاطب کے مرد یا عورت ہونے سے قطعِ نظر ایک عام خطاب کیا ہے، شارع کے خطاب میں موجود یہ عمومیتِ عام ہی باقی رہے گی۔ یوں شریعت انسان کے لیے ہے کسی مرد کے مرد ہونے کے لحاظ سے نہیں اور نہ ہی کسی عورت کے لیے اس کی عورت ہونے کے لحاظ سے ہے بلکہ یہ انسان کے بحیثیت انسان ہونے کے لحاظ سے ہے۔ شرع میں جتنی شرعی تکالیف ہیں وہ صرف انسان کے لیے آئی ہیں اسی طرح اس میں جتنے بھی حقوق اور واجبات ہیں وہ انسان کے لیے اور انسانوں پر ہیں۔ یہی اس بات کی دلیل ہے جو اس دفعہ میں ہے کہ عورت کو بھی وہی حقوق دیئے جائیں گے جو مردوں کو دیئے جاتے ہیں، اس کے بھی وہی فرائض ہیں جو عورتوں کے ہیں کیونکہ شرع انسان کے لیے آئی ہے اور یہ دونوں ہی انسان ہیں۔ یہ صرف خواتین یا مردوں کے لیے نہیں بلکہ شارع کی جانب سے انسان کو خطاب میں یہ دونوں احکامِ شرعیہ کے سامنے برابر ہیں۔

شارع کے خطاب میں یہ عمومیت پوری شریعت میں باقی رہے گی، یہ عمومیت ہر حکم میں باقی رہے گی جب تک کہ شرع میں شرعی نص کے ذریعے عورت کے ساتھ خاص حکم وارد نہ ہو یا شرعی نص کے مطابق مرد کے متعلق کوئی خاص حکم وارد نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تب ہی یہ کہا جائے گا کہ یہ حکم عورت کے ساتھ خاص ہے یا یہ حکم مرد کے ساتھ خاص ہے۔ جبکہ باقی شریعت انسان کے لیے اپنی عمومیت پر ہی رہے گی قطع نظر کہ وہ انسان مرد ہے یا عورت۔ "اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں"، "اے ایمان والو! اللہ اور رسول ﷺ کی پکار کا جواب دو"، "اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو"، "تم میں سے جو چاند دیکھے اس کو چاہیے کہ روزہ رکھے"، "اپنے میں سے دو عادل لوگوں کو گواہ بناؤ" وغیرہ، یہ سارے احکامات انسان کے لیے اپنی عمومیت پر ہی رہیں گے قطع نظر کہ وہ انسان مرد ہے یا عورت۔

اصل یہی ہے کہ شارع نے انسان کے لیے شریعت اتاری، محض عورت یا مرد کے لیے نہیں بلکہ ان دونوں کے لیے انسان ہونے کے ناطے شریعت کو نازل کیا۔ پھر اس کے بعد شارع نے عورت سے متعلق کچھ

خاص شرعی احکامات یا مرد کے لیے بعض مخصوص احکامات دیئے۔ مرد یا عورت سے متعلق یہ مخصوص احکامات اس حد تک ہوں گے جو شرع نے بتا دیے ہے اور اس سے تجاوز نہیں کریں گے، ان کا مرد یا عورت کے ساتھ مخصوص ہونا(تخصیص) صریح نص کے وارد ہونے سے ہی ہو گا، مرد یا عورت کے لیے متعین احکامات کی یہ تخصیص اس عمومیت سے مستثنیٰ ہوتی ہے جو کہ شرع میں ہے اس لیے شریعت کا عموم اپنی جگہ بر قرار رہے گا۔
مثال کے طور پر کچھ احکامات خواتین کے ساتھ مخصوص ہیں اور مردوں کے لیے نہیں جیسے (خاص دنوں میں) نماز کو ترک کرنا، حیض کے دنوں میں رمضان کے روزے نہ رکھنا۔ اسی طرح ایک عورت کی شہادت کو ایسے مسائل میں کافی قرار دیا گیا ہے جو صرف خواتین کو ہی معلوم ہوتے ہیں: جیسے بکارت (لڑکی کے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے) کا مسئلہ۔ اس میں عام شہادت کے نصاب کی شرط نہیں ہوتی، بلکہ یہ عورت کا مخصوص مسئلہ ہے جس کے بارے میں نصوص وارد ہوئی ہیں لیکن یہ خاص ہونا عورت تک ہی محدود ہو گا مرد کے لیے نہیں ہو گا، کیونکہ نص اسی کے بارے میں ہے۔ لیکن کسی اور مسئلے میں یہ تخصیص نہیں ہو گی بلکہ شارع کا خطاب اسی طرح عام ہی رہے گا کیونکہ اس میں مرد یا عورت کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ وہ خطاب انسان کے لیے ہے۔
کچھ احکامات صرف مردوں کے لیے بھی ہیں جیسے حکمرانی، چنانچہ حکمران صرف مرد ہی ہو سکتا ہے، یہ حکم مردوں کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ اس کے بارے میں نص وارد ہے۔ لیکن یہ اختصاص صرف حکمرانی کے بارے میں ہے عدلیہ یا کسی ریاستی محکمے کی سربراہی کے بارے میں نہیں کیونکہ نص صرف حکمران یا اولی الامر کے بارے میں ہے کسی اور چیز بارے میں نہیں۔ اس لیے جس چیز کے بارے میں نص وارد ہوئی ہے معاملہ صرف اس تک ہی محدود رہے گا۔ جہاں تخصیص کرنے والی نص نہ ہو وہاں بالکل تخصیص نہیں کی جائے گی، بلکہ مرد اور عورت دونوں صرف انسان ہونے کی حیثیت سے شرع کے مخاطب ہوں گے، مرد یا عورت ہونے کی حیثیت سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں عورت یا مرد کے حقوق یا عورت اور مرد کے فرائض کا کوئی وجود نہیں، بلکہ اسلام میں یہ ہے کہ انسان کے بحیثیت انسان ہونے کے حقوق اور فرائض ہیں قطع نظر اس کے کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ شریعت اپنے تمام احکامات کے لحاظ سے انسانوں کے لیے عام ہے پھر اس میں سے بعض

احکامات کا استثناء (تخصیص) ،خاص نصوص کے ذریعے کیا گیا اور ان کے ذریعے عورت کو عورت ہونے کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا۔ جبکہ بعض احکامات کو مستثنیٰ کر کے خاص نص کے ذریعے ان سے مرد کو مرد ہونے کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا۔ شریعت کی عمومیت اور اس کے احکامات میں سے ہر حکم کے عام ہونے کی بنا پر عورت بھی مرد کی طرح تجارت، زراعت اور صنعت کاری کر سکتی ہے کیونکہ شارع کا خطاب انسان کے لیے ہے۔ اسی طرح تمام قولی تصرفات جیسے عقود (معاہدے) اور معاملات انجام دے سکتی ہے کیونکہ شارع کا خطاب انسان کے لیے ہے۔ ملکیت کے اسباب میں سے کسی بھی سبب کے ذریعے مالک بن سکتی ہے اور کسی بھی طریقے سے خود یا کسی اور کے ذریعے اپنے اموال کو بڑھا سکتی ہے کیونکہ شارع کا خطاب انسان کے لیے ہے۔ تعلیم حاصل کر سکتی ہے اور دے سکتی ہے کیونکہ شارع کا خطاب انسان کے لیے ہے۔ سیاست کر سکتی ہے، سیاسی پارٹیوں میں حصہ لے سکتی ہے، حکمرانوں کا احتساب کر سکتی ہے کیونکہ شارع کا خطاب انسانوں کے لیے ہے۔ یوں عورت زندگی کے تمام ضروری معاملات میں احکامِ شرع کے مطابق مردوں کے شانہ بشانہ حصہ لے سکتی ہے کیونکہ شارع کا خطاب انسانوں کے لیے ہے۔

دفعہ نمبر115: عورت کو ریاست میں ملازم مقرر کرنا جائز ہے۔ وہ قاضی مظالم کے علاوہ قضاء کے دوسرے مناصب پر فائز ہو سکتی ہے۔ وہ مجلسِ امت کے اراکین کو منتخب کر سکتی ہے، خود بھی اس کی رکن بن سکتی ہے، خلیفہ کے انتخابات میں شریک ہو سکتی ہے اور خلیفہ کی بیعت کر سکتی ہے۔

اس کی دلیل وہی اجارہ (ملازمت) کی دلیل ہے کیونکہ ایک عام ملازم بھی اجیر (اجرت لینے والا) ہے اور قاضی بھی۔ اجارہ کی دلیل عام اور مطلق ہے: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **«أَعْطُوا الأَجِيرَ أَجْرَهُ قَبْلَ أَنْ يَجِفَّ عَرَقُهُ»** "ملازم کو اس کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو"، اس کو ابنِ ماجہ نے عبد اللہ بن عمرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ یہاں لفظ اجیر ایک عام لفظ ہے جو مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ اسی طرح بخاری نے ابو ہریرۃؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے رب سے روایت

کرتے ہوئے فرمایا «**ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ**» " میں قیامت کے دن تین آدمیوں کا خود مدمقابل ہوں گا"، یہاں تک کہ فرمایا «**وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَاسْتَوْفَى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِ أَجْرَهُ**» "اور وہ آدمی جس نے اجرت پر ملازم رکھا کام تو اس سے پورا لیا لیکن اس کو اجرت نہیں دی"۔ یہاں لفظ (اجیر) مطلق ہے جو مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے۔ اجارہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ عوض کے بدلے منفعت کا عقد (معاہدہ) ہے۔ حکومتی دفاتر میں کام کرنا، قضاء (عدلیہ) میں کام کرنا، یہ سب منفعت (نفع) ہے جس کے لیے ریاست اور ملازم کے درمیان عوض، جو کہ تنخواہ ہے، کے بدلے عقد (کنٹریکٹ) موجود ہوتا ہے۔ عمرؓ نے الشفاء جو ان کی قوم کی ایک خاتون تھی کو مدینہ میں قاضی حسبہ مقرر کیا۔ البتہ خاتون کا قاضی مظالم بننا جائز نہیں، وہ قاضی القضاء بھی نہیں بن سکتی کیونکہ یہ المظالم کے قاضیوں کے اوپر مسئول ہوتا ہے جو کہ حکمرانی میں آتا ہے۔

جہاں تک مجلس امت کا تعلق ہے تو یہ شوریٰ اور محاسبہ کے لیے ہے اور شوریٰ اس عام دلیل سے ثابت ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران:159) "اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہا کیجئے"۔ اور وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ:38) "اور ان کا ہر کام مشورے سے ہوتا ہے"۔ جس وقت مسلمانوں نے حلق (بال مونڈھنے) اور تقصیر (بال کاٹنے) سے انکار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ام سلمہؓ کے پاس جاکر فرمایا «**لَقَدْ هَلَكَ الْمُسْلِمُونَ**» "بے شک مسلمان ہلاک ہوگئے"، اسے بخاری نے مِسوَر بن مخرمہ سے روایت کیا ہے پھر سارا قصہ بیان کیا ہے۔ ام سلمہؓ نے آپ ﷺ سے عرض کی کہ: آپ خود بال صاف کیجئے وہ آپ ﷺ کے خلاف نہیں کریں گے، آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا تو وہ بھی اٹھے اور بال چھوٹے کیے یا صاف کردیے۔ پھر ام سلمہؓ نے کہا کہ ان کو لے کر جلدی سفر کیجئے، آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ یہاں آپ ﷺ نے ایک خاتون کی رائے لی جو اس بات کی دلیل ہے کہ ہر قسم کے سیاسی اور غیر سیاسی امور میں خواتین سے رائے لی جا سکتی ہے۔ مجلسِ شوریٰ کا ممبر صرف رائے دینے میں وکیل (نمائندہ) ہوتا ہے۔ اور وکالت جس طرح مرد کے لیے جائز ہے بالکل اسی طرح عورت کے لیے بھی جائز ہے کیونکہ اس کی دلیل عام ہے۔ یہی حال

محاسبہ کا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی نصوص عام ہونے کی وجہ سے مرد اور عورت دونوں کے لیے ہیں۔ مسلم نے امِ سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«سَتَكُونُ أُمَرَاءُ فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ، فَمَنْ عَرَفَ بَرِئَ، وَمَنْ أَنْكَرَ سَلِمَ، وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ، قَالُوا: أَفَلاَ نُقَاتِلُهُمْ ؟ قَالَ: لا مَا صَلَّوْا»** ''عنقریب ایسے حکمران ہوں گے جن کو تم پہچانو گے اور ناپسند کرو گے، جس نے ان کو پہچانا وہ بَری ہوا۔ جس نے ان کا انکار کیا وہ سلامت رہا۔ لیکن جو راضی ہو کر تابعداری کرتا رہا (وہ بَری ہوا نہ سلامت رہا)۔ انہوں کہا: کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں''۔ یہاں نماز اسلام کے مطابق حکومت کرنے سے کنایہ ہے اور حدیث عام ہے، یہ مرد اور عورت ہر ایک کے لیے ہے۔ جس طرح مردوں نے حکمرانوں کا محاسبہ کرنا ہے خواتین نے بھی کرنا ہے۔

مردوں کی جانب سے حکمران کے احتساب کے حوالے سے بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ ''جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ابو بکرؓ خلیفہ بنے، اہلِ عرب میں سے کچھ لوگ مرتد ہو گئے۔ عمرؓ نے کہا: ان لوگوں سے کیسے لڑ سکتے ہو، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: مجھے اس وقت تک لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ لا الہ الاّ اللہ نہ کہیں، جس نے یہ کہا اس نے اپنا مال اور جان ہم سے محفوظ کر لیا سوائے اس کے جو حق ہے، اس کا حساب اللہ پر ہے۔ اس پر ابو بکرؓ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں ضرور ان لوگوں سے قتال کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں۔ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اللہ کی قسم! اگر وہ مجھے چھوٹی سی رسی بھی نہ دیں جو وہ رسول اللہ ﷺ کو دیتے تھے تو میں اس پر ان سے قتال کروں گا''۔ عمرؓ نے کہا: ''اللہ کی قسم! اصل بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ابو بکر کا دل کھول دیا تھا، میں نے بھی سمجھ لیا کہ یہی حق ہے''۔

رہی بات خواتین کی جانب سے حکمران کے احتساب کی تو جس وقت عمرؓ نے عورت کے مہر کے بارے میں یہ کہا کہ چار سو درہم سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک عورت نے یہ ماننے سے انکار کیا اور کہا: ''اے عمر! آپ ایسا نہیں کر سکتے ہیں، کیا آپ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا ہے: **وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا** (النساء :20) ''اگر تم نے انہیں خزانے بھی دیے ہوں تو اس میں سے کچھ بھی

واپس مت لو۔ تب عمرؓ نے فرمایا: ایک عورت نے صحیح بات کی اور عمرؓ نے غلطی کی۔ اس کو قرطبی نے اپنی تفسیر میں، آمدی نے اپنی احکام میں اور غزالی نے اپنی مستصفیٰ میں روایت کیا ہے۔

عورت کی جانب سے خلیفہ کو منتخب کرنے کے لیے انتخابات میں حصہ لینے اور خلیفہ کی بیعت کرنے کے حوالے سے امِ عطیہؓ کی حدیث صریح ہے کہ خواتین نے بیعت کی۔ بخاری نے ام عطیہؓ کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ **«بَايَعْنَا النَّبِيَّ ﷺ فَقَرَأَ عَلَيْنَا أَنْ لاَ يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَنَهَانَا عَنِ النِّيَاحَةِ، فَقَبَضَتِ امْرَأَةٌ مِنَّا يَدَهَا ...»** ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تو آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی اور ہمیں نوحہ سے منع فرمایا تو ہم میں سے ایک عورت نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا..."۔ اسی طرح آیتِ کریمہ میں بھی ہے کہ **اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ** (الممتحنہ:12) "جب مومن عورتیں بیعت کے لیے تمہارے پاس آئیں"۔ یہ بھی عورتوں کی بیعت کے حوالے سے صریح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کے لیے جائز ہے کہ خلیفہ کو منتخب کرے اور اس کی بیعت کرے۔

دفعہ نمبر 116: عورت کا حکمران بننا جائز نہیں۔ اس لیے وہ خلیفہ، معاون، والی اور عامل نہیں بن سکتی اور نہ ہی ایسا کوئی بھی عہدہ لے سکتی ہے جو براہِ راست حکمرانی میں آتا ہے۔ وہ قاضی القضاء، محکمہ مظالم میں قاضی اور امیر جہاد بھی نہیں بن سکتی۔

اس دفعہ کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں بخاری نے ابی بکرہ سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی کہ اہلِ فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنی ملکہ بنالیا ہے تو فرمایا: «لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً» "وہ قوم ہرگز فلاح (بھلائی) نہیں پائے گی جس نے اپنی حکمرانی عورت کے سپرد کردی"، اس حدیث کو بخاری نے ابی بکرہ سے روایت کیا ہے۔ یہ صریح ہے کہ عورت کو حکمران بنانا جائز نہیں۔

ہر وہ عمل جس کا تعلق حکمرانی سے ہے جیسے خلیفہ بننا، معاون بننا، والی بننا، قاضی القضاء بننا، قاضی مظالم بننا یا کسی عمالہ (ضلع) کا عامل بننا عورت کے لیے مطلقاً جائز نہیں کیونکہ حدیث صریح ہے۔

جہاں تک امیر جہاد نہ بننے کی بات ہے تو اگرچہ یہ حکمرانی میں نہیں آتا، لیکن یہ اس لیے ہے کہ جہاد عورت پر فرض ہی نہیں تو جو کام اس پر فرض نہیں وہ اس کی امیر بھی نہیں بن سکتی۔

دفعہ نمبر 117: عورت کی ایک خاص زندگی ہے اور ایک عام۔ عام زندگی میں وہ خواتین، محرم مردوں اور غیر محرم مردوں کے ساتھ اس طرح رہ سکتی ہے کہ اس کے ہاتھوں اور چہرے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آنا چاہیے۔ بے پردہ اور زینت کا اظہار بھی نہ ہو۔ خاص زندگی میں صرف خواتین اور محرم مردوں کے ساتھ رہنا ہی اس کے لیے جائز ہے۔ غیر محرم مردوں کے ساتھ رہنا اس کے لیے بالکل جائز نہیں۔ دونوں حالتوں میں احکام شرعیہ کی پابندی لازمی ہے۔

اس دفعہ کی دلیل استیذان (اجازت طلب کرنے) والی آیت ہے: **لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا** (النور:27) "اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں تعارف اور سلام کے بغیر داخل نہ ہو"۔ اسی طرح محارم کے سامنے زینت ظاہر کرنے والی آیت **وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوَاتِهِنَّ** (النور:31) "اور اپنی زینت کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں سوائے اپنے شوہروں کے یا اپنے باپ کے سامنے یا اپنے سُسر کے سامنے یا اپنے بیٹوں کے سامنے یا اپنے شوہروں کے سامنے یا اپنے بھائیوں کے سامنے یا اپنے بھتیجوں کے سامنے یا پھر اپنی بہنوں کے سامنے"۔ یہ آیت خاص زندگی (پرائیویٹ لائف) کی دلیل ہے۔ اسی طرح کامل لباس یعنی خمار کا آیت میں ذکر **وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ** (النور:31) "اور اپنی چادر کو اپنے سینے پر ڈال لیں" جلباب والی

آیت يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ (الاحزاب:59)"اپنے جلباب کو اپنے اوپر ڈال لیں"، عدم تبرج والی آیت غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِيْنَةٍ (النور:60)"اپنی زینت کو ظاہر کرتے ہوئے بے پردگی سے نہ نکلو"۔ یہ آیات ان نصوص کے ساتھ جو اُن واجبات، مندوبات اور مباحات پر دلالت کرتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں طور پر مشروع قرار دیا ہے عام زندگی (پبلک لائف) کی دلیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح خواتین کے لیے عام زندگی میں مردوں کے ساتھ زندگی گزارنے کو مباح قرار دیا ہے اسی طرح تجارت، زراعت، صنعت، ریاست کی ملازمت، سیاسی سرگرمیوں اور وابستگیوں، حکمرانوں کے احتساب اور کارزارِ زندگی سرگرم رہنے کو مباح قرار دے کر اس کے لیے کچھ خاص احکامات دیے ہیں۔ عام زندگی کے لیے اس کے لباس کا بھی تعین کر دیا جس میں ہاتھ اور چہرے کے علاوہ پورے بدن کو ڈھانپنا ہوگا اور اظہارِ زینت بھی نہیں ہو گا۔ ارشاد ہے وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (النور:31)"اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو (عادتاً) ظاہر ہوتا ہے"، ابنِ عباسؓ نے کہا ہے کہ یہ چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں۔ اس کو بیھقی نے سنن الکبریٰ میں، ابن عبد البر نے التمہید میں اور ابنِ کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ الْجَارِيَةَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ يَصْلُحْ أَنْ يُرَى مِنْهَا إِلاَّ وَجْهُهَا وَيَدَاهَا إِلَى الْمِفْصَلِ»"لڑکی جس وقت بالغ ہو جائے اس کے چہرے اور کلائیوں تک ہاتھ کے علاوہ کچھ نہیں دِکھنا چاہیے"، اس کو ابوداؤد نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ ارشادِ باری ہے: غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِيْنَةٍ (النور:60)"بے پردگی سے زینت کا اظہار کرنے والی نہ ہو"۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَيُّمَا امْرَأَةٍ اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ عَلَى قَوْمٍ لِيَجِدُوا مِنْ رِيحِهَا فَهِيَ زَانِيَةٌ» "جو عورت خوشبو لگا کر اس لیے لوگوں کے پاس سے گزرتی ہے تاکہ وہ اس کی خوشبو سونگھ لیں تو وہ زناکار ہے"۔ اس کو نسائی نے ابو موسیٰ الاشعریؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ حاکم نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے اور ذھبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے۔ جس وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عورت کے لیے خاص زندگی میں رہن سہن کی حدود مقرر کیں تو گویا اس کو عورتوں، محارم اور بچوں کے علاوہ کسی کے ساتھ رہائش سے منع فرمایا۔ اس خاص زندگی

میں اس کو خواتین، محارم اور بچوں کے علاوہ دوسروں کے سامنے لباس میں تبذل (بے پردگی) سے منع فرمایا، ارشاد فرمایا **وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ** (النور: 31) ''اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں...''۔ اس خاص زندگی میں اس کے پاس تنہائی میں بغیر اجازت کے آنے سے منع فرمایا خواہ داخل ہونے والا محرم ہو یا غیر محرم۔ ارشاد فرمایا: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا** (النور: 27) ''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ گھر والوں میں سے تعارف اور سلام کے بغیر داخل نہ ہو''۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو اس کی ماں کے گھر میں داخل ہونے کے لیے بھی اجازت لینے کا حکم دیا۔ یہ اس دفعہ کے دلائل تھے۔

دفعہ نمبر118: غیر محرم کے ساتھ خلوت (تنہائی) ممنوع ہے۔ اسی طرح غیر محرموں کے سامنے تبرج (زینت دکھانے) اور ستر کھلا رکھنے سے روکا جائے گا۔

اس دفعہ میں تین امور کا بیان ہے:

اول: خلوت (تنہائی) کی ممانعت۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ **«وَلاَ يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ، فَإِنَّ ثَالِثَهُمَا الشَّيْطَانُ»** ''کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ خلوت میں نہ رہے کیونکہ اس وقت ان دونوں کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے''، اس کو احمد نے صحیح اسناد کے ساتھ عمرؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ **«لاَ يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلاَّ وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ»** ''کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ بغیر محرم کے اکیلے میں نہ رہے''، اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

دوسرا: تبرج سے منع کیا گیا ہے۔ جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۢ بِزِيْنَةٍ** (النور: 60) ''زینت کا اظہار کرنے والی نہ ہو''۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ **وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ** (النور: 31) ''اور (زمین پر زور سے) اپنا پاؤں نہ ماریں کہیں اس سے

زینت (زیور وغیرہ کا کسی کو) علم نہ ہو جس کو وہ چھپانا چاہتی ہیں''۔ اس میں تبرج والے کاموں سے منع کیا گیا ہے۔ لغت میں تبرج زینت کے اظہار کو کہتے ہیں، قاموس المحیط میں کہا گیا ہے: **وتبرجت أظهرت زينتها للرجال** 'تبرج کا مطلب مردوں کے لیے اپنی زینت کا اظہار ہے'۔ تبرج کے لفظ کا شرعی معنی بھی یہی ہے۔ تبرج الگ ہے زینت کرنا الگ ہے۔ زینت کرنا اور زینت کا اظہار کرنا دونوں الگ الگ کام ہیں۔ زینت اگر اس طرح ہو کہ اس کی طرف مردوں کی توجہ نہ ہوتی ہو تو وہ تبرج نہیں، اس لیے تبرج کا مطلب صرف زینت کرنا نہیں بلکہ اس طرح زینت کرنا کہ اس کے سبب مرد متوجہ ہوں تبرج کہلاتا ہے کیونکہ تبرج کا مطلب اجنبی لوگوں کے سامنے زینت اور خوبصورتی کا اظہار کرنا ہے۔ 'عورت نے تبرج کیا' کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اجنبیوں کے سامنے اپنی زینت کو نمایاں کیا۔ اس کی تائید ان نصوص سے بھی ہوتی ہے جن میں تبرج والے کاموں سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے کہیں بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ زینت سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے **وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ** ''اور وہ (زمین پر زور سے) اپنا پاؤں نہ ماریں تاکہ ان کی وہ زینت ظاہر نہ ہو جس کو وہ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں''۔ اس میں واضح طور پر حکم ہے کہ اپنی زینت کا اظہار نہ کریں کیونکہ فرمایا 'تاکہ ان کی وہ زینت (اجنبیوں) کو معلوم نہ ہو جو چھپی ہوئی ہے'۔ اور ابو موسیٰ الاشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«أَيُّمَا امْرَأَةٍ اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ عَلَى قَوْمٍ لِيَجِدُوا مِنْ رِيحِهَا فَهِيَ زَانِيَةٌ»** ''جو عورت خوشبو لگا کر اس لیے لوگوں کے پاس سے گزرے کہ لوگ اس کی خشبو سونگھ لیں تو وہ زانیہ ہے''۔ یعنی وہ زانیہ کی طرح ہے۔ اس کو نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس میں بھی تبرج والے عمل سے منع کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس قول میں کہ: ''جو عورت خوشبو لگا کر اس لیے لوگوں کے پاس سے گزرتی ہے کہ لوگ اس کی خوشبو سونگھ لیں''، واضح طور پر اظہارِ زینت سے منع کیا گیا ہے، یعنی اس لیے خوشبو لگانا کہ لوگ سونگھ لیں۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«صِنْفَانِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَمْ أَرَهُمَا: قَوْمٌ مَعَهُمْ سِيَاطٌ كَأَذْنَابِ الْبَقَرِ يَضْرِبُونَ بِهَا النَّاسَ، وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيلاَتٌ مَائِلاتٌ رُءُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ، لاَ يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلا يَجِدْنَ رِيحَهَا، وَإِنَّ**

رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ كَذَا وَكَذَا» ''اہلِ جہنم میں سے دو قسم کے لوگ جن کو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ایک وہ لوگ جن کے پاس گائے کے دم کی طرح کوڑے ہیں جن سے وہ لوگوں کو مار رہے تھے اور وہ عورتیں جو کپڑے پہن کر بھی ننگی ہیں جو (مردوں کو) مائل کرتی ہیں اور (خود) مائل ہوتی ہیں، ان کے سر اونٹنی کے کوہان کی طرح ہیں۔ یہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور نہ ہی اس کی خوشبو پائیں گی، حالانکہ اس کی خوشبو بہت دور سے آتی ہے''، اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ بھی تبرج والے اعمال سے منع کرتی ہے کیونکہ اس میں واضح طور پر ہے **"كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ"** یعنی اظہار زینت کرنے والی۔ اسی حدیث میں ہے کہ **"مُمِيلاَتٌ مَائِلاتٌ"** یعنی مائل کرنے والی اور مائل ہونے والی، ایسی حرکات کرنے والی جن سے وہ مردوں کی توجہ حاصل کرتی ہیں۔ اس حدیث میں یہ بھی فرمایا: ''ان کے سر مائل ہونے والی اونٹنی کے کوہان کی طرح ہیں''، یعنی وہ اپنے بالوں کی زینت کو ظاہر کرنے والی ہیں یعنی وہ اپنے بالوں کو بڑھا کر کے ان کو لپیٹ کر گٹھا بنا کر خراسانی اونٹنی کے کوہان کی طرح بناتی ہیں۔ یہ واضح ہے کہ وہ ایسا مردوں کے سامنے زینت کے اظہار کے لیے کرتی ہیں۔ یوں وہ تمام نصوص جو تبرج والے اعمال سے منع کرنے کے بارے میں ہیں، مردوں کو مائل کرنے کے لیے زینت کے اظہار سے منع کرتی ہیں۔ یہ تبرج کے لغوی معنی کی تائید کرتی ہیں کہ وہ زینت کا اظہار ہے محض زینت نہیں۔ لغوی اعتبار سے تبرج ہی ممنوع ہے، احادیث میں جو ممنوع ہے اس کا مدلول بھی یہی ہے۔ وہ زینت ممنوع نہیں جس میں تبرج نہ ہو۔

تیسرا: اجنبیوں کے سامنے عورت (ستر) کو نہ کھولنا، عورت پر اپنے چہرے اور ہاتوں کے علاوہ تمام بدن کو چھپانا فرض ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے کہ **وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا** (النور:31) ''اور اپنی زینت کا اظہار نہ کریں مگر جو (عادتاً) ظاہر ہوتا ہے''۔ ابنِ عباسؓ نے کہا: یہ ہاتھ اور چہرہ ہے۔ اس کو بیہقی نے سنن الکبریٰ میں اور ابن عبد البر نے التمہید میں اور ابن کثیر نے التفسیر میں روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّ الْجَارِيَةَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ يَصْلُحْ أَنْ يُرَى مِنْهَا إِلاَّ وَجْهُهَا وَيَدَاهَا إِلَى الْمِفْصَلِ»** ''لڑکی جب بالغ ہو جائے تو اُس کے چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ کوئی

حصہ نظر نہیں آنا چاہیے"، اس کو ابو داؤد نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ عورت کا سارا بدن ستر ہے اور اس کو چھپانا فرض ہے۔

شارع نے لباس میں یہ شرط رکھ دی کہ یہ جلد کو چھپائے، اس لیے ایسا لباس پہننا فرض ہے جس سے چمڑے کا رنگ نظر نہ آئے یعنی جلد پوشیدہ رہے، یہ نظر نہ آئے کہ رنگ گورا، سرخ، گندمی یا کالا ہے یعنی پردہ (کپڑا) اس طرح ہو کہ اس سے یہ نظر نہ آئے کہ رنگ گورا یا سرخ ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ستر کو چھپایا ہوا ہے۔ اگر کپڑا اتنا باریک ہو کہ اس کے نیچے جسم کی رنگت نظر آرہی ہو تو اس کو مستور (جسم کو چھپایا ہوا) نہیں کہا جا سکتا بلکہ کہا جائے گا کہ ستر کھلا ہوا ہے کیونکہ رنگت کو چھپائے بغیر ستر نہیں ہو سکتا۔ شارع نے فرمایا: "چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آنا چاہیے"۔ اس میں شارع نے ستر کے لیے یہ شرط لگا دی کہ لباس ایسا ہونا چاہیے کہ اس سے جسم نظر نہ آئے، اس لیے عورت کے کپڑے ایسے ہونے چاہیے کہ اس کے نیچے بدن نظر نہ آئے۔

دفعہ نمبر 119 : مرد اور عورت دونوں کو ایسے کسی بھی کام سے روکا جائے گا جو اخلاقی لحاظ سے تباہ کن ہو یا معاشرے میں فساد کا باعث ہو۔

اس دفعہ کی دلیل وہ ہے جو رافع بن رفاعہ نے کہا ہے کہ "اور (رسول اللہ ﷺ نے) ہمیں باندی کے ہاتھ کی کمائی کے علاوہ اس کی ہر قسم کی کمائی سے منع کیا گیا ہے..." اس کو احمد نے روایت کیا ہے اور زین اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ یعنی عورت کو ہر اس کام سے روکا جائے گا جس میں اس کے جنس (عورت ہونے) سے (غلط) فائدہ اٹھایا جائے، باقی اعمال اس کے لیے مباح ہی ہوں گے۔ مذکورہ حدیث کے لفظ "سوائے اس کے ہاتھ کی کمائی کے" سے یہی علم حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اس کے ہاتھ کی مشقت سے فائدہ اٹھانا مقصود ہو، جس سے یہ بھی مفہوم نکلتا ہے کہ اس کے جنس سے فائدہ اٹھانا مقصود نہ ہو۔ مزید یہ کہ شرعی قاعدہ ہے

کہ ”حرام کاوسیلہ بھی حرام ہے“۔ پس ہر اس کام سے روکا جائے گا جو حرام تک پہنچنے کا وسیلہ (ذریعہ) ہو، خواہ یہ غالب گمان سے ہی کیوں نہ ہو۔ ایک اور شرعی قاعدہ ہے کہ ”مباح چیز کی کوئی قِسم ضرر (نقصان) کا سبب بنتی ہو تو صرف اُس قِسم کو ہی منع کیا جائے گا باقی چیز مباح ہی رہے گی“۔ اس لیے ہر شخص کو خواہ مرد ہو یا عورت کسی بھی ایسے مباح کام کو کرنے سے روکا جائے گا جس کو کرنے میں اس شخص کے لیے ضرر ہو یا امت کے لیے ضرر ہو یا معاشرے کے لیے ضرر ہو اور اس ضرر کی نوعیت کوئی بھی ہو۔

دفعہ نمبر120: ازدواجی زندگی اطمینان کی زندگی ہوتی ہے، میاں بیوی کا رہن سہن (میل جول) ساتھیوں (دوستوں) کا ہوتا ہے۔ مرد کی بالادستی دیکھ بھال کے لحاظ سے ہوتی ہے حکمرانی کے لیے نہیں۔ عورت پر اطاعت فرض ہے جبکہ مرد پر اس کے لیے رواج (عرف) کے مطابق نفقہ۔

اس دفعہ کی دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: **هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا** (الاعراف:189) ”وہ ذات (اللہ) ہی ہے جس نے ایک ہی جان (آدم) سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کے لیے جوڑا پیدا کیا تا کہ اس کے پاس وہ سکون حاصل کرتا ہے“۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَمِنْ اٰيَاتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً** (الروم:21) ”اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لیے جوڑیاں (بیویاں) تم ہی میں سے بنائیں تا کہ تم سکون سے رہو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی“۔ اس میں لفظ لِيَسْكُنَ ہے جس کے معنی اطمینان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: **وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ** (البقرہ:228) ان کا اسی طرح حق ہے جس طرح ان پر واجب ہے“۔ ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ: شوہروں پر بیویوں کا یہ حق ہے کہ ان کے ساتھ اچھائی اور بھلائی سے پیش آئیں اور ان بیویوں کا فرض یہ ہے کہ اپنے شوہروں کی اطاعت کریں“۔ اس کو قرطبی نے اپنی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: **وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ** (النساء:19) کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ '**والعشرة**' میل جول اور دل لگی کر

نے کو کہتے ہیں۔ جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا: **«فَاتَّقُوا اللَّهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللَّهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللَّهِ»** ”عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو تم نے ان کو اللہ کی امان کی وجہ سے لیا ہے اور اللہ کے کلمے کی وجہ سے ان کے جسم تمہارے لیے حلال ہیں“، اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ سے یہ بھی روایت ہے کہ **«خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لأَهْلِي»** ”تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ اچھا ہو، اور تم سب میں سے مَیں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہوں“، اس کو ترمذی نے عائشہؓ سے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حسن صحیح غریب ہے، اس کو ابنِ حبان اور حاکم نے بھی روایت کر کے صحیح قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: **«وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ»** ”تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے لیے بہتر ہو“، اس کو ترمذی نے ابو ہریرۃؓ سے راویت کر کے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے اہل وعیال پر بہت مہربان تھے، ان کی دل جوئی کیا کرتے تھے، ان کو ہنساتے بھی تھے۔ جب عشاء کی نماز پڑھ کر گھر آتے تو سونے سے قبل تھوڑی دیر ان کے ساتھ خوش گپیاں کرتے۔ خواتین کی دل جوئی کرتے۔ یہ سب اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ازدواجی زندگی اطمینان کی زندگی ہے۔ یہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ وہ ایسا کام کرے جس سے ازدواجی زندگی اطمینان سے گزرے۔ ابنِ عباسؓ کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ: میں اپنی عورت کے لیے ایسے ہی زینت کرتا ہوں جس طرح وہ میرے لیے زینت کرتی ہے، مجھے پسند ہے کہ میں اس کا حق ادا کرنے کے لیے مکمل صفائی کروں تاکہ اس کا جو حق مجھ پر ہے اس کو پورا ادا کروں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ** (البقرۃ:228) ”ان کا اسی طرح حق ہے جس طرح ان پر واجب ہے“، اس کو قرطبی نے اپنے تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ گھر میں قوام (مسئول) مرد کو بنایا ہے جو کہ اس آیت میں ہے کہ **اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ** (النساء:34) ”مرد عورتوں پر بالادست (ذمہ دار) ہیں“۔ لیکن یہ ذمہ داری دیکھ بھال کی ہے حکمرانی کی نہیں ہے۔ قاموس المحیط میں ہے: **(وقامت المرأة تنوح طفقت، والأمرُ اعتدل كاستقام، وفي ظهري أوجعني، والرجلُ المرأةَ وعليها مانها وقام**

بشأنها)۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مرد کا عورت پر قوّام (سرپرست) ہونے کا مطلب لغوی معنی کی رُو سے عورت پر خرچ کرنا اور اس کی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ یہی لغوی معنی آیت کا معنی ہو گا کیونکہ اس کے علاوہ اس کا کوئی شرعی معنی وارد نہیں ہوا۔ یہ معنی **"قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ"** کا ہوا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اس کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ جہاں تک بات اس کے ساتھ معاشرتی صحبت (دوستی) کی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَصَاحِبَتِهِ (عبس:36)"اور اس کا ساتھی" مراد اس سے بیوی ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اپنی ازواج کے ساتھ دوستوں کی طرح میل جول رکھتے تھے، کسی مسلط امیر کی طرح نہیں۔ ازواج بھی آپ ﷺ سے بحث مباحثہ کیا کرتی تھیں۔ عمرؓ بن خطاب کے بارے میں روایت ہے: "اللہ کی قسم زمانہ جاہلیت میں ہم عورتوں کو کسی قسم کی اہمیت نہیں دیتے تھے یہاں تک کہ اللہ نے ان کے حوالے سے احکامات نازل نہیں کر دیے اور ان کے حقوق مقرر کر دیے۔ فرمایا: ایک دن میں اپنی بیوی پر حکم چلا رہا تھا کہ اس نے کہا: اگر تم یوں یا اس طرح کرو تو اچھا ہو گا۔ عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا: تم کون ہوتی ہو مجھے یہ کہنے والی؟ جو کام میں کرنا چاہتا ہوں اس میں تمہارا کیا دخل ہے؟ اس نے مجھ سے کہا: اے ابنِ خطاب! مجھے تعجب ہے کہ تم نہیں چاہتے کہ میں تم سے سوال کروں حالانکہ تمہاری بیٹی رسول اللہ ﷺ سے اس قدر سوال کرتی ہے کہ آپ ﷺ ناراضگی میں دن گزارتے ہیں۔ یہ سن کر عمرؓ کھڑے ہوئے اور اپنی چادر لے کر روانہ ہوئے اور حفصہؓ کے گھر میں داخل ہو کر فرمایا: اے میری بیٹی تو رسول اللہ ﷺ سے اس قدر سوال کرتی ہے کہ آپ ﷺ سارا دن ناراضگی میں گزارتے ہیں؟ حفصہؓ نے کہا: جی ہاں میں آپ ﷺ سے خوب بحث کرتی ہوں۔ میں نے کہا: میں تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی سے ڈراتا ہوں" یہ متفق علیہ ہے۔ انسؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ کی کسی زوجہ نے ایک برتن میں کھانا بھیجا، تو عائشہؓ نے اس برتن پر ہاتھ مارا تو برتن الٹ گیا اور جو کھانا تھا وہ گر گیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھانے کے بدلے کھانا اور برتن کے بدلے برتن"، اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ حسن صحیح ہے۔ یہ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ کا اپنی ازواج پر قوّام ہونا ان کی دیکھ بھال اور پرورش کے لیے تھا حکومت چلانے کے لئے نہیں تھا۔

وہ سب آپ ﷺ کے ساتھ دوستوں کی طرح تھیں رعایا کی طرح نہیں۔ آپ ﷺ کا ان کے ساتھ رہن سہن اور میل جول دوستانہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت پر شوہر کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے اور نافرمانی کو حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے: **وَاللَّاتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا**(النساء :34) ”جن (بیویوں) کی طرف سے نافرمانی کا تمہیں خوف ہے، ان کو (پہلے) نصیحت کرو، (باز نہ آئیں تو) ان سے بستر جدا کرلو (پھر بھی بات نہ بنے تو) ان کو (ہلکا پھلکا) مارو، اگر تمہاری اطاعت شروع کردیں تو ان کے خلاف (سخت گیری کے لیے) بہانہ مت ڈھونڈو“۔ جبکہ خاوند پر بیوی کے لیے نفقہ کو واجب کر دیا۔ ارشاد ہے: **لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتَاهُ اللّٰهُ** (الطلاق:7) ”وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق خرچ کرنا چاہیے اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہیے کہ اللہ نے جتنا دیا ہے اتنا خرچ کرے“۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«أَلاَ إِنَّ لَكُمْ عَلَى نِسَائِكُمْ حَقًّا وَلِنِسَائِكُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا، فَأَمَّا حَقُّكُمْ عَلَى نِسَائِكُمْ فَلاَ يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ مَنْ تَكْرَهُونَ، وَلا يَأْذَنَّ فِي بُيُوتِكُمْ لِمَنْ تَكْرَهُونَ، أَلا وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ أَنْ تُحْسِنُوا إِلَيْهِنَّ فِي كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ»** ”سنو تمہارا تمہاری بیویوں پر حق ہے اور تمہاری بیویوں کا تم پر حق ہے۔ تمہارا تمہاری بیویوں پر یہ حق ہے کہ تمہارے بستر پر کسی کو آنے نہ دیں اور کسی ایسے شخص کو تمہارے گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں جو تمہیں ناپسند ہو۔ ان کا تم پر یہ حق ہے کہ تم ان کے کپڑوں اور کھانے پینے کے معاملے میں ان کے ساتھ بھلائی کرو“، اس کو ترمذی نے ابنِ احوص سے ان کے باپ کے حوالے سے روایت کیا ہے۔ جبکہ مسلم میں جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ تمہارے بستر پر کسی کو آنے نہ دیں اور ان کا تم پر یہ حق ہے کہ تم کھانے پینے اور پہنے کے معاملے میں ان سے اچھا سلوک کرو“۔ یہ بھی روایت ہے کہ ھند (ابوسفیان کی بیوی) رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور کہا: ”اے اللہ کے رسول ﷺ! ابوسفیان کنجوس آدمی ہے، مجھے اس قدر نہیں کھلاتا جو مجھے اور میرے بچے کے لیے کافی ہو، مگر میں اس سے چھپا کر کچھ لیتی رہتی

ہوں"۔ فرمایا: "جو رواج کے مطابق تمہیں اور تمہارے بچے کے لیے درکار ہو، لے لیا کرو"، یہ متفق علیہ ہے اور راوی عائشہؓ ہیں۔ یہ سب اس دفعہ کی دلائل ہیں۔

دفعہ نمبر 121: گھر کے کام کاج میں میاں بیوی مکمل تعاون کریں گے، گھر سے باہر کے تمام کاموں کو انجام دینا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ گھر کے اندر کے تمام کام حسب استطاعت بیوی کے ذمہ ہیں۔ جو گھریلو کام وہ نہیں کر سکتی اس کے لیے خادم مہیا کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔

اس دفعہ کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فعل اور قول ہے، آپ ﷺ نے گھر کے اندر کے کام کاج کی ذمہ داری اپنی بیٹی فاطمہؓ کو دی جبکہ گھر سے باہر کے کام علیؓ کے ذمہ لگائے، اس کو ابنِ ابی شیبہ نے ضمرہ بن حبیب سے روایت کیا ہے اگرچہ اس حدیث کی سند میں ابو بکر بن مریم الغسانی ہے مگر ابو حنیفہ نے اس حدیث کو لیا ہے اور ابن حجر نے الفتح اس کے بارے میں کہا ہے کہ "یہ علیؓ بن ابی طالب کی اس حدیث سے مستنبط ہے جس میں ہے کہ فاطمہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس خادم مانگنے کے لیے آئی تو آپ ﷺ نے انہیں سوتے وقت کچھ کلمات پڑھنے کی تلقین فرمائی"۔ اس حدیث کو بخاری نے علی بن ابی طالبؓ سے نقل کیا ہے جو کہ یوں ہے "فاطمہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس خادم طلب کرنے کے لیے آئیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ بتادوں، جب سونے کے لیے بستر پر لیٹ جاؤ تو تینتیس بار سبحان اللہ، تینتیس بار الحمد للہ اور چونتیس بار اللہ اکبر پڑھا کرو۔ اس کے بعد میں نے ان کو کبھی ترک نہیں کیا۔ سفیان نے کہا کہ جنگِ صفین کی رات بھی نہیں؟ کہا صفین کی رات بھی نہیں"۔ یہ گھر کے کام کاج کے بیوی پر لازم ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ خادم طلب کرنا کام کے بھاری (بوجھل) ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اگر خدمت واجب نہ ہوتی تو اتنا بوجھ اٹھا کر خدمت کیونکر کی جائے۔ یہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ بیوی گھر کے کام کاج اپنے استطاعت کے مطابق ہی کرے گی۔ اگر خادم کے بغیر گزارہ نہ ہو تو خادم مہیا کیا جائے گا کیونکہ فاطمہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے خادم

طلب کیا۔ یوں اگر خاوند گھر سے باہر کے کام اور بیوی گھر کے اندر کے کام انجام دیتے رہیں تو یہ دونوں کے درمیان تعاون ہے۔

دفعہ نمبر 122: چھوٹے بچوں کی کفالت عورت پر واجب اور اس کا حق ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم بشرطیکہ چھوٹا بچہ اس کفالت کا محتاج ہو۔ جس وقت اس کو اس کی ضرورت نہ رہے تو دیکھا جائے گا کہ اگر پرورش کرنے والا اور والی دونوں مسلمان ہوں، مرد ہو یا عورت، تو چھوٹے لڑکے یا لڑکی کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ جس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے رہے۔ اگر ان دونوں میں سے ایک مسلمان ہو تو کوئی اختیار نہیں دیا جائے گا بلکہ ان دونوں میں سے مسلمان کے حوالے کیا جائے گا۔

اس دفعہ کی دلیل وہی ہے جو عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ **«أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، إِنَّ ابْنِي هَذَا كَانَ بَطْنِي لَهُ وِعَاءً، وَثَدْيِي لَهُ سِقَاءً، وَحِجْرِي لَهُ حِوَاءً، وَإِنَّ أَبَاهُ طَلَّقَنِي وَأَرَادَ أَنْ يَنْتَزِعَهُ مِنِّي، فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: أَنْتِ أَحَقُّ بِهِ مَا لَمْ تَنْكِحِي»** "ایک عورت نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ میرا بچہ ہے میرا پیٹ اس کا برتن تھا، میرے پستان اس کے پینے کے لیے تھے اور میری گود اس کی پناہ گاہ تھی۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی اور اس کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا: جس وقت تک تم شادی نہیں کرتی تم ہی اس کی زیادہ حقدار ہو"، اس کو ابو داؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے، ذہبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب تک بچے کو پرورش کی ضرورت ہے ماں ہی اس کی زیادہ حقدار ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے شادی کرنے تک اسی کو پرورش کا حقدار قرار دیا اور بچے کو کوئی اختیار نہیں دیا۔ جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بچے کو پرورش کی ضرورت تھی۔ اور ابنِ ابی شیبہ نے صحیح اسناد کے ساتھ عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ام عاصم کو طلاق دی اور اس کے پاس جا کر اس کے گود میں موجود

عاصم کو لینا چاہا، اس نے بچے کو اپنی طرف کھینچ لیا اور دونوں میں کشمکش (کھینچا تانی) ہو گئی جس سے بچہ رو پڑا۔ پھر دونوں چل کر ابو بکر صدیقؓ کے پاس گئے۔ آپؓ نے فرمایا: "اس (ماں) کا چھونا، گود میں لینا اور اس کی خوشبو اس بچے کے لیے تم سے زیادہ بہتر ہے، یہاں تک کہ بچہ بڑا ہو جائے اور جس کے ساتھ چاہے رہے"۔ اس لیے جس بچے کو پرورش کی ضرورت ہو تو اس کی پرورش کا حق اس کی ماں کو حاصل ہے اور اس پر واجب بھی ہے۔ اس (عورت) کی ماں اور دادی کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ ان تمام عورتوں کا یہی حکم ہے جن کو پرورش کا حق حاصل ہے۔ جب بچہ بڑا ہو جائے یعنی رضاعت کا زمانہ گزر جائے، تو دیکھا جائے گا کہ اس کو (گود میں لے کر) پرورش کرنے کی ضرورت ہے کہ نہیں۔ یہ مختلف بچوں میں مختلف ہو سکتا ہے، کوئی بچہ پانچ سال میں اتنا ہو جاتا ہے کہ اس کو حضانہ (گود) کی ضرورت نہیں رہتی دوسرا اس سے کم یا زیادہ عمر میں اس پرورش سے مستغنی ہو سکتا ہے۔ تب اس کو ماں باپ میں سے ایک کو اختیار کرنا ہے۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ: "نبی ﷺ نے ایک لڑکے کو ماں باپ میں سے ایک کو چننے کا اختیار دیا"، اس کو احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے، جبکہ ابو داؤد نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے، جس کو ابنِ حبان نے صحیح کہا ہے: **«... أَنِّي سَمِعْتُ امْرَأَةً جَاءَتْ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ρ وَأَنَا قَاعِدٌ عِنْدَهُ فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنَّ زَوْجِي يُرِيدُ أَنْ يَذْهَبَ بِابْنِي وَقَدْ سَقَانِي مِنْ بِئْرِ أَبِي عِنَبَةَ وَقَدْ نَفَعَنِي، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: ... هَذَا أَبُوكَ وَهَذِهِ أُمُّكَ فَخُذْ بِيَدِ أَيِّهِمَا شِئْتَ، فَأَخَذَ بِيَدِ أُمِّهِ فَانْطَلَقَتْ بِهِ»** "... میں نے اس عورت کو سنا جو رسول اللہ ﷺ کے پاس، جہاں میں بیٹھا ہوا تھا، آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! میرا شوہر میرے بچے کو لے جانا چاہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ... یہ تیرا باپ اور یہ تیری ماں ہے، جس کے ساتھ جانا چاہتے ہو اس کا ہاتھ پکڑو۔ اس بچے نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑا اور وہ اس کو لے کر چل پڑی"۔ یہ دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بچہ لڑکا ہو یا لڑکی اس کی رضاعت ختم ہو جائے اور اس کو گود میں پرورش کرنے کی ضرورت نہ رہے تو اس کو ماں باپ میں سے اختیار دیا جائے گا چاہے اس کی عمر تین سال ہو یا

اس سے زیادہ بشرطیکہ اس کو گود کی ضرورت نہ ہو۔ اگر اس کو گود کی ضرورت ہو تو کوئی اختیار نہیں دیا جائے گا بلکہ ماں کے حوالہ کیا جائے گا۔ ہاں اگر وہ عورت (ماں وغیرہ) کافر ہو اور بچے کو پرورش کے لیے طلب کرے اور بچہ اگر گود کا محتاج ہو تو مسلمان کی طرح اس کو بھی ماں کے حوالے کیا جائے کیونکہ حدیث عام ہے "جب تک تم شادی نہیں کرو گی تم ہی اس کی حق دار ہو"۔ اگر بچے کو گود میں لے کر پرورش کرنے کی ضرورت نہ ہو تب اختیار نہیں دیا جائے گا بلکہ جو مسلمان ہو اس کے سپرد کیا جائیگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا** (النساء:141) "اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مؤمنوں پر ہرگز کوئی غلبہ (بالادستی) نہیں دیا"۔ تربیت کرنے والے کی بچے پر بالادستی ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **«الإِسْلاَمُ يَعْلُو وَلاَ يُعْلَى»** "اسلام غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا"۔ اس کو دارقطنی نے عائذ المزنی سے حسن اسناد سے روایت کیا ہے۔ تربیت کرنے والا بچے پر غالب ہوتا ہے اور بچے کا کافر کے ماتحت تربیت پانا گویا اس کو کفر کی تلقین کرنا ہے جو کہ جائز نہیں۔ پس اسی پر عمل کیا جائے گا۔

جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے جس کو ابو داؤد نے عبد الحمید بن جعفر سے ان کے باپ پھر دادا رافع بن سنان سے نقل کیا ہے کہ: **«أَنَّهُ أَسْلَمَ، وَأَبَتِ امْرَأَتُهُ أَنْ تُسْلِمَ، فَأَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَتِ: ابْنَتِي، وَهِيَ فَطِيمٌ أَوْ شَبَهُهُ، وَقَالَ رَافِعٌ: ابْنَتِي، قَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ: اقْعُدْ نَاحِيَةً، وَقَالَ لَهَا: اقْعُدِي نَاحِيَةً، قَالَ: وَأَقْعَدَ الصَّبِيَّةَ بَيْنَهُمَا، ثُمَّ قَالَ: ادْعُوَاهَا، فَمَالَتِ الصَّبِيَّةُ إِلَى أُمِّهَا، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: اللَّهُمَّ اهْدِهَا، فَمَالَتِ الصَّبِيَّةُ إِلَى أَبِيهَا فَأَخَذَهَا»** "اس نے اسلام قبول کیا لیکن اس کی بیوی نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر کہا: میری بچی ابھی چھوٹی ہے۔ جبکہ رافع نے کہا بچی میری ہے۔ رسول اللہ ﷺ ان سے فرمایا ایک کونے میں جا کر بیٹھو اور عورت سے فرمایا تم دوسرے کونے میں جا کر بیٹھو۔

(راوی) کہتا ہے کہ بچی کو ان دونوں کے درمیان بٹھایا۔ پھر فرمایا: دونوں اس کو بلاؤ۔ تو بچی ماں کی طرف گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ اس بچے کو ہدایت دے۔ بچی باپ کی طرف چل پڑی تو باپ نے لے لیا"۔ اس حدیث کو اگرچہ حاکم نے صحیح کہا ہے اور ذھبی نے بھی اس کی موافقت کی ہے جبکہ دار قُطنی نے ذکر کیا کہ اس بچی کا نام عمیرہ تھا۔ احمد اور نسائی نے اسی حدیث کو ایک اور روایت کے ساتھ نقل کیا ہے، چنانچہ نسائی نے عبد الحمید بن جعفر الانصاری سے اس کے دادا کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ **«أَنَّهُ أَسْلَمَ، وَأَبَتِ امْرَأَتُهُ أَنْ تُسْلِمَ، فَجَاءَ ابْنٌ لَهُمَا صَغِيرٌ لَمْ يَبْلُغِ الْحُلُمَ، فَأَجْلَسَ النَّبِيُّ ﷺ الأَبَ هَا هُنَا وَالأُمَّ هَا هُنَا، ثُمَّ خَيَّرَهُ فَقَالَ: اللَّهُمَّ اهْدِهِ، فَذَهَبَ إِلَى أَبِيهِ»** "وہ اسلام لایا اور اس کی بیوی نے اسلام لانے سے انکار کیا۔ ان دونوں کا چھوٹا بیٹا آگیا، جو نابالغ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ماں کو ایک جگہ اور باپ کو دوسری جگہ بٹھایا۔ پھر بچے کو اختیار دیا اور فرمایا: اے اللہ اس کو ہدایت دے، وہ بچہ اپنے باپ کے پاس گیا"۔ ابنِ جوزی نے ان دونوں روایتوں کے بارے میں کہا ہے کہ جس روایت میں کہا گیا ہے کہ وہ بچہ لڑکا تھا یہی روایت صحیح ہے۔

رسول اللہ ﷺ لڑکے کے انتخاب پر راضی نہ تھے، پس اس کے لیے دعا کر دی تو اس نے اپنے مسلمان باپ کا انتخاب کیا۔ یعنی بچے کو ماں باپ میں سے مسلمان کے حوالے کیا جائے گا۔

الحمدللہ اس کتاب کا پہلا حصہ مکمل ہو گیا۔ کتاب کا دوسرا حصہ اقتصادی نظام، تعلیمی پالیسی اور خارجہ پالیسی پر مشتمل ہے۔